خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

جولائی 2013

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

11 **انشائیہ**
جون ایلیا
خواہشوں کے جنگل میں ایک صاحبِ دانش کی حقیری سی آرزو

12 **آپ کے خط**
مدیراعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 **زخمِ گل**
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

45 **زہرباد**
ناہید سلطانہ اختر
گھر کو گھر بنانے اور رشتوں کی اساس کو واضح کرتی ایک شاہکار کہانی

64 **کشکول**
انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

95 **خوفِ محبت**
کاشف زبیر
خوابوں کے منظر میں حقیقی پناہ کی متلاشی ایک حسینہ کی سادگی

114 **منہ زور**
مرزا امجد بیگ
محبت کی راکھ میں سلگتے جذبات کی کارفرمائیاں

143 **تہِ دام**
سلیم انور
تہِ دام آنے والے ایک بلند پرواز پنچھی کی روداد

152 **محفلِ شعر و سخن**
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

155 **انصاف**
تنویر ریاض
من مانی کرنے والے ایک نادان کی خوش فہمیاں

164 **مُسافر**
ناصر ملک
گل و گلزار سے راہِ پُرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

207 **واپسی**
ڈاکٹر شیر شاہ سید
پُرجوش تقاریر کرنے والی لڑکی اور ایک ستم زدہ عورت کی بپتا

213 **شمعِ فروزاں**
ضیا تسنیم بلگرامی
کٹھن آزمائشوں میں پورا اترنے والے ایک اور معتبر ولی کا قصہ

223 **عشق بھلائے نہ بھولے**
محمد الیاس
کسی کے عشق میں اپنی ذات کو مٹانے والے ایک سچے عاشق کا قصہ

237 **چلتر**
بابر نعیم
محبت اور فریب کا ایک دلچسپ سنگم

240 **آخری مرحلہ**
ایچ اقبال
جذباتی بھونچال، سرکش موجوں کے درمیان نمو پانے والے رشتوں کی داستان

آئیڈیل پبلک لائبریری
0334-9630916

جلد43 • شمارہ 07 جولائی 2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

خواہش

جون ایلیا

مینھ کا جھمکا لگا ہے۔ پرنالے بہہ رہے ہیں۔ برآمدے سے ایک لڑکے کی آواز آرہی ہے۔ ''چلنی میں مرچیں بادل کی کرچیں'' میری بھانجی ام ریحانہ نے ایک کاغذ پر چہل قاف لکھ کر اور اس کے بالائی حصے میں دھاگا پرو کر ہارسنگار کی ٹہنی میں لٹکا دیا ہے۔ بس اب کوئی دم میں بادل چھٹ جائیں گے۔

میرا ہمزاد بائیں دروازے سے داخل ہو کر میرے سامنے آن بیٹھا ہے۔ وہ بہت اداس دکھائی دیتا ہے۔ چند لمحے بعد وہ آپ ہی آپ ایک اداس محویت کے ساتھ خود کلامی کے انداز میں مصروف تکلم ہو جاتا ہے۔

''سنا ہے کہ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی زبان بولنے اور ایک ہی سا احساس رکھنے والے دو گروہ، دو جلالت مآب گروہ ایک دوسرے کا جیتا لہو بہار ہے ہیں۔ میں نے غلط کہا، جیتا لہو نہیں، یہ تو سات سو ساڑھے سات سو برس کا بگڑا ہوا لہو ہے۔ اردو معاشرے کی سیاست اور اردو تہذیب کی تاریخ کا بگڑا لہو۔ یہاں میں اس سے بھی زیادہ کڑوی بات کہوں گا اور وہ یہ کہ میرا اور تمہارا سڑا ہوا لہو۔ میں تو اب اپنے وجود سے گھن کھانے لگا ہوں۔ میں وقت کی ایک سڑاند ہوں۔ میرے وجود کی سمتیں سڑی ہوئی ہیں۔

''میرا لمحہ لمحہ ایک بہتان اور اتہام ہے۔ میرا لہو اونٹ رہا ہے اور وہ تلاملی ہے کہ بس! میں زندگی کے بہاؤ سے کٹ گیا ہوں اور ایک جوہڑ بن کے رہ گیا ہوں۔ مجھے ''جوہڑ'' پر یاد آیا کہ میرے بزرگ اپنی زبان کو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کہتے تھے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان۔ ہنہ، ہشت۔

''اردو تہذیب کے بے چارے بزرگوں، عالی شان بزرگوں کے کچھ نام ہیں جو کسی ترتیب کے بغیر میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو، بھگت کبیر، رحیمن (عبدالرحیم خان خاناں) شمس العشاق، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ، وجہی، فضلی، شاعر شاعراں ولی، سراج، مرزا مظہر جان جاناں، ارسطوئے ہند خان آرزو، خدائے سخن میر، مرزا سودا، میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، نظیر، مصحفی، لبھو رام دیگر، خدائے سخن میر انیس، غالب علی کل غالب، پیر و مرشد حضرت بہادر شاہ ظفر، سید احمد خاں، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، نواب امداد امام اثر، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، علامہ اقبال، منشی پریم چند، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، فراق، جگر، یگانہ چنگیزی، منٹو، مولانا عبدالمجید سالک، ن م راشد، کرشن چندر...... یہ ہیں اردو تہذیب کے چند جاوداں نام۔ مگر یہ کیوں تھے؟ انہیں کیوں ہونا چاہیے تھا؟ ان کے نہ ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا؟ ان کے ہونے سے آخر کیا فرق پڑا؟ جب کہ ان کے وارث ہم ہیں، بے ہودہ ترین ہم۔ مینھ تو کبھی کبھی برستا ہے، پرنالے تو کبھی کبھی بہتے ہیں، پر ان ناموں کے وارث ایک دوسرے کا لہو روز بہاتے ہیں۔ میں، تم اور ہم سب لہو بہنے اور بہانے کا لگا تار، موسم منانے اور خاک کو لہو سے رچانے میں ایسے طاق اور مشاق ہو گئے ہیں کہ صل علیٰ۔

میں تمہاری زبان کی گرہ کھولنے والوں، اسے اس کے طور سے بولنے والوں اور اس ناشدنی کے جوہر تولنے والوں میں سب سے زیادہ ہیچ اور پوچ متنفس ہوں۔ پر مجھ ایسے لوگ، رایگاں لوگ تو سالہا سال سے ہونے کی طرح ہیں ہی نہیں۔ اور اس شہر، اس خود آزار اور خوں خوار شہر کا کوئی شہری ہونے کی طرح ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

میں اپنے حسابوں اس نحوست زدہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس نے تمہیں، اردو تہذیب کے جواں فکر، نمایندو، وقت اور حالات کے ناز پروردہ نمایندو! تمہیں سیدھ کے سجاؤ پر لانا چاہا۔ پر تم نے ہمیں اپنی ٹھوکروں پر رکھا۔ ہم تمہاری بدبخت زبان کے ادیب و شاعر تھے اس لیے تم نے ہمیں دھتکار دیا۔ کیا تاریخ یہ حقیقت محفوظ نہیں رکھے گی کہ دھتکارنے والے کون تھے اور دھتکارے جانے والے کون؟

تمہارے اور ہمارے بعض معتبر بزرگوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب درست تھا یا نادرست، یہ ایک بے نتیجہ بحث کی بات ہے مگر بہر حال خواب دیکھا گیا تھا اور بڑی لگن سے دیکھا گیا تھا۔ جب اس خواب کی تعبیر مل گئی تو نوظہور اور مقدس سیاست مداروں نے اس تعبیر کو خواب کے منہ پر دے مارا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ملک انسانوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے نہیں، فرشتوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

یہ داستان نہ مختصر ہے اور نہ خوشگوار۔ بہر حال پھر ایک نئی نسل برروئے کار آئی، تم برروئے کار آئے اور تم نے خیالوں کے بجائے حقیقت کی، حقیقی مسئلوں کی بات کی۔ اور یہ ایک خیر طلبی کی بات تھی مگر یہ خیر طلبی صرف اپنے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور یہیں سے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ یہ طور صرف تمہی نے نہیں اختیار کیا، اس ملک کے ہر گروہ نے اختیار کیا۔

میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اردو بولنے والے ہوں یا سندھی بولنے والے، بلوچ ہوں یا پختون، پنجابی ہوں یا سرائیکی یا دوسرے، یہ سب کے سب ان حساس اور باشعور نوجوانوں اور جوانوں کی ذمے داری ہیں جو لوگوں کا حق منوانے کی اہلیت اور استطاعت رکھتے ہوں اور جنہیں قبول عام اور قبول عوام کی سند حاصل ہو۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسا گروہ نہیں پایا جاتا جس کی جیب میں دوسرے گروہوں کے لیے بھی کوئی مژدہ نامہ ہو...... میں انسانوں کو زبانوں میں، علاقوں میں، عقیدوں میں اور نسلوں میں بانٹنا، ذہن اور عمل کا سب سے زیادہ گندہ اور گھناؤنا جرم خیال کرتا ہوں۔

میری حقیر ترین مگر عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ نئی نسل کے مقتدر سیاست داں نئی توانائی، نئی پرماجرائی، نئے حوصلے اور نئے ولولے کے ساتھ اپنی صف بندی کریں، ایسی صف بندی جو اس ملک کے تمام عوام، محروم عوام کے لیے زندگی خیز اور دل انگیز امیدوں کا جاں پرور سرمایہ قرار پائے۔ یہی نہیں بلکہ مژدہ قرار پائی۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں جس طرح اب اداس ہوں، آئندہ بھی اداس رہوں گا مگر بھلا میں کون!''

یہ تھا میرے ہمزاد کا کلام جو تمام ہوا۔ .... ٭٭٭

آپ کے خط

محترم قارئین
السلام علیکم!

جولائی 2013ء کا پُر بہار شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے زیرِ نظر ہے۔ سب سے پہلے تو رمضان شریف کی بے حد مبارکباد۔ رب العزت سے دعا ہے کہ ان بابرکت ساعتوں میں ہماری عبادتوں اور دعاؤں کو قبول فرمائے اور ہمیں تینوں عشروں کی رحمتوں نعمتوں سے فیضیاب کرے (آمین) ملک میں الیکشن اور سلیکشن کا کھیل ختم ہو چکا اور عوام نے ہمیشہ کی طرح ''نئی'' حکومت سے حالات میں بہتری کی ''پرانی'' امیدیں پھر سے وابستہ کر لی ہیں۔ ویسے اب امیدوں کا انبار بھی مسائل کی طرح بڑھتا جا رہا ہے۔ مضطرب و منتشر عوام آس لگائے بیٹھے ہیں کہ بلی تھیلے سے نکل کر کیا کارنامہ انجام دیتی ہے۔ تب تک ہم امید کی تال پر بے یقینی سے سر دُھنتے رہیں گے۔ جبکہ دوسری جانب کراچی میں بدامنی کی بدولت چھوٹی بڑی صنعتوں کا دوسرے صوبوں میں منتقلی کا عمل ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ان سطور کے تحریر ہونے تک نئی حکومت کا کوئی لائحہ عمل سامنے نہیں آیا، تاحال عوام کو بجلی اور پانی کے بحران کا سامنا گزرے کل سے زیادہ شدید ہے۔ بجٹ آنے سے پہلے اشیائے خورونوش کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ دکانداروں کی من مانیاں، ٹرانسپورٹ کرائے میں اضافہ اور عوام کی بے بسی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جہاں اسمبلیوں میں بڑے بڑے بل پاس کرائے جاتے ہیں وہاں بجٹ سے قبل قیمتوں میں اضافے کے خلاف کوئی قانون سازی کیوں نہیں کی جاتی...... بہر حال امید خیر کی ہی رکھنی چاہیے اور ممکن ہے آنے والے کل میں وہ سب کچھ ممکن ہو جائے جو جانے والے کل میں ہم چاہتے تھے...... اس سیاسی جوڑ توڑ کو چھوڑ کر اب ہمیں بھی اپنی محفل کی خبر لینا چاہیے کیونکہ...... سیاستدانوں کی طرح اپنے پیاروں سے اتنی بے خبری اچھی نہیں ہوتی۔

✠ **اعجاز احمد راحیل**، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''آپ کی یاد آئی قلم نے ساتھ دیا، کاغذ نے سینہ حاضر کیا اور ذہن نے آپ کی یاد میں پھول برسائے، دل نے گلدستۂ سخن تحریر کیا پھر میں نے لکھا...... جون کا شمارہ 20 مئی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو ملا تو موسم کول کول ہو گیا...... دوستو، محبت کوئی وقت کا بہلاوا نہیں ہے، یہ رشتے، یہ جذبے تو دل کی سرزمین پر امربیل کی طرح پھیلے ہوتے ہیں، ان کو دل سے نکالنا بہت ہی کٹھن ہوتا ہے...... یہ سسپنس کی محبت کی انتہا ہی تو ہے جو ایک بار پھر حاضرِ محفل ہوں...... صدرِ محفل شیر علی خان کو وِنر ہونے اور شادی کی مبارکباں...... ڈیئر برادر، آپ اگر ہمیں بھی شادی پہ بلا لیتے تو کیا حرج تھا؟ قیصر اقبال گچہ صاحب بھی اپنے آپ کو اعلیٰ ثابت کرنے پر تلے نظر آئے، ویسے آپ کو اس سے کیا؟ گوبھی کا پھول ہو یا پھول گوبھی کا...... آپ کا تبصرہ مزہ دے گیا...... اپنے بہت ہی محترم حکیم سید محمد رضا شاہ کی کوشش بھی اللہ اللہ کر کے کامیاب ہو گئی...... محترمہ ساجدہ راجا بھی لوڈشیڈنگ کا رونا روتی نظر آئیں یقیناً ان کا میک اپ خراب ہوا ہوگا...... اپنے بابر بھائی کا تبصرہ اور باتیں مزہ دے گئیں بہر حال بھائی ہتھ ہولا رکھیں ایسا نہ ہو کہ ''آپ کے خط'' کی مشینری سے یہ دو چار پرزے بھی غائب ہو جائیں۔ محترم تصویر العین کا تبصرہ اور یہ جملہ، باہر کے موسم سے دل کا موسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ دل کے موسم سے باہر کا موسم متاثر ہوتا ہے، زبردست لگا بے شک من میں لگی ہوئی آگ کو ساون کی بارش بھی نہیں بجھا پاتی۔ بھائی رضوان تنولی صاحب کا تبصرہ اچھا لگا۔ ویسے برادر آپ کو پتا ہونا چاہیے ماہا ایمان کا سلیکشن ہو چکا ہے...... کستوری لگا کے...... بہت ہی پیارے بھائی توصیف احمد صاحب، ہم شاعر لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں سب اچھا لگتا ہے...... عدنان یوسف برادر، تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ...... محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ اور طاہرہ یاسمین کو دیا گیا مشورہ عمدہ لگا...... رمضان پاشا کی بھاشا بھی خوب رہی۔ حسیب احمد چنائے صاحب، برادر ہمایوں سعید ہاتھ دھو کے پیچھے نہیں پڑتا بلکہ نہا دھو کے پیچھے پڑتا ہے۔ سید محی الدین اشفاق کا تبصرہ اور اعلیٰ سوچ قابلِ داد ہے، یقیناً ہمارے پڑھے لکھے حکمرانوں کو ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کا محفل میں نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میرا مشورہ قبول کر کے اللہ اللہ کرنے بیٹھ گئیں، تھینکس...... ادریس احمد خان، ثمینہ حبیب، عدنان یوسف، رائے قیصر اقبال کے تبصرے اچھے لگے بہر حال محفل میں آغا فرید احمد خان، تفسیر عباس بابر، نعمان پیارے اینڈ MR ڈب کلاں کی کمی محسوس ہوئی۔ تاریخی کہانی امیر غلام، یوسف عادل شاہ کی پر الم و پر مسرت داستانِ حیات متاثر کن رہی۔ ناصر ملک کی مسافر میں چندو ماہی شہریار کے کندھے پہ سر رکھے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی ہے یقیناً کوئی اپنا ہونا چاہیے جس سے بندہ اپنا دکھ بانٹ سکے۔ چندو ماہی کے سفر کی اذیتیں اور اس کے پیروں کے اک اک آبلے پہ درج تفصیل زیست غمزدہ کر گئی ہے۔ رضوان کا کردار حقیقت سے قریب تر لگا...... کشکول کی موجودہ قسط بھی پُر تجسس اور سنسنی خیز رہی...... آخری صفحات پر موجود دولت کے پاؤں منفرد استوری ثابت ہوئی۔ دولت کے لیے انسان پتا نہیں کیا کچھ کرتا ہے مگر یہ تو ہاتھوں کا میل ہے...... عبدالرشید کی بے حسی بالکل اچھی نہ لگی کہ ایک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ دھوکا کیا مگر انتقام قدرت سے بندہ خود کو کیسے بچا سکتا ہے؟ عبدالرشید نے جیسا کیا ویسا ہی بھرا...... انسان دشمن میں ملک صاحب ہمیشہ کی طرح مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ احمد اقبال کی سرپرائز اور کاشف زبیر صاحب کی فرض ماں باپ کے احساسات و جذبات کو اجاگر کرتی قابلِ تعریف تحریریں ہیں یقیناً دنیاوی رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ عظیم تر ہے یہ کہانیاں پڑھ کے جذبات سے مغلوب ہو کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تک ویلوٹ کے تازہ کارنامے نے خاصا مسرور کیا۔ محفلِ شعر و سخن میں مہرین ناز، توصیف احمد، حافظ شاہد عمران، سید محی الدین اشفاق، ریاض بٹ، رضوان تنولی، ساجدہ راجا، محمد قدرت اللہ نیازی اینڈ بابر عباس و مسز بابر عباس کے اشعار اچھے لگے۔''

✠ **مہر اختر عباس تھراج**، ظفر اقبال ظفری، کبیر والا سے محفل میں چلے آ رہے ہیں ''اب کی بار سسپنس 17 مئی کو موصول ہو گیا۔ ٹائٹل بے حد

پسند آیا۔ میری مدیرِ اعلیٰ سے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ محی الدین نواب سے سلسلے وار ناول لکھوائیں۔ پلیز ہماری اس عرض کو حکام بالا تک ضرور پہنچائیں۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے) محفل میں قدم رکھا تو وزارت کی کرسی پر شیر علی خان کا قبضہ تھا۔ ڈبل مبارک جناب، دوسری ہماری بھابی جی کو گھر لانے کی۔ ادریس خان، آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ موبائل فون آج کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاس بھی دکھائی دیتا ہے جو، ان کے لیے ایک مہلک ہتھیار بن چکا ہے۔ ابرار وارث، آپ کی خوشی بجا ہے، آپ کی طرح میں بھی محی الدین نواب کا بے حد فین ہوں۔ قیصر بھائی یہ تو بتا دیں کیا زیادہ عمر کو بھی کے پھول کی ہوتی ہے؟ وہ گلاب کا پھول تھیں، آپ نے گوبھی کا بنا دیا۔ ڈیئر شاہ محمد رضا نقوی صاحب! دیکھ لو آپ نے یاد کیا اور ہم پہنچ گئے۔ سنائیے کیسے ہیں آپ؟ ساجدہ راجا، ہم بھی دیہاتی ہیں مگر آپ شاید پہلی خاتون ہیں جو دیہات سے خط لکھ رہی ہیں۔ تصویر العین آپ کا خط بے حد پسند آیا ہے وجہ یہ ہے کہ آپ نے سب قارئین کے خطوط کی تعریفیں کی ہیں تو کوئی ایسا بھی ہونا چاہیے جو آپ کو پسند کر سکے۔ قدرت اللہ بھائی! آپ کے لیٹر نے خوب ہنسایا ہے۔ مسافر اے ون جا رہی ہے۔ میڈم شکیلہ کے بارے میں عجیب انکشافات ہو رہے ہیں۔ انکل ناصر ملک مجھے اپنے علاقے کے لگتے ہیں۔ عائشہ فاطمہ کی لاسٹ استوری، دولت کے پاؤں پڑھی، بہت اچھی لگی۔ کہانی کی تعریف کرنا گویا۔ اب مجھے یاد نہیں آ رہا کیا کہوں۔۔ بہر حال اس دفعہ کے سسپنس نے لوڈشیڈنگ کی کمی پوری کر دی۔''

✠ **زویا اعجاز**، لاہور سے چلی آ رہی ہیں ''سب ہم وطنوں کو نیا جمہوری اقتدار مبارک ہو۔ پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ مملکتِ خداداد کا نظم و نسق اب اہل ترین حکمرانوں کو نصیب ہو۔ اٹھارہ مئی کی گرم تپتی سہ پہر میں سسپنس سے ملاپ راحت بخش تھا۔ ٹائٹل غیر متاثر کن تھا۔ دوپٹے اور بالیوں کا انداز بے حد پرانا ہے۔ محفل میں گرما گرمی جاری تھی۔ گرم جوشی سے استقبال پر سب عاشقانِ سسپنس کا دلی شکریہ۔ بابر عباس اور تصویر العین جی اپنی تاخیر سے آمد پر یہی کہوں گی دیر آید درست آید۔ قیصر اقبال صاحب، پھول تو پھول ہوتا ہے گلاب کا ہو یا گوبھی کا۔ ویسے میں سسپنس میٹرک کلاس سے پڑھ رہی ہوں۔ تحاریر میں اس مرتبہ احمد اقبال کی سرپرائز بلاشبہ استوری آف دی منتھ تھی۔ پردیس کی صعوبتیں اور اپنوں سے دوری کا دکھ تو بس پردیسی ہی جان سکتے ہیں یا ان کے لاحاصل انتظار میں مبتلا مائیں اور بیویاں۔ مرزا امجد بیگ اور ملک صفدر حیات کی کہانیاں ہر بار مخصوص موضوع و ڈگر پر مبنی ہوتی ہیں۔ عائشہ فاطمہ کی دولت کے پاؤں بس ایوریج تھی۔ کہانی میں مزید بہتری لائی جا سکتی تھی۔ مسافر میں چندو ماہی مصائب در مصائب میں مبتلا ہے۔ اس ماہ کی قسط میں ماموں رضوان کا کردار شاندار تھا اور ان کا فلسفۂ محبت لاجواب۔ جبکہ فائزہ کا کردار و گفتار انتہائی گھناؤنے ثابت ہوئے۔ کشکول کا ٹیمپو انتہائی سلو ہو گیا ہے۔ مترجم کہانیوں میں مریم کے خان کی جیت کی ہار بہترین تھی۔ ایلس کی جہدِ لاحاصل نے بہت دکھی کیا۔ دیگر کہانیوں میں فرض، عارف کامل، ایضاً اور ٹرکی کی چوری بھی خوب رہیں۔ پاس ورڈ متاثر کرنے میں بالکل ناکام رہی۔ اس ماہ احسان سحر کا مراسلہ پسند آیا۔ مجموعی طور پر جون کے شمارے کو سو میں سے پچانوے نمبر ملیں گے۔'' (شکریہ)

✠ **قیصر اقبال گچہ**، کلول، ضلع بھکر سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مئی کی گرمی اور جون کا سسپنس اور سرورق پر موجود حسینہ مستقبل میں آنے والی شدید گرمی کا سوچ کر محوِ حیرت۔ جون ایلیا کا انشائیہ پہچان میں اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم انسان اور شیطان میں پہچان پیدا کریں۔ شیر علی خان، آپ یہ وضاحت بھی کر دیتے کہ عمارا اگر صرف کشف ہوتا تو آپ کو بہت اچھا کیوں لگتا؟ شاید آپ اسے ''کشف معجون'' سمجھ کر ہڑپ کرنا چاہتے۔ زویا اعجاز کو اپنی ہانکنے کے لیے 10 منٹ دیے تھے مگر موصوفہ محفل میں کوئی خاص رنگ نہ جما سکیں۔ ثمینہ حبیب، اپنے چھوٹے سے دماغ کو اس بات میں مت اُلجھاؤ کہ 16 تاریخ کو سسپنس کیسے آ سکتا ہے؟ اگر میں کہہ دوں کہ بعض اوقات تو یہ 15 کو بھی آ جاتا ہے تو آپ کا ننھا سا دماغ پٹاخا مار جائے گا (کمال ہے) حکیم سید نقوی صاحب، آپ کو پتا بھی نہیں چلا کہ سرورق کی حسینہ آپ ہی کو تو دیکھ کر اپنا منہ آنچل میں چھپا رہی تھی۔ بابر عباس صاحب، ہمایوں کو تیز مرچیں چبانے دیں، خوش فہمی کا مارا ہے، افاقہ ہوگا۔ ساجدہ راجا، ویسے زیادہ مت ہنسنا۔ یہ ہنسنا کہیں آپ کی صحت کو مزید صحت مند نہ بنا دے۔ تصویر العین، آپ نے کریموں، پوڈروں کے اشتہارات پسند نہ کرنے کی وضاحت کر دی۔ ویسے بھی ان کاموں کی ایک مخصوص عمر ہوتی ہے۔ نیازی بھیا، ہمایوں کو کچھ اور دلاسا دو۔ محفل کے نہلا دہلا، اس دفعہ بھی غائب ہیں۔ لگتا ہے مذاکرات کسی کنارے نہیں لگ رہے۔ کہانیوں میں آغاز ڈاکٹر ساجد امجد کی امیر غلام سے کیا۔ عادل شاہی خاندان کے واقعات پڑھے۔ یوسف عادل شاہ کے حالاتِ زندگی، جنگیں اور پھر موت تک تمام واقعات معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھے۔ مدرز ڈے کی مناسبت سے احمد اقبال کی سرپرائز جان محمد جانو کے لیے ایک ماں کی طرف سے دیا گیا سرپرائز جس کا بھید پانچ سال بعد کھلا، غیر متوقع ہی تھا۔ انوار صدیقی کی کشکول میں آئی جی کے بار بار استعفیٰ دینے کا عقدہ کھلا کہ وہ بھی کوبرا کا ڈسا ہوا ہے۔ کاشف زبیر کی فرض میں مارک کا سفر ادھورا رہا اور اس ادھورے ٹریک کو مکمل کیا اس کے باپ ایرک نے۔ ملک صفدر حیات نے انسان دشمن میں اپنا کیس خوش اسلوبی سے مکمل کیا اور ساری مارا ماری کے بعد رانی کے قاتل گلاب خان کو اپنے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں خوب جکڑا۔ مسافر میں چندو ماہی کا چندو سے میڈم شکیلہ بننے کا سفر ابھی جاری ہے۔ عمر حیات جیسا بھی تھا مگر اس کی موت کا افسوس ہوا۔ ضیا تسنیم بلگرامی اس دفعہ عارف کامل میں ابو محمد کی بہن عصمت خاتون کے بطن سے پیدا ہونے والے اور بعد میں ولی کامل کے منصب پر فائز ہونے والے ابو یوسف کے واقعات نے ایمان کو تازہ کیا۔ انعامی کہانی سے شہرت حاصل کرنے والی عائشہ فاطمہ آخری صفحات پر دولت کے پاؤں کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ مانا کہ عبدالرشید نے شہر بانو کے باپ کے ساتھ بہت برا کیا۔ مگر شہر بانو نے بھی رشید کا گھر بار برباد کر کے اور اسے اپنی اوقات میں لا کر اپنا انتقام تو لیا، مگر کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ آخر میں اسے معاف کر دیتی کیونکہ معافی سب سے بڑا انتقام ہے۔ ماضی میں سفر کرنے والے بابر نعیم کی پاس ورڈ میں رچرڈ کو آخرت کے سفر پر بھی روانہ ہونا پڑا۔ مریم کے خان کی جیت کی ہار میں ایلس نے موت کا کھیل، کھیل کر انعامی رقم حاصل کی لیکن کوون کی موت اس جیت کو ہار میں بدل گئی۔ تنویر ریاض کی مات میں لوچین نے دوستی کا حق ادا کیا اور مصطفی صادق کو اس بات کا احساس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ کتنا بڑا کھلاڑی ہے۔ نجمہ مودی کی ٹرکی کی چوری میں تک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ اور رونالڈ کی ہر کام مکمل ہونے کے باوجود کینیڈا کے درجۂ حرارت ناپنے کے پیمانے سے ناواقفیت اسے لے ڈوبی۔ محفلِ شعر و سخن میں دوسرے نمبر پر مہرین ناز کا انتخاب پسند آیا۔ سسپنس میں یہ نیا نام لگتا ہے۔ الغرض جون کا سسپنس ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا۔''

✠ **محمد جاوید شبیر**، [illegible] علی پور، مظفر گڑھ سے تشریف لائے ہیں ”20 مئی کو سخت ترین گرمی میں سسپنس ایک سرد ہوا کے جھونکے کی مانند ملا جس سے پورے جسم میں ایک ٹھنڈی پڑ گئی۔ اتنی شدید گرمی اور اوپر سے لوڈشیڈنگ کا عذاب، بچے تو بچے بڑے بھی بلبلا اٹھے ہیں گاؤں سے لے کر شہروں تک سب لوگ لوڈشیڈنگ کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ جون ایلیا کی پہچان پڑھنے کے بعد بزم دوستاں میں داخل ہوئے۔ آج کل کے میڈیا، انٹرنیٹ، کاروباری مسائل اور بے پناہ مصروفیت کے باوجود بھی یہ سسپنس کا ہی کمال ہے کہ اس نے اپنے ہر قاری کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ شیر علی کا تبصرہ واقعی صدارت کے قابل تھا۔ سعید عباسی، محمد رضا، تصویر العین، بابر عباس، قدرت اللہ نیازی، رائے قیصر اور رمضان پاشا کے تبصرے خوب تھے۔ عظیم تاریخ داں، ڈاکٹر ساجد امجد کی امیر غلام بہت ہی اچھی تاریخی کاوش تھی۔ ان کا میں بہت بڑا فین ہوں۔ احمد اقبال کی سرپرائز بہت اچھی تحریر تھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی قسط وار تحریر کا انتظار ہے۔ (انشاءاللہ جلد، کچھ صبر کریں ابھی تو نواب صاحب کی باری ہے) ملک صفدر حیات کی تحریر انسان دشمن نے کافی متاثر کیا۔ ناصر ملک کی مسافر کے کیا کہنے مسافر کا ہمیں شدت سے ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔ باقی تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے محفل میں شریک ہو رہی ہیں ”مئی کی تپتی، جھلستی دوپہر میں جب سسپنس آیا تو بالکل ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے آٹھ نو گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کے بعد ایک گھنٹا بجلی آنے سے ہوتی ہے۔ سید محی الدین اشفاق، اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے (آمین) رضوان تنولی کریڑوی، میں نے اصلی والی قینچی کی بات کی ہے اور جس قینچی کی آپ بات کر رہے ہیں وہ آپ کو مبارک ہو۔ مجھے ویسے بھی زیادہ بولنا پسند نہیں اور مجھ سے مل کر ویسے بھی ہر کسی کی یہی رائے ہوتی ہے کہ یہ کم گو ہے۔ توصیف احمد مجھے تو جو آئیڈیا اچھا لگا فوراً بتا دیا آپ کو اگر کوئی پرانی کہانی پسند نہیں تو نئی اسٹوری کی فرمائش کر دیجیے گا اس میں اتنا جلنے والی کیا بات ہے۔ جلنا چھوڑو اور...... عدنان یوسف، سرورق کی حسینہ جب شرما یا ڈر رہی تھی تو کیا آپ اس کے آس پاس موجود تھے، ویسے لڑکیوں کے بارے میں زیادہ بنوں والوں کو نہیں پتا ہوگا تو کس کو پتا ہوگا۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی، واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ چل پڑھا میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھا رہا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کی کمی ہے جبکہ پڑوسی ملک میں پاکستان سے زیادہ غربت اور تعلیم کی کمی ہے لیکن ان کا میڈیا کسی بات کو اتنا بڑا ایشو نہیں بناتا۔ پاکستان میں تو اگر کوئی انسان گٹر میں بھی گر جائے نا تو پاکستانی میڈیا اس بات کو انٹرنیشنل معیار کی نیوز بنا کر پیش کرے گا جس سے پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر بدنامی ہوتی ہے۔ رمضان پاشا، کہانیاں تو سب دوست پڑھ ہی لیتے ہیں۔ کچھ جلدی کچھ لیٹ لیکن ڈائجسٹ کے دوستوں سے ملاقات تو مہینے بعد ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا دوستوں سے بحث اور شرارتیں کرنے میں مزہ آتا ہے۔ حسیب احمد، میرے لیے سارے موسم ایک جیسے ہیں۔ نہ بہار آنے کا پتا چلتا ہے نہ خزاں (اللہ خیر کرے سب خیریت تو ہے نا) ہمایوں سعید، آپ ہاتھ دھو کر کیوں پیچھے پڑے، حسیب احمد کے، نہا کر پیچھے پڑنا چاہیے تھا آپ کو۔ رائے قیصر عباس کھرل، مجھے ہمیشہ سے علامہ اقبال کی طوطے کی فریاد نظم آتی ہے، آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ بہت پسند رہی ہے لہٰذا میری شروع سے عادت ہے کہ میں تمام قیدیوں کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ انہیں رہائی نصیب فرمائے (آمین) بلیک لسٹ میں ہمایوں سعید کو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ پچھلے دو ماہ سے ہمایوں سعید کے خط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تفسیر عباس، آپ کب واپس خطوط کی محفل میں آ رہے ہیں۔ مسافر کی قسط اس بار کچھ خاص نہیں تھی وہی چندو کا ماضی جو یقیناً آئندہ مزید دو اقساط تک تو ضرور چلے گا۔ کشکول میں آکٹوپس کے انجام کا شدید انتظار ہے جو طویل ہوتا جا رہا ہے۔ عائشہ فاطمہ کی دولت کے پاؤں میں عبدالرشید کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا اس نے نیلوفر کو کیوں چھوڑا۔ کترنیں میں محمد قدرت اللہ نیازی، مقبول حسین کی چوائس اچھی لگی۔ محفل شعر و سخن میں سلیم کامریڈ، حافظ شاہد عمران اور سید محی الدین اشفاق کی پسند اچھی لگی۔“

✠ **توصیف احمد**، منگھوپیر روڈ، کراچی سے شرکت کر رہے ہیں ”خدا خدا کر کے 11 مئی کا دن آیا...... اور خیریت سے گزر بھی گیا۔ پورا دن عجیب قسم کے وسوسے دل اور دماغ کے گرد منڈلاتے رہے۔ محفل دوستاں میں جیسے ہی قدم رکھا، شیر علی خان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ شیر علی خان صاحب فتح پور لیہ میں آپ کی خالہ رہتی ہیں، یہ بات آپ سید محی الدین سے کہہ رہے ہیں۔ کہیں آپ کا ارادہ محی الدین اشفاق صاحب کے ہاں مہمان بننے کا تو نہیں ہے۔ ساجدہ راجا، عجب نرالا انداز ہے آپ کا، صابر اور شاکر بھی ہیں اور دھمکی آمیز شکوہ بھی کر رہی ہیں۔ تصویر العین صاحبہ، آپ بھی کمال کرتی ہیں اب اگر طاہرہ یاسمین کے پاس موبائل ہی نہ ہو! رضوان بھائی اگر ماہا ایمان آپ کی مریدنی ہے تو پھر آپ ضرور کسی دربار کے مجاور ہوں گے۔ پیر عامل رضوان شاہ کستوری والے۔ قدرت اللہ صاحب شکر کیجیے کہ حسینہ دوپٹا اوڑھ کے سو گئی ورنہ تو بعض بدنصیب گرمی کی شدت سے مٹی اوڑھ کے سو جاتے ہیں۔ حسیب احمد یہ چنائے کس وائرس کا نام ہے۔ طاہرہ گلزار تو تقریباً ہر ماہ ہی اسکواڈ سے باہر ہوتی ہیں لیکن ہمایوں سعید آپ کو بحیثیت بارھویں کھلاڑی بلیک لسٹ میں دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ تاریخی کہانی امیر غلام میں ملکہ نے اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے کسی دوسرے کے بچے کی جان لے لی۔ سو معلوم ہوا کہ مرد ہی نہیں عورت بھی انتہائی بے رحم اور خطرناک حد تک سفاک ہو سکتی ہے۔ سرپرائز میں جان محمد نے جتنا بڑا سرپرائز تیار کیا تھا اس سے کہیں بڑے سرپرائز کا شکار ہو گیا۔ لیکن یقیناً پڑھنے والے کو دکھی کر گیا۔ انسان دشمن میں ملک صاحب ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے عناصر کے خلاف برسرپیکار نظر آئے۔ محفل شعر و سخن میں ثمینہ صاحبہ کا انتخاب انعام یافتہ ہونا چاہیے تھا۔“

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سرورق پہ بجی لڑکی ویسی ہی تھی جیسے عام لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہی کسی کی محبتوں میں جھلملاتی آنکھیں اور وہی خواب نگر میں گشت کرتی۔ سوچوں کی پروازیں۔ میری غیر ناقص رائے کے مطابق صنف نازک کو جذباتی طور پر اتنا کمزور اور بے وقوفوں کی حد تک معصوم نہیں ہونا چاہیے۔ اسی نکتے پہ اگر کوئی اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ شیر علی برادر! میں نے تو آج تک سب کو اسٹیج پر کھڑے ہو کر گرجتے برستے دیکھا ہے۔ بیٹھ کر گرجنے والوں کو آپ نے کہاں دیکھ لیا اور لالٹین یو پی ایس سے مہنگی ہے یہ بھی صرف آپ کے منہ سے سنا۔ قیصر اقبال صاحب! انداز و الفاظ سے آپ قطعی کسی اسکول کے پرنسپل نہیں لگتے۔ بابر عباس صاحب، جب آپ اپنی شریک حیات کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھا کر طویل طویل خط لکھتے ہیں تو وہ آپ کے بات بے بات قہقہے لگانے اور طفلانہ کمنٹس لکھنے پہ سرزنش نہیں کرتیں؟ تنولی صاحب، یہ قدرتی عمل ہے کہ جب انسان بے اختیار ہنستا ہے تو اس کا منہ کھل جاتا ہے۔ توصیف صاحب! چھوڑیے، مجھے ماہا صاحبہ کی شناخت میں دربدر بھٹکنے کا نہ کوئی شوق ہے نہ وقت۔ وہ جو بھی ہے اس محفل کی ایک قابل احترام تبصرہ نگار ہے۔ قدرت اللہ صاحب! احسان سحر اور قیصر اقبال صاحب تو جو ہیں سو ہیں مگر آپ تو قوم کے معمار ہیں آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ اللہ کو یہ سخت ناپسند ہے کہ کوئی اشرف المخلوقات کو کسی اور مخلوق سے تشبیہ دے۔ حسیب صاحب، میں طنز صرف ان حضرات پر کرتا ہوا جو خود تن پرور کرتے ہوئے ذرا حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ ماں کے متعلق لکھی گئی کہانی سرپرائز پڑھی۔ احمد اقبال کے دلنشین انداز نے اتنے شاندار موضوع کی کہانی کو ایک منفرد ٹچ دیا۔ بے شک بے شک ماں جیسی ہستی دنیا میں اور کوئی بھی نہیں ہو سکتی۔ کاشف زبیر کی سنسنی خیز کہانی فرض بھی شروع سے آخر تک اپنے ٹرانس میں رکھنے میں کامیاب رہی۔ ملک صاحب انسان دشمنوں سے نبرد آزما نظر آئے۔ رانی کی بے وقت موت نے دکھی کیا۔ دھڑکنیں بڑھاتی جیت کی ہار حد سے زیادہ سفاک کہانی تھی۔ انگر مین کے جنونی تھیم نے حقیقی معنوں میں رونگٹے کھڑے کر دیے۔ آخری صفحات پہ بجی کہانی دولت کے پاؤں ذرا ذرا سی فلمی لگی۔ بہت سے واقعات ایسے تھے جو کہ بہ ظاہر غیر منطقی محسوس ہوئے۔ بہرحال عائشہ فاطمہ کی کاوش شاندار رہی۔“

✠ **مظہر سلیم**، ضلع رحیم یار خان، ظاہر پیر سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ماہ جون کا سسپنس اس مرتبہ بہت تاخیر سے موصول ہوا، یقین جانیے اس بار پرچے کے حصول کے لیے ہم پہ بری گزری۔ سرورق کی حسینہ جو آنکھوں میں نادیدہ محبوب کا انتظار لیے انگشت بدنداں نظر آئیں۔ ذاکر صاحب کی فنی مہارت کا کمال ہے۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ حسب سابق اچھا لگا۔ خطوط کی محفل میں موسم گرما نے اپنا اثر دکھایا اس لیے خطوط میں بھی خاصی گرما گرمی تھی۔ ارے رے رے یہ ہمارا خط شامل اشاعت دیکھ کر تمام تبصرہ نگاروں کے چہرے ایسے لٹک گئے ہیں جس طرح کراچی کی بسوں سے مسافر لٹکے ہوتے ہیں۔ اس بار شیر نے بازی مار لی، ہمارا مطلب ہے شیر علی خان نے بہت مختصر مگر جاندار تبصرہ لکھا، خان جی صدارت کی کرسی اپنے نام کرنے پر اور نئی نویلی دلہن لانے پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ باقی تبصرہ نگاروں میں قیصر اقبال کچہ، رضوان تنولی، زویا اعجاز نے بھی خوب لکھا۔ ویسے قیصر بھائی، آپ نے زویا کو پھول کہہ کر کیا تاثر دینے کی کوشش کی ہے؟ وہ بھی گوبھی کا پھول اور ہاں یاد آیا کچھ عرصہ سے ایک بزرگ خاتون تبصرہ نگار حافظہ ایمان، ماہا آباد، سوری، سوری ماہا ایمان آف حافظ آباد کے غیاب سے پریشان ہو کر ان کے ہم عمر ہمایوں سعید نے احتجاجاً اپنا نام بلیک لسٹ میں لکھوانا شروع کر دیا ہے اور سعدیہ بخاری صاحبہ، آپ سے ایک گزارش ہے، آپ خط لکھتے وقت تھوڑی سی شکر گھول کر پی لیا کریں تاکہ آپ کی تحریر میں تھوڑی سی مٹھاس پیدا ہو سکے۔ تمام خطوط پڑھنے کے بعد جب آپ کا خط پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے برفی اور جلیبی کھانے کے بعد کسی نے تیز مرچوں والا سالن کھلا دیا ہو۔ ویسے ہمارے قلم کی مٹھاس قدرت کی ودیعت کردہ ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ناکام حسرتوں، نم آلود جذبوں، محبت کی گتھیوں کو سلجھاتی یہ قسط بہت شاندار رہی۔ احمد اقبال صاحب کی سرپرائز نے بھی بہت متاثر کیا۔ جانو عرف جونی کی طرح نجانے کتنے تارکین وطن، وطن سے دوری اور دیار غیر میں شہریت نہ ملنے کے سبب دہری اذیت کا شکار رہتے ہیں۔ اس مرتبہ چونکہ ہمیں سسپنس بہت تاخیر سے ملا اس لیے باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔“

✠ **بابر عباس، مسز بابر عباس**، کھاریاں سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”سر جی سسپنس ڈائجسٹ کا نیا شمارہ جون 2013ء کی شکل میں حاضر خدمت ہے اور میں غور سے سرورق کی سوہنی اور من موہنی جاپانی حسینہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں جو کبھی میری کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ حسب معمول خوب صورت اور پیارا تھا خدائے بزرگ و برتر ایلیا صاحب کو اپنی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) اس بار کرسی صدارت پر اپنے بے جان تبصرے کے ساتھ شیر و بھائی کیسے ہیں آپ! ابرار وارث، عزیزم خط پسند کرنے کا شکریہ۔ زویا جی، جس طرح آپ نے محمد اکبر، سید شکیل کاظمی اور سعدیہ بخاری کا نام لیا ہے اس سے لگتا ہے کہ آپ محفل کی پرانی قاریہ ہیں اور نام بدل کر خط لکھ رہی ہیں۔ سعید عباسی بھیا منہ کڑوا ہونے کی اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں، عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔ قیصر اقبال صاحب، میں تو نہیں لڑکھڑاتا بلکہ آپ جیسے شریر بچے کبھی کبھی پیچھے سے دھکا دے دیتے ہیں۔ ثمینہ صاحبہ بڑا ہی خشک خط تھا آپ کا بالکل مزہ نہیں آیا پڑھ کر۔ واہ جی واہ اس بار تو روکھے سوکھے ہو کر اپنے حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی صاحب بھی محفل میں آئے ہیں حکیم صاحب، بتا کر آتے میں پھول ہی لے کر آ جاتا اور ہاں، آپ نے قبلہ بڑے حکیم صاحب عرف آغا فرید خان، اختر عباس تھراج اور راجا ثاقب نواز ثاقب کا ہی نام کیوں لیا اور بھی ساتھی غائب ہیں باقی آپ نے خط میں میرا ذکر نہیں کیا، کیا میں نے آپ کی فیس مار لی تھی۔ ہارون رشید آف مردان، خان صاحب ذرا ہتھ ہولا ہی رکھیں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا باقی محمد عمار کشف کا تعلق مرزا غالب کے خاندان سے نہیں بلکہ مرزا غالب کی روح اس میں داخل ہو گئی تھی۔ ساجدہ راجا صاحبہ، لگتا ہے آپ کی کہانی بچوں کے کسی ڈائجسٹ میں شائع ہوئی تھی اس لیے آپ کو پہلا انعام ملا ہے۔ تصویر العین بی بی، یہ آپ نہیں آپ کے اندر تفسیر عباس بابر کی روح بولتی ہے، کبھی کبھی انسانی جسم میں روحیں بھی گھس جاتی ہیں باقی خط پسند کرنے کا شکریہ اور ہاں سعدیہ بخاری کی جگہ آپ کیوں جواب دے رہی ہیں۔ رضوان تنولی کریڑوی صاحب، آپ بھی مجھے وہ مزدور لگے جس کو مزدوری کے بعد کارخانے دار سے پیسے نہیں ملے۔ عدنان یوسف بیٹا، میں اور توصیف احمد، عمار کشف کے مشکل الفاظ کا رونا نہیں رو رہے تھے بلکہ عمار کشف کی طرف سے دی گئی انعامی اسکیم حل کر رہے تھے اور یہ عقل مندوں کا کام ہے۔ رمضان پاشا بھایا، کیا بات ہے بھئی کیا بات ہے، بڑے انگارے چبا رہے ہو۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اریضہ بخاری کا فرض نبھاتے ہوئے مجھے ہدف بنایا۔ حبیب احمد چنائے، چن ماہی آپ کی عمر کیا ہے؟ عادل خان صاحب آپ کو سارے خط سنجیدہ لگے آپ کا مطلب ہے کہ ہمیں خط کی جگہ لطیفے لکھ کر بھیجنے چاہیے تھے۔ رائے عباس کھرل بھیا، خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ ان سب اسیران جیل کو رہائی دلائے جو کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا جیل میں کاٹ رہے ہیں۔ حسنین عباس بلوچ بیٹا، رہائی کے بعد تم ایسے غائب ہوئے کہ ہم سب محفل میں تمہارے خط پڑھنے سے بھی گئے لگتا یہی ہے بیوی کو پیارے ہو گئے ہو۔ بشریٰ افضل آنٹی نے بھی خود کو صرف سرگزشت کی حد تک محدود کر لیا ہے لگتا ہے میدان چھوڑ کر بھاگ گئی ہیں۔ سر جی ایک خوش خبری آپ سے اور محفل کے دوستوں سے شیئر کرنی تھی وہ یہ کہ 28 اپریل 2013ء کو اللہ تعالیٰ نے

مجھے ایک پیاری سی بیٹی عطا کی ہے اور بیٹی کا نام میں نے ماہین بابر رکھا ہے، اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ آمین (مبارک باد قبول کریں) اور بات ہو جائے کچھ کہانیوں کی، حسب معمول اس بار بھی سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ناصر ملک صاحب خدا آپ کے قلم میں اور نکھار پیدا کرے۔ مسافر نے ہم قارئین کو مکمل طور پر اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ دوسرے نمبر پر باری آتی ہے کشکول کی جوفی الحال تو ایویں ہی جارہا ہے، ان میں سکاموں۔ مقصد پراسراریت تھا مگر یہ صرف جرائم کو احاطہ کرنے والی کہانی ہے، پراسراریت برائے نام ہے۔ آخری صفحات پر سسپنس ڈائجسٹ نے ہمیشہ یادگار اور خوب صورت کہانیاں دی ہیں، دولت کے پاؤں بھی ان میں سے ایک ہے۔ عائشہ فاطمہ ایک زبردست لکھاری کے روپ میں نظر آئیں، ویل ڈن۔ اس بار حسام بٹ صاحب، ملک صفدر حیات صاحب کی ڈائری سے انسان دشمن نے کرائے اور حسب معمول ملک صاحب نے اس کیس کو بھی حل کر دیا اور مجرم گلاب خان کو اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ ماؤں کے عالمی دن کے حوالے سے احمد اقبال صاحب کی تحریر سرپرائز یقیناً اس حوالے سے ایک زبردست اور معیاری تحریر تھی۔ شروع کے صفحات کو آپ نے مکمل طور پر ڈاکٹر ساجد امجد کے حوالے کر دیا ہے، اس بار ڈاکٹر صاحب امیر غلام لے آئے اور حسب معمول ہمیں تاریخ کی سیر کراتے رہے۔ باقی کی کہانیاں بھی اچھی اور خوب صورت تھیں اور سسپنس کے معیار کے مطابق تھیں۔" (شکریہ)

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "سرورق کی رنگینی اور انشائیے کی پہچان سے گزر کر اپنی محفل میں جا وارد ہوئے۔ اداریے کے بعد شیر علی خان کی مزاج پرسی کی اور مبارک باد دی۔ ان کے بعد اپنے آپ سے ملاقات ہوئی۔ دیگر دوستوں کے خط بھی نظر آرہے تھے جہاں دلچسپ تبصروں سے مستفید ہوئے۔ پھر مقبول عام سلسلے مسافر میں حاضری دی جہاں شکیلہ کی ماضی کی داستان چل رہی ہے۔ دوسرا سلسلہ کشکول تھا۔ وہاں بھی کہانی اپنے اختتامی مراحل میں چل رہی ہے۔ تیسری کہانی تاریخ کے جھروکوں سے لی ہوئی ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر امیر غلام تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد جس خوب صورت پیرائے میں لکھتے ہیں وہ انہی کا خاصہ ہے، پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت میں واقعات وحالات رونما ہو رہے ہوں۔ جان لینا اور جان دینا بادشاہوں اور بادشاہ گروں کا ہمیشہ وطیرہ رہا ہے۔ سرپرائز بھی احمد اقبال صاحب کی کہنہ مشقی کی دلیل تھی جہاں جانو زندگی بھر کی کوشش کے باوجود گھر جا کر بھی دست رہا اور ماں سے ملن نہ ہو سکا۔ ماں ایسا رشتہ کہ ہمیشہ اولاد کو دیتی ہے طلب کچھ نہیں کرتی۔ کاشف زبیر کی فرض نے بھی بہت متاثر کیا جس میں ایک باپ نے اپنی اولاد کے ادھورے مشن کو پورا کیا۔ پاس ورڈ بھی بہتر تھا۔ بیچ میں شگوفوں سے بھی محظوظ ہوئے۔ شعروسخن میں اشعار نے بھی لطف دیا۔ جیت کی ہار نے مجھے اچھا سبق دیا کہ آگ کے دریا سے گزر کے آنے کے بعد مقصد حیات فوت ہو چکا تھا۔ مات بھی اچھی لگی جہاں ایک دوست نے دوست کی مدد کی۔ دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی تحریر عارف کامل تھی، ولی اللہ کے دوست ہوتے ہیں جتنا وہ دنیا سے منہ موڑتے ہیں اتنا ہی وہ ان کی طرف بڑھتی ہے۔ نک کا کارنامہ ٹرکی کی چوری دلچسپ تھی۔ ایضاً بھی اچھی کہانی تھی کہ ایڈم نے اپنے پارٹنر کو قتل کیا مگر انتہائی مہارت اور چالاکی کے باوجود پھنس گیا۔ آخری صفحات کی خوب صورت کہانی دولت کے پاؤں تھی جسے عائشہ فاطمہ نے تحریر کیا۔ بہت ہی پراثر اور جاندار تحریر تھی۔"

✠ **محمد تقی عباس**، قیدی سزائے موت سینٹرل جیل میانوالی سے تشریف لائے ہیں "دوسری مرتبہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جون کا پروانہ 25 تاریخ کو ملا گرمی بہت زیادہ تھی اور حسب معمول بجلی بھی نہیں تھی۔ ٹائٹل کی حسینہ کو دیکھا تو دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ اس نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا، روتے دل کے ساتھ محفل یاراں میں گئے۔ کرسی پر شیر علی خان براجمان تھے ان کو آداب کیا۔ سید محمد رضا شاہ نقوی، آپ کی پرخلوص دعاؤں کا شکریہ۔ بھائی میرا تعلق (دریا خان ضلع بھکر) سے ہے۔ انکل بابر عباس اور پیاری آنٹی اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے۔ سید محی الدین اشفاق، دوسروں کا دکھ درد بانٹنا چاہیے۔ پیاری بہن تصویر العین، شکر ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوئیں۔ پیاری بہن، ہم قیدیوں کے خون سڑ چکے ہیں اگر پھر بھی آپ کا دل چاہے تو میں حاضر ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، مجھے دیکھ کر ٹائٹل گرل بھلا کیوں پریشان تھی۔ میری تمام بھائیوں اور بہنوں سے گزارش ہے کہ خدا کے لیے اپنے ماں باپ کا کہا مانا کریں، ہم میں سے تقریباً 90 فیصد اپنے والدین کی نافرمانی کی سزائیں بھگت رہے ہیں۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، میڈم کے حالات پڑھ کر رونا آگیا۔ فائزہ کا دوسرا رخ بہت برا تھا۔ اس نے چندو کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ دولت کے پاؤں سبق آموز کہانی تھی۔ عبدالرشید کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ملک صفدر حیات کی تحریر بہت پسند آئی۔ انسان ایک جرم چھپانے کے لیے دوسرے جرم کر بیٹھتا ہے۔ نجمہ مودی صاحبہ یہ ٹرکی کیا چیز ہے۔ گوشت ہے یا سبزی ہے؟ محفل شعروسخن میں مہرین ناز، ناصر علی صدیقی، ثمینہ حبیب، سلیم شہزادرائے، عنصر محمود کرڑ کا انتخاب بہت پسند آیا۔ میرا ایک ساتھی ہے وہ اپنی داستان حیات کہانی کی شکل میں بھیجنا چاہتا ہے، مہربانی کر کے کچھ راہنمائی فرمائیں کیا وہ شائع ہو سکتی ہے؟" (سرگزشت میں سچی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ آپ بھجوادیں)

✠ **عبدالغفور خان خٹک، محمد اعجاز خٹک**، کوئٹہ کینٹ سے محفل کی زینت بنے ہیں "اس ماہ کا ڈائجسٹ 22 کو ملا تو حسینہ باقی ٹھیک تھی لیکن اس کا ہاتھ چوڑیوں کے بغیر سونا سونا تھا، اس کے بعد خطوط کی محفل میں داخل ہوئے تو جناب اپنے شیر علی بھائی 1 ماہ کے لیے صدارت پر فائز تھے۔ شیر علی UPS لالٹین کا بدل نہیں، ہے لیکن لالٹین کی قدر اب بھی ہے یہ یو پی ایس سے اچھا ہے، آپ کو شیر علی شادی کی مبارک باد قبول ہو، زویا اعجاز محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ حسنین عباس، رہائی مبارک ہو محفل میں آئیں۔ ساجدہ راجا سرگودھا صاحبہ جب بندہ خط لکھتا ہے تو خط کا انتظار ہوتا ہے لیکن جب نہیں ہوتا وہ بھی تین تین ماہ تو بندے کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ سید محی الدین اشفاق، آپ کی امی کا افسوس ہے مرحومہ کو خدا جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ تصویر العین صاحبہ، ہوسکتا ہے کہ طاہرہ یاسمین کسی ایسی جگہ کی ہو کہ وہاں موبائل ہی نہ ہو تو لالٹین تو ہر جگہ ہے نا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب، مسافر وہاں سے سائٹ پر چلی گئی جب شہر یار کو میڈم کہتی ہے کہ میرے ساتھ اکیلے چلو تو اس راز سے پردہ تو اٹھے گا کہ کیوں کسی اور کو نہیں لے کر گئی ہے۔ عادل خان، آپ کی بات ٹھیک ہے موبائل کا استعمال آپ کے ہاتھ میں ہے کہ غلط کریں یا کہ صحیح۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، ماموں رضوان نے جو کچھ کہا تھا وہ راج بھی کر رہی ہے اور شہر یار کی صورت میں محبت کرنے والا بھی ہے یہ بھی پتا چلا کہ میڈم میٹرک پاس ہے وہ بھی اچھے حالات میں۔ اس ماہ

کی کہانی نمبر 1 سرپرائز جو ماں کے بارے میں بھی بہت خاص کہانی تھی۔ اولیائے کرام کی کہانی پڑھی، روح کو سکون ملا۔ جیت کی ہار میں ایک بہن کی محبت شامل تھی لیکن وہ جیت کر بھی ہار گئی تھی۔ دولت کے پاؤں میں عبدالرشید جیسے دولت کے پجاری ہوتے ہیں لیکن وہ نیلوفر جیسی حیادار اور نیک بیوی کی قدر نہ کر سکا اور شہر بانو نے کس طرح اپنے والد کی دولت اپنے پاس واپس کرلی۔"

✠ **زیڈ۔ اے نیازی**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں تشریف لائے ہیں "میں نو وارد تو اس لیے نہیں ہوں کیونکہ پچھلی مرتبہ بلیک لسٹ آچکا ہوں۔ افسوس اس بات پر ہے کہ پچھلے دس سال سے میں ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں سزائے موت کا قیدی ہوں اور متواتر خاموش قاری تھا پہلی مرتبہ خاموشی توڑی لیکن بلیک لسٹ ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کر رہا ہوں (اچھی بات ہے آپ نے حوصلہ نہیں ہارا، اب تو خوش ہیں) الیکشن کی دھوم دھام رہی۔ بڑے بڑے جلسے، جلوس، وعدے اور قسمیں اٹھائی گئیں۔ ہوسکتا ہے کہ لوڈشیڈنگ کا خاتمہ ہو سکے (بالکل درست فرمایا آپ نے) سسپنس 20 تاریخ کو ملا۔ سیدھے یاروں کی محفل میں پہنچ گئے۔ اپنا خط تلاش کیا۔ بلیک لسٹ دیکھی افسوس ہوا۔ اپنے گرائیں حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی کا خط دیکھا، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ صدارت پر شیر علی خان تشریف فرما تھے، خان صاحب مبارک ہو۔ ماہا ایمان اور طاہرہ یاسمین صاحبہ کی کمی ضرور محسوس ہوئی۔ پھر کہانیوں کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ میڈم شکیلہ کا بیک گراؤنڈ کافی ایموشنل اور حیرت انگیز ہے، اس سے سبق ملتا ہے کہ انسان مائع کی طرح حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ کس طرح اپنے آپ کو ڈھالتا جاتا ہے۔ کشکول میں لیاقت حسین کا کردار بہت ہی زبردست ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھ رہا ہوں۔"

✠ **قیصر گل اینڈ منشی رانا حماد فرہاد**، سینٹرل جیل ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "گرمی اف خدا، دوپہر کے وقت سزائے موت کے سیل اس قدر تپ جاتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جہنم سے پہلے ہی جہنم میں جھونک دیا گیا ہو۔ خدا بھلا کرے ہمارے حکمرانوں کا جو بجلی کو ناپید کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں نسیم حجازی کی تصنیف پڑھی۔ جس کا عنوان تھا "سفید جزیرہ" آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ وہ کتاب 88ء میں لکھی گئی تھی۔ اس میں پاکستان کو سفید جزیرہ کا نام دیا گیا ہے اور جو کچھ ہمارے حکمران آج اس دور میں کر رہے ہیں، ان کے کارناموں کو بالکل عین اصل شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر سطر پڑھنے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی لکھی گئی ہو۔ جون 13ء کا شمارہ 22 مئی کو موصول ہوا۔ جب میں رات 9 بجے بجلی نہ ہونے کی بنا پر اندھیرے میں بیٹھا ریڈیو پر آئی، پی، ایل کا میچ سننے میں مصروف تھا۔ لائٹر کی نا ہونے کے برابر روشنی میں شمارے کا دیدار کیا۔ جون ایلیا صاحب سے معذرت کر کے محفل یاراں میں داخل ہوا جہاں ایڈیٹر صاحب کو بھی گرما گرمی گردان میں مصروف پایا، ساتھ ہی انہوں نے عامر اطلس کو 14 سال بعد کفر توڑتے ہوئے دکھایا، اچھا لگا۔ شیر علی خان کرسی صدارت پر براجمان تھے اور کوئی ہانڈی پکا رہے تھے۔ ادریس بھائی کیا بات ہے آپ نے شعر زبردست لکھا۔ ابرار وارث آپ کے شہر میں بہت پرانے دوست رہتے ہیں ان کی وجہ سے آپ بھی دوست نما نظر آتے ہیں۔ قیصر بھائی یہ گچھ کیا ہے؟ ثمینہ حبیب آپ خوش قسمت ہیں کہ گرمی کے جھلسا دینے والے دنوں میں کوئٹہ جیسے ٹھنڈے علاقے کا لطف اٹھا رہی ہیں۔ حکیم رضا صاحب اگر آپ سچ مچ کے حکیم ہیں تو میرے پتے پر برائے مہربانی گرمی سے نمٹنے کے ایک دو نسخے ہی بھیج دیں۔ بابر عباس صاحب اپنی مسز کو بھی کھینچ لائے آپ؟ اللہ بھلا کرے ان کا۔ ساجدہ راجا...... راجا تو مذکر کے لیے استعمال ہوتا ہے آپ ساجدہ رانی لکھا کریں، محی الدین اشفاق، اللہ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ تصویر العین میری بہن، آپ کا خط بہت اچھا تھا۔ رضوان کریڑوی صاحب کستوری کو چھوڑیں کریڑا اتارنے کی دوائی استعمال کریں۔ راجا ثاقب نواز ثاقب رتی ٹبی ساہیوال سے آیا کرتے تھے، پتا نہیں کہاں گم ہو گئے ہیں۔"

✠ **زارا خان**، درہ آدم خیل سے چلی آرہی ہیں "میں پچھلے چند سال سے سسپنس پڑھ رہی ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں (خوش آمدید) جون کا سسپنس کچھ تاخیر سے ملا۔ میں سب سے پہلے سسپنس کی محفل میں ساتھیوں کے خط پڑھتی ہوں۔ قیصر اقبال گچہ صاحب کا خط میرا پسندیدہ ہوتا ہے، آپ تفسیر بابر کو لفظوں کا کھلاڑی کہتے ہیں مگر مجھ سے پوچھیں تو لفظوں کا کھلاڑی وہ ہوتا ہے جو دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے اور یہ کریڈٹ قیصر صاحب کو جاتا ہے۔ کہانیوں میں مجھے مسافر سب سے پسند ہے اور میڈم شکیلہ کی کہانی بہت مزہ دے رہی ہے۔ کشکول بھی اچھی ہے اور اورنگ زیب کا کردار بہت جاندار ہے۔ ملک صفدر حیات اور بیگ صاحب کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ سسپنس میں آخری کہانی سسپنس کی جان ہوتی ہے۔ تاریخی کہانی اور اللہ کے ولیوں کے واقعات بھی معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں۔ باقی چھوٹی کہانیاں بھی اور محفل شعروسخن بھی لاجواب ہیں۔" (بہت شکریہ)

✠ **چودھری احمد خان**، چکری، راولپنڈی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سسپنس 18 مئی کی صبح ملا۔ اتنی گرمی، بجلی عید کے چاند کی طرح غائب۔ مطالعہ کے بعد خط لکھنا آسان نہیں۔ انشائیہ جون ایلیا، سچ برداشت کر کے سچ پر چل کر پوری دنیا کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ شیر کی زبردست دہاڑ سے ڈر کر آپ نے شیر علی خان جیسے کاغذی شیر کو تخت پر بٹھا دیا۔ قیصر اقبال گچہ کلول، اپنا نام مختصر کر کے ہم غریبوں کو بھی جگہ دیا کریں۔ مسٹر و مسز بابر عباس کھاریاں، جب بیوی گھریلو کام کے ساتھ آفس 18 گریڈ کی جاب ہم سے تنخواہ زیادہ لیتی ہو تو بے بسی فائدہ مند رہتی ہے۔ تصویر العین، اوکاڑہ کیا آپ کو اور سعدیہ بخاری کو تا حال انار نہ ملا جو سوبیمار کی منتظر ہیں؟ امیر غلام، ڈاکٹر ساجد صاحب، پلیز نزدیکی تاریخ لکھیں۔ سرپرائز، جانو ولایتی میم اور ڈالر کے بدلے ماں کی عظیم جنت کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ کشکول، آکٹوپس کدھر گیا۔ علاوہ کافی کردار غائب ہیں، سکندر شاہ و ماروی نئے چہرے، ایس پی اورنگ زیب کا تبادلہ، لیاقت حسین اپنی ماں کی دعاؤں سے کبھی ناکام نہ ہوگا۔ ملک صاحب انصاف دشمن گلاب خان کے خود ٹکڑے کر دیتے، بے گناہ بچی کی موت کا قلبی دکھ۔ صفحہ اشعار، شاہد عمران، ذریان سلطان، توصیف احمد، مہرین ناز اچھے اشعار۔ مسافر، چندو کو سازش کے تحت فائزہ و صفیہ نے بدنام کرایا، بدلہ عمر حیات کی موت، گرفت سے نکل چندو کب میڈم شکیلہ کا روپ لیتی ہے؟ سردار حیدر سے خاص معرکہ نہ ہوا۔ عارف کامل قلبی و روحانی سکون والی اچھی تحریر، انگریزی کہانیاں متاثر نہ کر سکیں۔ دولت کے پاؤں واقعی نہیں ہوتے، عبدالرشید کو بدنیتی و خیانت کی اچھی سزا ملی۔"

فضا خان، لاہور سے چلی آرہی ہیں ’’کچھ عرصہ سے دل اور دماغ اس سوچ میں الجھے ہوئے تھے کہ ہم سسپنس کی محفل میں حاضر ہوں یا نہیں۔ دل نے کہا سسپنس اپنا ہے۔ لوجی ہم حاضر ہوگئے محفل میں۔ ذاکر انکل نے جون کے سرورق پر ایک شاہکار تخلیق کرکے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ جون ایلیا کے انشائیہ پہچان میں اس بات سے 100 فیصد اتفاق کہ صیادوں کو باغباں نہ سمجھو۔ شیر علی صاحب، خط سادہ مگر انعام زیادہ۔ بڑی گل اے جی، ادریس صاحب صرف کہانیوں پر تبصرہ۔ پنگا از ناٹ چنگا، ہمایوں سعید کا منہ بند کرنے والے قیصر اقبال گجہ صاحب سب سے پہلے میں آپ کا تبصرہ پڑھتی ہوں۔ کیونکہ وہ سب سے بیسٹ ہوتا ہے، تصویر آپی، آپ کو سب کے خطوط اچھے لگے، بڑی گل اے جی۔ قدرت اللہ بھائی، گھر میں صنف نازک کے سامنے میاؤں میاؤں اور گھر سے باہر صنف نازک پر دہاڑ دہاڑ بڑی گل اے جی۔ رمضان پاشا بھائی، نواب صاحب کی کہانی نے آپ پر خوب اثر کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول، اورنگ زیب اور سراج کی مشکلات میں اضافہ کرنے والے شیخ حامد اب کوبرا بن کر بھی ڈسنے والا ہے۔ مسافر میں دشمنوں کے نرغے میں گھری چندو کی روداد اور لٹو اور جانو کے مکروہ عزائم پر اختتام ایک ماہ کا انتظار دے گیا۔ آخری کہانی دولت کے پاؤں میں عبدالرشید نے شہر بانو کے والد کے ساتھ برا کیا مگر شہر بانو بھی اسے فٹ پاتھ پر لے آئی۔ پہلی کہانی امیر غلام میں عادل شاہی خاندان کے ایک چراغ یوسف عادل شاہ کے واقعات پڑھے۔ انسان دشمن میں ملک صاحب کی محنت رنگ لائی اور رانی کا قاتل گلاب خان ملک صاحب کے آہنی شکنجے میں آگیا۔ سرپرائز میں جان محمد عرف جانو ماں کو سرپرائز دینے کی حسرت میں الٹاماں سے سرپرائز لے بیٹھا۔ قرض میں ایرک نے اپنے بیٹے کے کام کو انجام تک پہنچایا۔‘‘

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے تشریف لائے ہیں ’’ماہ مئی بہت اداسیاں اور غمگینیاں دے گیا۔ 3 مئی بہت اذیت ناک دن تھا میرے اور میری پوری فیملی کے لیے۔ ہمارے والد محترم سید عاشق حسین شاہ انتقال کر گئے۔ یکم مئی کو امی جان کی برسی تھی انہیں اس دنیا سے گئے 12 سال ہوگئے ہیں تب میں بہت چھوٹا تھا اور اب 3 مئی کو ابو جان کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا، کچھ عرصہ سے بستر علالت پر تھے میرا بہت سا ٹائم ان کے کام کرنے میں ان کے قریب گزرتا۔ بہت عادت ہوگئی تھی ان کی۔ ان کے چلے جانے سے بالکل فارغ ہوگیا ہوں، کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ ایم اے پارٹ ا کے پیپر شروع ہو رہے ہیں۔ ایسے میں مجھے سب کی دعائیں چاہئیں جبکہ دعا کرنے والے جاچکے ہیں۔ (ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے اور مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے (آمین) دعائیں دینے والے تو یقیناً چلے گئے لیکن ان کی دی ہوئی دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اللہ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، آمین) ادارہ اور تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے ابو جان کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کریں اور یہ کہ خدا ہمیں صبر عطا کرے۔‘‘ (آمین)

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ’’جون 2013ء کا سسپنس وقت مقررہ پر ہی مل گیا۔ سرورق اچھا تھا، البتہ فہرست کی تزئین کاری میں کوئی جدت نہیں تھی۔ انشائیہ حسب معمول کھرا اور کڑوا تھا۔ کالم آپ کے خط میں اول نمبر آنے والے شیر علی خان کو دوسری بار پالا مارنے پر دوبار مبارک باد پیش کرتا ہوں، بابر عباس صاحب، کسی خاتون کو مذاق میں بھی کچھ کہنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ الفاظ کے دانت نہیں ہوتے لیکن یہ کاٹ لیتے ہیں (بہت خوب) تصویر العین صاحبہ، اب یہ لڈو کی تکرار ختم کیجیے، بہت ہوگیا، اب کوئی نیا شوشا چھوڑیے۔ حسیب احمد صاحب جی ہاں، میں بہت پرانا قاری ہوں، رہی بات میری عمر کی تو سمجھ لو جب سسپنس کا پہلا شمارہ مارکیٹ میں آیا تو اس عاجز کی عمر 41 سال تھی، میں پہلے شمارے ہی سے سسپنس کا قاری چلا آرہا ہوں، جب تک بینائی ساتھ دے گی سسپنس پڑھتا رہوں گا (بہت شکریہ) تاریخی داستان امیر غلام میں چند غیر حقیقی اور غیر فطری واقعات بیان ہوئے ہیں۔ سرپرائز کہانی زبردست تھی، آخر احمد اقبال صاحب کی تحریر ہے، کوئی مذاق ہے۔ کشکول اور مسافر میں ماہ بہ ماہ کرداروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، پچھلے کرداروں کو یاد رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے، مسافر میں چندو ماہی کنویں سے نکلی کھائی میں جاگری۔ کشکول کا اختتام دبنگ تھا۔ انسان دشمن اس بار بٹ صاحب کی کہانی بہت ہی زوردار تھی، شہر کے S.P. کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ پاس ورڈ میں مزہ نہیں آیا۔ مات میں کچھ دلچسپی تھی، ایضاً کہانی تھی تو اچھی مگر اختتام بے نتیجہ۔ غیر ملکی کہانیوں میں سب سے اچھی جیت کی ہار تھی، دولت اس طرح بھی لٹائی جاتی ہے یہ اب معلوم ہوا، ہارٹ اٹیک تو نرا پاگل دا پتر تھا۔ پھر ہم کو ایسی سسپنس سے بھرپور کہانی پڑھنے کو کیسے ملتی۔ اس دفعہ نک ویلوٹ کو چرغہ چوری کرنے کا کام ملا۔ مجرموں کو پکڑنے کے لیے نک کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آیا۔ دولت کے پاؤں محترمہ عائشہ فاطمہ کی یہ کہانی کافی عرصہ یاد رہے گی، یہ محترمہ تو خواتین کے مطلب کی چیزیں تحریر کرتی ہیں، اس بار انہوں نے ہم مردوں کے لیے بھی ایک یادگار چیز تحریر کی ہے۔ واہ کیا بات ہے۔‘‘

رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی سے تشریف لائے ہیں (ہم قارئین کے نمبر شائع کردیا کرتے تھے جس سے کچھ مشکلات پیدا ہوئیں، اب نمبر شائع نہیں کیے جائیں گے) ’’16 تاریخ کو 42 سینٹی گریڈ کی گرمی میں سورج اپنی مکمل آب و تاب سے خرمن نشیمن پہ گرمی برسا رہا تھا ایسے میں عاشق سسپنس کو معشوق سسپنس مل جانا ٹھنڈی خوشگوار ہوا بن کے نصیب ہوا۔ الیکشن ہوچکے ہیں جوڑ توڑ، دھرنے احتجاج جاری ہیں۔ سرورق کو نظر انداز کرکے جملہ اشتہارات پھلانگ کے مرحوم جون ایلیا کے انشائیہ پہچان کا مطالعہ کیا، لکھتے ہیں سچ آخر کیا ہے؟ پہچان کرو؟ ایلیا جی، شیطان کھل کے اپنی شیطانیوں میں مصروف ہیں۔ چاچو جی آپ لکھتے ہیں اس ماہ محفل کا فاتح کون ہوگا تو جناب گھوڑے کی ریس کا پتا میدان میں، سپاہی کا محاذ جنگ میں، پہلوان کا اکھاڑے میں اور فاتح محفل کا پتا لفظوں کی اس محفل میں ہوگا...... صدر محفل شیر علی کو کرسی صدارت اور شادی کی ڈبل مبارکاں، کستوری لگا کے...... ابرار وارث سسپنس کا ٹائٹل ایویں سا ہو یا شیویں سا عاشقان سسپنس کو سرورق سے نہیں صرف سسپنس سے پیار ہے...... حکیم سید محمد رضا شاہ جی، اللہ پاک آپ کی زبان مبارک کرے اور ہمیں قابل فخر قیادت میسر آئے، آمین...... زویا اعجاز، محفل میں جب تک گھمسان کا رنگ نہ ہو مجھ جیسے قاری کو مزہ نہیں آتا...... سعید عباسی اگر کسی ساتھی کو سرورق حسینہ پسند نہ آئے تو اس کے لیے صرف 2 صفحے پلٹنے کے بعد حور بھی موجود ہے کستوری لگا کے۔ بابر عباس، آپ کی تعریف کے لیے اتنا کہوں گا آپ کی باتیں کروڑوں کی اور دکان پکوڑوں کی...... ساجد راجا نے اپنی دھاک اور رعب و دبدبہ جمانے کے لیے شیخی بگھاری کہ میری کہانی کو ایک ڈائجسٹ کے لیے پہلا انعام ملا۔ محترمہ اس ڈائجسٹ کا نام کیا ہے؟ کیا عالم ارواح میں شائع ہوتا ہے؟ جی بھیا قیصر اقبال، ارے سنیے تو ہمایوں کیا جنگل سے برآمد ہونے والی نرالی مخلوق ہے، ارے بچہ ہے یار اس لیے بچگانا حرکتیں کرجاتا ہے، چھوڑ دیجیے بے چارے کو...... باجی طاہرہ گلزار، مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے اور سر جی کی کاٹ چھانٹ کی تلوار جلاد کی تلوار سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے اس لیے طاہرہ جی اپنے سر جی کسی کو معاف نہیں کرتے کستوری لگا کے...... نٹ کھٹ دوست شاعر راحیل اعجاز المعروف جگا تبصرہ لکھا کرو ڈیئر...... تصویر العین آپ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں، آپ بہت گریٹ ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، آپ کی شاندار حوصلہ افزائی نے رضوان تنولی کو ببر شیر بنادیا۔ بھیا نعیم سلطان، ہم تو سر سے کفن باندھ کے اس محفل میں کودے ہوئے ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا ساجد امجد کی امیر غلام سے کی تحریر، اگر صرف یوسف تک محدود رہتی تو مزہ دیتی بہت سارے کرداروں نے داستان کو گول گندہ بنا ڈالا اس لیے نہ تو کچھ سمجھ آئی اور [illegible] لطف آیا۔ مسافر میں جب سے چندو ماہی کے ابتدائی واقعات شروع ہوئے ہیں کہانی میں پہلے سے زیادہ نکھار آتا جارہا ہے۔ ناصر ملک سے درخواست کروں گا کہ استاد صوفی رضوان والا کردار کافی اچھا لگا اس لیے اس کردار کو گم نہیں کرنا آنے والی اقساط میں اس کردار کو رول دیتے رہا کرنا۔ حیرت و اسرار اور ماورائی کہانیوں پہ اتھارٹی مانے جانے والے انوار صدیقی کی کشکول زوال کے بعد عروج کی جانب گامزن ہوچکی ہے، کہانی کافی اقساط میں سست رہنے کے بعد اب چست ہوتی جارہی ہے۔ آخری صفحات کا نادر و نایاب تحفہ عائشہ فاطمہ نے مضبوط پلاٹ پہ لکھی گئی دولت کے پاؤں کے روپ میں دیا، کرائے کا ٹیکسی ڈرائیور عبدالرشید کہاں سے کہاں پہنچا اور پھر اپنی چوری چماری والی شروع کی جانب والی ایک بے ایمانی سے واپس اس مقام ٹیکسی تک آیا۔ عبدالرشید کے لیے پنجابی کی مشہور و معروف کہاوت جتھے دی کھوتی اتھے آن کھلوتی...... محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، محمد عقیل چٹھہ، قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت عمدہ لگا...... کترنیں گزارہ لائق رہیں......‘‘

ابرار وارث، درآباد، سندیلیانوالی سے حاضر ہوئے ہیں ’’اپنا خط تیسرے نمبر پر دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہوگیا۔ جنگل کے بادشاہ شیر کی مثل ہماری محفل کا بادشاہ بھی شیر ہی تھا بھئی کرسی صدارت مبارک۔ پلیز آپ سب سے گزارش ہے کہ مجھے یہ میں میں، تو تو نہیں کرنا آتی، پلیز مجھے بھی سکھا دیں۔ (کمال ہے) سب سے پہلے مسافر سے اسٹارٹ کیا، کہانی کا پتا ہی نہیں چلا کب ختم ہوئی۔ چندو پر تو شاید مظالم کے ریکارڈ توڑ دیے حویلی والوں نے...... چندو کے لیے اتنے صدمات سے بچنے کا یہی طریقہ تھا کہ وہ رضوان سے ہی شادی کرلیتی۔ عائشہ فاطمہ کی دولت کے پاؤں پڑھی، بڑی جاندار تحریر تھی۔ واقعی میں عبدالرشید کے پاس دولت شہرت جتنی جلدی آئی تھی اس سے بھی جلد سب کچھ چھن گیا۔ مریم کے خان اور کاشف زبیر کی کہانیاں تو شمارے کی جان تھیں۔ اشعار میں سب سے زیادہ عقیل چٹھہ کا شعر پسند آیا۔ باقی احمد حسن عرضی، مہرین ناز، محمد بشارت، سلطان قائم خانی اور حسنین ہاشمی کے اشعار پسند آئے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔‘‘

تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے اپنی محفل میں شریک ہیں ’’الیکشن میں سلیکشن کے...... صبر آزما مرحلے کے بعد، عوام کو ایک دفعہ پھر، امید کے کچے دھاگوں کا سہارا۔ ضرورت چہروں کو نہیں، نظام کو بدلنے کی ہے۔ جون کا گوہر نایاب 16 مئی کی سرمئی شام کے دھندلکے میں شہر دل کی سرحد تک...... فصیل جسم و جاں سے گزر کر پہنچا، سرورق نے کافی سے زیادہ مایوس کیا۔ آغاز بزم یاراں میں ادارے کا فکر انگیز اداریہ...... ریاست اور سیاست کی باتیں، لیکن اب ریاست یا سیاست کا نہیں...... بلکہ وراثت کا مسئلہ ہے...... پہلا خط خانیوال کے شیر علی خان نے مجاہدانہ عزائم کے ساتھ رقم کیا۔ آپ بھی جہاد ازدواج میں شامل ہوکر بیوی کو پیارے ہورہے ہیں گویا...... اللہ آپ کو کامیاب و سرخرو فرمائے۔ کراچی سے ادریس احمد خان کے شعر بلکہ...... شیر نے دعوت فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ گویا آپ کو اب تک...... عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے......؟ لاہور سے زویا اعجاز بھی دانت تیز کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ کلول سے قیصر اقبال گجہ کے حملے اور جملے بھی زبردست رہے، آپ نے وضاحت نہیں فرمائی کہ نہلا کون ہے اور دہلا کون......؟ اور ماہی بے چاری کو مت چھیڑو...... ان کے تلوے میں اب تیل دستیاب نہیں ہے۔ کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کی لاعلمی نے دعوت فکر دی، خیر مطمئن رہیے...... دیر ہے اندھیر تو نہیں۔ کھاریاں سے بابر عباس...... بیٹی کی ولادت، یعنی اللہ کی رحمت کے نزول پر مبارکباد قبول فرمائیے اور عہد قدیم کی خطرناک ترین مخلوق قوم یاجوج ماجوج کو مت پکاریئے۔ برا وقت اور مصیبت پوچھ کر نہیں آتی اور آپ جنہیں یاد کررہے ہیں مثلاً ماما ایمان، اریضہ وغیرہ تو اب تو ان کی نظر کے قدیم ترین چشمے بازار میں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ سرگودھا سے ساجدہ راجا باوثوق ذرائع کے عین مطابق آپ کو انعام دینے والے اپنے کیے پر کافی شرمندہ ہیں۔ اوکاڑہ سے بہت پیاری تصویر العین، دل سے یاد رکھنے اور تہ دل سے یاد کرنے کا ازحد شکریہ۔ دیگر گمشدہ احباب میں اے ایم یعنی آسیہ مقبول چودھری، دلنشین بلوچ اور آغا فرید احمد خان قسم سے، بہت یاد آتے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر کہنہ مشق مصنف، محقق دوراں ڈاکٹر ساجد امجد نے...... خزینۂ کتب تواریخ سے ایک اور گوہر نایاب دریافت کیا۔ یہ تاریخی واقعات عہد حاضر کے حکمرانوں کے لیے درس عبرت ہیں۔ ناصر ملک کی سحر انگیز تحریر، راہ زیست کے نشیب و فراز پر...... ایک مسافر بے نوا کی تلخ و طویل مسافت...... مسافر اپنی مثال آپ ہے، چندو ماہی کی اثر انگیز روداد نے مسحور کرکے رکھ دیا ہے۔ اب دیکھیے کہ چندو سے میڈم شکیلہ تک...... کے سفر کے دوران پردۂ تقدیر سے کیا کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انوار صدیقی کی کشکول ایک محیر العقول سلسلہ انمول ثابت ہورہی ہے۔ آخری صفحات کا توشۂ خاص، عائشہ فاطمہ کی دولت کے پاؤں، خواہشات کے تاج محل کی بنیادوں میں، خون ناحق شامل ہو تو یہی انجام ہوتا ہے۔ احمد اقبال کی اسٹوری آف دی منتھ، سرپرائز نے کافی افسردہ کیا۔ بزم اشعار میں قارئین کے معیار و ذوق کی داد دینا ضروری ہے۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

مہرین ناز، حیدرآباد۔ احمد خان توحیدی، الطوارفی اسٹیل، کراچی۔ ماریہ فاروق، چمن۔ چودھری عاصم اقبال جسپال، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ حافظ شاہد عمران چدھڑ، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی۔ سوہا جی، لاہور۔ حسیب احمد چنائے، الگڈی کرک

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

زخم گل

ڈاکٹر ساجد امجد

جب فرش کی خاک عرش پر چاند بن کر چمکتی ہے تو بہت سی آنکھوں میں حیرانی کی چمک آجاتی ہے... بالآخر دن رات کے الٹ پھیر سے تاریخ ان لمحات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ جس دنیا کا آسمان رنگ بدلتا ہو وہاں کی زمین پر رہنے والے پل پل روپ بدلتے ہیں۔ اس کا رنگ روپ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بدلتا گیا حتیٰ کہ حضرت نظام الدین اولیا کی پیش گوئی درست ثابت ہوگئی اور وہ... جو کہ ایک غریب الوطن اور پریشان حال عام سا آدمی تھا دکن کی بادشاہت نے اس کے دروازے پر دستک دے ڈالی مگر تمام تر کٹھنائیوں کے باوجود اس سارے سفر میں ایک دلربا چہرے نے اسے اپنی محبت کے حصار میں یوں قید کیے رکھا کہ کسی تکلیف کا احساس تک نہ ہو پایا اور وہ ایک عزم اور حوصلے سے اس طرح بڑھتا گیا کہ پھر اس نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی یہ اور بات کہ چاہت اس کے ہم قدم تو نہ چل سکی مگر تصور کی دنیا کو آخری سانس تک سجائے رکھا اور اس نے بھی محبت کے اس سفر میں جانے والی کی آخری نشانی گیندے کے پھولوں سے اپنی سلطنت کو مہکا دیا... کہ کچھ تو حق ادا اسے بھی کرنا تھا، سو کر دیا۔ سچ ہے محبت بادشاہ یا فقیر نہیں دیکھتی بس دل دیکھتی ہے اور پھر اسیری کا یہ طوق بخوشی گلے میں ڈالے رکھتی ہے۔ یونہی تو کوئی تاریخ میں امر نہیں ہو جاتا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ مرجع خلائق کے سامنے فقیروں اور سپاہیوں کی بھیڑ جمع تھی۔ سپاہی اس لیے کھڑے تھے کہ ایک طرف شاہی ہاتھی کھڑا جھوم رہا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ شہزادہ محمد تغلق (الغ خاں) نیاز مندی کو حاضر ہوا ہے۔ یہ سپاہی شہزادے کی حفاظت کے لیے پہرا دے رہے تھے۔ فقیروں کی معمول سے زیادہ بھیڑ اس لیے تھی کہ شہزادے کی فیاضی ضرب المثل تھی۔ وہ جب سوار ہوتا تھا تو اشرفیوں کے تھال لٹاتا ہوا چلتا تھا۔ یہ فقیر، غربا اور مساکین شہزادے کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک فقیر ان سب میں نہایت انوکھا تھا۔ کپڑے فقیروں کے' چہرہ بادشاہوں کا۔ آنکھوں میں اطمینان، چوڑی پیشانی پر اقبال مندی کی تحریر البتہ وضع قطع سے گھبراہٹ طاری تھی۔ دوسرے فقیروں سے الگ تھلگ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ دوسرے فقیر بار بار خانقاہ کے دروازے کی طرف بڑھتے تھے جنہیں سپاہی پیچھے دھکیل دیتے تھے جبکہ اس شخص کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

یہ غیاث الدین تغلق کا دور حکومت تھا اور شہزادہ محمد تغلق اس کا ولی عہد تھا لہٰذا اس کی شان و شوکت کسی طرح سلطان سے کم نہیں تھی۔

سلطان غیاث الدین، حضرت نظام الدین اولیاؒ سے دلی رنج رکھتا تھا۔ کسی طور یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادے اور اکابرین سلطنت حضرت نظام سے ربط ضبط رکھیں یا ان کی خانقاہ پر حاضری دیں لیکن اس کی منادی کے باوجود اکابرین سلطنت پروانوں کی طرح کھنچے چلے آتے تھے۔ خصوصیت سے سلطان کے بھائی کا بیٹا فیروز شاہ تو سخت عقیدت مندوں میں تھا۔ شہزادہ محمد تغلق بھی کبھی کبھی حاضری دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خانقاہ میں موجود تھا اور باہر بھیڑ جمع تھی۔

درخت کے نیچے کھڑا ہوا مسکین شخص اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ غلط وقت پر آگیا ہے۔ شہزادے کے ہوتے ہوئے اسے باریابی کا موقع کیسے مل سکتا ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ واپس چلا جائے اور پھر کسی وقت آئے کہ بھیڑ میں ہلچل ہوئی۔ معلوم ہوا شہزادہ خانقاہ سے باہر آرہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ مزدور سروں پر خوان اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ مزدوروں نے باہر نکلتے ہی زر و جواہر لٹانے شروع کردیے۔ فقیر اسے لوٹنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اسی لوٹ مار میں شہزادے کی حفاظت کے لیے آئے ہوئے سپاہی بھی شامل تھے۔ ایک سپاہی نے اس سے بھی کہا۔

”غریب معلوم ہوتے ہو۔ ایک اشرفی بھی مل گئی تو دن پھر جائیں گے۔ لوٹتے کیوں نہیں؟“

”میں غریب ضرور ہوں لیکن خیرات پر زندگی گزارنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تو شیخ سے ملنے آیا ہوں۔ جو کچھ وہ دیں گے اسے لے لوں گا۔“

”وہاں سے تو ”جو“ کی روٹی ملے گی۔“

”میرے لیے وہی بہت ہے۔“

کچھ دیر میں شہزادہ باہر آیا۔ اس کے ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر اور ایک مخصوص آواز نکال کر اسے سلامی دی اور بیٹھ گیا۔ طلائی سیڑھی لگادی گئی۔ شہزادہ اس سیڑھی کے ذریعے ہاتھی پر بیٹھ گیا۔

شہزادے کے اٹھ جانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کچھ بے چین سے نظر آنے لگے تھے۔ بار بار نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ انہوں نے خادم کو بلایا۔

”ایک سلطان رخصت ہوا دوسرا سلطان دروازے پر کھڑا ہے۔ جاؤ اسے بلا کر لے آؤ۔“

خادم خانقاہ سے باہر آیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ طبل و علم تھے، نہ مرصع ہاتھی نہ جڑاؤ گھوڑے۔ نہ زین نہ عماری، زمین خالی تھی ساری۔ کسی سلطان کا نام نشان نہیں تھا۔ وہ مسکین شخص درخت کے نیچے اب بھی کھڑا تھا۔ غالباً سوچ رہا تھا، شہزادہ رخصت ہوگیا، بھیڑ چھٹ گئی۔ اب وہ اپنی قسمت آزمائے، دروازے پر جائے اور کسی خادم سے بات کرے۔

خادم اچھی طرح دیکھ بھال کے واپس چلا گیا۔

”حضور، باہر تو کوئی سلطان نہیں ہے۔ ایک مسکین صورت مفلوک الحال شخص ضرور کھڑا ہے۔“

”ہاں، وہی تو ہے جسے تاجدار ہونا ہے۔ جلدی کرو اسے بلا کر لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مایوس ہو کر واپس ہوجائے۔ اس کی قسمت کا دروازہ کھلنے سے پہلے بند ہوجائے۔“

خادم دوبارہ باہر آیا۔ مسکین صورت شخص مایوس ہوکر درخت کی مخالف سمت چل پڑا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی اور دن قسمت آزمائی کرے گا۔

کوئی شخص اسے بلا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ امید کی شمع پھر دل میں روشن ہوگئی۔ اس نے الٹے قدموں چلنا شروع کردیا۔

”بھائی تم خوش قسمت ہو۔ حضرت شیخ نے تمہیں خود طلب کیا ہے۔“

”بھائی اگر وہ مصروف ہیں تو میں پھر کبھی آجاؤں گا۔

یری پریشانیاں تو چلتی ہی رہیں گی۔“

”تو کیا تم ان کی حکم عدولی کرو گے؟“

”یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”تو پھر چلو۔ گھر آئی دولت کو کیوں لوٹاتے ہو۔“

وہ شخص اس خادم کے ہمراہ خانقاہ کے اندر آگیا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ مسند پر تشریف فرما تھے۔ اس وقت وہ تنہا تھے صرف دو فقیر ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ذکر و اشغال میں مشغول تھے۔

اس شخص نے اندر داخل ہوتے ہی حضرت شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت نے پاؤں سکیڑ لیے۔

”سر اٹھاؤ، یہ سر جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔“

”میرا نام حسن ہے۔ دارالسلطنت میں نیا نیا داخل ہوا ہوں۔ تنگدستی سے پریشان ہوں۔“

کھانا ختم ہوچکا تھا۔ حضرت شیخ نے اپنے افطار کے لیے جو کی روٹی رکھی تھی۔ اس میں سے تھوڑی سی روٹی اپنی انگلی کے سرے پر رکھ کر حسن کو دی۔

”یہ دکن کی حکمرانی کا تاج ہے جو بہت کشمکش، محنت اور عرصہ دراز کے بعد تیرے سر پر رکھا جائے گا۔“

وہ کہتے کہتے رہ گیا کہ یہ تاج جب رکھا جائے گا تب رکھا جائے گا ابھی کی تنگدستی کیسے دور ہو۔ اس وقت تک بھوک سے بچوں گا تو تاج سر پر رکھوں گا۔

پاس ادب سے قوت گویائی چلی گئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ حضرت روشن ضمیر ہیں۔ میری پریشانیوں سے واقف ہوں گے۔ میرے حق میں ضرور دعا گو ہوں گے۔

وہ وہاں سے اٹھا تو کوئی واضح جواب نہ ملنے کے باوجود اس کا دل مطمئن تھا۔

خانقاہ سے نکل کر گھر کی طرف چل دیا۔

ابھی گھر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ گیندے کا ایک پھول اس کے قدموں میں آکر گرا۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ برابر کے گھر میں ایک دریچہ کھلا ہوا تھا مگر اس وقت اس میں کوئی تھا نہیں۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ دریچے میں کوئی لڑکی ہوگی جس نے یہ پھول اس کی طرف اچھالا ہے۔ اس کی عمر اور خوبصورتی یقیناً ایسی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس میں دلچسپی لے سکتی تھی لیکن اس وقت وہ جن حالات میں گھرا ہوا تھا، اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی کی دلچسپی کا جواب دلچسپی سے دیتا۔ اس نے دریچے پر نظریں جمائے رکھنے کے بجائے اسی میں عافیت جانی کہ گھر میں چلا جائے اور مستقبل کی فکر کرے۔

چند ہی روز ہوئے تھے کہ وہ ایران سے دہلی میں وارد ہوا تھا۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت کچھ جمع پونجی ساتھ لایا تھا جس سے اس نے یہ مکان خرید لیا تھا۔ اس کے پاس اب بھی کچھ رقم تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ رقم جلد ہی خرچ ہوجائے گی۔ کچھ ایسے حالات تھے کہ ایران واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اسے اسی شہر میں رہ کر کوئی مقام حاصل کرنا تھا۔ اس کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

وہ پیدل چل کر آیا تھا۔ تھک گیا تھا۔ تھکن اتارنے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے نہ جانے کیوں اس پھول کا خیال آیا جو اس کے قدموں میں آکر گرا تھا۔ پھول سے زیادہ اسے یہ خیال پریشان کررہا تھا کہ اس پھول کو پھینکنے والا یا پھینکنے والی کون ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے کتنی چاہت سے پھول پھینکا تھا اور میں اسے یونہی باہر پڑا چھوڑ آیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا، پھول اب بھی زمین پر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر پھول اٹھایا اور غیر ارادی طور پر دریچے کی طرف دیکھا۔ معما حل ہوگیا۔ ایک لڑکی، نہایت خوب صورت اس کی طرف محویت سے دیکھ رہی تھی لیکن اس سے نظریں چار ہوتے ہی وہ دریچے سے ہٹ گئی۔ حسن کی نظریں انتظار کرتی رہیں کہ وہ دریچے پر پھر آئے گی لیکن وہ نہیں آئی۔ حسن مایوس ہوکر گھر میں آگیا۔ پھول اب بھی اس کی مٹھی میں بند تھا۔ اس نے پھول کو تکیے کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پھول کسی اور نے پھینکا ہو اور وہ لڑکی بعد میں وہاں آئی ہو۔ نہیں، وہ جس طرح شرما کر پیچھے ہٹی ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پھول اسی نے پھینکا تھا مگر کیوں؟ یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سوگیا۔

خواب میں بھی وہ اس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔

کسی وقت آنکھ کھلی۔ شام کے وقت وہ بازار کی سیر کو ضرور جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی تیار ہوا اور نکلنے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا۔ اس مرتبہ دو پھول اس کے قدموں میں آکر گرے۔ اس نے پھولوں کی طرف دیکھنے کے بجائے دریچے کی طرف دیکھا تاکہ چور پکڑا جائے۔ اس کی نظر پڑتے ہی لڑکی نے دریچہ چھوڑ دیا لیکن حسن اسے پہچان چکا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ پھول پھینکنے والی وہی ہے کوئی اور نہیں۔ حسن کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ اب وہ نہیں آئے گی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ لوٹ کر آیا تو لامحالہ اس کی نظر دریچے کی طرف اٹھ گئی۔ دریچہ

کھلا تھا مگر سنسان تھا، کوئی پھول بھی آکر نہیں لگا تھا۔

وہ جب بازار سے آیا تھا تو گیندے کے چند پودے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے یہ پودے گھر کی ایک کیاری میں لگا دیے۔ اسے اچانک گیندے کے پھولوں سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ان پودوں میں لگے ہوئے پھولوں کو دیکھتا رہا۔ شاید اسے کوئی یہاں بھی چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا کیونکہ جب وہ دوسرے دن صبح ہی صبح اٹھا اور ان پودوں کو پانی دینے لگا تو اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک سنی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور پتھر بن گیا۔ ایک لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ یقیناً وہی لڑکی تھی جسے وہ دریچے میں دیکھ چکا تھا۔

’’مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے۔ میں تمہارے گیندے کے پودے دیکھنے آئی ہوں۔‘‘

’’ہاں ہاں اندر آؤ۔ میں تو یوں حیران ہو رہا تھا کہ میں تمہیں جانتا نہیں۔‘‘

’’اندر تو بلاؤ۔ میں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔‘‘

اس نے راستہ دے دیا اور وہ اندر آ گئی۔

’’میرا نام جے ماتا ہے۔ آپ کے پڑوس ہی میں تو رہتی ہوں۔‘‘

’’اچھا اچھا بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔‘‘

’’میں تمہارے پودے دیکھنے آئی ہوں۔‘‘

’’ہاں ہاں خوب دیکھو۔‘‘

’’تمہیں گیندے کے پھول اچھے لگتے ہیں؟‘‘

’’پہلے تو نہیں لگتے تھے۔ اب اچھے لگنے لگے ہیں۔‘‘

’’آپ کو زمین پر پڑے ہوئے پھول اچھے نہیں لگتے ہوں گے۔‘‘

’’زمین پر پڑے پھولوں ہی نے تو مجھے یہ ترغیب دی کہ میں پودے گھر میں لے آیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے حسین پھول زمین پر پھینکتا کون تھا۔‘‘

’’میں وہ پھول زمین پر پھینکنے کے لیے تو نہیں پھینکتی تھی۔‘‘

’’اچھا تو وہ پھول تم پھینکتی تھیں۔‘‘

’’آپ کی سندرتا نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو معاف کر دیں۔‘‘

’’مجھے برا نہیں لگا لیکن میرے حالات ایسے ہیں کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگا۔‘‘

’’آپ مرد ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ مرد تو اپنے حالات خود بناتا ہے۔‘‘

’’میں اس شہر میں نیا آیا ہوں۔ ابھی تو راستے تلاش کر رہا ہوں۔‘‘

’’میں پوچھ سکتی ہوں مہاراج کہاں سے پدھارے ہیں؟‘‘

’’میرا وطن ایران ہے۔ ماں باپ ایک مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ میری جان کو بھی خطرہ تھا لہٰذا میں تقدیر بنانے یہاں چلا آیا۔‘‘

’’میرے پتاجی تغلق کے دربار میں ہیں۔ میں ان سے تمہارا ذکر چھیڑوں گی۔ شاید تمہیں کوئی ملازمت مل جائے۔‘‘

’’ہاں ضرور کرنا۔ پھر آگے بڑھنا میرا کام ہے۔‘‘

جے ماتا اسے چند ہی روز میں پرستش کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ اب پھول پھینک کر متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود اس سے ملنے آ جاتی تھی۔ دونوں مل کر پودوں کو پانی دیتے اور خوب باتیں کرتے تھے۔

’’آپ کو معلوم ہے میں آپ سے پریم کرنے لگی ہوں۔‘‘ ایک دن جے ماتا نے کہا۔

’’میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے حالات ایسے ہیں کہ یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیا خبر مجھے کہاں جانا پڑے اور تمہیں جدائی کا دکھ دے کر چلا جاؤں۔‘‘

’’جدائی تو میری قسمت ہے۔ ہم دونوں کا دھرم ہمارے بیچ ہے۔ تم مسلمان ہو اور میں ہندو۔ ہم دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا میں تمہاری پوجا کرتی رہوں گی۔ بس ایک وعدہ کرو۔ پھر ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔‘‘

’’کہو، کس بات کا وعدہ لینا ہے؟‘‘

’’جب تک ہم زندہ ہیں دونوں میں سے کوئی شادی نہیں کرے گا، نہ تم، نہ میں۔ ہم میں سے کوئی مر جائے تو زندہ رہنے والا آزاد ہو گا۔‘‘

جب وہ یہ عہد لے رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

حسن نے اس سے کئی مرتبہ کہا کہ وہ اس کا خیال چھوڑ دے۔ وہ پردیسی ہے، کیا خبر کس طرف نکل جائے لیکن جے ماتا تو جیسے اس پر نثار تھی۔ چپکے چپکے یہ کوشش بھی کرتی رہی کہ کس طرح حسن کو کوئی ملازمت مل جائے تاکہ وہ حالات کا رونا بند کر دے لیکن اس کی قسمت کی سختی تھی کہ کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن جے ماتا اس کے گھر آئی تو بہت خوش تھی۔

’’کل تم کہیں مت جانا۔ میں کسی وقت بھی تمہیں بلانے آؤں گی۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہو گا۔‘‘

’’کیوں، کیا تمہارے پتاجی کو مجھ پر رحم آ گیا؟‘‘

’’وہ تو ہمیشہ ہی تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ مجھے تو تمہیں کسی اور سے ملوانا ہے۔‘‘

’’یہ کیا تم پہیلیاں بجھواتی رہتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں۔‘‘

’’میں بتانا تو نہیں چاہتی تھی مگر تم خفا ہو رہے ہو تو بتائے دیتی ہوں۔ کل ہمارے گھر گنگو برہمن براجمان ہو رہے ہیں۔ تمہارا ان سے ملنا ضروری ہے۔‘‘

’’مجھے ان سے کیا دلچسپی۔ ہاں تمہارا گھر اندر سے دیکھنے ضرور آ جاؤں گا۔‘‘

’’ارے تمہیں نہیں معلوم۔ وہ بہت بڑے جوتشی (منجم) ہیں۔ شہزادہ تغلق تمام کام انہی سے پوچھ کر کرتا ہے۔ ان سے میں تمہاری جنم کنڈلی نکلواؤں گی۔ معلوم تو ہو تمہارے حالات میں سدھار کیوں نہیں آ رہا ہے۔‘‘

’’یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کی قسمت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی ملا تھا۔ انہوں نے پتا ہے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟‘‘

’’کیا کہا ہے۔‘‘

’’تم سنو گی تو ہنسو گی۔ انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی ہے کہ میں دکن کا تاجدار بنوں گا۔‘‘

’’مجھے ذرا بھی ہنسی نہیں آئی۔ انہوں نے کہا ہے تو سچ ہی کہا ہو گا۔ تم تو چاہتے ہو چٹ منگنی ہو اور پٹ بیاہ ہو جائے۔‘‘

’’ہاں انہوں نے یہ کہا ضرور تھا کہ مجھے یہ مرتبہ بہت محنت اور عرصہ دراز کے بعد ملے گا۔‘‘

’’میں تو کہتی ہوں ان کی یہ بات پوری ہونے کو ہے۔‘‘

’’تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟‘‘

’’گنگو برہمن شہزادے کے بہت قریب ہے۔ شہزادہ ان کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں شہزادے کی ملازمت دلوا دے اور تم ترقی کرتے کرتے دکن کے بادشاہ بن جاؤ۔‘‘ یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گئی۔

’’تم خوش ہونے کے بجائے اداس کیوں ہو گئیں؟‘‘

’’تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم دکن کے بادشاہ بن گئے تو مجھ سے واقعی دور چلے جاؤ گے۔‘‘

’’ارے اس وقت تو میں بادشاہ ہوں گا۔ تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔ بادشاہوں کی تو ہندو رانیاں بھی ہوتی ہیں۔‘‘

’’سچ کہو حسن۔‘‘ جے ماتا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ’’تم اگر راجا بن گئے تو مجھے بیاہنے آؤ گے۔‘‘

’’میں اس وقت تک تخت پر قدم نہیں رکھوں گا جب تک تم سے شادی نہیں کر لیتا۔ اس وقت کس میں ہمت ہو گی جو انکار کرے۔‘‘

’’تب کی تب دیکھی جائے گی۔ کل گھر پہ رہنا۔ میں بلانے آؤں گی۔‘‘

حسن کو گنگو برہمن سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن قسمت کا حال جاننے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔ اسے بھی تھا۔ وہ دوسرے دن گھر سے بالکل نہیں نکلا۔

دوپہر کا وقت تھا کہ جے ماتا اسے بلانے آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جے ماتا کے پتا سے اس کی ملاقات ہو رہی تھی۔ وہیں گنگو برہمن بھی بیٹھا تھا۔ جے ماتا نے اس کا تعارف ایک اچھے ہمسائے کی حیثیت سے کرایا۔ اس سے پہلے کہ جے ماتا جنم کنڈلی کا ذکر کرتی حسن نے اپنی تنگدستی کا ذکر چھیڑ دیا۔

’’مجھے کوئی ایسی نوکری یا روزگار مل جائے جس سے میں اپنا کفیل ہو سکوں۔‘‘

اپنے خاندان اور دہلی میں وارد ہونے کا ذکر وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ گنگو برہمن اس کے حالات سن کر بہت متاثر ہوا تھا اور اس کی دل سے مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے حسن کے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ اسے نواح دہلی میں بنجر زمین کا ایک ٹکڑا ایک جوڑی بیل اور کام کرنے کے لیے دو مزدور دے دیے تاکہ اس زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پال سکے۔

اس موقع پر جے ماتا نے اس کی جنم کنڈلی کا ذکر چھیڑا لیکن گنگو برہمن نے دلچسپی نہیں لی اور ٹالتے ہوئے کہا کہ جنم کنڈلیاں تو بڑے لوگوں کی ہوتی ہیں حسن مہاراج تو مزدور ہیں۔ ان کی محنت ہی ان کی جنم کنڈلی ہے۔

’’میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ حضرت نظام الدین نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے سر پر دکن کی بادشاہت کا تاج رکھا جائے گا۔‘‘

’’اب تو جنم کنڈلی کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی۔ وہ مہان ہیں۔ انہوں نے جو کہہ دیا وہ ضرور پورا ہو گا۔ اب میں ان کی قسمت کا حال کیا بتاؤں۔‘‘

’’ذرا یہ معلوم ہو جاتا کہ ایسا کب تک ہو گا؟‘‘ جے ماتا نے پھر اصرار کیا۔

’’زیادہ چھانو گے تو کرکرا ہی ہو گا۔ محنت کرتے رہو

اور وقت کا انتظار کرو۔ کسی وقت ہوا تو جنم کنڈلی نکال بھی لوں گا۔“

جے ماتا نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ گنگو برہمن کو جلدی بھی ہو رہی تھی۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے حسن کو ہدایت کی کہ وہ اس کے گھر آ کر بیلوں کی جوڑی لے لے اور مزدوروں کو لے کر اپنی زمین پر چلا جائے۔

دوسرے دن حسن اس کے گھر گیا۔ بیلوں کی جوڑی اور مزدوروں کو لے کر زمین پر پہنچ گیا۔

مزدوروں نے زمین کو کاشت کے لیے کھودنا شروع کیا۔

ایک دن مزدور زمین میں ہل چلا رہے تھے کہ ہل کی نوک زمین کے اندر پھنس گئی۔ حسن کے کہنے پر مزدوروں نے بیلوں کو بھگانے کی کوشش کی لیکن ہزار کوشش کے باوجود ہل کی نوک باہر نہ آ سکی۔ حسن نے مزدوروں سے کہا کہ گڑھا کھود کر دیکھیں، ہل کس چیز میں پھنس گیا ہے۔ زمین کے اندر ایسی کیا چیز ہے جو ہل کو باہر نہیں آنے دے رہی ہے۔

مزدوروں نے گڑھا کھودا تو معلوم ہوا کوئی زنجیر ہے جس میں ہل کی نوک پھنس گئی ہے۔ اب تو اسے تشویش ہوئی کہ زمین میں زنجیر کیوں ہے۔

”یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔“ مزدوروں نے کہا۔

”تھوڑا اور کھودو تا کہ معلوم ہو زنجیر کا دوسرا سرا کہاں ہے۔“

”اب تو آپ مالا مال ہو جائیں گے۔ اس کا کچھ حصہ ہمیں بھی ملنا چاہیے۔“

”اگر یہاں خزانہ ہے تو نہ یہ میرا ہے نہ تمہارا۔ زمین کا مالک گنگو برہمن ہے۔ یہ خزانہ اسی کی ملکیت میں جانا چاہیے۔ میں اسے پہنچا دوں گا۔“

مزدوروں نے بے دلی سے کھودنا شروع کیا۔ ذرا سی کھدائی کے بعد ایک بڑا برتن نظر آنے لگا۔ زنجیر اس برتن کے منہ سے بندھی ہوئی تھی۔ برتن کھول کر دیکھا تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سونے کے سکے اور اشرفیاں لبالب بھری ہوئی تھیں۔

مزدوروں نے ایک مرتبہ پھر حسن کو مشورہ دیا کہ وہ نادانی نہ کرے اور اس خزانے کو اپنے قبضے میں لے لے لیکن حسن کی ایمانداری نے یہ قبول نہیں کیا کہ آقا کی دی ہوئی زمین کے مال میں خیانت کرے۔

اس نے برتن کی تمام دولت ایک بڑی چادر میں باندھی اور گنگو برہمن کے مکان پر پہنچ گیا۔

”اس چادر میں کیا ہے حسن؟“

”یہ وہ خزانہ ہے جو مجھے آپ کی زمین سے ملا ہے۔“

حسن نے کہا اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔

”یہ زمین اب تمہاری ہے۔ یہ خزانہ بھی تمہارا ہوا۔ جاؤ اور اپنی تنگدستی دور کرو۔“

”آپ نے مہربانی کر کے یہ زمین مجھے دی ہے۔ اس خزانے پر میرا کوئی حق نہیں۔“

گنگو برہمن اس کی ایمانداری سے بہت خوش ہوا اور دوسرے ہی دن وہ شہزادہ تغلق کے دربار میں حاضر ہوا اور شہزادے کو پورے واقعے سے آگاہ کیا۔ محمد تغلق کو بھی حسن کو ایمانداری پر حیرت ہوئی۔

”اس زمانے میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ اتنی دولت دیکھ کر تو اچھے اچھوں کے ایمان خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا شخص ہے۔“

”اگر آپ فرمائیں تو میں اسے آپ کے سامنے پیش کروں۔ آپ خود ملاحظہ فرما لیجیے گا۔“ گنگو برہمن نے کہا۔

”آپ نہ بھی کہتے تو میں اس سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتا۔“

حسن اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ گنگو برہمن اس سے ملنے آیا۔ یہ حیرت ہی کی بات تو تھی کہ تغلق کا مقرب خاص اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ وہ نہ صرف ملنے آیا تھا بلکہ حسن سے اس طرح پیش آ رہا تھا جیسے حسن نہیں گنگو اس کا ملازم ہو۔

”آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کی مہربانی سے میں زمین کا مالک بنا ہوں۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔“

”کل تک میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن آج معاملہ دوسرا ہے۔“

”آج کیا سورج مغرب سے نکل آیا ہے؟“

”کل جب میں نے آپ کی ایمانداری کو آنکھوں سے دیکھ لیا تو میں آپ کی جنم کنڈلی نکالنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ آپ معمولی آدمی نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قسمت کا زائچہ بتاتا ہے کہ آپ کسی دن بلند اقبال اور باعزت ہوں گے اور کسی اونچے عہدے پر پہنچیں گے۔“

”اگر آپ کا حساب ٹھیک ہے تو شاید ایسا ہی ہو لیکن میں اپنے آپ کو اس وقت بھی آپ کا نوکر ہی تصور کروں گا۔“

”آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”اگر آپ کو کوئی باعزت عہدہ دنیا میں عطا ہو تو میرا نام بھی اپنے نام کا حصہ بنا کر لکھنا تا کہ میرا نام بھی حیات جاوداں حاصل کر لے۔“

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی کروں گا۔“

”اپنے اس زائچے پر مجھے اس لیے بھی یقین ہے کہ آپ کو شہزادہ تغلق نے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ شاید اب ترقی کی راہیں آپ پر کھلنے والی ہیں۔“

”مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ شہزادے نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ یہ بھی یقیناً آپ کی مہربانی سے ہوا ہوگا۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

گنگو یہ کہہ کر چلا گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ وہ کل اس کے گھر پہنچ جائے۔ وہ اسے لے کر تغلق کے دربار میں جائے گا۔

جے ماتا اپنے دریچے سے دیکھ رہی تھی کہ گنگو برہمن اس کے گھر آیا ہے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ حسن اب اتنا بڑا آدمی ہو گیا ہے کہ گنگو برہمن اس سے ملنے آیا ہے۔

گنگو برہمن کے رخصت ہوتے ہی وہ حسن کے گھر پہنچ گئی۔

”واہ جی! اب تم اتنے بڑے آدمی ہو گئے کہ درباری منجم تم سے ملنے آتا ہے۔“

”دیکھ لو۔ اب میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ شہزادہ تغلق نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ گنگو برہمن یہی بتانے آیا تھا۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر بڑے آدمی بنتے ہی مجھے بھول مت جانا۔“

”میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ راستہ مجھے تم ہی نے دکھایا تھا۔ گنگو برہمن سے مجھے تم ہی نے ملوایا تھا۔“

”اچھے سے کپڑے پہن کر جانا۔ تم شہزادے سے ملنے جا رہے ہو۔“

”اچھا جی، میں تمہاری اس ہدایت پر بھی عمل کروں گا۔“

”مجھے بتانا ضرور شہزادے نے کیا کہا اور ہو سکے تو میرا ذکر بھی کر دینا۔“

”شہزادے سے کہوں گا مجھے کوئی اچھی سی نوکری دو مجھے جے ماتا سے شادی کرنی ہے۔“

جے ماتا شرما کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

حسن نے اپنی سب سے اچھی پوشاک نکالی اور حسن گنگو کے ہمراہ شہزادہ محمد تغلق کے دربار میں پہنچ گیا۔ شہزادے نے اپنی جہاں دیدہ نظریں اس پر ڈالیں اور پہلی ہی نظر میں اس سے متاثر ہو گیا۔ بہت دیر تک حسن سے اس کے حال احوال پوچھتا رہا اور یہ جانچ لیا کہ وہ صرف ایماندار ہی نہیں نہایت ذہین بھی ہے۔

”اتنی دولت دیکھ کر تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اسے اپنے گھر لے جاؤ۔“

”شہزادہ سلامت! میں جب گھر سے نکلا تھا تو میں نے یہ عزم کیا تھا کہ جو کچھ کماؤں گا اپنے زورِ بازو سے کماؤں گا، اس دولت پر میری کوئی محنت خرچ نہیں ہوئی تھی پھر میں اسے کیوں اپنے گھر لے جاتا۔ ہاں اگر مجھے آپ کوئی ملازمت دے دیں تو اپنی کمائی پر میرا حق ہوگا۔“

”میں تمہارے عزم اور ایمانداری سے بہت خوش ہوا ہوں۔ میں بادشاہ سے تمہاری سفارش ضرور کروں گا۔“

حسن دربار سے واپس آیا تو امید کی ایک کرن اس کے دل میں چمک رہی تھی لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس مرتبے پر فائز ہونے والا ہے۔

شہزدہ تغلق، حسن سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے بادشاہ غیاث الدین تغلق سے اس کی ایمانداری کا ذکر کیا۔ یہ سفارش بھی کی کہ اسے کوئی اعلیٰ عہدہ دیا جائے۔

غیاث الدین تغلق اپنے بیٹے کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے حسن کو شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا اور اسے ایک صدی امیروں کے زمرے میں شامل کر لیا۔

حسن نے یہ منازل اتنی تیزی سے طے کر لی تھیں کہ اسے گنگو برہمن کے زائچے پر یقین آ گیا۔ ساتھ ہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی پیش گوئی یاد آئی۔ دکن کی منزل تو ناممکن دکھائی دے رہی تھی لیکن یہ عہدہ اسے مل گیا تھا۔ اس نے اسی عہدے کو اپنی منزل سمجھ کر گنگو برہمن سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ گنگو بہمنی لکھنا شروع کیا اور اپنا نام حسن گنگو بہمنی لکھنے لگا۔

یہ عہدہ ملنے کے بعد جے ماتا سے شادی کرنے کی راہیں کھل چکی تھیں۔ وہ اب ایسے عہدے پر متمکن تھا کہ اس کا مسلمان ہونا جے ماتا سے شادی میں رکاوٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر وہ جے ماتا کے باپ سے بات کرے گا۔

جے ماتا بھی بہت خوش تھی اور اسے اپنے باپ سے بات کرنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سمجھاتی رہتی تھی۔ وہ رات عجیب تھی۔ جے ماتا اس کے پاس آئی تو بہت خوش تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے باپ سے بات کر لی ہے اور اب حسن بلا کھٹکے اس سے بات کر سکتا ہے۔ وہ بہت دیر تک اس کے پاس رہی تھی اور مستقبل کے خواب دیکھتی رہی تھی۔

اس رات کی صبح ہوئی تو حسن کی آنکھ رونے کی آوازوں سے کھلی۔ یہ آوازیں جے ماتا کے گھر سے آ رہی

تھیں۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ ایک اچھے پڑوسی کی طرح اس کے دروازے پر گیا کہ حقیقت حال دریافت کرے۔ پھر جو کچھ اسے معلوم ہوا اس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ جے ماتا کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر گئی تھی۔

اب وہ کس سے کس کا ہاتھ مانگتا۔ جے ماتا اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جے ماتا کو سانپ نے ڈسا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جے ماتا کو اس کے باپ نے راستے سے ہٹایا ہے۔ اسے یہ برداشت نہ ہوگا کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے۔

یہ اس کا وہم بھی ہوسکتا تھا مگر کوئی ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ کسی کارروائی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ اس کی چتا کے ساتھ کچھ دور تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔

اب اپنے گھر میں رہنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ ایک دریچہ تھا جو ہر وقت اس کے سامنے تھا۔ یہ خیال بھی ہر وقت اسے خون کے آنسو رلاتا رہتا تھا کہ جے ماتا کے قاتل اسی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اس نے گھر تبدیل کرلیا۔ اس نئے گھر میں بھی گیندے کے پودے بڑی تعداد میں لگ گئے۔

* * *

سلطان غیاث الدین نے دہلی سے کچھ فاصلے پر تغلق آباد کے نام سے شہر آباد کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ اس کے امرا و ملوک وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ تغلق آباد میں حاکم مقرر کر کے خود بادشاہ دہلی میں رہتا تھا۔

721 ہجری میں سلطان غیاث الدین نے شہزادہ تغلق کو چتر عطا کیا اور ایک مستعد لشکر کے ساتھ ''ورنگل'' اور ''تلنگانہ'' کے خلاف مہم پر روانہ کیا۔

شہزادہ تغلق ورنگل پہنچ کر اس کے قریب خیمہ زن ہو گیا اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔

شہزادہ کو گئے ہوئے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ شہزادے کو متواتر کامیابیاں مل رہی ہیں کہ لکھنوتی کے چند امرا حاکموں کی شکایت لے کر سلطان تغلق شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنی پریشانی اور بے بسی کی داستانیں اس انداز سے سنائیں کہ سلطان نے لکھنوتی کے مسلمانوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ محمد تغلق ورنگل کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے محمد تغلق کو اپنی روانگی کی اطلاع بھجوائی اور لشکر کے ساتھ لکھنوتی روانہ ہو گیا۔

سلطان کی ہیبت ہندوسندھ کے تمام علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی لہٰذا جیسے ہی اس کا پرچم سایہ انداز ہوا لکھنوتی کا حاکم سلطان ناصر الدین اس کی درگاہ میں اطاعت کا سر نیاز لے کر حاضر ہوا اور شرف خاک بوسی حاصل کیا۔

ابھی سلطان کی تلوار نیام سے باہر بھی نہیں آئی تھی کہ اس علاقے کے راؤں اور راجاؤں نے سلطان کی اطاعت قبول کرلی۔

سلطان نے ناصر الدین کو دوبارہ چتر عطا کیا۔ اردگرد کے علاقوں کے باغیوں کی سرکوبی کی اور واپسی کا طبل بجوا دیا۔

محمد تغلق ورنگل کو فتح کر چکا تھا۔ اس تک خبر پہنچی کہ سلطان تغلق آباد کے دارالحکومت میں پہنچنے والا ہے تو اس نے حکم دیا کہ تغلق آباد سے تین چار کوس کے فاصلے پر افغان پور کے قریب ایک چھوٹا سا کوشک (محل) تیار کیا جائے تا کہ سلطان رات کو وہاں قیام کرے۔

یہ محل صرف تین دن میں تیار ہو گیا۔ محمد تغلق بھی یلغار کرتا ہوا تغلق آباد پہنچ گیا اور باپ کے استقبال کے لیے شہر کو روشنیوں سے آباد کر کے استقبال کے لیے باہر نکلا۔

غیاث الدین تغلق افغان پور کے قریب پہنچا اور محل کھڑا دیکھا تو حیران رہ گیا۔

''اس سے پہلے تو یہ محل یہاں موجود نہیں تھا۔''

''حضور کے قیام کے لیے یہ محل شہزادۂ معظم نے تیار کروایا ہے۔ ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ آپ یہاں شب بسر فرمائیں۔ اس کے بعد دہلی تشریف لے جائیں۔''

''ہمیں دہلی پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ وہاں ہماری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بعض لوگ سازشوں پر کمر بستہ ہو گئے ہیں اور ہماری موت کی جھوٹی افواہیں پھیلائی جارہی ہیں لیکن ہم اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کریں گے اور اس محل میں ایک رات گزاریں گے۔''

تغلق آباد میں شادیانے بجائے جارہے تھے، شہنائیاں گونج رہی تھیں کہ عصر کی نماز کے وقت سلطان تغلق نئے کوشک کے قریب پہنچا اور اسی میں مقیم ہوا۔

سلطان محمد نے امرا، ملوک اور دوسرے اکابر کے ساتھ باپ کا استقبال کیا اور شرف قدم بوسی سے مشرف ہوا۔ اسی وقت سلطان نے کھانا طلب کیا۔

کھانے کے بعد چونکہ ہاتھیوں کی پریڈ ہونا تھی لہٰذا ہاتھی بانوں نے ہاتھی دوڑانے شروع کر دیے تا کہ جب

سلطان ہاتھیوں کے ملاحظہ کے لیے آئے تو ہاتھی پوری طرح چاق و چوبند ہوں۔

سلطان ملوک و امرا کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا اور باہر ہاتھی دوڑ رہے تھے۔ ان کی دھمک محل کے اندر تک محسوس کی جارہی تھی۔

جب لوگ کھانا کھا چکے تو ہاتھ دھونے کی غرض سے باہر آئے۔ محمد تغلق بھی گھوڑوں، ہاتھیوں اور دوسرے لوازمات شاہی کی ترتیب کے لیے باہر چلا آیا جنہیں وہ بادشاہ کے ملاحظہ اور خوشنودی کے لیے لایا تھا۔

یہ محل صرف تین دن کی مدت میں تیار ہوا تھا۔ اس کی بنیادیں ابھی گیلی تھیں جو ہاتھیوں کے دوڑنے بھاگنے کی وجہ سے ہل گئیں۔ جس چبوترے پر سلطان چھ سات ہمراہیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس کی چھت اچانک گر گئی۔ ایک شور مچ گیا، لوگ محل کے ملبے کی طرف دوڑے۔ جلدی جلدی بیلچوں اور کدالوں کا انتظام کیا گیا۔ ملبا ہٹایا تو سلطان کی لاش نکلی۔

سلطان کی ناگہانی موت مورخین کے نزدیک اختلافی مسئلہ بن گئی ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ شہزادہ تغلق نے جان بوجھ کر باپ کو قتل کیا۔ اتنی کم مدت میں محل تعمیر کرانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے قصداً باپ کی جان لی یعنی محل کی بنیادیں کمزور رکھوائی گئی تھیں۔ بعض کہتے ہیں یہ اتفاقی حادثہ تھا۔ ہاتھیوں کے دوڑنے کی وجہ سے محل کی چھت گر گئی۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ آسمانی بجلی گری تھی اور بعض زبانی روایات یہ بھی ہیں کہ غیاث الدین تغلق نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو کہلا بھیجا تھا کہ جب تک میں دہلی پہنچوں آپ دہلی سے نکل جائیں۔ اس کے جواب میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے یہ جملہ کہا تھا۔ ’’ہنوز دلی دور است‘‘ (ابھی دلی دور ہے) یعنی تمہیں دہلی پہنچنا نصیب ہی نہ ہوگا۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا اور سلطان دہلی پہنچنے سے قبل ہی محل کی چھت کے نیچے دب کر مر گیا۔

شہزادہ تغلق نے باپ کے سوگ میں تین دن گزارے اور چوتھے دن تغلق آباد ہی میں تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور خود کو محمد شاہ تغلق کے نام سے موسوم کیا (اس کا اصل نام الغ خاں تھا)

تخت حکومت پر بیٹھنے کے چالیس دن بعد وہ تغلق آباد سے شہر دہلی میں آیا اور برکت و نیک فال کی وجہ سے قدیم دولت خانے میں سلاطین ماضیہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

دہلی میں بچہ بچہ خوشیاں منا رہا تھا۔ قدم قدم پر آرائش و زیبائی نے عجیب عالم پیدا کر دیا تھا۔ سلطان نے حکم دیا تھا کہ اس کے جلوس کے دوران شہر کے کوچوں اور محلوں میں روپیہ برسایا جائے، چنانچہ مٹھیاں بھر بھر کر سونے اور چاندی کے تنکے گلیوں اور مکانوں کی چھتوں پر پھینکے گئے اور دیکھنے والوں کی جھولیوں میں ڈالے گئے۔

جب محمد شاہ نے کچھ دن تخت پر گزار لیے تو امرا و ملوک کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ امرائے صدہ میں حسن بھی تھا جو شہزادے سے ملاقات کے لیے گیا۔ اب وہ اتنا دولت مند ہوگیا تھا کہ بادشاہ کو نذر پیش کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آج ایک ایسی چمک تھی جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ سلطان تغلق سے یہ چمک پوشیدہ نہ رہ سکی۔

’’حسن، میں تمہاری آنکھوں میں کوئی نئی بات دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’حضور کو تخت نصیب ہوا ہے۔ اس کی خوشی میں میری آنکھوں کا رنگ تبدیل ہوگیا ہوگا۔‘‘

حسن نے یہ خوب صورت جواز پیش تو کر دیا تھا لیکن وہ سلطان کی بصیرت سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ سلطان کو جتنا وہ جان سکا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مخلوق خدا کو وہ بہت جلد اپنا دشمن بنا لے گا اور اسے (حسن کو) یہ موقع بہت جلد ملنے والا ہے کہ وہ دکن فتح کر لے۔ سلطان کی غلط حکمت عملیوں سے دکن میں انتشار پیدا ہوگا اور اس انتشار سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

سلطان نے جو سوال حسن سے کیا تھا اس پر سب چونکے تھے۔ گنگو برہمن بھی وہاں موجود تھا۔ حسن سے اس کی ایسی بے تکلفی تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا لہٰذا جب دربار برخواست ہوگیا تو گنگو برہمن نے اس سے پوچھ لیا۔

’’تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے جب سلطان نے تمہاری آنکھوں کی چمک دیکھی؟‘‘

’’سچی بات یہ ہے کہ میں کچھ اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شہزادے کی اضطرابی فطرت مملکت کے نظام کو خراب کر دے گی۔‘‘

’’تمہارا اندازہ درست ہے۔ میرا حساب بھی یہی کہتا ہے لیکن ہر بات بادشاہوں کے سامنے بیان کرنے کی نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ سلطان میں خوبیاں بے پناہ ہیں اس لیے ممکن ہے اس کے زوال کو طویل عرصہ لگ جائے۔ یہ اتنی جلدی نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔‘‘

’’میں نے مدت کا اندازہ تو نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتا ہوں۔‘‘

’’پھر تمہاری آنکھوں میں وہ چمک کیوں تھی جس کی طرف سلطان نے اشارہ کیا تھا؟‘‘

’’میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔‘‘

’’کہیں تمہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی اس پیش گوئی کا خیال تو نہیں آگیا تھا جو انہوں نے تمہارے دکن کے تاجدار ہونے کے بارے میں کی تھی۔‘‘

’’سچی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال آیا تھا۔ ملک میں انتشار ہوگا تو مجھے موقع ملے گا۔‘‘

’’میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن تمہارے تاجدار ہونے کی نشانیاں مجھے بھی تمہارے زائچے میں نظر آئی تھیں۔ اگر ایسا ہوگیا تو مجھ سے ایک وعدہ اور کرو۔ خزانچی کے عہدے پر مجھے اور میرے بعد میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا۔‘‘

حسن اپنے نام میں تبدیلی پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس نے اس وعدے پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

’’ایک عہد اور کرو۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کسی اور کے سامنے مت کرنا۔ اور جو قدم اٹھانا میرے مشورے کے بعد اٹھانا۔‘‘

حسن نے وہ رات خوابوں اور خیالوں میں گزار دی۔ اس کے ذہن میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا، یہ مقام تمہیں نہایت جدوجہد اور عرصہ دراز کے بعد ملے گا۔

حسن اس ’’عرصۂ دراز‘‘ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

حسن کے اندازے درست ثابت ہو رہے تھے۔ محمد تغلق کی طبیعت میں اختراع اور نئی نئی باتیں سوچنے کا مادہ بہت تھا۔ انوکھے فیصلے کر لیتا تھا اور پھر یہ بھی چاہتا تھا کہ ان فیصلوں پر من و عن عمل بھی کیا جائے۔ جب وہ لوگ جو ان کو عملی شکل دینے پر مامور ہوتے، ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا کہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں تو ان کی یہ ناکامی ان کے قتل کا پروانہ بن جاتی۔

اس سفاکی میں وہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ کوئی دن اور ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ بہت سے مسلمانوں کا خون نہ بہائے اور محل کے داخلی راستوں کے سامنے خون کی نہر رواں نہ ہو جاتی ہو۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں تنفر پیدا ہوگیا۔ خزانہ خالی ہوگیا اور ہر طرف ابتری اور درہمی پھیل گئی۔ ان نفرتوں نے بغاوتوں کو جنم دینا شروع کیا۔ یہ اس کی عالی ہمتی تھی کہ وہ ان بغاوتوں کو فرو کرتا رہا۔ حالات یہاں تک پہنچے کہ دیوگیر اور گجرات کے علاقوں کے علاوہ اور کوئی علاقہ مضبوط و منضبط نہیں رہا۔ خاص دارالحکومت دہلی کے علاقوں میں بھی بڑے پیمانے پر بغاوت اور سرکشی نے سر اٹھایا۔

ان بغاوتوں میں سب سے خطرناک بغاوت وہ تھی جو اس کے چچازاد بھائی کی طرف سے برپا کی گئی۔ اس بھائی کا نام گرشاسپ تھا۔ وہ گلبرگہ (دکن) کے قریب ایک مقام ساغر کا جاگیردار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ رعایا محمد تغلق سے بے زار ہوگئی ہے۔ سلطنت کا ڈھانچا بالکل بگڑ کر رہ گیا ہے تو اس کے دل میں ہوس ملک گیری کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے قلعہ ساغر کو بہت مضبوط کر لیا اور لشکر کی تنظیم میں وقت صرف کرنے لگا۔ دکن کے دیگر امرا کو ہم خیال بنایا اور ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جب محمد تغلق نے اس کی سرکشی کی خبر سنی تو دہلی کے تمام نامور امرا اور گجرات کے لشکر کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور کئی مرتبہ کی خونریز جھڑپوں کے بعد اس بغاوت پر قابو پا لیا گیا۔

یہ بغاوت فرو ہوگئی لیکن تغلق کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اس کو اچانک یہ خیال آیا کہ غالباً سارا ہندوستان دہلی کی شہنشاہیت سے منحرف اور باغی ہوتا جارہا ہے۔ حدود مملکت چونکہ بہت بڑھ گئی تھیں اور خبریں پہنچنے میں دیر لگتی تھی لہٰذا اس نے سوچا پایۂ تخت کے لیے کسی ایسے مقام کو منتخب کیا جائے جو ان ملکوں کے، جن پر قبضہ و تصرف ہے، نزدیک ہو اور ان ملکوں اور پایۂ تخت میں وہی تعلق رہے جو دائرے کے خطوط کو اپنے مرکز سے، ہر نئے حادثے کی اطلاع بادشاہ کو فوراً ہو جائے۔

اس نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امرائے سلطنت کو طلب کیا کہ ان سے مشورہ کیا جائے۔ ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔

ان امرا میں سے چند نے پایۂ تخت کی تبدیلی کے فیصلے کی مخالفت کی تو وہ ان پر برس پڑا۔ ’’میں نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ کس شہر کو پایۂ تخت کا درجہ دوں۔‘‘

بعض امرا نے اجین کو پایۂ تخت منتخب کرنے کی صلاح دی۔

’’شہر اجین طول و عرض کے لحاظ سے ہندوستان کے بالکل وسط میں واقع ہے اور ہند کے مشہور حکمران کھتری راجا بکرماجیت نے اسی خیال کو مدنظر رکھ کر اجین کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔‘‘

مشورہ معقول تھا۔ دلیل مضبوط تھی لیکن بعض مقرب

امرا بادشاہ کے رجحان سے واقف تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی خوشنودی کے لیے دیوگیر (دیوگڑھ) کو مرکز سلطنت بنانے کا مشورہ دیا۔

بادشاہ پہلے ہی دیوگڑھ کا گرویدہ تھا۔ اسے ان امرا کا مشورہ پسند آیا اور فرمان جاری کر دیا کہ تمام شہری عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان دیوگڑھ منتقل ہو جائیں۔

اس نے دیوگڑھ کا نام دولت آباد رکھا اور اپنے استاد قتلغ خاں کو دولت آباد کا فرماں روا بنا دیا اور یہ حکم عام کر دیا کہ جس کا دل چاہے خواہ منصب دار ہو یا امیر قتلغ خاں کے ہمراہ دولت آباد میں قیام کر سکتا ہے۔

حسن برسوں سے کسی موقعے کی تلاش میں تھا۔ گنگو برہمن سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گنگو برہمن نہایت گھاگ پنڈت تھا۔ وہ حسن کی جلد بازی کو تھامے ہوئے تھا۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے جب دکن کے انتشار کو دیکھتے ہوئے اس نے دکن جانے اور قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا لیکن گنگو برہمن اسے روکے ہوئے تھا مگر یہ موقع ایسا آیا کہ تغلق خود اپنے امرا سے کہہ رہا تھا کہ وہ دکن چلے جائیں۔ گنگو برہمن اب اسے نہیں روک سکا۔ حسن ایک صدی امرا کے ساتھ دیگر دوستوں اور عزیزوں کے ہمراہ دولت آباد روانہ ہو گیا۔ یہاں اسے جاگیر کے طور پر کونجی کا شہر اور ایک باغ دامن دولت سے عطا ہوا۔

اس باغ میں اس نے بہ کثرت گیندے کے پودے لگوائے۔ اس عرصے میں اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کے دل سے جے ماتا کا خیال نہیں نکل سکا تھا۔ یہ گیندے کے پھول جے ماتا کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہی تو تھے۔

حسن حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ ابھی تو مزے میں گزر رہی تھی لیکن حالات بتا رہے تھے کہ تغلق کی سلطنت زوال کے قریب ہے۔ مالوہ اور گجرات وغیرہ بغاوت کے گڑھ بنے ہوئے تھے۔ امیران صدہ خوف زدہ تھے اور اپنے اپنے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے کیونکہ جب کوئی بغاوت جوان ہوتی تھی اس کا نزلہ امیران صدہ پر گرتا تھا۔ یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب تغلق نے یہ سوچا کہ ایک یک صدی امرا کا بڑا گروہ جو بادشاہ کی مرضی کے خلاف شاہی مجرموں کو پناہ دے رہا ہے، دولت آباد سے واپس بلا کر ایک دوسرا گروہ وہاں بھیج دیا جائے۔ اس نے اس پر عمل بھی کیا۔

سلطنت کے بگاڑ کے لیے یہ انتظامات ہی کیا کم تھے کہ اس نے قتلغ خاں کو مع جماعت دیوگیر سے طلب کر لیا۔ دیوگیر کے لوگ قتلغ خاں کے چلے آنے سے پریشان اور بددل ہو گئے کیونکہ قتلغ خان سے خوش تھے اور اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ اس کے بجائے اس کے بھائی نظام الدین کو جو بھروچ میں تھا، دیوگیر بھیج دیا۔

کچھ عرصہ بعد دیوگیر کی وزارت عماد الملک سرتیز کو اس حکم کے ساتھ دی کہ امیران صدہ میں سے جو بھی شاہی حکم کی مخالفت کریں اور سست روی کا مظاہرہ کریں انہیں فی الفور قتل کر دیا جائے۔

قتلغ خاں کے رخصت ہوتے ہی دبی ہوئی چنگاریاں ابھرنے لگیں۔ بغاوت کی باتیں ہونے لگیں، سرکشی کے ارادے جڑ پکڑنے لگے۔ اب یہ باتیں عام ہونے لگی تھیں کہ دیوگیر ہاتھ سے گیا سوائے اس کے کہ بادشاہ خود وہاں جائے اور کچھ عرصہ کے لیے حکومت اپنے ہاتھ میں لے اور اس علاقے کے سرکشوں کو ہلاک کر دے۔

بادشاہ نے اس وقت بھی نزاکت حال کو نہ سمجھا اور عزیز خمار جیسے کوتاہ اندیش کو مالوہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ وہ بعد میں پہنچا پہلے یہ فرمان پہنچ گیا۔

‘‘میں نے سنا ہے کہ جو شخص بھی بغاوت کرتا ہے وہ امیران صدہ کے بل پر کرتا ہے اور امیران صدہ لوٹ مار کے لیے اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

امیران صدہ میں جس کو تو سمجھے کہ شریر اور فتنہ پرور ہے اس کو جس طرح بہتر سمجھے ختم کر دینا۔’’ عزیز خمار نے وہاں پہنچتے ہی امیران صدہ اور لشکر کے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔

‘‘ہر فتنہ جو اطراف میں اٹھتا ہے امیران صدہ کی بدولت اٹھتا ہے لہٰذا انہیں قتل کرنے میں مجھے کوئی تکلف نہیں ہوگا۔’’

اس نے ایک ہی وقت میں اسی ((80) گردنیں اڑا دیں۔

یہ خبر جب دیوگیر اور گجرات پہنچی تو ان علاقوں میں جہاں جہاں بھی امیران صدہ موجود تھے وہ ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی قوتیں یکجا کیں اور بغاوتیں کر دیں۔

حسن گنگو دولت آباد میں متحرک ہو گیا۔ اس نے تمام امیران صدہ کی مجلس بلائی اور انہیں خطرات سے آگاہ کیا۔

‘‘محمد شاہ تغلق کے ظلم سے اب ہم میں سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اس سے پہلے کہ ہم بے گناہ قتل کیے جائیں ہمیں چاہیے کہ اپنے اپنے علاقوں میں بغاوتیں برپا کر دیں۔ جب کوئی امیر کمزور پڑے تو دوسرا اس کی مدد کو پہنچے، جب یہ بغاوتیں ایک ساتھ برپا ہوں گی تو سلطان کے لیے ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔’’

حسن گنگو کی پراثر تقریر نے کام کر دکھایا۔ امیران صدہ اپنے اپنے علاقوں میں پہنچے تو بغاوتوں کا بازار گرم ہو گیا۔ خاص طور پر گجرات میں زبردست شورش اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہی کارندوں نے دہلی کی طرف گھوڑے دوڑا دیے جو شورش کی خبروں سے لدے ہوئے دہلی تک پہنچے اور محل شاہی کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔ قاصدوں نے تمام حالات بے کم و کاست بیان کر دیے۔

‘‘دولت آباد کے امیر صدہ حسن گنگو بہمنی نے پورے دکن میں آگ لگا دی ہے۔ اس کی پراثر تقریریں بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہی ہیں۔ وہ باغیوں کا سرخیل بنا ہوا ہے۔ شاہی خزانہ جو دہلی کی طرف آ رہا تھا اسے لوٹ لیا گیا۔ گجرات کے سوداگر جو کپڑا اور قیمتی اشیا لا رہے تھے، وہ لوٹ لی گئیں۔ اس مال و دولت نے امیران صدہ کو باشوکت اور طاقتور بنا دیا ہے۔ تمام امیران صدہ متحد ہو گئے ہیں اور اب ان کی قوت کو توڑنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔’’

‘‘یہ حسن گنگو وہی شخص ہے جسے ہماری سفارش پر امیر صدہ بنایا گیا تھا اور جو دہلی سے دولت آباد چلا گیا تھا۔’’

‘‘جی سلطان مکرم، یہ وہی نمک حرام ہے اور آپ کا درباری منجم گنگو برہمن اس کا دست راست بنا ہوا ہے۔ حسن گنگو کے پاس بڑا لشکر آ گیا ہے جس کے ذریعے اس نے دولت آباد کا امن تہ و بالا کر دیا ہے۔’’

‘‘اس نمک حرام کی سرکوبی کے لیے ہم خود جائیں گے اور گجرات میں قیام کر کے امیران صدہ کو طلب کریں گے۔ انہیں سمجھائیں گے۔ اگر نہ مانے تو ہماری تلوار ان کا فیصلہ کرے گی۔’’

قتلغ خاں دیوگیر سے آنے کے بعد دہلی میں تھے۔ انہیں جب بادشاہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے پیغام بھجوایا۔

‘‘امیران صدہ سے مقابلے کے لیے جہاں پناہ کا جانا مناسب نہیں۔ امیران صدہ کی حیثیت کیا اور مقام کیا۔ اگر حضور مجھے یہ خدمت سونپ دیں تو میں مجرموں کو پابہ زنجیر آپ کے قدموں میں لے آؤں۔ اگر معاملہ رفع دفع کا ہے تو حسن گنگو جو سب کی سرداری کر رہا ہے مجھ سے کبھی تقرب رکھتا تھا، میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔’’

محمد شاہ تغلق کی فطرت میں حد درجہ ضد تھی۔ وہ جو فیصلہ کر لیتا تھا اس سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے اس مشورے کو اہمیت نہیں دی اور فرمان جاری کیا کہ روانگی کی تیاری جلد کی جائے اور لشکر میں اضافہ کیا جائے۔

گجرات جاتے ہوئے وہ سلطان پور کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا کہ اسے عزیز خمار کے قتل کی خبر ملی۔ امیران صدہ نے اسے ایک جھڑپ کے دوران ہلاک کر دیا تھا۔

یہ خبر سلطان محمد کو فکر مند کرنے کے لیے بہت تھی۔

وہ متواتر کوچ کرتا ہوا آگے بڑھا اور بھروچ کے مقام پر مقیم ہو گیا۔ اس نے اپنے دو نمائندوں کو دولت آباد بھیجا کہ خاموشی سے جا کر یہ معلوم کریں کہ وہاں فتنہ پھیلانے والوں میں کون کون شامل ہے اور ان کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں۔

یہ دونوں ابھی راستے میں تھے کہ حسن کے جاسوسوں کو معلوم ہو گیا کہ سلطان نے دو جاسوسوں کو دولت آباد بھیجا ہے۔

حسن ابھی اس خبر کی چھان پھٹک کر ہی رہا تھا کہ سلطان کے دو امیر احمد لاچین اور قزلباش بیگ دولت آباد پہنچے اور قتلغ خان کے بھائی نظام الدین (جس کے ہاتھ میں دولت آباد کا نظام تھا) کو سلطان کا فرمان دکھایا۔

‘‘دولت آباد کے لشکر سے پندرہ سو سوار معروف امیران صدہ کے ہمراہ تیار کر کے بھروچ بھیج دو۔ میں چاہتا ہوں دکن کے تمام ایک صدی امرا گجرات میں جمع ہو جائیں کیونکہ وہاں ایک بہت بڑی جمعیت کی ضرورت ہے۔’’

نظام الدین نے پندرہ سو کا لشکر جمع کیا۔ قاصدوں کو دوڑا کر گلبرگہ، رائچور وغیرہ سے تمام ایک صدری امرا کو دولت آباد طلب کر لیا تا کہ یہاں سے انہیں گجرات بھیجا جائے۔

حسن گنگو کے محل کے سامنے ایک بڑھیا چراغ لیے کھڑی تھی۔ محل کے اندر چند امرا موجود تھے۔ یہ بڑھیا آنے والوں کو راستہ دکھانے کے لیے کھڑی کی گئی تھی۔

حسن گنگو کی سربراہی میں یہ امرا سلطان کی طرف سے بھیجے گئے فرمان پر غور کر رہے تھے کہ کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کیا جائے۔ سب کی رائے یہی تھی کہ اسی وقت نظام الدین کو گرفتار کر کے دولت آباد پر قبضہ کر لیا جائے لیکن حسن نے اس رائے کی مخالفت کی۔

‘‘اس وقت ہم تھوڑے سے لوگ ہیں۔ گلبرگہ اور رائچور وغیرہ سے امرائے صدہ کو دولت آباد پہنچنے دو۔ انہیں بھی اپنا ہم خیال بنانا ہوگا۔ ان کے ساتھ لشکر بھی ہوگا۔ اس لشکر کو ہم اپنی قوت بنا لیں گے۔ ان امرا کے ذریعے گلبرگہ وغیرہ میں بھی علم بغاوت بلند ہو جائے گا۔’’

اس رائے پر سب نے اتفاق کیا۔ قاصدوں کو گلبرگہ اور رائچور روانہ کر دیا گیا جن کے ذریعے کہلوایا گیا کہ امرائے صدہ دولت آباد پہنچنے میں جتنی دیر ہو سکتی ہے لگائیں اور زیادہ سے زیادہ لشکر لے کر آئیں۔

بلائے گئے امرا نے دولت آباد پہنچنے میں چھ ماہ سے زیادہ مدت لگا دی۔ جب دولت آباد آئے تو چار ہزار مسلح فوج ان کے ہمراہ تھی۔

لاچین اور قزلباش بیگ کی سربراہی میں گجرات کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ابھی وہ پہلی منزل پر ہی پہنچے تھے۔ ابھی دکن کی سرحد نہیں چھوڑی تھی کہ حسن نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں تمام امرا نے شرکت کی۔ حسن تقریر کرنے کھڑا ہوا۔

”محمد تغلق نے ہمیں تخت کے سامنے اس لیے بلایا ہے کہ ہمیں بے گناہ قتل کردے۔ یاد رکھو اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو ہم میں سے ایک بھی واپس نہیں آئے گا۔ بکری کی طرح خود کو قصاب کے حوالے کرنے سے کیا فائدہ۔ اچھا ہے کہ ہم دکن سے باہر نہ جائیں اور نہ مفت میں اپنی زندگی قسائی کے حوالے کریں۔“

حسن کے توجہ دلانے پر سب نے آپس میں مشورہ کیا اور بغاوت کردی۔ لاچین اور قزلباش دونوں امیروں کو جنہیں سلطان نے بھیجا تھا، قتل کردیا۔ اسی منزل سے واپس لوٹے اور دیوگڑھ (دولت آباد) آگئے۔ نظام الدین کارفرما کو گرفتار کرکے قید کردیا اور ان کارکنوں کو جو بطور امانت تخت کی طرف سے بھیجے گئے تھے گرفتار کرلیا اور ان کی گردنیں اڑا دیں۔

دولت آباد کے لوگوں نے اپنی جان کی سلامتی اسی میں دیکھی کہ اطاعت گزار بن جائیں۔

دولت آباد کی بغاوت کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو اس نے لشکر تیار کیا اور بھروچ سے دولت آباد کی طرف چل دیا۔ متواتر کوچ کرتا ہوا دولت آباد پہنچ گیا۔ اس وقت تک حسن کے جھنڈے تلے تیس ہزار کا لشکر جمع ہوچکا تھا۔ اس لشکر میں مغل راجپوت بھی تھے، دکنی سپاہی بھی اور افغان بھی۔ حسن اس لشکر کو لے کر آگے بڑھا۔ نہایت شدید معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ باغیوں کا پلڑا بھاری ہے بلکہ ایک وقت تو وہ آیا جب لگتا تھا سلطان یا تو گرفتار ہوجائے گا یا مارا جائے گا کہ تغلق کی مدد قدرت کی طرف سے ہوگئی۔ حسن کے لشکر کا ایک سردار نورالدین خان جہاں کے تیر لگا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی چھ ہزار خاصے کے سوار میدان جنگ سے فرار ہوگئے۔ باغیوں کے علم بردار پر ایسی وحشت طاری ہوگئی کہ اس کے ہاتھ سے جھنڈا نیچے گر پڑا۔ جب باغیوں کو جھنڈا نظر نہ آیا تو وہ سمجھے شکست ہوگئی۔ اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

عجیب قیامت خیز منظر تھا۔ جیتی ہوئی بازی ہاری جاچکی تھی۔ میدان جنگ کے قریب ہی تغلق نے خیمے گاڑ لیے تھے۔

میدان جنگ سے کافی فاصلے پر لٹے پٹے امرا جمع ہو رہے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اسی اندھیرے میں یہ امرا زمین پر بیٹھ گئے۔ یہی ان کی مجلس مشاورت تھی۔

ان امرا نے طے کیا کہ دولت آباد کے امرا بچی کھچی فوج کو لے کر دولت آباد کے قلعے میں محصور ہوجائیں اور حسن گنگو مسلح افواج کو لے کر گلبرگہ کے قلعے میں نہایت ذمے داری کے ساتھ رہے اور بادشاہ کی فوج جس طرف بڑھے یہ اس فتنے کو دبانے کی کوشش کرے۔ باقی امرا اپنی اپنی جاگیروں پر جاکر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوجائیں اور ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار رہیں۔

ان باتوں میں نصف رات گزر گئی تھی۔ اسی اندھیرے میں ان مشوروں پر عمل کرلیا گیا۔ صبح ہوئی اور اندھیرا چھٹا تو رزم گاہ خالی پڑی تھی۔

اب ایک طرف اس کے ہاتھ سے گیا ہوا دولت آباد تھا جہاں باغی محصور ہوگئے تھے دوسری جانب حسن گنگو تھا جو فرار ہوکر گلبرگہ کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ اگر حسن گنگو پر قابو پالیا جاتا تو پوری تحریک کا خاتمہ ہوسکتا تھا لہٰذا سلطان خود تو دولت آباد کی طرف چل دیا اور ایک جری فوج کو عمادالملک کی ہمراہی میں حسن گنگو کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ کردیا۔

”گلبرگہ پر قبضہ کرو اور فسادیوں میں سے جس کو پاؤ قتل کرو۔ کوئی زندہ نہ بچنے پائے۔“

سلطان تغلق نے آگے بڑھ کر قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کرلیا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت حملہ کرکے اس تھوڑی سی فوج کا قلع قمع کرسکتا تھا لیکن نجومیوں نے خبردار کیا کہ تین دن تک حملہ نہ کیا جائے۔

تین دن تک وہ دولت آباد ہی میں رہا۔ کسی ممکنہ خوف کے پیش نظر دولت آباد کی آبادی بھاگ کھڑی ہوئی، کچھ دہلی پہنچے کچھ راستے ہی میں مرکھپ گئے۔ جو دہلی پہنچے ان کی زبانی یہ خبر پہنچ گئی کہ باغیوں کا عروج ہوا اب سلطان دولت آباد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا ہے اور سخت مشکل میں ہے۔ گلبرگہ پر حسن گنگو کا اقتدار ہے، تمام علاقے میں سخت افراتفری ہے۔

طالع آزماؤں کو ایک مرتبہ پھر موقع مل گیا۔ بادشاہ کے ایک غلام طغی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم سرکشی بلند کیا اور گجرات کو فتح کرنے کے لیے دہلی سے نکل کھڑا ہوا۔

محمد شاہ تغلق حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ سرنگیں کھودی جارہی تھیں۔ قلعۂ دولت آباد کی فصیلیں گرانے کے لیے سامان مہیا کیا جارہا تھا کہ بادشاہ تک یہ خبر پہنچ گئی۔

”طغی نے گجرات کے امیر صدگان اور زمینداروں کو اپنے ساتھ ملالیا ہے اور نہروالا آگیا ہے۔“

یہ سنتے میں سلطان کو گجرات کی فکر ہوئی۔ اس نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کرنے کے لیے تھوڑی سی فوج چھوڑی اور خود گجرات کی طرف چل پڑا۔

تغلق کے برے دن آچکے تھے۔ وہ امرا جو شکست کھانے کے بعد اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے تھے، انہوں نے جب سنا کہ تغلق دولت آباد سے واپس آرہا ہے تو وہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ شاہی لشکر دریائے نربدا کے ساحل پر پہنچا تھا کہ ان امرا کے لشکریوں نے شاہی فوج کے آگے اور پیچھے حملہ کرکے تمام مال و متاع چھین لیا اور چند ہاتھیوں کو روک لیا جو سونے اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے اور انہیں لے کر اپنی جائے قیام پر واپس آگئے۔

حسن گنگو اس امداد غیبی سے باغ باغ ہوگیا۔ اس نے فوراً آس پاس کے امرا کو جمع کیا اور بیس ہزار کا لشکر اکٹھا کرکے احمد آباد بیدر کی طرف چلا۔

عمادالملک جو حسن گنگو کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا، بیدر پہنچ کر رک گیا تھا۔ حسن گنگو پہنچا تو وہ پہلے سے موجود تھا۔ عظیم الشان معرکہ برپا ہونے والا تھا۔ عمادالملک بھی صف آرا ہوگیا تھا۔ دونوں فوجیں خندقیں کھودنے میں مشغول ہوگئیں۔ حسن کے پاس ایک بڑا لشکر تھا لیکن عماد الملک کی دلاوری مشہور تھی۔ شاہی لشکر بھی اس کے پاس تھا اور پھر بیدر کا قلعہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ حسن جنگ میں پہل کرنے میں محتاط تھا۔ بیس دن ہوگئے تھے کوئی فریق بھی پہل کرنے پر تیار نہیں تھا۔

اردگرد کے علاقوں میں خبریں گردش کر رہی تھیں۔ حسن کا دبدبہ اور ہیبت اتنی تھی کہ اس موقع پر ہر شخص اس کی مدد کرنے پر تیار تھا۔

تلنگانہ کا راجا، تغلق سے ناخوش تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حسن، تغلق کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے تو اس نے پندرہ ہزار پیادوں کی کمک حسن کی طرف روانہ کردی۔ اگلے ہی دن پانچ ہزار سوار دولت آباد سے حسن کی مدد کے لیے آگئے۔

اتنی قوت بڑھ جانے کے بعد مشکل تھا کہ حسن خاموش رہتا۔ اس نے طبل جنگ بجا دیا۔ صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی۔ فریقین کے بہادر جنگ میں کام آتے رہے۔

عمادالملک کی بہادری میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن حسن کی قسمت میں تاجوری لکھی جاچکی تھی کہ عماد الملک اس معرکے میں مارا گیا۔ اس کے قتل کا شور برپا ہوتے ہی اس کی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

احمد آباد اور بیدر کے قلعوں پر قابض ہونے کے بعد حسن گنگو نے اپنے ایک معتمد کو تھوڑے سے لشکر کے ساتھ وہیں چھوڑا اور خود دولت آباد پہنچ گیا۔

روزہ دار اور ڈاکو

حضرت سیدنا ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں۔“

میں قافلے کے ہمراہ ملک شام جارہا تھا راستے میں ڈاکوؤں کی جماعت نے ہمیں لوٹ لیا اور سارا مال و اسباب اپنے سردار کے سامنے ڈھیر کردیا۔ سامان میں سے شکر اور بادام کی تھیلی نکلی۔ سارے ڈاکوؤں نے نکال کر کھانا شروع کردیا مگر ان کے سردار نے ان میں سے کچھ نہ کھایا۔ میں نے پوچھا۔

”سب کھا رہے ہیں مگر آپ جوان کے سردار ہیں کیوں کچھ نہ کھایا؟“ اس نے کہا۔ ”میں روزے سے ہوں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تم لوٹ مار بھی کرتے ہو اور روزہ بھی رکھتے ہو؟“ سردار بولا۔ ”اللہ سے صلح کے لیے بھی تو کوئی راہ باقی رکھنی چاہیے۔“ حضرت ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں۔ ”کچھ عرصہ بعد میں نے اسی ڈاکو کو احرام کی حالت میں طواف خانہ کعبہ میں مشغول دیکھا۔ اس کے چہرے پر عبادت کا نور تھا اور مجاہدات نے اسے کمزور کردیا تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تم وہی شخص نہیں ہو؟“ وہ بولا۔ ”جی میں وہی ہوں اور سنیے۔ اسی روزے نے اللہ کے ساتھ میری صلح کرادی ہے۔“

روض الریاحین، ساجدہ راجہ کی معلومات
ہنڈواں ضلع سرگودھا

محمد تغلق کے وہ امرا جو محاصرہ کیے ہوئے تھے، عماد الملک کے قتل کی خبر سن کر بہت ہراساں تھے اور جب انہوں نے یہ سنا کہ حسن گنگو منزلیں مارتا ہوا دولت آباد کی طرف چلا آرہا ہے تو تاب مقابلہ نہ رہی۔ محاصرہ اٹھا کر کچھ دہلی چلے گئے کچھ گجرات کی طرف بھاگ گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی پیش گوئی پوری ہونے کے دن قریب آ گئے تھے۔ حسن کو مقبولیت بھی حاصل تھی اور اس کا رعب و دبدبہ بھی قائم ہو چکا تھا لہٰذا مکمل فتح کے بعد جب امرا کے درمیان یہ بحث چھڑی کہ حکمران کسے بنایا جائے تو ہر طرف سے حسن کے نام کا شور برپا ہونے لگا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ چتر شاہی حسن کے سر پر رکھا جائے۔

تخت نشینی کب ہو؟ مسلمان منجموں اور ہندو پنڈتوں میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ تخت نشینی میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ ہندو پنڈتوں کا سرخیل گنگو برہمن تھا اور ظاہر ہے حسن اس کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے ہندو پنڈتوں کی رائے مان لی اور ان کی بتائی ہوئی تاریخ پر حسن کے سر پر دکن کی سلطنت کا تاج رکھ دیا گیا۔ اس نے اپنا لقب علاؤ الدین قرار دیا اور علاؤ الدین حسن گنگو (بعض نے گانگو لکھا ہے) بہمنی کے نام سے مشہور ہوا۔

جب حسن بہمنی نے ہندوؤں کی بتائی ہوئی ساعت پر تخت نشینی کی رسم ادا کر لی تو مسلمان منجموں نے افسوس کا اظہار کیا اور اسے حسن کے حق میں نیک فال نہ سمجھا۔ میر محمد بخشی جو منجم اور ماہر ریاضی تھے، اس کے پاس تشریف لائے اور افسوس کا اظہار کیا۔

’’اگر آپ نے ہماری رائے پر عمل کیا ہوتا اور ہماری تجویز کردہ گھڑی پر تخت جلوس فرماتے تو بہت اچھا ہوتا۔‘‘

’’آخر اس اظہار افسوس کا سبب کیا ہے؟‘‘

’’حضور، سیاروں کی شکل اور وضع سے یہ معلوم ہوا تھا کہ جس وقت بادشاہ نے تخت پر قدم رنجہ فرمایا اس وقت کی تاثیر یہ ہے کہ اس خاندان میں بادشاہوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہ ہو گی اور حکومت کا زمانہ بھی دو سو سال سے کم ہی رہے گا۔ اس کے برخلاف جو وقت ہم نے تجویز کیا تھا اس حساب سے سات سو سال تک اس خاندان کی حکومت دکن میں رہتی اور آپ کے خاندان کے تقریباً ایک سو پچاس حکمران اس تخت پر بیٹھتے۔‘‘

حسن بہمنی کو مدت حکومت کم ہو جانے کا افسوس ضرور ہوا لیکن دل سے یہ خطرہ جاتا رہا کہ حکومت کو فوری کوئی خطرہ ہے۔ اس علم نجوم کی فضیلت بعد میں اس وقت ظاہر ہو گئی جب ایک سو ستر برس بعد آل بہمنی کی حکومت ختم ہوئی اور حکمران بیس تک نہ پہنچ سکے۔ اگر وہ مسلمان منجموں کی تجویز مان لیتا تو ممکن ہے حکومت کا دورانیہ سات سو سال رہتا۔

⁂

محمد شاہ تغلق، طغی کی بغاوت کا حال سن کر دولت آبا سے چلا گیا تھا۔ جب وہ بھروچ پہنچا تو طغی کنبایت چلا گیا۔ سلطان نے ملک یوسف بغرا کو ایک عظیم لشکر کے ہمراہ کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھروچ میں رکا رہا۔

ملک یوسف بغرا جب کنبایت پہنچا تو طغی مقابلے پر آ گیا۔ یوسف بغرا نے اس سے جنگ کی لیکن وہ اس جنگ میں مارا گیا اور اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کی فوج کے وہ آدمی جو گرفتار ہونے سے رہ گئے تھے، بھاگے اور سلطان کے پاس بھروچ پہنچ گئے۔ سلطان انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی۔ دریائے نربدا عبور کیا اور کنبایت کی طرف روانہ ہوا۔

طغی تک سلطان کی آمد کی خبر پہنچی تو اس نے فرار ہونے ہی میں عافیت جانی اور ’’اساول‘‘ پہنچ کر دم لیا۔ سلطان بھی پیچھا چھوڑنے والا کب تھا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا۔ طغی اساول سے ’’نہر والا‘‘ بھاگ گیا۔ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ایسی مہم نہیں تھی کہ سلطان بارش کا موسم ختم ہونے کا انتظار کرتا۔ وہ عین بارش میں روانہ ہو گیا، راستے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ نہر والا کے بجائے کسی اور طرف نکل گیا ہے۔ سلطان نے نہر والا جانے کا ارادہ ترک کیا اور اساول کی طرف واپس ہونے لگا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ طغی کے لشکر سے اس کا سامنا ہو گیا۔ سلطان کا لشکر اتنا قریب تھا کہ طغی کے پاس بھاگنے کا راستہ بھی نہیں بچا تھا۔ مجبور ہو کر طغی کے فوجی سلطان کی فوج پر ٹوٹ پڑے لیکن ہاتھیوں کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایسا گھنا جنگل تھا کہ آدمی داخل ہو تو غائب ہو جائے۔ طغی کا لشکر اس جنگل میں غائب ہوا اور نہر والا پہنچ گیا۔

تین روز بعد سلطان نہر والا آیا مگر اس عرصے میں طغی ٹھٹھہ کی طرف بھاگ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب گجرات پوری طرح سلطان کے قبضے میں تھا۔

گجرات کے مقدم اور رایاں ہر طرف سے آنے لگے۔ انہوں نے نذریں پیش کیں اور خلعت و انعام سے سرفراز ہوئے۔

⁂

سلطان تغلق گجرات کے نظم و ضبط میں مشغول تھا کہ خبر پہنچی کہ حسن گنگو اور دوسرے باغی جو اس سے پہلے شکست کھا کر منتشر ہو گئے تھے اب پھر ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ انہوں نے عماد الملک کو قتل کر دیا ہے۔ حسن گنگو نے چتر رکھ یا ہے اور تخت نشیں ہو گیا ہے اور اپنا خطاب سلطان علاؤ الدین مقرر کیا ہے۔

سلطان نے دولت آباد کو بڑے ارمانوں سے آباد کیا تھا۔ اس کی خاطر دہلی کو ویران کیا تھا اور اب وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

’’حسن گنگو کبھی میرے دروازے پر نوکری کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ اب وہ تاجدار بنا بیٹھا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ سلطانی صرف سلطانوں کو زیب دیتی ہے غلاموں کو نہیں۔ میں اسے تخت پر نہیں رہنے دوں گا۔‘‘

اس کا مورخ ضیاالدین برنی اس وقت اس کے قریب بیٹھا تھا۔ سلطان بے اختیار اس سے مخاطب ہوا۔

’’میری مملکت میں متضاد امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک کا علاج کرتا ہوں تو دوسرا غالب آ جاتا ہے۔ تو بتا تیری رائے میں اس کا کیا علاج ہونا چاہیے؟‘‘

ضیاالدین برنی جو بہت دن سے ایک ہی بات سوچ رہا تھا، اس وقت موقع آیا کہ اسے بیان کر دے۔

’’میں نے تاریخ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ اگر بادشاہوں سے رعایا کو نفرت پیدا ہو جاتی تھی اور فتنے اٹھنے لگتے تھے تو وہ اپنے لڑکے یا بھائی کو، جس کو سلطنت کے قابل سمجھتا تھا، تخت پر بٹھا دیتا تھا اور خود گوشہ نشیں ہو جاتا تھا۔‘‘

’’میرا کوئی لڑکا نہیں ہے جو میرا قائم مقام ہو سکے۔ کوئی اور تجویز بتا۔‘‘

’’بعض تاریخوں میں ان اعمال کو ترک کر دینا تجویز کیا ہے کہ جن سے رعایا متنفر ہو۔‘‘

’’اگر تیرا اشارہ اس طرف ہے کہ میں لوگوں کا خون بہاتا ہوں تو میں اسے ہرگز ترک نہیں کروں گا اور اب تو حسن گنگو نے میرے غضب کو آواز دی ہے۔ میں دولت آباد کی شاہراہوں کو خون سے بھر دوں گا۔‘‘

ضیاالدین برنی نے جب دیکھا کہ سلطان کے غصے نے اس کی تجویزوں کو مسترد کر دیا ہے تو سامنے سے ہٹ جانے ہی میں عافیت جانی۔

سلطان تغلق جس مسند پر بیٹھا ہوا تھا اس سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر قاصدوں کو طلب کیا۔ دہلی میں موجود مختلف امیروں ملک فیروز، احمد ایاز، ملک غزنیں، صدر جہاں وغیرہ کے نام الگ الگ فرمان ان کے حوالے کیے کہ اپنے اپنے لشکروں کے ہمراہ فوراً پہنچیں تاکہ حسن بہمنی کی تادیب کے لیے کارروائی کی جائے۔

متواتر خبریں پہنچ رہی تھیں کہ حسن بہمنی کے پاس بے شمار فوج جمع ہو گئی ہے لہٰذا جب تک یہ لشکر پہنچتے سلطان نے ارادہ بدل دیا اور ان لوگوں کو بھیجنا موقوف کر دیا۔

’’گجرات کی مہم اور طغی کو کسی نتیجے پر پہنچانے کے بعد میں خود حسن بہمنی سے نمٹنے کے لیے دولت آباد جاؤں گا۔‘‘

سلطان محمد نے دیوگیر کی مہم سے ہاتھ کھینچ لیا اور گجرات کے معاملات درست کرنے میں مصروف رہا۔

اس نے تین برساتیں گجرات میں گزاریں اور پھر وہ طغی کا پیچھا کرتے ہوئے ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا، وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

⁂

حسن بہمنی نے تخت دکن پر قدم رکھا تو دو یادیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک ماں کی یاد تھی جسے وہ گیندے کے پھولوں میں تلاش کرتا رہتا تھا۔ دوسرا حضرت نظام الدین اولیاؒ کا خیال جن کا اب وصال ہو چکا تھا۔ حسن نے سلطنت سنبھالتے ہی دو حکم ایک ساتھ جاری کیے۔ پہلا حکم یہ کہ تمام خاص و عام اپنے گھروں میں گیندے کے پودے لگائیں اور دوسرا حکم یہ کہ پانچ من سونا اور دس من چاندی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لیے غریبوں، یتیموں اور مسکینوں میں تقسیم کیے جائیں۔

ان احکامات کے بعد اس نے حسنِ انتظام پر توجہ دی۔ جن لوگوں نے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تھا ان کو بڑے بڑے مناصب عطا کیے۔ گلبرگہ سے اسے بڑی محبت تھی۔ اس نے گلبرگہ کو پایہ تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔

جب وہ ان انتظامات میں مشغول تھا تو اسے گنگو برہمن سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ گنگو نے اس سے عہد لیا تھا کہ جب وہ دکن کا تاجدار بن جائے تو خزانہ شاہی کا انصرام اس کے اور اس کی اولاد کے سوا کسی کے ہاتھ نہ دے۔ حسن نے یہ وعدہ پورا کیا اور گنگو برہمن کو دکن کے خزانۂ شاہی کا مختار بنا دیا۔ یہ فرمان بھی جاری کیا کہ اس کے بعد یہ عہدہ اس کے خاندان کے افراد میں منتقل ہوتا رہے۔

تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ہو گزرے ہیں کہ بہت چھوٹے سے مقام سے اٹھ کر کوئی بڑے مرتبے پر پہنچا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی نے اپنے زور بازو سے

کوئی ملک فتح کیا ہو اور وہاں کا بادشاہ بنا ہو جبکہ کوئی دنیاوی اسباب اس کے پاس نہیں تھے۔ حسن ایک عام آدمی کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا اور دکن فتح کر لیا۔

ایک زمانہ وہ تھا جب وہ جے ماتا سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی غربت آڑے آ رہی تھی۔ اس نے اس سے کہا بھی تھا کہ جب وہ کسی عہدے پر پہنچ جائے گا تو اس سے شادی ضرور کرے گا لیکن جب دہلی میں اسے ایک صدی امرا میں شامل کیا گیا تو جے ماتا کا انتقال ہو گیا۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی برسوں گزر گئے تھے۔ اب وہ ہوتی بھی تو کیا۔ اب تو حسن کی نہیں حسن کے بیٹے کی شادی کے دن تھے۔ اب اس کی وہ شان و شوکت تھی کہ جس سے کہتا وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے کو دیتا بلکہ کتنے ہی ایسے تھے جو اس سے رشتۂ قرابت قائم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے دبدبے کے آگے خاموش تھے۔ انہی میں ملک سیف الدین، وکیل سلطنت بھی تھا۔

ملک سیف الدین نہایت ایماندار اور نیک اطوار تھا۔ اس نے حصول سلطنت میں حسن کا بہت ساتھ دیا تھا اور اب متمنی تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی حسن کے بیٹے سے ہو جائے لیکن اب مراتب میں فاصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ یہ بات اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ عجیب بات یہ کہ خود حسن بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میر محمد بدخشی اس کے پاس آئے بیٹھے تھے۔ وہ نہایت اعلیٰ پائے کے امیر اور منجم تھے۔ حسن نے نہایت ترکیب سے یہ ذکر ان کے سامنے چھیڑ دیا۔

’’میر صاحب، ذرا حساب لگا کر یہ تو بتائیے کہ اگر ملک سیف الدین کی بیٹی سے میرے بیٹے کی شادی ہو جائے تو کیسی رہے گی؟‘‘

’’یہ تو میں حساب لگائے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر رشتہ نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’آنکھوں دیکھی بہت سی باتیں غلط بھی ہو جاتی ہیں۔ آپ حساب لگا کر بتائیے۔‘‘

میر محمد بدخشی نے اسی وقت زائچہ تیار کیا اور حسن کے سامنے رکھ دیا۔

’’یہ رشتہ بہت مبارک ثابت ہوگا لیکن اس کے نتیجے میں ایک حاسد آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا لیکن یہ بھی قوی امکان ہے کہ آپ محفوظ رہیں گے۔‘‘

’’میری پوری زندگی حاسدوں کے درمیان گزری ہے۔ مجھے ان کی پروا نہیں۔‘‘

’’آپ نے کیا یہ رشتہ طے کر دیا ہے؟‘‘

’’یہ کام بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ ملک سیف الدین بیٹی کا باپ ہے۔ اسے یہ پورا حق ہے کہ انکار کر دے۔ ممکن ہے وہ ہمارا لحاظ کر کے انکار نہ کر سکے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ بات کریں۔‘‘

’’میری خوش بختی ہے کہ یہ اختیار آپ مجھے دے رہے ہیں۔‘‘

میر محمد بخشی نے اسی وقت ملک سیف الدین سے ملاقات کی۔

’’سیف الدین، میں ایک بات کئی روز سے سوچ رہا ہوں۔ سلطان آپ پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔ اگر یہ تعلق رشتہ داری میں تبدیل ہو جائے تو کیا زیادہ اچھا نہ ہوگا۔‘‘

’’مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن حضور سلطان کو ضرور اعتراض ہوگا۔ جب تک وہ ہمارے سردار تھے، سلطان نہیں بنے تھے اس وقت میرے اور ان کے تعلقات برابری کے تھے لیکن اب معاملہ دوسرا ہے۔ وہ بادشاہ ہیں اور میں ان کا ملازم۔ اگر خفا ہوئے تو میں دربدر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’آپ خاطر جمع رکھیں۔ اگر خفا ہوں گے تو مجھ پر ہوں گے آپ کا نام درمیان میں نہیں آئے گا۔ مجھے تو آپ کی رضامندی درکار تھی۔ اگر آپ کو اعتراض نہیں تو بات پکی سمجھوں۔‘‘

میر محمد بخشی نے حسن بہمنی کو خوش خبری سنا دی کہ ملک یوسف اس شادی پر تیار ہے۔

دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ حسن کی بیوی ملکۂ جہاں نے ایک روز حسن سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا۔

’’اگر اس خوشی کے موقع پر میری بہن بھی ہوتی تو میری خوشی دوبالا ہو جاتی۔ آپ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہماری پہلی خوشی ہے اور میری بہن نہیں ہے۔‘‘

’’آپ کی کوئی بہن بھی ہے۔ آج تک آپ نے بتایا ہی نہیں۔‘‘

’’وہ میری سوتیلی بہن ہے۔ میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ وہ دوسری ماں سے ہے۔ بے چاری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے، کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔‘‘

’’وہ ہے کہاں۔ میں اسے کہاں سے بلاؤں؟‘‘

’’وہ آج کل ملتان میں مقیم ہیں۔‘‘

سلطان نے نہ انکار کیا نہ اقرار کہ وہ اسے بلائے گا یا نہیں۔ بس خاموشی سے باہر چلا آیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ملکۂ جہاں کی آتش شوق کو مزید بھڑکائے گا۔ آخر وقت تک اسے نہیں بتائے گا کہ اس کی بہن ملتان سے آ گئی ہے۔

اس نے محل سے باہر آتے ہی ملتان کی جانب آدمی روانہ کر دیے کہ وہ شہزادے کی خالہ کو لے کر آئیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت سے پہلے ملکہ جہاں کو خبر ہو۔ اس نے تمام کارروائی نہایت خاموشی سے کی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کون ملتان گیا ہے اور کیوں گیا ہے۔

ملکۂ جہاں کی آرزو ہی یہ تھی کہ اس کی بہن شادی میں شریک ہو لہٰذا اس کے آنے سے پہلے شادی کیسے ہو سکتی تھی جبکہ تقریبات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ملکۂ جہاں کی بہن کا کہیں دور دور تک پتا نہ تھا۔ حسن نے انتظام کرنے والوں کو حکم دیا کہ جشن کو طول دیتے رہیں اور اس میں جتنا بھی روپیہ خرچ ہو اس کی مطلق پروا نہ کی جائے۔ جشن ہوتا رہا۔ شادیانے بجتے رہے۔ ایک انوکھا اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ جگہ جگہ منجنیقیں لگا دی گئی تھیں اور ان پر رکھ کر مٹھائی کی گولیاں شہر کے لوگوں پر برسائی جاتی تھیں۔ امرا، ملازمین اور منصب داروں میں ہر روز نئے تحائف تقسیم کیے جاتے تھے۔ دن کا آغاز منجنیقوں کے ذریعے گیندے کے پھول برسا کر کیا جاتا تھا۔ جب تک جشن جاری رہا یہی معمول رہا۔

چھ مہینے بعد جو لوگ ملتان گئے تھے ایک ڈولی کے ساتھ محل میں داخل ہوئے۔ حسن ڈولی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ جشنِ مسرت کے موقع پر سب لوگوں کو بیش قیمت تحفے دیے جا رہے تھے، ملکۂ جہاں کے لیے یہ تحفہ تھا۔ اس نے ملکۂ جہاں کی خدمت میں کہلوایا کہ ملک سیف الدین کی ہمشیرہ ملاقات کے لیے آ رہی ہیں۔ انہیں نہایت عزت کے ساتھ ڈولی سے اتارا جائے اور خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ملکۂ جہاں نے جیسے ہی ڈولی کا پردہ اٹھایا اور بہن کی صورت دیکھی تو حیران رہ گئی۔ سلطان کی مہربانی کی قائل ہوتے ہی اس نے سلطان کو بلا بھیجا۔ سلطان کو بھی یہ دیکھنے کی جلدی ہو رہی تھی کہ بہن کو دیکھ کر ملکۂ جہاں پر کیا گزرتی ہے۔ اس نے تمام کام موقوف کیے اور حرم میں چلا آیا۔ اس نے ملکہ کے برابر جس عورت کو بیٹھے دیکھا وہ کوئی اور نہیں جے ماتا تھی۔ ملکۂ جہاں تو صرف حیران ہوئی تھی، وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ جے ماتا اگر ہوتی بھی تو بوڑھی ہو چکی ہوتی، پھر یہ کون ہے۔ وہی ناک وہی نقشہ۔ باتیں کرنے کا وہی انداز۔ کیا جے ماتا نے اس کی خاطر دوسرا جنم لے لیا ہے؟ اس نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں اس نے ملکۂ جہاں سے کچھ جاننے کی کوشش کی۔

’’تمہاری بہن تو تم سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ذرا بھی تو نہیں ملتی۔‘‘

’’میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ میری سوتیلی بہن ہے۔‘‘

’’پھر بھی باپ کے رشتے سے کچھ تو تم سے ملتی جلتی ہوتی۔‘‘

’’بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں بالکل ایسی ہی تھی۔‘‘

’’بہت خوب صورت ہوں گی اس کی والدہ۔‘‘

’’بہت خوب صورت تھیں۔ ایک اور بات بتا دوں۔ وہ مذہب کے اعتبار سے ہندو تھیں۔ میرے والد نے چپکے سے انہیں مسلمان کیا تھا، اس کے بعد شادی کی تھی۔‘‘

’’رہنے والی کہاں کی تھیں؟‘‘

’’دہلی کی۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ والد صاحب نے ان کے والدین کا گھر دولت سے بھر دیا تھا۔ تب وہ شادی کے لیے تیار ہوئے تھے۔‘‘

’’ان کا انتقال کیسے ہوا تھا؟‘‘

’’شاید وہ اپنی شادی سے خوش نہیں تھیں۔ دو سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔ جانے کیا روگ لگا تھا کہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔‘‘

’’اب تو مجھے بھی اس کہانی سے دلچسپی ہونے لگی۔‘‘ حسن نے کہا۔ ’’نام کیا تھا ان کا؟‘‘

’’بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا، جے ماتا تھا ان کا نام۔‘‘

اس کے بعد کچھ اور پوچھنے کی سکت نہیں تھی۔ حسن اپنے آنسو چھپانے کے لیے وہاں سے اٹھ گیا۔ دیوان خانے میں پہنچ کر ملازموں کو حکم دیا کہ جب تک وہ نہ کہے کوئی اس کے پاس آنے کی جرأت نہ کرے۔ اس نے گیندے کے پھولوں سے بھرے ہوئے طشت کو گود میں رکھا اور جے ماتا کے خیالوں میں کھو گیا۔ برسوں گزر گئے تھے لیکن کل کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ جے ماتا کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ پھر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گیندے کے پھول اس کے قدموں میں بکھر گئے۔ اس کا مطلب ہے میرے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ جے ماتا مری نہیں تھی، اسے کسی بہانے سے یا زبردستی ملتان بھیج دیا گیا تھا اور مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہ خبر پھیلا دی گئی کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے لیکن ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟

جب مسلمان سے ہی شادی کرنی تھی تو مجھ میں کیا برائی تھی۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ میں اتنی دولت انہیں نہیں دے سکوں گا جو انہیں دوسری جگہ سے مل رہی تھی۔ بہر حال اب کیا ہوسکتا تھا۔ جے ماتا مجھے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی شکل میں میرے پاس آگئی ہے، میں اسے جتنی خوشیاں پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں گا۔ اس نے جشن کی مدت میں اضافہ کردیا تاکہ وہ بھی اس سے اچھی طرح لطف اندوز ہوسکے۔ عیش وعشرت کی محفلیں دوبارہ منعقد ہوئیں۔ مزید چھ مہینے اور گزر گئے۔

جشن کی مدت ختم ہوئی تو خطبۂ نکاح پڑھا گیا۔ پھر دلہن رخصت ہوکر شہزادے کے گھر آئی۔

جشنِ شادی بہ خیر وخوبی اختتام کو پہنچا۔ اب پیش گوئی کا دوسرا حصہ سامنے آنے والا تھا۔ میر محمد بدخشی نے بتایا تھا کہ اس شادی کے نتیجے میں کوئی حاسد اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

ملک سیف الدین اب تک محض رکنِ سلطنت تھا لیکن اب شاہی خاندان سے قرابت داری ہوگئی تھی لہٰذا جب جشن نوروز کے موقع پر دربار منعقد ہوا اور تمام عالم، فاضل، مفتی اور ارکان دولت شاہی دربار میں جمع ہوئے تو ملک سیف الدین کو سب سے بلند جگہ پر بٹھایا گیا کیونکہ اب وہ صرف وکیل سلطنت نہیں حسن بہمنی کا سمدھی بھی تھا۔ اب تک یہ مرتبہ امیر الامرا اسمٰعیل فتح خان کو حاصل تھا۔ اسے ملک سیف الدین کی یہ پذیرائی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اس وقت بھرے دربار میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن ایک دن وہ تنہائی میں حسن بہمنی سے ملا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر تخت کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

”کیا میں اب اتنا گیا گزرا ہوگیا کہ ملک سیف الدین مجھ سے بھی بلند جگہ پر بیٹھے۔“

”وہ کسی بھی جگہ بیٹھے لیکن یہ بتائیے آپ کے مرتبے میں کوئی فرق آیا یا میں نے آپ کے عہدے میں کوئی کمی کی؟“

”درباروں میں مراتب کا فرق نشستوں کی ترتیب ہی سے ہوتا ہے۔ آپ دربار کے مالک ہیں جس کو جو جگہ عطا فرمائیں لیکن میری جو بے عزتی ہوتی ہے وہ میں جانتا ہوں۔“

اب حسن کو اس پر رحم آگیا۔ اسے اپنے اور قریب کرلیا۔

”دیکھو اسمٰعیل فتح خاں، میں نے تمہیں سپہ سالار اور امیر الامرا بنایا ہے۔ ملک سیف الدین نائب السلطنت اور وکیل سلطنت ہے۔ دونوں مراتب میں جو فرق ہے اسے تم خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ جو قدر و منزلت تمہاری ہوسکتی ہے ملک سیف الدین کی نہیں ہوسکتی۔ یہ البتہ ہے کہ اب وہ میرا سمدھی ہے۔ تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے۔“

بادشاہ کے ان تسلی آمیز کلمات نے اسمٰعیل خان کو بہ ظاہر مطمئن کردیا۔ دربار میں خوش وخرمی سے آتا بھی رہا لیکن اس کے دل میں اندر ہی اندر بادشاہ کے خلاف مخالفت اور نفرت کی آگ بھڑکتی رہی۔ اس آگ نے ایسی شدت اختیار کی کہ اس نے سازشوں کے محل کی بنیاد ڈالنی شروع کردی۔ پہلے اپنے بیٹوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ پھر بعض امرا کو سبز باغ دکھائے۔ یہ طے ہوا کہ سلطان جب شکار یا سواری کے لیے نکلے تو اسے قتل کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ وہ امیر الامرا تھا اور سپہ سالار بھی۔ بہت سے امیر اس کے ساتھ ہوگئے۔ سلطان کی قسمت ابھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے اس سازش کا حال معلوم ہوگیا۔ اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسمٰعیل کی چوری پکڑی گئی ہے۔ معمول کا اجلاس طلب کیا۔ شہر کے تمام خاندان، امرا، علما و مشائخ اس میں شریک تھے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ سلطان کو کہیں حملے کے لیے جانا ہے اور اس نے مشورے کے لیے سب کو بلایا ہے۔ اسمٰعیل فتح خاں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ جب سب لوگ جمع ہوگئے تو اس نے مجمع کو مخاطب کیا۔

”میں نے اپنے دوستوں اور وفاداروں کو نوازنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خطابات اور جاگیروں سے نوازتا رہا ہوں۔ کسی کا حق نہیں مارا۔ ہر ایک کو حسب حال عہدے اور مراتب عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ میری مملکت میں ہر طرف خوشحالی اور امن ہے لیکن بعض لوگوں کو یہ خوش حالی اور میرا عروج ایک آنکھ نہیں بھا رہا ہے۔ وہ میرے خلاف سازشیں کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ رک گیا۔ سناٹے کی چڑیا ہر سر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس سازش کی بات کررہا ہے۔ سلطان نے اچانک اسمٰعیل خان کو مخاطب کیا۔

”میں نے جب اس سازش کا کھوج لگایا تو اسمٰعیل خاں اس کے ہر صفحے پر تمہارا نام لکھا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تم میری جان کے درپے ہو اور مجھے قتل کرنے کی سازش کررہے ہو۔ کیا تم اس سے انکار کروگے؟“

اسمٰعیل خاں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا لیکن آدمی ہوشیار تھا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔

”سلطان ذی احتشام! میں آپ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا جبکہ آپ سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں۔ مجھے ایسا مہربان بادشاہ ملا ہے کہ میرا استقبال کھڑے ہوکر کرتا ہے۔ پہلے مجھے بیٹھنے کو کہتا ہے پھر اپنے تخت پر بیٹھتا ہے۔ پھر میں اس کے قتل کا ارادہ کیوں کروں گا۔“

”کیا تم اس بات سے ناخوش نہیں ہوئے تھے کہ میں نے ملک سیف الدین کو تم سے بلند جگہ پر بٹھایا۔“

”بے شک! مجھے شکایت ہوئی تھی لیکن آپ کی وضاحت کے بعد میرا دل صاف ہوگیا تھا۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میرے دل میں شکایت کا ایک حرف بھی باقی نہیں رہا تھا اور نہ ہے۔ سیف الدین میرے بھائیوں سے بڑھ کر ہیں اور آپ سے تو میں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ میری اولاد آپ پر قربان ہو، میں کسی سازش کا حصہ نہیں۔“

”سوچ لو اسمٰعیل خاں، اگر اب بھی اپنا جرم قبول کرلو تو میں تمہیں معاف کرسکتا ہوں۔“

”آپ حکم فرمائیں۔ میں اپنی گردن اپنی تلوار سے کاٹ کر قدموں میں رکھ دوں لیکن خدارا مجھے کسی سازش میں شامل نہ سمجھیں۔ میرا دامن غداری کے ہر دھبے سے پاک ہے۔“

”تم اتنا کہتے ہو تو یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں لیکن دوسرے لوگوں سے بھی تو سنوں۔ وہ تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“

”حضور، میں آپ کا وفادار ہوں اس لیے بہت سے لوگ میرے دشمن ہوگئے ہیں۔ وہ تو جھوٹ سچ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں تاکہ آپ کو بدگمان کیا جائے۔“

”یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ کون سچ بول رہا ہے، کون جھوٹا ہے۔“

سلطان نے اہل مجلس کو مخاطب کیا۔

”مجھے معلوم ہے آپ میں سے بہت سے لوگ اسمٰعیل فتح خاں کی باتوں میں آکر مجھ سے منحرف ہوگئے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اپنے بد ارادے سے باز رہ کر میرے ساتھ وفادار رہنا چاہتے ہیں تو نہایت ایمانداری سے اسمٰعیل فتح کی سازش کا انکشاف میرے سامنے کردیں۔ صاف گو اشخاص سے کسی طرح کی باز پرس نہ کی جائے گی اور نہ کوئی سزا دی جائے گی۔“

یہ سنتے ہی اسمٰعیل کے وہ تمام ساتھی جو خفیہ طور پر اس کے ساتھ ہوگئے تھے، اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسمٰعیل کے خلاف گواہی دینے لگے۔ اب تک اس سازش میں جو جو باتیں طے ہوئی تھیں سب ایک ایک کرکے بتادیں۔

”اسمٰعیل خاں، اب کیا کہتے ہو؟“

”حضور، میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ سب میرے خلاف ہوگئے ہیں۔ آپ کی خوشنودی کے لیے مجھے قصوروار قرار دے رہے ہیں۔“

”ان لوگوں میں تیرے بیٹے بھی شامل ہیں۔ کیا وہ بھی تجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے؟“

”یہ کسی کی باتوں میں آگئے ہوں گے۔“

”صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو نے سازش تیار کی تھی اور اس کے لیے ان سے بیعت لی تھی۔“

”یہ سب جھوٹے ہیں۔“

”میں نے شرعی حجت پوری کرلی ہے۔“

علما و مشائخ موجود تھے۔ گواہوں کے بیانات سننے کے بعد اسمٰعیل فتح خاں کے قتل کا فتویٰ جاری کردیا۔ حسن نے اتنا انتظار بھی نہیں کیا کہ اسمٰعیل خاں کو مقتل میں لے جایا جاتا۔ سرِ محفل اسے قتل کرادیا۔

اس کے ساتھ جو دوسرے لوگ شریک تھے ان کا قصور معاف کیا اور کسی سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی گئی۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے اسمٰعیل فتح کا عہدہ اس کے بیٹے کو دے دیا گیا اور تمام امرا کو شاہی مراعات عطا کی گئیں۔

اسمٰعیل کے قتل اور پھر اس کے بیٹے کو وہی عہدہ دینے اور گناہ گاروں کو معاف کردینے سے حسن گنگو کی بہت شہرت ہوئی اور عوام کے دلوں پر اس نے پوری طرح غلبہ پالیا۔

اردگرد کے راجاؤں پر بھی حسن کی فیاضی اور برتاؤ کا بہت اچھا اثر ہوا۔ خاص طور پر رائے تلنگانہ پر تو بہت ہی مثبت اثر ہوا۔ وہ جو روپیہ دہلی کے خزانہ شاہی میں بھیجا کرتا تھا اب ہر سال خزانۂ بہمنی میں داخل کرنے لگا۔

حسن کے بہترین حسن انتظام نے دولت آباد کو امن کا گہوارہ بنادیا۔ اس کی آمدنی میں بھی قابل قدر اضافہ ہونے لگا۔ تغلق کا کانٹا درمیان سے نکل گیا تھا لہٰذا اب وہ مطمئن تھا۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ عوام میں اس کی مقبولیت ہے۔ دور دور تک کوئی مخالف نہیں ہے تو اس کے سر میں جہاں کشائی کا سودا سمایا۔ خزانے کی کثرت نے ایک بڑا لشکر اس کے گرد جمع کردیا تھا۔ جان دینے والے امرا موجود تھے۔ رعایا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اگر میں اس

تمام لشکر کو جواب میرے قبضے میں ہے لے کر نکلوں تو فتح ونصرت میرے قدم چومے گی۔ اس نے ارادہ کیا کہ ادھونی سے بیجانگر اور سیت بن رامیسر سے مالا بار تک کا سارا علاقہ اپنے قبضے میں کرلوں بعدازاں گوالیار کی طرف بڑھوں اور پھر مالوہ اور گجرات بھی اپنے قبضے میں کرلوں۔

اس کی عادت تھی کہ وہ جو ارادہ کرتا اس پر خود اچھی طرح غور کرتا، اس کے بعد اجلاس طلب کر کے مشورہ کرتا تھا۔

وہ اس رات کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا لہٰذا اطمینان کی نیند سویا۔ نیند گہری ہوئی تو کمرا کسی خوشبو سے بس گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی فوجیں صف بستہ کھڑی ہیں۔ جنگ کا ماحول ہے لیکن خود اس کا یہ حال ہے کہ میدان جنگ سے دور ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے امرا اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ شاہی اطبا سرہانے کھڑے ہیں۔ اتنی دیر میں امرا ایک طرف ہٹ گئے اور سفید ساڑی میں ملبوس ایک عورت اس کے قریب آئی۔ یہ جے ماتا تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پریشان نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی حسن نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت نے اٹھنے نہیں دیا۔

''حسن، مبارک ہو۔ میں نے فتح کے شادیانے سنے ہیں۔ تمہاری فوجیں فتح یاب ہوئی ہیں۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ اب مجھے امید ہے میری بیماری رخصت ہوجائے گی۔''

''تمہیں ہوا کیا ہے؟''

''اطبا کہتے ہیں مجھے ہیضہ ہوا ہے مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''تمہیں ہیضہ ہوجائے اور میں پریشان نہ ہوں۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کثرت شراب نوشی سے بچنا مگر تم نہیں مانے۔''

''ہاں، لیکن اب کیا ہوگا؟''

''یہ سفید ساڑی دیکھ رہے ہو۔ میری مانگ میں سیندور بھی نہیں ہے۔ میں آج بیوہ ہوئی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے جے ماتا غائب ہوگئی۔

اس کے کانوں میں دور سے آوازیں آرہی تھیں۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ چلا رہے تھے۔ سلطان کا انتقال ہوگیا۔ سلطان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

اتنا شور مچا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ جب سے وہ جے ماتا سے جدا ہوا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے خواب میں آئی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس خواب پر غور کرتا رہا۔ خواب کا پہلا حصہ تو بالکل واضح تھا۔ وہ جہاں کشائی کا فیصلہ کرچکا تھا۔ خواب سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے فتح نصیب ہوگی لیکن دوسرے حصے نے اسے الجھا دیا۔ کیا فتح کے فوراً بعد اس کا انتقال ہوجائے گا؟ جے ماتا مجھے خبردار کرنے آئی تھی کہ میں شراب نوشی سے گریز کروں؟ مجھے ہیضہ کیوں ہوگیا تھا، خواب میں کوئی اور بیماری بھی ظاہر ہوسکتی تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہوگئی۔ اس نے اپنے سمدھی ملک سیف الدین کو طلب کیا۔ اسے خواب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن اپنے عزائم ضرور دہرائے۔ اس کے عزائم سننے کے بعد ملک سیف الدین نے اسے ادب واحترام سے جواب دیا۔

''آپ کے عزائم سے مجھے اختلاف نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک بڑے لشکر کے مالک ہیں لیکن یہ عرض ضرور کروں گا کہ آپ جس علاقے میں جارہے ہیں یعنی کرناٹک کا علاقہ۔ یہ پورا علاقہ نہروں اور درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ آب وہوا مرطوب ہے۔ ہمارے جانور ایسی آب وہوا کے عادی نہیں ہیں۔ جانور زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ لشکر کشی کا خیال دل سے نکال دوں کیونکہ جانوروں کے بغیر تو کوئی جنگ لڑی نہیں جاسکتی۔''

''میرا یہ مقصد نہیں، میری عرض تو یہ ہے کہ بادشاہ خود پہل نہ فرمائیں بلکہ پہلے ایک جمعیت کرناٹک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جائے اور ان باغی راجاؤں کی سرکوبی کی جائے جنہوں نے اب تک تحفے اور ہدیے دربار میں نہیں بھیجے ہیں اور نہ اپنی فرماں برداری کا اظہار کیا ہے۔ سلطنت دہلی آج کل انتشار کا شکار ہے اس لیے موقع ہے کہ آپ خود گوالیار اور مالوہ کا سفر کریں اور اپنے جھنڈے کو بلند کر کے فتح ونصرت کے شادیانے بجائیں۔''

حسن بہمنی کو اپنا خواب یاد آیا تو اسے ملک سیف الدین کا مشورہ صائب نظر آیا۔ خواب میں جس فتح کی نوید سنائی گئی تھی وہ یہی فتح ہوگی۔

اس وقت اسے خواب کے دوسرے حصے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

دوسرے دن اس نے اجلاس طلب کیا اور امرائے سلطنت کے سامنے اپنا فیصلہ رکھ دیا۔

''عماد الملک تاشقندی!''

''جی سلطان محترم؟''

''آپ ایک جمعیت لے کر کرناٹک کی مہم پر تشریف لے جائیں گے۔''

''بندہ حاضر ہے۔''

''مبارک خاں لودھی آپ کے ہمراہ ہوں گے۔ ان راجاؤں کے دماغ بزور شمشیر درست کریں گے جنہوں نے ابھی تک ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔''

دونوں امرا اپنی اپنی جمعیتوں کو لے کر بلائے بے درماں کی طرح کرناٹک پہنچ گئے۔ چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی کیا مجال تھی کہ ان دلاوروں پر غلبہ پاتے۔ اس لشکر نے ہندوؤں کی راجدھانی کو جی بھر کر لوٹا۔ بستیاں اجاڑتے، گھروں کو لوٹتے رہے۔ دو سو لاکھ سونا، بیش بہا ہیرے، جواہرات، موتی، نقد مال وزر ہاتھ لگا۔ دو سو مشہور ہاتھی، ایک ہزار طوائفیں اور سازندے تھے جو خراج کے طور پر وصول کیے گئے۔ ان راجاؤں سے عہد لیا کہ ہر سال خراج ادا کریں گے۔

موسم برسات شروع ہوچکا تھا لہٰذا یہ جمعیت فاتحانہ شان سے گلبرگہ میں داخل ہوئی۔ سیکڑوں ہاتھی مال وزر سے لدے ہوئے سڑکوں سے گزرے تو شہریوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ حسن بہمنی کے رعب ودبدبے کا ایسا چرچا ہوا جو برسوں میں نہیں ہوا تھا۔

جب یہ لشکر بخیر وخوبی اپنے مشن سے واپس آگیا تو حسن نے ملک سیف الدین سے ایک مرتبہ پھر مشورہ کیا۔ سیف الدین کا مشورہ یہی تھا کہ اب حسن کو مالوہ اور گجرات کی فتح کے لیے نکل جانا چاہیے۔ حسن بھی تیار بیٹھا تھا۔ سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ کرناٹک کی مہم کی کامیابی نے اس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے۔ وہ حسن آباد گلبرگہ سے روانہ ہوکر دولت آباد پہنچ گیا۔ دوسرے دن اپنے لشکر کے ملاحظہ کے لیے گھاٹ پر پہنچا۔ پچاس ہزار سوار اسے سلامی دینے کے لیے موجود تھے۔

اس نے سپاہیوں کا جائزہ لیا۔ طاقت کا اندازہ کیا اور مطمئن ہوگیا کہ اگر اس لشکر کے ساتھ اس نے گجرات اور مالوہ پر چڑھائی کی تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور مشیروں کے ساتھ بیٹھ کر اس راستے کا تعین کرنے لگا جس سے گزر کر اسے ''مالوہ'' پہنچنا تھا۔ اس وقت دربار میں وہ افراد بھی موجود تھے جنہیں جائزہ لینے کے لیے مالوہ بھیجا گیا تھا۔ وہ سلطان کو وہاں کی آب وہوا اور لوگوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سیاسی حالات اور ابتری سے بھی آگاہ کر رہے تھے، اسی وقت سلطان کو اطلاع دی گئی کہ راجا رائے ہرن کا قاصد اس سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ سلطان کو تعجب ضرور ہوا تھا کہ راجا نے اپنا قاصد کیوں بھیجا ہے لیکن قاصد کو واپس بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے دربار برخاست کیا اور قاصد بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوگیا۔

اس قاصد نے اپنے راجا کی طرف سے بادشاہ کی خدمت میں درخواست کی کہ گجرات کے حکمرانوں اور دکن کے بادشاہوں میں ہمیشہ میل ملاپ رہا ہے لہٰذا بادشاہ سب سے پہلے گجرات پر حملہ کرے تاکہ راجا کو ان جاگیرداروں سے نجات ملے جو راجا کی حکمرانی کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

''تمہارا راجا اس وقت کہاں ہے؟'' سلطان نے دریافت کیا۔

''گجرات میں فساد برپا ہے۔ رعایا جاگیرداروں سے تنگ آچکی ہے اور امداد کی منتظر ہے۔ راجا دکنی فوج کے ڈر سے ''بکلانہ'' میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اپنے موروثی ملک میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ آپ گجرات میں اپنی فوجیں لے جائیں۔ سرکش جاگیرداروں کا خاتمہ کریں اور راجا کو اپنا بہی خواہ سمجھیں اور پھر اطمینان سے ''مالوہ'' پر چڑھائی کریں۔''

''یہ ایسا معاملہ ہے کہ میں اپنے امرا اور اراکین سلطنت سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا تم میرے مہمان رہو گے۔''

سلطان نے ایک مرتبہ پھر امرا کو طلب کیا اور قاصد سے ہونے والی گفتگو ان کے سامنے رکھ دی۔ اراکین کو یہ شک ضرور ہوا تھا کہ راجا اپنے ہی ملک پر حملہ کرنے کی ترغیب کیوں دے رہا ہے۔

''راجا کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ابھی وہ بادشاہ دہلی فیروز شاہ کا باج گزار ہے۔ ہم نے گجرات فتح کرلیا تو وہ ہمارا باج گزار بن کر حکومت کرے گا۔''

''وہ ہم سے مقابلہ بھی تو کرسکتا تھا۔''

''مقابلے کی صورت میں یہ ہماری صوابدید تھی کہ اسے حکمران رہنے دیں یا نہیں۔ ہمیں خوش کر کے وہ اپنی حکمرانی پکی کرنا چاہتا ہے۔''

''ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے فیروز شاہ کو اپنی مدد کے لیے بلالیا ہو اور ہمیں باتوں میں الجھا رہا ہو۔''

''ایسا اس لیے نہیں ہوسکتا کہ اس وقت گجرات میں عملاً جاگیرداروں کی حکومت ہے۔ اور اگر فیروز شاہ کی فوج مقابل آئی تو ہم اس سے بھی مقابلہ کرلیں گے۔''

”جب دہلی کے حکمران فیروز شاہ ہی سے مقابلہ کرنا ہے تو پھر مالوہ اور گجرات دونوں برابر ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ گجرات کے عوام خود بھی ہمیں بلانے کے متمنی ہیں۔“

قاصدوں کو مطمئن کر کے واپس بھیج دیا گیا اور گجرات کی طرف روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شہزادہ محمد کو بہ طور ہراول بیس ہزار سواروں کے ہمراہ روانہ کیا۔ شہزادہ نہایت تیزی سے روانہ ہوا۔ ”نوساری“ تک پہنچا تھا کہ اس علاقے میں شکاری جانوروں کی بہتات دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ باپ کی طرح وہ بھی شکار کا شوقین تھا۔ اس نے ”نوساری“ میں قیام کا ارادہ کرلیا۔ سلطان کو اس علاقے کی تمام کیفیت لکھ بھیجی۔

سلطان شکار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ جس وقت شہزادے کا پیغام ملا وہ دولت آباد سے روانہ ہو چکا تھا لہٰذا بہت جلد نوساری پہنچ گیا۔

اس علاقے کی آب و ہوا مرطوب تھی۔ آتے ہی اثر ہوا اور بخار نے گھیرلیا۔ شکار کی افراط تھی اور وہ شکار کا شیدائی۔ نامناسب آب و ہوا کے باوجود وہ ”نوساری“ میں ٹھہرا رہا اور شکار میں مشغول ہوگیا۔ شراب و کباب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

یہ سلسلہ ایک مہینے تک چلتا رہا۔ بادشاہ کو ہیضہ ہوگیا۔ گجرات قریب تھا لیکن وہ صحت سے دور تھا۔ جب بستر سے لگ گیا تو مایوسی نے پاؤں دراز کیے۔ مہم ادھوری چھوڑی اور حسن آباد گلبرگہ کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔

گلبرگہ پہنچ کر اپنے دیکھے ہوئے خواب کا دوسرا حصہ یاد آگیا۔ اسے یاد آیا کہ جب خواب میں جے ماتا اس سے ملنے آئی تھی تو کسی نے آواز دے کر بتایا تھا کہ بادشاہ کو ہیضہ ہوگیا ہے۔ جے ماتا اسی لیے پریشان تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے کہ اسے میری موت نظر آرہی تھی۔ میرا خواب کتنا سچا تھا۔ اس نے فتح کے شادیانے سنے تھے۔ یہ میری فتح ہے کہ راجا خود مجھے گجرات پر حملے کی دعوت دے رہا ہے۔ فتح کے شادیانے بجنے میں کتنی دیر تھی بلکہ فتح ہو ہی گئی تھی لیکن مجھے ہیضہ ہوگیا جیسا کہ میں نے خواب میں سنا تھا۔

اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ مرنے والا ہے۔

اس نے صدر الشریف سمرقندی کو طلب کر کے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور اپنی مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں ملک سیف الدین، اس کے بیٹے اور اپنے بھتیجے میں تقسیم کردیا۔

اس کا بستر علالت ایک ایسی جگہ پر تھا جس کا رخ گلی کی طرف تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور حکم دیا کہ جو جس وقت آنا چاہے اسے آنے دیا جائے۔ لوگ اس کی مزاج پرسی کے لیے آنے لگے۔ وہ ان کے حالات کی پوچھ گچھ کرتا، مظلوموں کی داد سنتا۔

اس نے یہ حکم بھی دیا کہ تمام قیدی علاوہ ان قیدیوں کے جو ملک کے لیے آزار کا باعث ہوں، رہا کر دیے جائیں۔ بڑے بڑے مجرم پابہ زنجیر دارالسلطنت میں جمع ہونے لگے اور بادشاہ نے ان کے قصور معاف کیے۔

اسے بستر علالت پر لیٹے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ کسی دوا سے کوئی افاقہ نہیں ہوا تو اس نے معالجوں کو اپنے پاس آنے سے روک دیا۔

”موت اب میرے قریب پہنچ گئی ہے اور موت کا علاج آپ لوگوں کے پاس نہیں۔ اب میں آپ کا نہیں، موت کا انتظار کروں گا۔“

اس کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے محمود کو یاد کیا۔ اسے بتایا گیا کہ شہزادہ مکتب میں اپنا سبق یاد کررہا ہے۔ کہا اسے بلاؤ۔

”آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟“

”حضرت شیخ سعدی کی بوستان پڑھ رہا ہوں۔“

”کس حکایت پر پہنچے اور اس حکایت میں کیا ہے؟“

”شیخ نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر ایک نے اپنی بہادری سے تمام دنیا کو فتح کرلیا مگر جب دنیا سے گیا تو خالی ہاتھ تھا۔ اپنی قبر میں کچھ ساتھ نہ لے گیا۔“

یہ سننا تھا کہ حسن گنگو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ ہچکیوں کے درمیان خزانچی کو بلوایا اور تمام خزانہ شاہی منگوا کر بیٹوں کو دیا۔

”یہ تمام خزانہ جامع مسجد میں علما کے درمیان تقسیم کردو۔“

سارا مال تقسیم کرنے کے بعد بادشاہ کو اطلاع کر دی گئی۔ بادشاہ نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور اس کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔

وہ ایک عام آدمی تھا۔ دکن کا تاجدار بنا اور گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد سڑسٹھ سال کی عمر میں (759ہجری) انتقال کیا۔

ماخذات تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین بدایونی۔ طبقات اکبری، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

زہرباد

ناہید سلطانہ اختر

سیدھی سی بات ہے کہ انسان غلط رستے پر چلے تو منزل سے بھٹک جاتا ہے... چیزیں اپنی جگہ نہ رکھی جائیں تو گھر بکھر جاتا ہے اور اگر رشتوں کا استعمال غلط ہو تو زندگی کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جب سائبان خود تپتی دھوپ میں جلانے پر کمربستہ ہو تو کوئی سایہ ٹھنڈک نہیں پہنچاتا... وہ معصوم رشتے بھی ایک ایسے ہی تپتے صحرا میں اپنی منزل کا نشان گم کر بیٹھے تھے۔

گھر کو گھر بنانے اور رشتوں کی اساس کو واضح کرتی ایک شاہکار کہانی

فولادی بکل والی چرمی بیلٹ ہاتھ میں لیے ابا صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھے انتہائی تسلسل کے ساتھ ذیشان کو غائبانہ بکھان رہے تھے۔ امی، ملیحہ اور معصومہ گھر کے ایک کمرے میں اپنی سانسوں کی رفتار دھیمی کیے بیٹھی تھیں۔ سلمان ابا کے حکم پر ذیشان کو تلاش کرکے باہر سے گھر لانے کو نکلا ہوا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ آج ذیشان کی کچھ زیادہ ہی شامت تھی۔ اس کی اکثر ہی شامت آجایا کرتی تھی۔

''آجائے آج گندی نسل...... سالے کی چمڑی نہ ادھیڑ دوں...... الو کا پٹھا...... کتے کا بچہ......سور کی اولاد کو کتنی دفعہ کہا ہے غصہ نہ دلایا کر مگر اصیل تھوڑی ہے کہ ایک دفعہ کی بات سن لے۔'' ابا کی بلند آہنگی امی اور دونوں بیٹیوں کو خوفزدہ کیے دے رہی تھی۔

''آج پھر دورہ پڑا ہے انہیں۔'' ملیحہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''زبان بندر کھواپنی۔'' امی بولیں۔

''شان کو سمجھائیں نا...... کیوں گھر میں نہیں رہتا وہ ابا کے آنے کے وقت۔'' معصومہ نے دبی دبی آواز میں امی سے کہا۔

''گھر ہی میں تو مرا رہتا ہے...... لڑکا ہے، کبھی نکل بھی جائے تو ابا کے آنے کے وقت گھر میں رہنا کوئی وظیفہ تو نہیں کہ ٹوٹ جانے سے گناہ ہوگا۔'' امی نے گھٹی گھٹی آواز میں ذیشان عرف شان کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے معصومہ کو گھورا۔

''اور کیا۔'' ملیحہ نے امی کی تائید کی۔

''آج بری طرح پٹے گا...... بہت غصے میں ہیں۔'' امی بولیں۔

''بے چارہ!'' ملیحہ نے شان سے غائبانہ اظہار ہمدردی کیا۔

صحن میں بے تابی سے ٹہلتے ابا اب مرکب سے مفرد گالیوں پر آگئے تھے۔ مرکب گالیاں دینے میں ابا کو یہ خیال ہی نہ رہتا کہ ان کے منہ سے نکلنے والی بہت سی مغلظات خود انہی کو پڑتی تھیں۔ اپنی اولاد کو وہ کبھی کتے سے منسوب کر دیتے، کبھی گدھے سے، کبھی سور سے تو کبھی الو سے...... کبھی اپنی پچھلی سات پشتوں کو تو کبھی ان کی ننھیال کو برا بھلا کہنے لگتے۔ خود پر پڑنے والی گالیوں میں تو ابا پھر بھی قدرے شستہ ہو جاتے، دوسروں کو دی جانے والی گالیاں تو نوک قلم پر آنے اور ضابطۂ تحریر میں لانے کے لائق ہی نہ ہوتیں۔ ایسی ایسی بوالعجب اور نادر روزگار کہ سننے والوں کا مزاج گھنٹوں نہیں دنوں مکدر رہتا۔

دشنام طرازی کو بھی اگر فنون لطیفہ کی ایک شاخ متصور کرلیا جاتا اور اس فن میں غیر معمولی دسترس پر حسن کارکردگی ایوارڈ عطا کیے جانے کی کوئی روایت ہوتی تو ابا اس فن میں یکتا قرار پاتے...... ایسی ایسی نادر روزگار گالیاں اور اس قدر روانی، تسلسل اور تنوع کے ساتھ کہ سننے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ایسی گالیاں ابا نے سیکھی کہاں سے تھیں آخر!

ابا کو غصہ بہت آتا تھا۔ صبح سے شام تک ان کی تیوریاں تنی رہتیں۔ غصہ کرنے اور گالیاں بکنے کے بہانے ڈھونڈتے۔ علی الصباح اٹھ بیٹھتے اور جب خلق خدا یاد اللہ میں مصروف ہوتی ابا دشنام طرازی شروع کر دیتے تمہیداً چند درجۂ اول گالیاں بکتے پھر کہتے ''سالے اینڈ رہے ہیں پڑے...... نہ نماز نہ قرآن۔'' جوش جذبات میں کبھی کبھی ابا سلمان جسے پیار سے مان پکارا جاتا تھا یا شان کی بیلٹ اٹھا لاتے اور نشانہ تاک کر اتنی زور سے رسید کرتے کہ سردی کے موسم میں تو زیر لحاف ہونے کے باعث پڑنے والوں کو پھر بھی کچھ بچت مل جاتی، گرمیوں میں مگر اتنے زور کی پڑتی کہ زیر عتاب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔

نیند بھی کیا قیامت کی آیا کرتی تھی چاروں کو! امی فجر کی اذان ہوتے ہی پیار سے جگانا شروع کرتی تھیں۔ ''مان، اٹھ جا بیٹا...... شان، اٹھو میری جان! ملیحہ نماز کا وقت ہو رہا ہے...... معصومہ، اٹھ جاؤ میرا بچہ۔'' چاروں کروٹ پر کروٹ بدلتے رہتے...... کبھی آہستگی سے کبھی ناگواری سے ''اچھا امی...... سن لیا ہے۔'' کہہ کر دوبارہ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگتے۔

''یہ سالے لاتوں کے بھوت ہیں...... بیٹا، بچہ ان کی سمجھ میں کب آتا ہے...... انہیں ڈنڈا لے کر جگایا کرو، ڈنڈا۔'' ابا، امی سے کہتے۔

ابا کی ایک بیلٹ پڑتے ہی بیلٹ کی ضرب کھانے والے تو کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھنے کے بجائے۔ ''اٹھ گئے ابا، اٹھ گئے۔'' کہتے بستر چھوڑ الف کی طرح سیدھے کھڑے ہو ہی جاتے باقیوں کی نیند بھی خطا ہو جاتی۔ ہفتہ واری تعطیل اور اسکول کالج کی تعطیلات کے دوران لمبی تان کر سونے کی خواہش حسرت ہی بنی رہتی۔ ابا کے غصے اور مغلظات سے ڈر کر بچے نماز کے لیے کھڑے بھی ہوتے تو نہایت بے دلی سے۔

جب تک ابا گھر میں رہتے گھر کی فضا محزون و مسموم رہتی۔ امی ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتیں۔ بچوں کو ڈرائے جاتیں۔ ''ذرا ہوش سے...... ذرا سنبھل کے، ابا گھر میں ہیں۔'' ابا نہ ہوئے ہوا ہو گئے...... ابا کی موجودگی میں چاروں بچے امی کے خوف دلائے بنا خود بھی محتاط ہی رہتے۔ بہ ضرورت امی سے یا آپس میں ایک دوسرے سے بھی بات چیت کرنا ہوتی تو سرگوشیوں میں کرتے۔ کوشش کرتے کہ ابا کا سامنا کم سے کم ہو۔ سامنا ہوتے ہی ابا کی زبان کسی نہ کسی بہانے آتش فشانی شروع کر دیتی...... غصہ کرنے اور گالیاں بکنے کے لیے ابا کو عموماً کسی بڑے اور بھاری بھر کم بہانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ چائے کی خالی پیالی یا سالن کی جھوٹی رکابی کا میز پر پڑا رہ جانا۔ کسی بچے کا چپل یہاں وہاں اتار دینا۔ جوتے کا الٹا ہو جانا۔ سنک میں میلے برتنوں پر نظر پڑنا۔ سنک یا واش بیسن میں پانی کی دھار تیز کھول لینا۔ چائے اسٹرانگ بنانے کے لیے پتی کا ذرا سا زیادہ استعمال۔ بستر کی چادر کا کونا کسی ایک طرف زیادہ لٹکا ہونا۔ ملیحہ یا معصومہ کے سر سے دوپٹا سرک جانا۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار چھوٹے چھوٹے لایعنی جواز ابا کو بکنے جھکنے کا بہانہ فراہم کرتے۔

صبح ناشتا اور رات کا کھانا حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق ایک ہی دسترخوان پر اکھٹے بیٹھ کر کھایا جاتا۔ ابا عقابی نگاہوں سے ایک ایک کی کارگزاری کا جائزہ لیتے رہتے۔ امی فق رہتیں۔ بچے کن انکھیوں سے کبھی انہیں، کبھی ان کے اشاروں کو اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھے جاتے۔ اکثر بھوکے ہی اٹھ جاتے۔ ہاں دوپہر کے کھانے پر ماسوا چھٹی والے دن جب ابا موجود نہ ہوتے دسترخوان پر چاروں کی موج مستی، چھینا جھپٹی اور ہا ہو دیدنی ہوتی...... مان، شان کی پلیٹ سے بوٹی اڑا لیتا تو شان، معصومہ کے سامنے دھرے گلاس پر چمچ سے جلترنگ شروع کر دیتا۔

''امی، مان بھائی کو دیکھیں۔''

''امی، شان کو سمجھالیں۔''

کبھی ملیحہ امی کو مدد کے لیے پکارتی کبھی معصومہ سراپا احتجاج بن جاتی۔ کبھی ایک بھائی دوسرے کے مقابل صف آرا تو کبھی دونوں مل کر بہنوں کو اپنی حرکتوں سے آوازار کر دیتے۔ ابا کی عدم موجودگی میں دونوں بھائیوں میں وہ لپاڈگی ہوتی کہ خدا کی پناہ! بہنوں کو بھی نہ بخشتے...... بہنیں بھی جوش میں آجاتیں...... اس کا تکیہ اس پر...... اس کا بیگ بردوش فضا یہاں سے وہاں تک! ابا کی غیر موجودگی میں بستر پر گاؤ تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر ٹی وی دیکھا جاتا، ریڈیو پر ایف ایم سنا جاتا، ٹیپ ریکارڈر پر گانے لگائے جاتے۔ لوڈو اور کیرم کی بازیاں جمتیں، دوستوں کو لمبی فون کالز کی جاتیں، امی سے میٹھا بنانے کی فرمائش ہوتی، دودھ پتی پی جاتی، مان اور شان کرکٹ میچ کھیلنے جاتے۔ ابا گھر پر نہ ہوتے تو چاروں مل کر کبھی کبھی تو اتنا ہلڑ مچاتے کہ امی عاجز آجاتیں۔ ''تم لوگ اپنے باپ ہی سے سیدھے رہتے ہو۔'' امی کو کہنا پڑتا۔

مان کانوں کو ہاتھ لگاتا۔ ''ایسا باپ اللہ......''

''ہر ایک کو دے۔'' شان اس کا جملہ درمیان سے اچک کر شوخی سے گرہ لگاتا۔

''ویسے یار امی۔'' مان امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے کہتا۔ ''آپ کے شوہر کو تخلیق کر کے اللہ میاں بہت پچھتائے ہوں گے۔''

''ہیں! ہیں! کیا بکواس کر رہے ہو...... تھتھکارو اور اللہ سے معافی مانگو۔'' امی مان کو گھورتیں۔

''مان بھائی بالکل معافی مت مانگنا...... زندگی خراب کر رکھی ہے ان محترمہ کے شوہر نے ہماری۔'' شان کہتا۔

''اوکے!'' مان بڑا ہونے کے باوجود شان کی بات پر آمنا صدقنا کہتا اور شان مسکرا کر کن انکھیوں سے امی کو دیکھتے ہوئے خود ساختہ انگریزی میں نظم لہک لہک کر گانے لگتا۔

تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی مدر
تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی برادر
تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی سسٹرز
تھینک یو گاڈ فار ورلڈ بیوٹی فل
سوری گاڈ یو میڈ مائی فادر
ہی لکس لائک اے مین
ان فیکٹ از اے جن!

امی آنکھیں دکھاتیں۔ ''سن لیا نا کسی روز تمہارے باپ نے تو وہ جوتے لگائیں گے کہ یاد رکھو گے...... شرم نہیں آتی...... ماں، بھائی اور بہنوں کے بنانے پر تو اللہ کا شکر ادا کیا جا رہا ہے اور باپ کے لیے کہتے ہو لگتا تو انسان ہے مگر حقیقت میں ہے جن...... شرم کرو...... آنے دو، بتاؤں گی انہیں۔'' امی کی دھمکی محض دھمکی ہی رہتی۔ کبھی بتانے کی ہمت ہی نہ کر پائیں وہ ابا کو کہ ان کی درشت مزاجی کی وجہ سے بچے ان کے بارے میں کس انداز سے سوچتے تھے۔

گھر میں ابا کے آتے ہی بچوں کی ساری چونچالی کافور ہو جاتی۔ ایک دم ساہوکار بن جاتے۔ تین سو ساٹھ ڈگری پر کھلے حلق کا زاویہ صرف پندرہ ڈگری تک آجاتا۔ زندگی ٹھٹھر کر پڑ جاتی...... اور مردنی اس کا جانشین بن بیٹھتی۔ مگر ابا کے جاتے ہی ان کے خوف سے بکل مارے پڑی زندگی یک بیک پوری توانائی کے ساتھ انگڑائی توڑتی اٹھ کھڑی ہوتی۔

ابا کے غصے سے سب سے زیادہ امی کی جان جاتی اور وہ اس لیے کہ صرف اپنی ذات ہی نہیں چاروں بچوں میں سے کسی ایک کو بھی زبان یا ہاتھ سے پہنچنے والی تکلیف کا اثر وہ براہ راست اپنے دل پر محسوس کرتی تھیں۔ ابا کی شریک زندگی ہونے کے باوجود امی کی بھی ان سے بس واجبی سی بات چیت رہتی اور وہ بھی ضرورتاً۔

''کھانا کھائیں گے؟''

''چائے بنا دوں؟''

''ککنگ آئل ختم ہوگیا ہے۔''

''سلمان کی فیس جانی ہے۔''

''معصومہ کو تین دن سے بخار ہے...... اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔''

بچوں کی بیماری آزاری کی اطلاع بھی امی، ابا کو اس وقت دیتیں جب گھریلو ٹوٹکوں یا گھر میں رکھی پرانی دوا دارو سے تکلیف رفع ہوتی نظر نہ آتی۔ امی کی محتاط گزارش ابا اکثر ان سنی کر دیتے...... اور سنتے تو ان کا ردعمل کچھ اس طرح ہوتا۔

''سالا آئل استعمال تھوڑی کرتے ہو تم لوگ، پانی کی طرح بہاتے ہو۔''

''فیس دینے کا فائدہ کیا ہے...... مردود دو مضمونوں میں تو فیل ہوگیا۔''

''پیراسٹامول کی گولی دے دو ٹھیک ہوجائے گی...... ڈاکٹر میرا باپ نہیں ہے جو فیس کے بغیر دیکھ لے گا...... یہاں تو......'' ابا ایک لمحہ کو توقف کر کے موٹی سی گالی دیتے پھر کہتے ''ہر دوسرے دن ہی کوئی نہ کوئی بستر پر پڑا ہوتا ہے۔''

امی چور سی بن جاتیں۔ ابا بیمار پڑی اولاد کو ڈاکٹر کے ہاں لے تو جاتے مگر نہایت بکتے جھکتے ہوئے۔ ''اور کھاؤ سالے مالٹے...... کھانے پر تو ایسے گرتے ہیں گندی نسل جیسے کبھی جڑا ہی نہ ہو...... خبیث ہاتھ پاؤں پھیلا کر پڑ جاتے ہیں کہ ہے نا ایک الو کا پٹھا اس کا تو باپ بھی لے جائے گا ڈاکٹر کے ہاں۔''

ڈاکٹر کے ہاں سے واپسی پر بھی ابا راستہ بھر بکتے جھکتے رہتے۔ کیمسٹ سے مجوزہ نسخہ کی دوائیں خریدتے تو نہایت کفایت کے ساتھ، مہنگی دوا تو گول ہی کر جاتے۔ ''یہ سالے ڈاکٹر تو اپنا کمیشن بنانے کو دواؤں کی فہرست لکھ دیتے ہیں...... اینٹی بایوٹک کی ضرورت کیا ہے...... خشکی کرتی ہیں...... آدمی ڈھیر ہوجاتا ہے ان سے...... گرم پانی سے غرارے کرو...... ٹھیک ہوجائے گا گلا۔''

''ڈاکٹر نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی لکھی ہوگی دوا۔'' بیمار بچے کی خیرخواہی میں امی دبی زبان سے کہتیں۔

''ڈاکٹر سالا ہم سے زیادہ عقل رکھتا ہے کیا۔'' ابا آنکھیں نکالتے۔ امی چپ ہوجاتیں۔ ابا سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ مرغے کی ایک ہی ٹانگ رہتی۔

ابا کے سامنے بچوں کے منہ سل جاتے...... دنوں، ہفتوں میں کوئی ایک آدھ جملہ اور بس!

سلمان، ذیشان اور ملیحہ کو ابا کے خلاف ڈھیروں ڈھیر گلے رہتے۔

باپ کوئی ایسے ہوتے ہیں۔

فلاں کے ابا کو دیکھو...... کتنی محبت سے بات کرتے ہیں، اپنے ہی نہیں دوسروں کے بچوں سے بھی!

ہمارے ابا!

اللہ توبہ!

خدا کسی کو ایسا باپ نہ دے!

مجال ہے جو کبھی محبت سے بات کرلیں۔

ہر وقت تیوری چڑھی رہتی ہے۔

اور گالیاں...... باپ رے!

دیکھیں گے تو جیسے کوئی جلاد دیکھ رہا ہے۔

چاروں بہن بھائیوں میں بس ایک معصومہ ہی تھی جسے ابا سے گلے بھی کم ہوتے اور جو دل ہی دل میں ابا کو بے تحاشا پیار بھی کرتی۔ ان کے کمرے کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی اور الماری میں رکھی چیزوں کی ترتیب میں وہ امی کا خاطر خواہ ہاتھ بھی بٹاتی، ابا کی چیزوں کو گنجینۂ گراں مایہ کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتی۔ ابا اپنی تمام برائیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسے اچھے لگتے تھے...... اچھے ہی نہیں بہت اچھے۔ اپنی جان سے بڑھ کر اچھے۔ اتنے اچھے کہ ان کی گالیاں کھا کر بھی وہ انہیں برا کہنے، برا سمجھنے کے بجائے دل ہی دل میں اللہ میاں سے گفتگو شروع کر دیتی۔ ''اللہ میاں! ابا کو اچھا بنا دیں نا...... گالیاں دینا کیوں نہیں چھوڑ دیتے وہ! آپ اگر چاہیں نا تو ان کا غصہ بھی کم ہوسکتا ہے...... ٹیچر کہتی ہیں نا...... اللہ میاں جس کام کا ہونا چاہتے ہیں کہتے ہیں کُن اور وہ کام ہوجاتا ہے...... فیکون!...... ابا کا غصہ کم کر دیں اللہ میاں...... غصہ بھی...... اور گالیاں بھی...... اور ہاں شان بے چارے کو مار پڑنا بھی۔''

ابا کی گالیوں اور غصے کی تان شان پر آکر ٹوٹتی۔ چاروں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ گالیاں بھی وہی کھاتا اور مار بھی سب سے زیادہ اسی کو پڑتی...... اسے بچانے کی کوشش میں دو چار ہاتھ امی کو بھی پڑ جاتے۔ شان تھا بھی تو بلا کا شرارتی اور فساد پرور...... بھائی اور بہنوں کے ساتھ تو چونچیں لڑاتا ہی، باہر والوں سے بھی پنگے لیتا پھرتا...... روزانہ اس کی کوئی نہ کوئی شکایت گھر پہنچی ہوتی...... آج شان نے یہ کر دیا آج وہ کر دیا...... کبھی کرکٹ کھیلتے ہوئے کسی کے بلے کا دستہ توڑ کر آجاتا کبھی راہ چلتے کسی دوست کو مذاق ہی مذاق میں ٹنگری دے کر گرا آتا...... کبھی اپنے کسی دوست کی حمایت میں اس کے کسی حریف کا سر پھاڑ آتا تو کبھی مکا مار کر کسی کی آنکھ پر نیل ڈال آتا...... شکایت گھر آنے پر امی بولائی بولائی پھرتیں۔ ''ابا کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔''

چھپانے کی ہزار کوششوں کے باوجود ابا کو کہیں نہ کہیں سے پتا چل ہی جاتا اور ایسی قیامت آتی کہ خدا کی پناہ! دھائیں دھول سے پڑوسی تک کانوں کو ہاتھ لگاتے اور گھر کے قریب واقع قبرستان میں اپنی اپنی قبروں میں سوئے مردے بھی جاگ اٹھتے۔ شان کو کبھی مرغا بنا کر اس کی پیٹھ پر سل دھر دی جاتی...... کبھی تابڑتوڑ ابا کے جھانپڑ پڑتے...... کبھی شکایت کنندہ کے اطمینان کی خاطر ابا اسے گھر کے باہر ہی کک پر کک لگاتے اور محلے کے بچے بڑے پہلے تو خاموش تماشائی بن کر شان کی ذلت و رسوائی کا تماشا دیکھتے پھر کوئی ہمدرد آگے بڑھ کر ابا کو ظلم سے باز رکھنے اور شان کو اس تشدد سے بچانے کی جرأت دکھاتا تو ابا سے لتاڑ کھاتا۔

''جاؤ جاؤ اپنا کام کرو...... زیادہ ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں...... یہ کمینہ تو اس لائق ہے کہ اسے چوراہے پر لٹکا کر اس کے اوپر ہنٹر برسائے جائیں۔''

شان بھی بدذات تھا، ابا کو بار بار موقع دیتا۔ اکثر زیر عتاب رہتا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔ شامت کبھی کبھی مان کی بھی آجاتی مگر شان کی نسبت بہت کم۔ مان کو کرکٹ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ گرمی، سردی، خزاں، بہار حتیٰ کہ ابا کی مار کی پروا کیے بغیر بھی وہ بلا اٹھا کر کرکٹ کھیلنے نکل جاتا۔ اکثر تو وہ ابا کی واپسی سے پہلے ہی گھر آجاتا لیکن اگر کبھی دیر ہوجاتی تو امی نے اس کا تریاق ڈھونڈ لیا تھا۔ ابا کی گھر واپسی کا وقت ہوتے ہی امی اس کی کتابیں میز پر پھیلا دیتیں اور گرم پانی میں چائے کا مگ ڈبو کر رکھتیں۔ خدانخواستہ ابا، مان کے آنے سے پہلے گھر آجاتے تو امی جھٹ پٹ مگ گرم پانی سے نکالتیں اور پہلے سے بنی رکھی چائے تھوڑی سی مگ میں ٹپکا کر مگ میز پر رکھ دیتیں۔ ابا مان کے بارے میں پوچھتے تو امی بڑے اعتماد سے کہتیں۔ ''بیٹھا پڑھ رہا تھا، ابھی ابھی چائے پی کر نکلا ہے ٹانگیں سیدھی کرنے کو۔''

''مردود کی ٹانگیں ایسی سیدھی کروں گا کہ سیدھی ہی رہ جائیں گی۔''

''کبھی تو نکلتا ہے بے چارا۔'' امی دبی زبان سے کہتیں۔

ابا، امی کو شک سے دیکھتے۔

''ابھی ابھی گیا ہے...... بس ابھی...... چائے کی پیالی تک تو گرم ہے اس کی۔'' امی ان کے اطمینان کو کہتیں۔

''آجائے آج۔'' ابا تیور بگاڑ لیتے۔

امی کو ہول شروع ہوجاتی۔ مان کبھی بچ جاتا کبھی ابا کے ہاتھوں اسے بھی پڑ جاتی۔

ملیحہ اور معصومہ کو بھی ابا سے اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹ، جھڑکیاں اور گالیاں پڑتی رہتیں۔ کبھی جوش جذبات میں ابا ایک آدھ ہاتھ بھی جڑ دیتے۔ ملیحہ، ابا کو منہ بھر بھر کے کوستی۔

''اللہ کرے مر جائیں۔''

''اللہ کرے فالج پڑ جائے ان کے ہاتھوں پر۔''

''ہوں! ہوں! باپ کو ایسا کہتی ہو۔'' امی ملیحہ کو آنکھیں دکھاتیں۔ ملیحہ پروا نہ کرتی۔

''اتنے لوگوں کے ابا مرتے ہیں...... ہمارے ابا کیوں نہیں مر جاتے۔'' ملیحہ کہتی۔

''ملیحہ!......'' امی کا لہجہ تنبیہی ہوتا۔

''رہنے دیں امی آپ زیادہ حمایت نہ کیا کریں ان کی۔'' ملیحہ منہ بناتی۔

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو تم۔''

''کیونکہ مجھے ابا سے نفرت ہے۔''

''انہی سے سہارا ہے ہم سب کو...... اللہ نہ کرے جس دن نہ ہوئے تو مجھ سمیت تم سب کو بھی پتا چل جائے گا۔'' امی ایک مشرقی عورت ہونے کا ثبوت دیتیں۔

''کیا پتا چل جائے گا۔''

''یہ تو اللہ نہ کرے ایسا ویسا وقت بتائے گا تمہیں۔''

''باپ کوئی ایسے ہوتے ہیں۔'' ملیحہ احتجاج کرتی۔

''ایسے بھی ہوتے ہیں۔'' امی کہتیں۔

''ہونہہ!'' ملیحہ جلے بھنے انداز میں سر کو جھٹکتی۔ ''کبھی میری دوستوں کے اباؤں کو تو دیکھیں آپ...... شازیہ کے ابو چھٹی سے آدھے گھنٹے پہلے ہی آکر کالج گیٹ پر کھڑے ہوجاتے ہیں اسے لینے کے لیے...... اور ایک ہمارے ابا ہیں، کبھی آئیں بھی تو میں تو اس ڈر سے کالج ہی سے نہ نکلوں کہ وہاں بھی وہ گالیاں بکنا شروع کر دیں گے...... مجھے تو ابا سخت برے لگتے ہیں۔''

''تمہارا بس چلے تو تم شاید کسی دن ابا کو قتل ہی کر دو۔'' ایک روز سلمان نے مذاقاً کہا۔

''ہاں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میرا بس چلے تو میں واقعی ایسا کروں...... وہ ہمارے ساتھ اچھا بھی کیا کرتے ہیں۔ جب وہ شان کو گھر کے باہر محلہ والوں کے

سامنے ذلیل کر رہے ہوتے ہیں تو......‘‘ ملیحہ نے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔

’’تو؟‘‘ مان نے اس کی بات کی تکمیل چاہی۔

’’میرا جی چاہتا ہے کہ پتا نہیں کیا کر دوں، ابا کو شوٹ کر دوں۔‘‘

’’شرم نہیں آتی باپ کے لیے ایسی باتیں کرتے۔‘‘ امی نے دونوں کو گھڑکا۔

’’انہیں شرم نہیں آتی ہمیں گالیاں دیتے۔‘‘ ملیحہ نے تلخی سے کہا۔

’’اور مارتے ہوئے بھی۔‘‘ مان نے گرہ لگائی۔

’’ہاں...... مارنے میں بھی کون سا دریغ کر جاتے ہیں وہ......شان بے چارا تو پکا ہو گیا ہے پٹ پٹ کر۔‘‘

’’باپ ہیں...... حق ہے انہیں غلط بات پر اولاد کو تنبیہ کرنے کا۔‘‘ امی نے ابا کی وکالت کی۔

’’تنبیہ اور ذلت میں فرق ہوتا ہے اماں۔‘‘ مان بولا۔

’’وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں...... باپ ہیں تمہارے۔‘‘

’’کبھی انہیں بھی یہ سمجھا دیں کہ ہم بھی اولاد ہیں ان کی۔‘‘ ملیحہ نے امی کو شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

امی گھائل نظروں سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ ’’میری بھی وہی درگت بنائیں گے تمہارے ابا جو وہ شان کی بناتے ہیں۔‘‘

’’یار اماں...... آپ کو ہم لوگوں کے لیے ہمت تو کرنی چاہیے تھی نا کبھی۔‘‘ مان ہاتھ جھٹکتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

امی اس کے روبرو جا کھڑی ہوئیں اور بہت پیار سے اس کے رخسار پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔ ’’بہت مشکل تھا بیٹے۔‘‘

’’روز روز ادھورا مرنے سے ایک بار پورا مر جانا ہی بہتر۔‘‘ ملیحہ بولی۔ اس کا یہ احتجاج گزشتہ روز ابا کے ہاتھوں شان کی بہیمانہ درگت کا ردعمل تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ابا سوچ سمجھے بنا یکا یک غصے میں آ جاتے تھے۔ گزشتہ روز بھی جس بات پر انہوں نے شان کی ہڈی پسلی ایک کر ڈالی، نہایت معمولی تھی۔ اسکول میں شان کے ہم جماعت سہیل نے اس کی کتاب پھاڑ ڈالی۔ شان نے اپنی پھٹی ہوئی کتاب اس کے ڈیسک پر ڈالی اور اس کی کتاب لے کر گھر آ گیا۔ شام کو عین اس وقت جب ابا گھر لوٹے ہی تھے، سہیل اپنے باپ کے ساتھ شکایت لے کر گھر آ گیا۔ بس پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ ابا نے گھر کے باہر ہی سہیل اور اس کے باپ کے سامنے شان کی گدی پر پہلا ہی ہاتھ ایسا بھرپور مارا کہ وہ ہائے اللہ! ہائے اللہ کہتا دُہرا ہو گیا۔ آنکھیں سرخ اور منہ سے لعاب نکلنے لگا۔ امی، ملیحہ اور معصومہ جو گھر کی کھڑکی سے لگی باہر جھانک رہی تھیں، لرز کر رہ گئیں۔ امی کے تو جیسے دل پر ضرب لگی، کلیجا تھام کر رہ گئیں۔ مان کھڑا دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ابا شان کو لاتیں رسید کرتے ہوئے گھر میں لائے۔ زبان سے اسے جو کچھ کہا سنا استغفر اللہ!

آفرین تھی امی پر کہ جو یہ سب کچھ دیکھ کر بھی چپ رہتیں اور شاباش شان کو جو انتہائی مستقل مزاجی سے ابا کی گالیاں سنتا تھا، ماریں کھاتا تھا۔ اس سے تو جیسے ابا کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان کی جبیں شکن آلود ہو جاتی، تیور بدل جاتے۔ بلاوجہ گالیاں دینے لگتے۔ ابا کی موجودگی میں سب کی جان پر بنی رہتی۔ صبح و شام چیخنا چلانا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ صبح بکے جھکے بغیر گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ شام کو گھر آتے تو اپنے اس معمول کی انجام دہی کے لیے کوئی بہانہ ہاتھ لگنے کو آدم بو! آدم بو! کی تفسیر بنے کبھی کمرے میں تو کبھی کچن میں جھانکتے کبھی غسل خانے کا پوسٹ مارٹم فرماتے تو کبھی صحن کا معائنہ کرنے لگتے۔ امی اور بچے دم سادھے رہتے۔

گھر کے ماحول کا بچوں کی نفسیاتی ہی نہیں جسمانی صحت پر بھی نمایاں اثر پڑا تھا۔ یوں تو چاروں ہی اپنی اصل عمر سے چھوٹے نظر آتے تھے مگر معصومہ تو جیسے بالکل ہی دب کر رہ گئی تھی۔ پستہ قامت، لاغر جسامت، آنکھوں میں خوف، چہرے پر گھبراہٹ...... ذرا سی بات پر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ ابا گھر میں ہوتے تو وہ امی کے آس پاس چھپی رہتی۔ جو کبھی ابا کسی ضرورت کے تحت بھی اسے پکار لیتے تو تھر تھر کانپنے لگتی۔

’’جی ابا۔‘‘ خوف کے مارے اس کی آواز بھی نہ نکلتی۔

’’تجھے یہ رومال نہیں پڑا دکھائی دے رہا...... اٹھا اسے۔‘‘ ابا گرجتے۔

وہ نیم جان سی دوبارہ امی کے پاس اپنے کنج عافیت میں پناہ لیتی۔ شان اسے دیکھ کر دبی دبی ہنسی ہنستا اور اسے چھیڑنے کی خاطر کہتا۔ ’’ماسی ماں!‘‘

’’امی! بھائی کو دیکھیں۔‘‘ معصومہ منمناتی۔

شان اس کی نقل اتارتا۔ ’’امی! بھائی کو دیکھیں۔‘‘

دونوں بھائیوں نے شرارتاً بہنوں کے نام بگاڑ رکھے تھے۔ ملیحہ کو میلی ہے اور معصومہ کو ماسی ماں کہتے۔

معصومہ کو ابا کی ڈانٹ سے خائف دیکھ کر شان ڈھٹائی سے کہتا۔ ’’ہم تو شاک پروف ہو گئے ہیں۔ ابا کچھ بھی کہیں اثر ہی نہیں ہوتا...... ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔‘‘

’’ایسی بھی کوئی بات نہیں۔‘‘ ملیحہ کہتی۔ ’’ابا کی آوازیں تو کالج تک پیچھا کرتی ہیں میرا۔‘‘

’’میں تو خواب میں بھی یہی دیکھتا ہوں کہ ابا ہاتھ میں بیلٹ لیے دنادن شان پر برسا رہے ہیں۔‘‘ مان کی نظریں شان پر ہوتیں۔

’’بے چارا!‘‘ ملیحہ کو شان سے ہمدردی محسوس ہوتی۔

’’ویسے یار، لگتی بڑے زور کی ہے...... میرا تو ایک دو میں ہی کام ہو جاتا ہے تُو اتنی کیسے برداشت کر لیتا ہے۔‘‘ مان پوچھتا۔

’’مجھے تو مزہ آتا ہے۔‘‘ شان ڈھٹائی سے مسکراتا۔

’’بے شرمو! اسی لیے تو میں تم لوگوں کی بیلٹیں چھپاتی پھرتی ہوں۔‘‘ امی کہتیں۔

’’نہ چھپایا کریں یار...... اب تو اتنی عادت ہو گئی ہے بیلٹ سے مار کھانے کی کہ ایک دو دن نہ پڑے تو یاد آنے لگتی ہے۔‘‘ شان کہتا۔

’’اور ان کے چھپانے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے...... ابا کو بیلٹ تلاش کرنا آتی ہے...... اور کسی کی نہ ملے تو اپنی الماری سے نکال لیتے ہیں۔‘‘ مان جتاتا۔

’’اللہ کرے زور کا سیلاب آئے اور ابا کی الماری سے ساری بیلٹیں بہا لے جائے۔‘‘ ملیحہ بڑے پردرد انداز میں بددعا کرتی۔

’’میرے بچو! انہیں تو میں نہیں سمجھا سکتی مگر تمہاری ماں ہونے کے ناتے تمہیں یہ سمجھانا میرا فرض ہے کہ زبان گناہوں کا پرخطر دروازہ ہے۔ اس دروازے کی حفاظت یہی ہے کہ اس پر پورا قابو رکھا جائے۔ غلط بات اس دروازے سے نکلنے ہی نہ دی جائے...... ایک مرتبہ حضرت معاذؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسولؐ اللہ! وہ کون سا عمل ہے جس سے بندہ جنت میں داخل ہو اور جہنم سے بچ جائے؟ آپؐ نے خاص خاص باتیں بتانے کے بعد فرمایا کیا میں تمہیں ان تمام پر حاوی چیز نہ بتلا دوں؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کیوں نہیں ضرور بتائیں۔ آپؐ نے اپنی زبان اپنی انگلیوں سے پکڑ لی اور فرمایا اسے اپنے قابو میں رکھو۔‘‘

’’اماں! کبھی یہ باتیں آپ اپنے میاں کو بھی سمجھائیں۔‘‘

’’ان کے لیے تو میں بس دعا ہی کر سکتی ہوں بیٹا۔‘‘

ابا گھر میں نہ ہوتے تو گھر کی فضا ہی بدل جاتی۔ امی ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتیں اور گھر کے کام کاج کرتے ہوئے اپنی موسٹ فیوریٹ لتا منگیشکر کے پرانے گانے دھیمی آواز میں سننے لگتیں۔

لتا کے گانے سننا امی کے لیے دنیا کی سب سے بڑی ’’لگژری‘‘ تھی۔ امی اسکول کے زمانے سے لتا کی آواز کی شیدائی تھیں۔ لتا کے گانے سننا امی کا پہلا عشق تھا۔ اپنے اسکول کے زمانے میں وہ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر جو بڑے ماما نے انہیں دبئی سے لا کر دیا تھا، اپنے سرہانے رکھ کر بڑے شوق سے لتا کے گانے سنتیں۔ لتا کے گانے سنتے سنتے ان کے دل میں ان کی زندگی کے دوسرے عشق نے گھر کر لیا تھا۔

اظہر ان کی سہیلی عافیہ کا چچا زاد تھا۔ لانبا، چھریرا اور قدرتی طور پر گھنگھریالے بالوں والا۔ اچھی نوکری کی تلاش میں اٹک سے پنڈی آیا تھا اور اپنے چچا کے ہاں مقیم ہوا تھا۔ عافیہ امی کی محلہ دار بھی تھی اور اسکول میں ان کی ہم جماعت بھی۔ جن دنوں اظہر، عافیہ کے ہاں مہمان ہوا، امی اور عافیہ دسویں جماعت کی طالبات تھیں۔

اظہر کے آتے ہی محلہ کی نوجوان لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ عافیہ کو، جس کے گھر کا وہ مہمان ہوا تھا، رشک سے دیکھا جانے لگا۔ اظہر کی ٹکر کا محلہ میں اس سے پہلے کبھی کوئی نوجوان دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ فلمی ہیرو لگتا تھا۔ عافیہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ خالہ نے اپنے بیٹے سے اس کا رشتہ مانگ رکھا تھا لہٰذا اظہر کے آنے سے اسے کچھ فرق نہیں پڑا۔ دو سے گویا تین بھائی ہو گئے گھر میں۔ امی کو آج بھی یاد تھا، وہ برکھا کی ایک شام تھی جب وہ عافیہ سے اس کی ریاضی کی نوٹ بک لینے اس کے گھر گئی تھیں۔ اظہر کو انہوں نے آتے جاتے دیکھ رکھا تھا۔ راہبہ نہ تھیں۔ محلہ کی دوسری لڑکیوں کی طرح اظہر کے بارے میں ان کے بھی دلی جذبات کم و بیش وہی تھے جو اس عمر کی لڑکیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کچھ باتیں ’’عین فطرت‘‘ ہوتی ہیں سو امی بھی ماورا نہ رہ سکیں۔

دو دن بعد ایک روز اسکول جاتے ہوئے عافیہ نے امی سے بڑی رازداری سے کہا۔ ’’تجھے ایک بات بتاؤں عالیہ...... اظہر بھائی تجھ سے پیار کرنے لگے ہیں۔‘‘

امی جو، ان دنوں اپنی ٹین ایج میں تھیں، بے ساختہ ٹھٹک گئیں۔ ’’بدتمیز!‘‘ انہوں نے عافیہ کو آنکھیں دکھائیں۔

’’سچ کہہ رہی ہوں۔‘‘ عافیہ مسکرائی۔

امی ٹھٹکی کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔

’’ایمان سے!‘‘ عافیہ کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

’’چپ کر۔‘‘ امی نے اسے گھڑکا۔

''تیری جان کی قسم۔''

''بکواس مت کر۔''

''ہائے قسم سے...... اچھا رک کیوں گئی ہے...... چل نا...... دیر ہو جائے گی۔'' عافیہ نے امی کو ٹہوکا دیا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں اور عافیہ نے دھیمے سُروں میں امی کو بتایا۔ ''پتا ہے کیا...... کل اظہر بھائی مجھ سے کہنے لگے ''عافیہ! وہ جو اس دن تمہاری کوئی دوست تمہاری کاپی لینے آئی تھی اس کا کیا نام ہے......'' میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔ میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا اچھی لگی ہے کیا! ادھر ادھر دیکھا پھر آہستہ سے بولے ''ابھی کسی سے کہنا مت۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میری اچھی بہن ہو۔''

''ہائے اللہ!'' امی نے سہم کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

عافیہ ہنس پڑی۔ ''پگلی! ہائے اللہ کی کیا بات...... جب سے اظہر بھائی ہمارے گھر آئے ہیں محلہ کی لڑکیاں بہانے بہانے ہمارے گھر آنے جانے لگی ہیں۔ تو پہلی لڑکی ہے جس کے بارے میں اظہر بھائی نے پوچھا ہے۔ تجھ سے پہلے محلہ کی کسی لڑکی کو لفٹ نہیں کرائی انہوں نے۔''

''میں کون سا مری جا رہی تھی ان کے لفٹ کرائے بغیر۔'' امی جو دسویں جماعت کی ایک الہڑ لڑکی تھیں، بولیں۔

''اب تو تجھے مرنا پڑے گا۔'' عافیہ نے کہا۔

''کیوں!'' امی نے بہ ظاہر بڑی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''کیونکہ اظہر بھائی نے بی کام کی ڈگری لے رکھی ہے۔ اتنے ہینڈسم ہیں۔ کوئی اچھی جاب بھی مل ہی جائے گی۔''

''مجھے کیا!'' امی نے وہی بے نیازی دکھائی۔

''پتا ہے چار بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ چچا ان کی کوئی بات ٹالتے نہیں...... اچھا، ایک بات بتا سچ سچ...... شادی کرے گی ان سے؟''

امی کو اپنے دل میں گدگدی سی محسوس ہوئی۔

''بول...... کرے گی؟'' عافیہ نے امی کے بازو کو اپنی کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''

اس رات ٹیپ ریکارڈر پر لتا کی کیسٹ لگائے لتا کی میٹھی، مدھر آواز سنتے ہوئے امی کا دھیان بار بار عافیہ کے کزن اظہر کی طرف جاتا رہا اور انہیں اپنے من میں گدگدی سی محسوس ہوتی رہی۔

اسکول آتے جاتے اظہر اکثر گلی میں دکھائی دینے لگا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں امی کی بابت اپنی پسندیدگی ظاہر کرتا۔ امی سمٹی سمٹائی، کتابیں سینے سے لگائے، نظریں چرائے اس کے قریب سے گزر جاتیں پھر ایک روز عافیہ کی زبانی پتا چلا اظہر کو ایک سرکاری محکمہ میں نوکری بھی مل گئی تھی اور اس نوکری کی وجہ سے اس نے پنڈی کو اپنا مستقل مسکن بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ امی کو یک گونہ خوشی ہوئی۔

''میں نے اظہر بھائی کو بتایا کہ عالیہ لتا منگیشکر کے گانے بہت شوق سے سنتی ہے...... پتا ہے کیا، چار کیسٹیں خرید لائے اور اب رات کو اظہر بھائی بھی لتا کے گانے سنتے ہیں۔'' دسویں کے امتحانات کے دوران ایک روز عافیہ نے امی کو بتایا۔

''پاگل ہیں۔'' امی نے پھر اسی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں...... ہیں تو۔'' عافیہ نے کہا۔

''کیا مطلب!'' امی چونکیں۔

''جن پر لوگ مرتے ہیں وہ تجھ سے پیار کرتے ہیں اور تو...... انہیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی...... تجھے تو ان سے عشق کرنا چاہیے، عشق۔''

''اماں کہتی ہیں...... لڑکیوں کو عشق، شادی کے بعد کرنا چاہیے...... صرف اپنے شوہر سے۔'' امی نے کہا۔

''عشق ہوگا تو شوہر بنے گا نا وہ۔'' عافیہ بے حجابی پر اتر آئی۔

''نہیں نہیں...... میں تو اسی سے عشق کروں گی جس سے میری شادی ہوگی۔'' امی بولیں۔

مگر دل کے اندر کہیں امی کو اظہر سے عشق ہو چکا تھا۔

دسویں کا نتیجہ بھی نہ آیا تھا کہ امی کے لیے ابا کے ایک جاننے والے کے توسط سے رشتہ آ گیا۔ لڑکا بی اے پاس تھا۔ نیم سرکاری ادارے میں ملازم۔ اپنے گھر کی چھت میسر تھی۔ عزت سے گزر بسر کا یقین تھا۔

اماں نے ابا سے کہا۔ ''لڑکے کے چال چلن کے بارے میں اطمینان کر لیں، اطمینان ہو جائے تو بسم اللہ۔''

امتحانات کے بعد عافیہ نے سلائی کڑھائی اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ امی کا اب اس سے کم کم ملنا ہو رہا تھا۔ امی کے لیے رشتہ آیا تو امی عافیہ سے ملنے کے بہانے اسے اور اس کے توسط سے اظہر کو یہ خبر سنانے کے لیے عافیہ کے گھر گئیں۔

''اظہر بھائی کا انگلینڈ کا ویزا لگ گیا ہے۔ وہ انگلینڈ چلے جائیں گے۔'' عافیہ نے بتایا۔ ''اب ان کی شادی بھی وہیں ہوگی...... چچا کے ایک دوست کی بیٹی سے۔''

''اور نوکری؟'' امی کو اپنی آواز بہت دور سے آتی

محسوس ہوئی۔

''نوکری چھوڑ دیں گے...... نوکری کا کیا ہے یار...... انگلینڈ کا ویزا اور باہر کی لڑکی کون چھوڑتا ہے۔''

امی کو یوں لگا جیسے کانچ کے کسی پیالے کو زوردار ضرب لگنے سے اس پر تار عنکبوت بن گیا ہو۔

شادی کے بعد امی اپنے نئے گھر آ گئیں۔ لتا کی آواز کی وہ آج بھی ویسی ہی شیدائی تھیں۔ اظہر ان کے لیے یادِ رفتہ بن چکا تھا۔ ابا ان کا پہلا اور آخری عشق قرار پا چکے تھے۔

دل میں تمہیں بسا کے
کرلوں گی میں بند آنکھیں
پوجا کروں گی تیری
ہو کے رہوں گی تیری

''یار اماں اب تو توبہ کر لیں۔'' مان امی کو ایسے گانے سنتے دیکھ کر چھیڑتا۔ ''اب بھی آپ انہی کی بن کر رہنا چاہتی ہیں...... اب تو اپنا پیچھا چھڑائیں ان سے اور ہمارا بھی۔''

''ہیں ہیں...... کیا بک رہے ہو۔'' امی آنکھیں نکالتیں۔

''طلاق لے لیں...... آپ بھی سکون سے رہیں گی ہم بھی مزے میں۔''

''وہ جوتے لگاؤں گی تمہارے کہ یاد کرو گے...... میری اور تمہاری عزت انہی کے دم سے ہے...... سمجھے۔''

امی اگلا گانا سنتے ہوئے خود بھی گنگنانے لگتیں۔

انکھیوں کے جھروکوں سے
میں نے دیکھا جو سانورے
مجھے تم نظر آئے
بڑی دور نظر آئے

''اوہو ہو اماں جی بہت دور نہ نکل جانا کہیں۔'' شان لتا کی سنگت میں گنگناتی اماں کے انہماک میں مخل ہوتا اور چھیڑنے کی خاطر کہتا۔ ''آپ کو کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملا تھا شادی کرنے کے لیے۔''

''ہمارے ہاں شادی کے لیے ماں باپ لڑکا دیکھتے ہیں لڑکی خود پسند نہیں کرتی۔'' امی کہتیں۔

''آپ کے اماں ابا کو آپ سے کوئی دشمنی تھی کیا جو ایسا آدمی دیکھا آپ کے لیے۔''

''کیا برائی ہے...... دیکھنے میں اچھے ہیں...... شریف ہیں...... پڑھے لکھے ہیں۔''

''بس ذرا زبان کے نٹس ڈھیلے ہیں اور ہاتھ بے قابو۔'' مان مسکراتا۔

12واں کھلاڑی

☆ڈاکٹر نے کرکٹ کھیلنے سے منع کر دیا ہے۔

○اچھا اس نے تمہیں کرکٹ کھیلتے دیکھ لیا ہوگا۔

☆بیوی نے دھمکی دی ہے میں نے کرکٹ نہ چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ دے گی۔

○یقین کر دیار میں بیوی کو بہت مس کروں گا۔

☆خود فریبی کا عادی نا اہل بلے باز کریز پر موجود تھا۔ وکٹ کیپر سے بولا۔ تمہارے خیال میں اس وقت دنیا میں کتنے عظیم کھلاڑی ہیں۔

○وکٹ کیپر نے چونک کر جواب دیا۔ تمہارے انداز سے ایک کم۔

مرسلہ: مومنہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کسی روز جب امی کا دل شان کی دھنائی پر کچھ زیادہ ہی پر ملال ہوتا تو کیسٹ بدل جاتی۔

نہ کوئی امنگ ہے
نہ کوئی ترنگ ہے
میری زندگی ہے کیا
اک کٹی پتنگ ہے

ملیحہ کا دل دکھنے لگتا۔

''امی جی بس میری تعلیم مکمل ہو جائے۔ میں جاب کر لوں گی...... ہم ابا سے الگ رہیں گے۔'' وہ امی کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی۔

''نہیں بیٹا۔'' امی ملیحہ کا خیال فوری رد کر دیتیں۔ ''عورت مرد سے بھاری ہوتی ہے...... تمہارے ابا جیسے بھی ہیں ان کے بنا میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔''

''اف اللہ امی...... اب پتی ورتا زمانہ نہیں رہا ہے جب عورت بے چاری کو مرد کی چتا کے ساتھ ہی زندہ جل جانا ہوتا تھا...... عورت کی اپنی ایک حیثیت ہے۔'' ملیحہ کو امی کی کم فہمی پر افسوس ہوتا۔

''کوئی حیثیت نہیں...... آج تمہارے ابا اللہ نہ کرے مجھ سے الگ ہو جائیں تو اپنے پرائے سو سو طرح انگلیاں اٹھائیں گے مجھ پر اور جو عیب نہیں بھی ہوگا مجھ میں وہ بھی لگا دیں گے...... اکیلی عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''

''میں آپ کو اکیلی رہ کر اور اپنی حیثیت منوا کر دکھاؤں گی...... سی ایس ایس کر کے اپنی پوسٹنگ کسی پاورفل

محکمہ میں کرواؤں گی...... پھر دیکھیے گا آپ۔"

"پاگل ہو تم...... عورت کتنی ہی بڑی افسر کیوں نہ لگ جائے عورت ہی رہتی ہے اور...... اکیلی بھلا کیوں رہو گی تم!"

"میں شادی نہیں کروں گی۔"

"بدفال منہ سے کیوں نکالتی ہو۔" امی ملیحہ کو آنکھیں دکھاتیں۔

"بدفال کیوں...... ابا جیسے آدمی سے شادی کرنے سے بہتر ہے شادی کی ہی نہ جائے۔"

"ابا میں کیا برائی ہے آخر...... بس گالیاں ہی تو دیتے ہیں نا...... مار تم میں سے جس کو بھی پڑتی ہے اپنی غلطی کی وجہ سے۔"

"ہاں بھئی ہم سب غلط ہیں۔ بس آپ اور آپ کی لاڈو ماسی ماں ٹھیک ہیں...... آپ کو اپنے میاں اور اسے اپنے ابا...... جیسے ہیں جہاں ہیں کی بنیاد پر نہ صرف قبول بلکہ بہت پیارے ہیں۔"

"کیوں نہ ہوں بھلا!" امی مسکراتیں۔

"اچھا بھئی اچھا...... کیجیے...... خوب عشق کیجیے آپ اپنے میاں جی سے اور ماسی ماں اپنے ابا جی سے۔" بھائیوں کی نقل میں ملیحہ بھی معصومہ کو ماسی ماں کہتی۔

"تمہیں کیا...... مجھے تو اپنے ابا بہت اچھے لگتے ہیں۔" معصومہ بہن کی بات پر منہ بناتے ہوئے کہتی۔ اسے ابا اپنی تمام تر کرختگی کے باوجود اچھے لگتے تھے۔ جب اس سے بڑے تینوں بہن بھائی مل بیٹھ کر ابا کی برائی شروع کرتے تو وہ ان سے بارہ پتھر پرے بیٹھی رہتی اور اپنی باریک سی آواز میں کہتی۔ "آنے دو ابا کو بتاؤں گی میں تم لوگوں کی باتیں۔"

"ابا کو بتاؤں گی۔" شان اس کی نقل اتارتا۔

"ایک لتر کبھی اسے بھی تیرے معیار کا پڑ جائے نا تو یہ کیا اس کے فرشتے بھی کبھی ابا کو بتانے کی بات نہ کریں۔" مان کہتا۔

"آپ لوگ ابا کی اتی برائیاں کیوں کرتے ہو؟"

"کبھی ابا سے بھی پوچھو کہ وہ ہمیں کبھی کتے کا بچہ، کبھی گدھے کی نسل کیوں بنا دیتے ہیں۔"

"وہ ابا ہیں۔" معصومہ وکالت کرتی۔ "انہیں غصہ آتا ہوگا نا تم لوگوں کی حرکتوں پر۔"

"انہیں اگر غصہ آتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں آسکتا۔"

"مجھے تو ابا اچھے لگتے ہیں۔"

"تمہارے پیچ ڈھیلے ہیں۔" مان اپنی حرکات وسکنات سے معصومہ کے دماغ میں خلل ہونا ظاہر کرتا۔ معصومہ پروا نہ کرتی۔ ابا سے اپنی محبت کے معاملے میں اس کے اور امی کے ستارے ملتے جلتے تھے۔ دونوں کی محبت غیر مشروط تھی۔ دونوں کے نزدیک ابا جہاں تھے جیسے تھے، اچھے تھے۔

◆ ◆ ◆

ابا ایسے کیوں تھے یہ کسی نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی...... خود ابا نے بھی نہیں، جو گھر والوں سے گالم گلوچ اور مار پیٹ کے بعد بہ باطن خود کو اکثر ملامت کرتے تھے۔ مان اور بالخصوص شان کو مارنے پیٹنے کے بعد وہ دل ہی دل میں از حد ملول ہوتے۔ تخلیہ میں وہ اپنے مار پیٹ کرنے والے ان ہاتھوں کو ان کے جرم کی پاداش میں اکثر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو اس بری طرح مروڑتے جیسے توڑ ہی تو ڈالیں گے۔ بال بچوں کو برا بھلا کہنے اور گالیاں بکنے والی زبان کو وہ ناقابل برداشت حد تک اپنے دانتوں تلے دبا لیتے۔ امی اور بچوں کو برا بھلا کہہ کر یا مار پیٹ کر گھر سے نکلتے ہی اور کبھی کبھی گھر میں بھی انہیں احساس ندامت آن گھیرتا۔ گالیاں کھا کر مان کے شرمندہ ہونے اور مار کھا کر شان کے بلبلا اٹھنے کی بازگشت انہیں دل گرفتہ کر دیتی۔ گھر سے باہر ہوتے تو شان کی بلبلاہٹ کا یاد آنا انہیں مضطرب رکھتا۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے وہ بہ طور زخم دوز گھر والوں کے لیے پھل فروٹ، مٹھائی، نمکو غرض کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ دل میں تہیہ کر لیتے کہ آئندہ نہ کسی کو گالی دیں گے، نہ بچوں میں کسی کو ماریں پیٹیں گے۔ لیکن اپنے عہد پر قائم نہ رہ پاتے۔ کوئی بات نہ بھی ہوتی تو بھی ان کی زبان دشنام طرازی کو مچلنے لگتی۔ ہاتھوں میں چل سی ہونے لگتی۔ کبھی مان کے بال ہاتھوں میں آجاتے، کبھی شان پر ان کی لاتیں برسنے لگتیں۔

ان کے اپنے ابا تو ایسے نہ تھے۔ وہ تو نہایت ٹھنڈے مزاج کے اور پیار کرنے والے آدمی تھے۔ شاید یہ ابا کے حالات کا ردعمل تھا۔ صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک مسلسل کام کر کے بھی ابا کے ہاتھ میں وہ نہ آتا جس سے وہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضرورتیں کماحقہ پوری کر سکتے، کبھی آٹا مہینا ختم ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا، کبھی چاول کا کنستر دہائی دینے لگتا۔ کبھی کلکنگ آئل کا خالی ڈبا منہ چڑانے لگتا تو کبھی چائے کی پتی وقت سے پہلے دغا دے جاتی۔ کبھی مان کی فیس تو کبھی ملیحہ کی سمسٹر فیس۔ کبھی شان کی یونیفارم چھوٹی ہو جاتی تو کبھی معصومہ کو پریکٹیکل جرنلز خریدنا ہوتے۔ کبھی ابا کا جوتا اتنا گھس جاتا کہ تلے میں سوراخ ہو جاتے، کبھی امی کے جسم کے جوڑ اتنے دکھنے لگتے کہ ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ٹھہرتا۔ ایک تھوڑی ہزار خرچے تھے اور ہر خرچہ اپنی جگہ انتہائی ضروری! اس پر مستزاد روز افزوں ہوشربا مہنگائی...... مہینا کے آخر میں تو ابا اپنی الماری میں ہینگرز پر لٹکی پتلونوں اور قمیصوں کی جیبیں ہی چپکے چپکے ٹٹولتے رہتے کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ کسی جیب سے زیادہ نہیں تو چند سو روپے ہی نکل آئیں...... کبھی کبھی تو معجزے کی یہ تمنا گھٹتے گھٹتے سکوں تک آٹھہرتی...... کچھ ریزگاری مل جائے تو اگلے دو دن کام پر پہنچنے کا آسرا تو ہو جائے۔ تیسرے دن تو پہلی تاریخ تھی ہی۔

پہلی تاریخ کا انتظار بھی عجب جاں گسل انتظار ہوتا۔ مہینا کی ابتدائی تاریخوں میں ناشتے میں ڈبل روٹی بھی ہوتی، آملیٹ بھی۔ ابا پہلی تاریخ کو گھر کے سودا سلف کے ساتھ جام یا جیلی کی شیشی اور مکھن کی ٹکیا بھی لائے ہوتے۔ ابا کے غصے اور گالم گلوچ میں بھی قدرے افاقہ رہتا۔ پھر جام جیلی کی شیشی اور مکھن کی ٹکیا ختم ہو جاتی۔ ابا کہتے "پیٹو ہیں سالے، ہفتہ بھی نہیں گزرتا جام کی شیشی بھی ختم مکھن بھی ہڑپ۔" گویا جام کی شیشی جام سے بھرا مرتبان تھی اور مکھن کی ٹکیا سل برابر تو وہ جسے مہینا بھر میں ختم ہونا چاہیے تھا۔ مہینے کی درمیانی تاریخوں تک ناشتے میں ڈبل روٹی اور انڈوں کا خاگینہ ملتا دو انڈوں میں امی کم سے کم دو پیاز اور ایک ٹماٹر کتر کر خاگینہ بناتیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں ہفتہ میں ایک دو مرتبہ بڑے کا گوشت اور سبزی کا سالن یا چکن بھی نصیب ہو جاتی۔ پھر مینو بدل جاتا۔ بیس تک پہنچتے پہنچتے ناشتے میں ڈبل روٹی کے سادہ سلائس رہ جاتے۔ خاگینہ بھی غائب ہو جاتا، ناشتا میں ڈبل روٹی کا استعمال ابا کو اس لیے وارے میں لگتا تھا کہ بصورت دیگر پراٹھوں میں تیل یا گھی صرف ہوتا۔ بیس کے بعد گوشت اور چکن کو فل اسٹاپ لگ جاتا۔ سبزی یا پھر دال...... ابا کا غصہ اور گالیوں کی رفتار بھی بڑھ جاتی۔ ابا پھونک پھونک کر جیب میں ہاتھ ڈالتے...... مہینا کے آخری دن تو عجیب بے کسی میں گزرتے...... ایک ایک کا منہ دیکھتے ہوئے...... ناشتا سے ڈبل روٹی غائب ہو جاتی...... توے کو تیل کی پھریری لگا کر رات کی باسی روٹی کو پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر توے پر گرم کر لیا جاتا۔ رات کی بچی دال سبزی ہوتی تو خیر ورنہ توے پر گرم کی ہوئی روٹی چائے سے کھا لی جاتی...... الماری میں لٹکی پتلونوں اور قمیصوں کی جیبیں ٹٹولتے کھنگالتے ابا کا غصہ اور گالیوں کی رفتار انتہائی حدوں کو چھونے لگتی۔ امی اپنی انگلیوں کی پوروں پر چار پانچ دن پرے پہلی تاریخ کا حساب یوں لگاتیں جیسے صدیاں گن رہی ہوں۔ "آج چھبیس ہوگئی کل ستائیس پھر اٹھائیس، انتیس، تیس۔" انگلیوں کی پوروں پر تاریخیں گن لینے کے بعد امی دنوں کا حساب لگاتیں۔

"آج جمعرات ہے...... کل جمعہ...... پھر ہفتہ، اتوار، پیر...... منگل کو پہلی۔" اور جو خدانخواستہ پہلی تاریخ کسی چھٹی والے دن پڑتی تو امی کو دسمبر، جنوری اور جولائی، اگست کی طرح سخت کھلتا۔ "لو یہ مہینا بھی اکتیس کا ہوگیا۔" سال میں دو مرتبہ بینک ہالیڈے جولائی اور جنوری کے مہینوں کو بتیس دن کا بنا دیتا۔ ابا کبھی دل ہی دل میں کبھی منہ ہی منہ میں بھی بینک والوں کو کبھی پالیسی سازوں کو برا بھلا کہنے لگتے۔ "پہلے ہی کچھ کم چھٹیاں ہوتی ہیں جو سالا یہ بینک ہالیڈے اور ...... یہ بینک والے کلوزنگ کر کے ہم عوام کی تو جیسے سات نسلوں پر احسان کرتے ہیں نا...... بونس نہیں ملتا ہے کیا...... جیبیں بھر بھر کے تنخواہیں لے جاتے ہیں...... یہ ایڈوانس...... وہ ایڈوانس...... فلاں بونس...... فلاں بونس...... بچوں کی پڑھائی کا خرچا تو باپ کے مرنے کا خرچا...... ان کے تو سالے ڈرائیوروں اور نائب قاصدوں کی بھی پانچوں گھی میں ہوتی ہیں۔" ابا کی گالیاں سنتے سنتے پہلی آجاتی اور چند دنوں کے لیے ابا کے غصہ اور گالیوں میں کچھ افاقہ ہو جاتا۔

معاشی مسائل کے علاوہ ابا کو اور بہت سے مسائل کا بھی سامنا رہتا۔ گھر سے باہر زندگی گھر کے اندر سے بھی زیادہ مشکل تھی...... ہر طرف نفسا نفسی اور افراتفری...... ہر شخص دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کے لیے تیار...... وقت سے پہلے ہی حشر کا سماں گویا! دکانوں میں جاؤ تو ہوشربا گرانی...... سڑکوں پر نکلو تو وحشت کا رقص...... نہ دوسرے کی عزت اور حقوق کا پاس نہ اپنی اور دوسروں کی جانی حفاظت اور ٹریفک قوانین کا احساس...... دفتر جانے اور گھر واپس آنے کے لیے ابا کو روزانہ عوامی بسوں میں سفر کرنا جسمانی اور روحانی اذیت سے دوچار کرتا۔ منی بسوں میں سر دھڑ کو ایک سو بیس کے زاویہ پر رکھے رکھے کمر تختہ ہو جاتی، وقت سے پہلے گھر سے نکلنے کے باوجود دفتر پہنچنے میں آئے دن دیر ہوتی۔ خامیوں اور کوتاہیوں والا افسر بھی ابا کو آئینہ دکھانے کھڑا ہو جاتا۔ "صابر صاحب! آج پھر سات منٹ لیٹ پہنچے ہیں آپ۔" ابا دل ہی دل میں اسے ایک غلیظ گالی دیتے اور زبان سے کہتے۔ "سوری سر! ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تھا۔"

"ایک آپ ہی کا تو نہیں یہ تو سب کا مسئلہ ہے۔" افسر کہتا۔

"سر! میرے روٹ پر پبلک ٹرانسپورٹ کی قلت ہے۔"

"جلدی نکلا کریں گھر سے...... دو گرم پراٹھے کھا کر

نکلنا تو ضروری نہیں۔"

"تیری ماں کی......" ابا دل ہی دل میں پھنکارتے۔

"مردود، سب کے سامنے ذلیل کرتا ہے۔"

"وقت پہ آیا کریں۔" افسر تنبیہ کرتا۔

ابا اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے۔ صبح سے شام تک انتہائی ایمانداری اور جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف رہتے اور چھٹی کے بعد دفتر سے نکلتے وقت اپنے افسر کے کمرے کا دروازہ بند اور اس کے باہر بیٹھے چپڑاسی کو دیکھ کر سوچتے آج اس نے نہ جانے کتنے لوگوں سے کہا ہوگا صاحب میٹنگ میں ہیں۔ دل ہی دل میں ابا اپنے بے ایمان افسر کو بکھانا شروع کر دیتے۔ "خبیث! دوسروں کے پانچ سات منٹ لیٹ ہونے پر ان کے گرم پراٹھے گننے کھڑا ہو جاتا ہے اور خود! کتے کا بچہ دس بجتے ہی گاڑی دبا کر بچوں کے پوتڑے دھونے گھر پہنچ جاتا ہے...... اور وہ اس کا چمچہ سردر خان مردود ہر فون کال پر...... صاحب میٹنگ میں ہیں...... اور ہر وزیٹر کو ایک ہی گولی...... صاحب ابھی دفتر کے کام سے باہر نکلے ہیں۔"

دفتر پہنچنے میں کبھی کبھار لیٹ ہو جانے سے قطع نظر ابا اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی نہایت دیانت اور جانفشانی سے کرتے۔ اسی لیے بددیانت اور تساہل پسند لوگوں سے انہیں چڑ تھی۔ ایسے لوگوں کو ابا کبھی دل ہی دل میں اور کبھی علی الاعلان بھی گالیاں دینے سے گریز نہ کرتے۔ اپنے افسر کی طرح کے خودرا فضیحت دیگراں نصیحت قسم کے لوگ ابا کا میٹر گھما کر رکھ دیتے۔ "کمینے! اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے۔"

ابا کی صحیح قدر امی کو تھی۔ "شکر کرو رزق حلال ڈالتے ہیں تمہارے باپ تمہارے پیٹوں میں۔" وہ بچوں سے کہتیں۔

"یار اماں کسی امیر آدمی سے شادی کرتیں ناں۔" مان کو حسب عادت شوخی سوجھتی۔

"ہاں...... ہم بھی کے ایف سی اور میکڈونلڈ تو جاتے۔" ملیحہ کہتی۔

"سائن بورڈ پر ہی زنگر دیکھ کر دل للچانے لگتا ہے۔" شان زور کا چٹخارہ بھرتا۔

"ندیدے!" امی تینوں کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑاتیں۔

"مان! میکڈونلڈ کا برگر کتنے کا ملتا ہوگا؟" شان امی سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مان کو آنکھ مارتا۔

"مجھے کیا پتا...... کبھی جائیں تو پتا چلے۔"

"پیسے جمع کر دیار...... چلیں گے کسی دن۔" ملیحہ تجویز دیتی۔

"میں بھی!" معصومہ منمناتی۔

امی اسے گھورتیں۔ "بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔" معصومہ کی نقل اتارتیں۔ "میں بھی۔"

"ساری دنیا جاتی ہے امی۔" مان کا لہجہ جار ہو جاتا۔

"ہاں اور کیا۔" ملیحہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ " ایک ہم ہی...... سارا وقت گھر میں مرے رہتے ہیں۔"

"کون کہتا ہے مرے رہو۔ جاؤ...... پیسے ہیں ا جیب میں؟" امی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔

"پیسے تو خیر جمع ہو ہی جائیں گے مگر...... وہ آپ جھڑوس میاں جو ہیں ناں آدم بو آدم بو کرتے ہمیں ذ کرنے وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔" ملیحہ کہتی۔

"شرم نہیں آتی باپ کو جھڑوس کہتے ہوئے۔" ا اسے آنکھیں دکھاتیں۔

"آپ کے میاں کو یار۔" ملیحہ اترا کر امی کے میں باہیں حمائل کر دیتی۔

"میرا میاں تمہارا تو جیسے کچھ لگتا ہی نہیں۔" امی ا کی باہیں جھٹکنے کی کوشش کرتیں۔

"یار اماں! آج آپ بتا ہی دیں...... ان سے بہتر نہیں مل سکتے تھے آپ کو ہمارے لیے۔" مان پھو کے سے کہتا۔

"شکر کرو کہ یہ بھی مل گئے۔" امی مان کو گھورتیں۔

"ہیں! کیا اباؤں کا اتنا کال تھا۔" ملیحہ آنکھ دبا ہوئے شان کو مسخرے پن سے دیکھتی۔

ابا کی عدم موجودگی میں مان اور شان کی خرمستیا امی کو آدا از ارر کھتیں۔ ٹی وی فل والیوم پر آن رہتا۔ ڈبل دونوں کے لیے اکھاڑا بنا رہتا، معصومہ ریفری بنی گنتی رہی ہوتی۔ "سیون...... ایٹ...... نائن...... ٹین۔"

ایسے میں اگر کہیں امی موقع واردات پر پہنچ جا معصومہ کا کان اپنے ہاتھ میں دبوچ کر کہتیں۔ "ٹین کی بچی! معصومہ منہ بسورنے لگتی۔ "مان بھائی نے کہا ریفری بنو۔"

"شکل دیکھی ہے اپنی۔"

"شکل تو پوری ریفریوں والی ہی ہے امی۔" اچھ اچھل کر شان کو بیک اپ کرتی ملیحہ مسکراتی۔

"اپنی شکل دیکھی ہے تم نے۔" امی ملیحہ کو گھورتیں۔

"بیا شاباسو۔" چاروں شانے چت پڑا شان لگاتا۔

”ہیں! بی پاشا تو کالی کلوٹی حیدرآبادن تھی، میرے بچپن میں ہمارے پڑوس میں رہا کرتی تھی...... تجھے اس کا نام کس نے بتایا؟“ امی حیران ہوتیں۔

شان قہقہہ لگاتا۔ ”یار اماں، یہ آپ کے بچپن کی حیدرآبادی پڑوسن کی نہیں پڑوسی ملک کی فلم اسٹار بپاشا کی بات کررہا ہے۔“

”ہاں پڑوسی ملک کے فلم اسٹاروں کی تو اسے پوری ابجد یاد ہے۔“ امی شان کو گھورتیں۔ ”ہارا ہوا پہلوان! کیسا چاروں شانے چت پڑا ہے...... چل اٹھ...... نالائق کہیں کا۔“

”بھائی سے کہیں میرے سینے پر سے اپنا پاؤں ہٹائیں۔“ شان منمناتا۔

”اتنا بڑا الم ڈھینگ!“ امی اب مان کو آنکھیں دکھاتیں۔ ”شرم تو نہیں آتی، چھوٹے بھائی کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑے ہو...... بہت اچھا کرتے ہیں تمہارے ابا تمہارے ساتھ...... اتنی سختی نہ رکھیں تم لوگوں پر تو تم لوگ آسمان سے ستارے نوچ لاؤ۔“

”محبت مجھے ان جوانوں سے ہے، ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند۔“ اپنا پاؤں شان کے سینے سے ہٹاتے ہوئے مان خاصے انقلابی انداز میں کلام اقبال ادا کرتا اور امی کے گھورنے پر کھی کھی کرنے لگتا۔ شان، ملیحہ اور معصومہ بھی اپنا اپنا منہ دبا کر ہنسنے لگتے۔ امی بڑبڑاتی ہوئی واپس پلٹ جاتیں۔

یہ ساری شرارتیں ابا کی عدم موجودگی ہی میں کی جاتیں۔ ابا کی موجودگی میں تو گھر سے آوازیں، رونق، زندگی کافور ہوجاتی۔ آس پڑوس میں بسنے والے بچے بڑے مان اور شان کو ذرا ذرا سی بات پر بس ایک ہی دھمکی دیتے۔ ”تمہارے ابا سے کہہ دیں گے۔“ اور بعض بدبخت کبھی سچی کبھی جھوٹی شکایتیں کر بھی دیتے۔ پھر جو شکایت دہندہ کی شامت آتی تو اللہ دے اور بندہ لے۔ جب شان کی دھنائی لگتی اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ”ہائے اللہ ابا جی اب نہیں...... اب نہیں میرے پیارے ابا جی اب نہیں...... اب نہیں۔“ کہتے ہوئے کبھی ادھر، کبھی ادھر گرتے پڑتے ہوئے تڑپتا، بلکتا تو ملیحہ کا ذہن ابا کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر غور فرمانے لگتا۔ معصومہ ایسے موقعوں پر امی کے آگے پیچھے دبکنے کی کوشش کرتی۔ امی کبھی اسے پناہ دے دیتیں کبھی بیزاری سے پرے دھکیلتے ہوئے کہتیں۔ ”دفع ہوجاؤ...... میں خود اپنی جان سے بیزار ہوں۔“

معصومہ گھر کے کسی کونے کھدرے میں دبک جاتی یا بڑے جستی صندوق کی آڑ میں جا چھپتی، اس کے بعد امی چپکے چپکے کبھی چوٹ کی ٹکور کرتیں کبھی زخموں پر برنال یا پولی فیکس لگاتیں۔ مار کھانے کے بعد شان دو تین گھنٹے وی آئی پی بنا رہتا۔ ملیحہ اسے اپنی جمع شدہ پونجی سے بسکٹ منگوا کر دیتی۔ معصومہ اپنے اسکول بیگ سے ٹافی، کینڈی، ببل گم یا بھنی مرغ دال کی مڑی تڑی سی تھیلی میں بچی چٹکی بھر مرغ دال اسے پیش کرتی۔ مان مثالی حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بیڈ پر کھل کر لیٹ رہنے کو جگہ دیتا یا پھر اپنی کوئی استعمال شدہ چیز اسے عطیہ کرنے میں راحت محسوس کرتا۔

”دونوں بھائی یونہی مل کر رہا کرو تو یہ کمبخت اتنی مار نہ کھائے۔“ امی دکھی لہجے میں کہتیں۔

”یہ پھر بھی اتنی ہی مار کھائے گا...... آپ میری بات لکھ لیں۔“ مان یقین سے کہتا۔

”کیوں! جب تم دونوں بھائی آپس میں مل کر رہو گے...... تم چھوٹے بھائی کو اچھا برا سمجھاتے رہو گے تو کیوں کھائے گا یہ مار؟“ امی شان کا بھرپور دفاع کرتیں۔

”امی جی! یہ پیدا ہی مار کھانے کے لیے ہوا ہے۔“ مان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی ہوتی۔

”خدا کا خوف کرو...... اس بے چارے کی تو ہڈی ہڈی دکھتی ہوگی۔“ امی شان کے سر سے پاؤں تک بہت سہج سہج اپنا ہاتھ پھیرتیں۔

مار کھانے کے بعد شان دو تین گھنٹے بڑے ٹھاٹ سے بستر پر پڑا رہتا۔ ایک آدھ دن ابا فقط گالیوں پر اکتفا کرتے پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات، ایسا واقعہ ہوجاتا جو شان کو ابا کے تھپڑوں، مکوں اور بیلٹ کی چٹاخ پٹاخ کے سامنے چک پھیریاں کھانے پر مجبور کردیتا۔ کبھی مان کی شامت بھی آجاتی۔ رواروی میں امی کو بھی ہاتھ لگ جاتے۔ ملیحہ اور معصومہ جب تک چھوٹی رہیں پٹتی رہتی تھیں مگر ان کے بڑے ہونے پر ابا نے ان پر ہاتھ تو اٹھانا چھوڑ دیا تھا تاہم غصے میں گالیاں اب بھی پڑ جاتی تھیں انہیں۔

* * *

ابا کے غصے اور بدکلامی کا یوں تو پوری ہی فیملی اثر لیتی تھی لیکن معصومہ سب سے زیادہ متاثر ہوتی تھی نتیجتاً بڑے بہن بھائیوں کے مقابلے میں وہ جسمانی طور پر بھی ناتواں تھی اور جذباتی اعتبار سے بھی کمزور۔ پڑھائی میں بھی کمزور تھی۔ کمرائے جماعت میں بھی وہ گھر کی طرح کسی کونے کھدرے میں دبک کر بیٹھنے کی کوشش کرتی۔ پڑھائی کے دوران اس کی نظریں کتاب پر رہتیں مگر ذہن ادھر ادھر بھٹکا رہتا۔ کبھی ابا کی گالیوں کی بازگشت تو کبھی شان کی مار پڑنے پر اس کی آہ و بکا کی یاد، کبھی ابا کی بات بے بات مان کو سرزنش تو کبھی امی پر چیخ پکار...... ٹیچر کوئی سوال پوچھتیں تو وہ گم صم سی کھڑی ہوجاتی۔ امتحان ہوتے تو کبھی مارجن پر اور کبھی رعایتی نمبروں سے پاس ہوتی۔ ابا کو مان اور ملیحہ کے ہاتھوں صفائی سے ترمیم شدہ رپورٹ دکھانی پڑتی۔ عقبی نشستوں پر اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھنے سے معصومہ کو ان کے بہت سے درون راز معاملات کی خبر رہتی۔ بڑی لڑکیوں کے ساتھ معصومہ کی نشست و برخاست کو اس کی بعض ہم جماعت لڑکیاں رشک سے دیکھتیں تو بعض شک سے۔ وقفہ کے دوران معصومہ کی بڑی ہم جماعتیں اسے اپنے ساتھ ہی بٹھالیتیں اور ایسی باتیں کرتیں جن سے معصومہ کو گدگدی سی ہونے لگتی۔

معصومہ کو نویں جماعت میں پہنچے چند ہی ہفتے گزرے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھنے والی بڑی لڑکیوں میں سے ایک، نیلوفر ایوب نامی لڑکی کا اپنے ہی ایک محلہ دار لڑکے سے افیئر چل رہا تھا جبکہ دوسری انیلہ فرمان کا صدر میں واقع ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک بڑی دکان پر ملازم نوجوان سیلز مین سے عشق عروج پر تھا۔ انیلہ اپنے والدین کے ہمراہ شاپنگ کے لیے اس دکان میں گئی تھی، بس وہیں اس سیلز مین نے انیلہ سے آنکھیں لڑائیں اور دکان کے ایک کارڈ پر اپنا فون نمبر لکھ کر چپکے سے اس تھیلے میں ڈال دیا جس میں انیلہ کے چھوٹے بھائی کے لیے خریدا ہوا سوٹ ڈالا گیا تھا۔ کارڈ پر لکھے گئے فون نمبر پر انیلہ نے موقع پاتے ہی فون کیا اور اس نوجوان سیلز مین سے رابطہ کیا یوں دونوں کا عشق چل پڑا۔ نیلوفر اور انیلہ روزانہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے عشق کے قصے سناتیں۔ دونوں کے پاس موبائل فون بھی تھے، وقفے میں دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے عشاق کے پیغامات پڑھواتیں۔ ہنستیں، مسکراتیں، قہقہے لگاتیں اور اپنے ساتھ بیٹھی معصومہ اور ارم کو بھی اپنی باتوں میں شریک رکھتیں۔ دونوں کو ان کے عاشقوں کی جانب سے محبت نامے بھی ملتے تھے، چھوٹے موٹے تحائف بھی۔ انیلہ کا دوست تو ایک روز اسے صبح اسکول آتے وقت راستے ہی سے ڈیٹ پر بھی لے جا چکا تھا اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا قصہ انیلہ نے مزے لے لے کر نیلوفر کو بطور خاص سنایا تھا، ارم اور معصومہ بھی کان لگائے سنتی رہیں۔ دونوں کے محبوب ارم اور معصومہ سے بھی واقف تھے۔ جب وہ ان سے ملنے کے لیے اسکول کے باہر گھات لگاتے تو دونوں نے انہیں اپنی قریبی دوستوں کی چہرہ آشنائی بھی کرادی تھی۔ چنانچہ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنی اپنی محبوباؤں کے نام محبت نامے وہ راہ گزرتی معصومہ یا ارم کو چپکے سے تھما جاتے۔

ایک روز نیلوفر کی انگریزی کی کاپی میں رکھا اس کے نام اس کے عاشق کا محبت نامہ پکڑا گیا۔ کاپی پڑتال کے لیے انگریزی کی ٹیچر کے پاس گئی تھی اور نیلوفر اس میں مذکورہ ”لولیٹر“ رکھ کر نکالنا بھول گئی تھی۔ خط کیا پکڑا گیا۔ کلاس میں تو جیسے بھونچال آگیا۔ ہیڈ مسٹریس نے ہنگامی بنیادوں پر تفصیلی انکوائری شروع کروا دی۔ کلاس کی لڑکیوں نے معصومہ اور ارم کے خلاف بھی گواہی دی۔ انکوائری کمیٹی نے معصومہ سے پوچھ گچھ کی تو اس نے قدرے ردوکد کے بعد اقرار کرلیا کہ وہ نیلوفر کے قصۂ عشق سے نہ صرف آگاہ تھی بلکہ ایک دو مرتبہ نیلوفر کے عاشق نے اسے اسکول گیٹ کے باہر لفافہ بھی دیا تھا نیلوفر کو پہنچانے کے لیے۔ بات کھلتے کھلتے انیلہ کا قصہ بھی کھل گیا اور معصومہ اس میں بھی قاصدہ پائی گئی۔ انکوائری کمیٹی کی ایما پر ہیڈ مسٹریس نے نہ صرف نیلوفر اور انیلہ بلکہ ارم اور معصومہ کے والدین کو بھی اسکول طلب کرلیا۔ انکوائری کمیٹی نے سفارش کی کہ چاروں لڑکیوں کی ماؤں ہی نہیں باپوں کو بھی بلایا جائے۔ انکوائری کمیٹی کا خیال تھا کہ مائیں اکثر اپنی اولاد کی غلطیوں پر پردے ڈال دیتی ہیں اور باپ سے چھپا جاتی ہیں لہٰذا لڑکیوں کی اصلاح کے لیے ماؤں کے ساتھ باپوں کو بھی بلانا ضروری تھا۔ ہیڈ مسٹریس نے اسکول ریکارڈ سے چاروں لڑکیوں کے گھروں اور ان کے باپوں کی جائے کار کے فون نمبرز نکلوائے اور خود بات کی۔ اسکول ریکارڈ میں معصومہ کے نام کے سامنے ایک ہی فون نمبر لکھا تھا اور وہ ابا کے دفتر کا تھا۔ ابا کو معصومہ کے اسکول سے فون آیا تو ان کا ماتھا ٹھنک گیا۔ ”پہلی فرصت میں آپ اور معصومہ کی امی اسکول آئیں...... ہو سکے تو آج ہی۔“ ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا۔ ابا کو دغدغہ لگ گیا۔ ایسی کیا بات تھی جو ہیڈ مسٹریس نے انہیں طلب کیا تھا۔ دفتر سے چھٹی لے کر وہ اسی دن اسکول جا پہنچے اور ہیڈ مسٹریس سے معذرتا کہا۔ ”میں دفتر سے آرہا ہوں اس لیے بچی کی والدہ کو ساتھ نہ لاسکا۔“

”کوئی بات نہیں...... آپ سے بات کرنا زیادہ ضروری ہے ہمارے لیے۔“ ہیڈ مسٹریس نے کہا اور انکوائری کمیٹی کی سربراہ کو اپنے دفتر میں طلب کرنے کے لیے انٹرکام پر بابو کو ہدایات دیں۔

انکوائری کمیٹی کی سربراہ ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں آئیں اور ابا کو ساری بات بتائی گئی۔

”آپ کی بچی خود تو کسی کے ساتھ ملوث نہیں مگر خدانخواستہ کسی وقت ہو سکتی ہے...... آپ کو اور اس کی والدہ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی دوستی اس قسم کی بڑی عمر کی لڑکیوں سے کیوں ہے...... جو لڑکا آج اس کے ذریعے کسی دوسری لڑکی کو خط بھجوا رہا ہے وہ کل آپ کی بچی کو بھی ٹریپ کر سکتا ہے...... یا کسی اور لڑکے کو آپ کی بیٹی کے پیچھے لگا سکتا ہے...... ایسے لفنگوں کا یہی ہوتا ہے۔“ کمیٹی کی سربراہ نے ابا سے کہا۔

”آپ فکر نہ کیجیے...... یہ نوبت نہیں آئے گی۔“ ابا نے کہا۔

ابا جو دو گھنٹے کی چھٹی لے کر دفتر سے نکلے تھے، دفتر واپس نہیں گئے۔ شام تک غصے کے گھونٹ پیتے ادھر ادھر گھومتے رہے۔ سوچتے رہے، انہیں تاؤ آ رہا تھا کہ معصومہ نے ایسی لڑکیوں سے دوستی کیوں کی تھی؟ وہ لغویات میں براہ راست نہ سہی بالواسطہ بھی کیوں ملوث ہوئی تھی آخر! ابا جتنا سوچتے گئے اسی قدر ان کا ذہن بوجھل ہوتا چلا گیا۔ ایک لمحے کو بھی ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ معصومہ نے گھر کے حالات سے گھبرا کر اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں کے بیچ پناہ لینے کی کوشش کی تھی...... وہ اس خدشہ پر تو غور کر رہے تھے کہ معصومہ خود بھی کسی لڑکے کے ساتھ توانوالو نہیں تھی مگر وہ اس امر پر غور نہیں کر رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو قصوروار وہ خود ہی نکلتے۔ بچوں کو بدکلامی، مار پیٹ، خوف اور اپنے سے دوری کے سوا انہوں نے اور کیا دیا تھا۔ کہیں نہ کہیں تو پناہ لینی ہی تھی انہوں نے۔

شام کو ابا گھر آئے تو ان کے چہرے پر پتھروں کی سی سختی تھی۔ امی اور بچے ڈرے سہمے سے تھے۔ معصومہ اسکول سے واپسی پر بتا چکی تھی کہ ابا آج اسکول آئے تھے، وجہ بھی اس نے امی کو بلاکم وکاست بتا دی تھی اور امی نے اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔

گھر آنے کے بعد ابا کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر انہوں نے الماری سے ایک بیلٹ کھینچی اور معصومہ کو پکارا۔ معصومہ جو مان اور شان میں سے کسی کی شامت آتے دیکھ کر امی کے آگے پیچھے دبک جایا کرتی تھی، ابا کی ایک ہی پکار پر نیم جان ہو گئی۔

”جاؤ...... ورنہ وہ اور زیادہ شور مچائیں گے۔“ امی نے کہا۔

”امی...... امی......“ معصومہ پتے کی طرح کانپنے لگی۔

مان، شان اور ملیحہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آج بے چاری معصومہ کی شامت آ گئی تھی۔

”معصومہ!“ ابا نے دوبارہ پکارا۔

”جاؤ...... ورنہ تمہارے ساتھ سب کی شامت آ جائے گی۔“ امی بولیں۔

معصومہ کانپتی، تھرتھراتی ابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی رنگت ہلدی ہو رہی تھی۔

”الو کی پٹھی!“ ابا دہاڑے اور انہوں نے معصومہ کو پوری شدت سے ایک بیلٹ رسید کی۔ معصومہ کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ ”چپ...... چپ“ ابا نے آنکھیں دکھائیں اور اسے کھینچتے ہوئے بڑے کمرے میں لے گئے۔

”میں مر گئی...... میں مر گئی...... امی جی مجھے بچا لیں۔“ امی اور بہن بھائیوں نے معصومہ کو کہتے سنا، مگر کس میں ہمت تھی کہ اسے بچانے جاتا۔

کمرے میں بند کر کے ابا نے معصومہ پر اتنا تشدد کیا کہ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ ابا نے کمرے سے باہر آ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی بیلٹ ایک طرف پھینکی اور امی کو پکار کر بولے۔ ”عالیہ! پانی پلا اسے۔“

امی ڈرتی ڈرتی کچن سے پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے نکلیں۔ کمرے میں پہنچیں تو معصومہ چت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور چھت سے لگی تھیں۔ منہ اور ناک سے خون جاری تھا، چہرہ جا بجا مضروب تھا، لگتا تھا ابا نے غصے میں دیوانہ وار بیلٹ برسائی تھی۔ امی نے معصومہ کو سہارا دے کر اٹھانے اور پانی پلانے کی کوشش کی مگر اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ امی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے خوفزدہ سی آواز میں اسے پکارا۔

”معصومہ! معصومہ!“

معصومہ مر چکی تھی۔

* * *

ابا بزدلوں کی طرح مفرور نہیں ہوئے۔ پولیس اسٹیشن پہنچے اور گرفتاری دے دی۔ میڈیا کے نمائندوں نے گھر پر یلغار بول دی۔ ٹی وی چینلز نے لائیو کوریج دی۔ معصومہ کی ڈیڈ باڈی، امی، ابا، ملیحہ، مان، شان سب کو بار بار ٹی وی اسکرین پر دکھایا جاتا رہا۔ آس پاس موجود بہت سے اپنے پرائے بھی کیمروں کی زد میں آ گئے۔ بقول بڑے ماموں سارا خاندان ہی ننگا ہو گیا۔ اخبارات نے خوب سرخیاں جمائیں۔

شقی القلب باپ کے ہاتھوں بیٹی کا وحشیانہ قتل۔

نوعمر طالبہ کی باپ کے تشدد سے ہلاکت۔

اسکول سے شکایت ملنے پر باپ نے بیٹی پر تشدد کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بیٹی کو اپنے وحشیانہ تشدد سے ہلاک کر دینے والا جنوبی باپ ڈرامائی طور پر خود تھانے پہنچ گیا۔

سفاک باپ کے ہاتھوں بیٹی کے قتل کی لرزہ خیز واردات۔

ابا نے پولیس کے سامنے اپنے اعترافی بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے بچی کے بارے میں اسکول سے شکایت ملنے پر اسے طیش میں آ کر زدوکوب کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گئی تھی۔

امی، ملیحہ، مان اور شان کو اس سانحے نے انتہائی دل برداشتہ کیا تھا۔ امی کی آنکھوں سے آنسو نہ رکتے۔ بہن بھائیوں کے دل معصومہ کو یاد کر کے دکھتے رہتے۔ اس کے کپڑے، جوتے، کتابیں، اسکول بیگ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ان سب کو معصومہ کی یاد دلاتی رہتیں۔ وہ کیا گئی گھر قبرستان کے سے سناٹوں میں ڈوب گیا۔ امی رنج والم کی تصویر بنی بیٹھی رہتیں۔ ملیحہ چپ چپ رہتی۔ مان اور شان کی شرارتیں، باہم لڑائیاں، امی سے پیار بھری نوک جھوک عہد پارینہ کا قصہ بن گئیں۔ معصومہ کی یاد امی اور تینوں بہن بھائیوں کی آنکھوں میں نمی بن کر جھلکتی رہتی۔ معصومہ کی آوازیں ان کی سماعت میں ابھرتی ڈوبتی رہتیں۔

”جی ابا!“ کبھی ابا کے پکارنے پر اس کی ڈری سہمی سی آواز۔

”امی بھائی کو دیکھیں۔“ ماسی ماں کہنے پر اس کا احتجاج۔

”وہ ابا ہیں...... انہیں غصہ آتا ہوگا نا تم لوگوں کی حرکتوں پر۔“ اس کا ابا کا دفاع کرنا۔

”آنے دو ابا کو بتاؤں گی میں تم لوگوں کی باتیں۔“ اس کا ابا کی حمایت میں بہن بھائیوں کو دھمکی دینا۔

”مجھے تو اپنے ابا اچھے لگتے ہیں۔“ تینوں بہن بھائیوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کا برملا اعتراف۔

ابا کی حمایت کرتے کرتے...... ان سے اپنی محبت کا برملا اعتراف کرنے والی معصوم اور بے ضرر سی معصومہ انہی کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے خاموشی کی ردا اوڑھ کر خاک بسر ہو گئی تھی...... جہاں سے اسے نہ امی کے آنسو واپس لا سکتے تھے، نہ

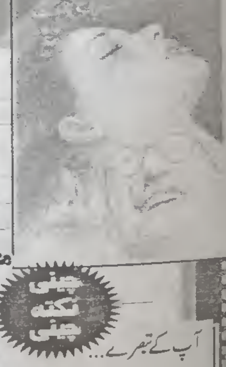

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

دہکتے جون 2013ء کے
جان فزا شمارے کی ایک جھلک

پہلی کہانی ● سیلسٹ کا میدان ہو یا کھیل کا ہر جگہ جان توڑ بازی کھیلنی پڑتی ہے...... ایک کرکٹر کی مشکلات کا تہلکہ خیز ٹکراؤ...... **محی الدین نواب** کے قلم کا شاہکار

گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام **اسما قادری** کا سلسلہ

للکار ● محبت کی جلتی بجھتی شمعیں اور انتقام کے بھڑکتے شعلے **طاہر جاوید مغل** کی سنسنی خیز تحریر

مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی پروردہ ناقابل فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

سرورق کی پہلی کہانی

جعل سازی اور فراڈ کے چکر میں ایک نئی دلدل میں دھنس جانے والے چہروں کی نقاب کشائی

سرورق کی دوسری کہانی

انتقام کے دہکتے شعلوں اور محبتوں کے قرض میں جکڑے کرداروں کی خونی روداد

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

بہن بھائیوں کی سسکیاں! اور اس المیے سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اپنے پرایوں میں ہر شخص معصومہ کی موت پر اپنے حسابوں رائے زنی کرتے نہ تھک رہا تھا۔

کچھ تو ہوگا جو باپ نے اسے قتل کردیا۔

کوئی ایسی ویسی بات ہی ہوگی۔

عزت کا معاملہ ہوگا جبھی تو باپ نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔

اللہ بچائے! آج کل کی لڑکیاں!

خدا کی پناہ! اپنے کرتوتوں سے اپنی جان سے تو جاتی ہیں، سارے خاندان کی عزت بھی مٹی میں ملا جاتی ہیں۔

کہنے والوں نے تو اس معصوم پر یہ بہتان لگانے سے بھی گریز نہ کیا کہ کسی سے ناجائز تعلق کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہوگئی تھی لہٰذا باپ نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔

لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکا ہے بھلا۔

ابا کو سگی بیٹی کے قتل کے جرم میں عدالت میں پیش کردیا گیا۔ امی نے اب بھی پتی ورتا عورت ہونے کا ثبوت دینے کا فیصلہ کیا اور ابا کے مقدمہ کی پیروی کے لیے وکیل کرلیا۔

* * *

”پاگل ہوگئی ہیں کیا! اس ظالم آدمی نے آپ کی بیٹی کو مار ڈالا...... وہ صرف ہمارا آپ کا نہیں، اسٹیٹ کا مجرم ہے اور آپ اسے معاف کردینا چاہتی ہیں۔“ سلمان نے ماں پر آنکھیں نکالیں۔

”وہ میرے شوہر اور تمہارے باپ ہیں۔“ امی نے کہا۔

”بدقسمتی سے!“ ملیحہ نے بھائی کی حمایت میں اپنی آواز ملائی۔

”کیا چاہتے ہو تم لوگ...... معصومہ تو اپنی جان سے گئی...... کیا باقی سب جیتے جی مرجائیں۔“ امی روہانسی ہوکر بولیں۔

”اس شخص کو معاف کردینے سے ہر بات بہتر ہے۔“ ماں کا لہجہ زہرناک تھا۔

”اکیلی کیسے چلاؤں گی میں یہ گھر...... کیسے اٹھاؤں گی تم لوگوں کا بوجھ۔“ امی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

”میں کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔“ امی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مان کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

”اور تمہاری پڑھائی؟“

”دفع کریں پڑھائی کو۔“

”نہیں بیٹا، نہیں۔“ امی نے بلک کر کہا۔ ”تعلیم ضروری ہے...... تعلیم کے بغیر انسان، انسان نہیں۔“

”تعلیم کے ساتھ بھی انسان حیوان ہی ہے...... آپ کا شوہر بھی تو تعلیم یافتہ ہی تھا...... کس درندگی سے مار ڈالا ہماری بہن کو...... اس بے چاری کی تو آواز بھی نہیں نکلتی تھی اس ظالم آدمی کے سامنے...... مجھے تو بار بار یہی خیال آتا ہے کہ وہ تو بارنے سے پہلے ہی مرگئی ہوگی۔“ مان کی آواز شدت رنج سے گھٹ گئی۔

”وہ کہتے ہیں ان کی نیت اسے مار دینے کی نہیں تھی۔“ امی نے عدالت کی طرح گھر میں بھی ابا کی پشت پناہی کرنی چاہی۔

”مگر میری نیت یہ ہے کہ وہ شخص جیسے ہی باہر آیا میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔“ مان نے تلخی سے کہا۔

”نہیں بیٹا، نہیں۔“ امی نے ہول کر کہا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”باپ ہیں تمہارے۔“

”باپ ایسے ہوتے ہیں؟“ مان نے امی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

امی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

ہاں! باپ ایسے تو نہیں ہوتے۔

باپ تو شفقت کا نام ہے...... عافیت اور امان کا نام ہے...... بے رحمی اور سفاکی کا تو نہیں۔

* * *

ابا کو اپنی غلطی کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر اعتراف جرم اور سرکاری وکیل کے تند و تیز سوالوں کے جواب دینا آسان تھا مگر اپنے ضمیر کا سامنا کرنا مشکل! بجا کہ زندگی ایک...... مسلسل اور مشکل جنگ تھی...... اپنی اور اپنے متعلقین کی بقا کے لیے...... مگر اس کا یہ مطلب کب تھا کہ اس جوکھی کی ساری تکان وہ اس وفا سرشت عورت اور اس کے بچوں پر اتارتے جو آج بھی ان کی پشت پناہی کو کھڑی ہوئی تھی...... زندگی کے بیرون خانہ مسائل کا نزلہ درون خانہ بیوی بچوں پر اتارنا تو مردانگی کی نفی تھی...... سراسر بزدلی اور کمزوری تھی۔ اسیر قفس ابا کا ضمیر نہ جانے کب کب کی اور کون کون سی باتیں کھوج کر لاتا اور اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کی زیادتیوں کا آئینہ ان کے سامنے کردیتا...... کبھی جو زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں آئیں بھی تو بات بے بات ان کے غصے نے ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی ملیامیٹ کرکے رکھ دیا تھا۔ اس آئینے میں انہیں کسی ایسی یاد کا عکس نہ دکھائی دیتا جب وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ مل بیٹھ کر خوش ہوئے ہوں...... ہنسے ہوں...... ان کی تیوریاں ہمیشہ چڑھی ہی دکھائی دیتیں...... اسی آئینہ میں انہیں معصومہ بھی دکھائی دیتی...... لرزتی، کانپتی، ہاتھ جوڑتی، معافی مانگتی، گڑگڑاتی اور روتی ہوئی...... اور پھر لمحہ لمحہ موت سے قریب تر ہوتی ہوئی۔ غصے میں ان پر ایسی وحشت اور بربریت طاری ہوئی تھی کہ انہوں نے تشدد کرکے اپنی ہی اولاد کو ہلاک کردیا تھا...... آخری سانسیں لیتی اور موت کی وادی میں اترتی ہوئی معصومہ کی یاد ابا کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ پچھتاوا انہیں ڈستا اور ندامت دل کا پیچھا نہ چھوڑتی...... ابا جتنا سوچتے اتنا ہی اپنے ضمیر کے قیدی بنے چلے جاتے۔

غصہ کسے نہیں آتا...... انسانی جبلت ہے...... مگر غصے میں نیک و بد کی تمیز نہ رکھنا انسانیت نہیں۔

کاش!

کاش کہ ابا غصہ میں حیوان نہ بن گئے ہوتے۔

* * *

امی نے ابا کو معصومہ کا خون معاف کردیا۔ مقتولہ کی وارث ہونے کے ناتے وہ ایسا کرنے کی مجاز تھیں۔ ابا گھر آگئے۔ نادم، شرمسار اور سر جھکائے ہوئے۔

تینوں بچے ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ خاموش، اداس اور دل گرفتہ ابا کے آنے پر ان تینوں نے معصومہ کی موت سے قبل اپنے معمول کے مطابق خوفزدہ ہوکر ابا سے چھپنے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ابا کو امی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پہلے مان اپنی جگہ سے اٹھا پھر ملیحہ اور شان ایک ساتھ اٹھے۔ انہوں نے ابا کو خاموشی، ناگواری اور نفرت سے دیکھا اور کچھ کہے سنے بنا آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

ابا نے امی کو دیکھا۔

امی نے نظریں چرالیں۔

ابا کا سر جھک گیا۔ ”مجھے معاف کردو عالیہ۔“ انہوں نے امی سے کہا۔

امی نے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچی۔ ایک نظر ابا کو دیکھا پھر ان کی نگاہیں کمرے میں بھٹکنے لگیں۔ یہ کمرا ان کے بچوں کی حیات افزا شرارتوں اور شوخیوں کی یادوں کا امین تھا۔ باپ کی عدم موجودگی میں وہ سب کس قدر شوخ اور چونچال ہوجایا کرتے تھے۔ کیسے کیسے چٹکلے چھوڑتے، ہنسنے پر آتے تو ہنستے ہی چلے جاتے۔ امی کا گھورنا اور گھڑکنا بھی ان کی ہنسی پر بند نہ باندھ پاتا...... بچے ایسے ہی ہوتے ہیں...... زندگی سے بھرپور اور لاابالی...... اس کمرے میں معصومہ کی یادیں بھی تھیں۔ آخری دن جب ابا نے غصے میں اسے پکارا تو وہ اسی کمرے میں تو بیٹھی تھی۔ یہیں سے اٹھ کر لرزتی کانپتی ابا کے پاس گئی تھی...... اس کی آخری چیخ اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے سنی تھی امی نے ”میں مرگئی...... میں مرگئی امی جی...... مجھے بچالیں۔“ اس کی درد بھری آواز کمرے تک پہنچی تھی۔ امی اسے بچانے کی ہمت نہ کرسکی تھیں۔ پھر اس کی آواز سنائی نہیں دی، وہ سچ مچ مرگئی تھی۔

کاش! ابا غصے میں اتنے وحشی نہ ہوئے ہوتے۔

امی کا دل بے پناہ دکھ رہا تھا۔ ابا ایک غصہ ور اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آنے والے آدمی نہ ہوتے تو آج اس گھر کے حالات کتنے مختلف ہوتے۔ ابا کی درشت مزاجی نے ان کے بال بچوں ہی نہیں خود ان کی اپنی زندگی بھی تہس نہس کرکے رکھ دی تھی۔

مسائل کب، کہاں اور کسے نہیں درپیش ہوتے۔ زندگی تو ہے ہی ہر ذی روح کی مسائل سے نبرد آزمائی کا نام۔ چرند، پرند، حیوانات، نباتات کون ہے جسے بقا کا مسئلہ درپیش نہیں۔ دن بھر دانے دنکے کی تلاش میں لمبی پرواز کے بعد دن ڈھلے اپنے شل بازوؤں کے ساتھ آشیانوں کو پلٹ آنے والے پرندے اپنی تکان کے غصے میں اپنے بچوں کو تو نہیں کھا جاتے۔ انہیں پروں میں سمیٹ کر بیٹھتے ہیں۔ دن بھر سورج کی روشنی میں اپنی ہی نہیں حیوانات کی غذا کی تیاری سے ہلکان نباتات رات کو ٹھنڈی ہوا دینے کا سلیقہ تو ترک نہیں کردیتے...... کیا اشرف المخلوقات انسان اتنا کمزور، ایسا گیا گزرا ہوگیا کہ زندگی سے نبرد آزمائی میں اپنے ہی بچے کھانے لگا۔

”مجھے معاف کردو عالیہ۔“ ابا نے گڑگڑا کر دوبارہ کہا۔

امی کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”میں تو معاف کرہی دوں گی مگر......“ امی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ابا کو شاکی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

ابا جنہوں نے اس سے پہلے کبھی امی کی پوری بات کو بھی قابل اعتنا نہ گردانا، آج ان کی ادھوری بات بھی ان کے قلب و روح میں تیر کی طرح اترتی چلی گئی اور ان کی نگاہیں ابا کے دل میں ترازو ہوگئیں۔

غصہ کیوں حرام ہے...... آج سے پہلے یہ بات وہ سلاخوں کے پیچھے بھی اتنی گہرائی کے ساتھ نہ سمجھ پائے تھے جتنا امی کی ادھوری بات اور شاکی نگاہوں نے سمجھا دیا تھا۔

امی کی وفا پرستی انہیں سلاخوں کے پیچھے سے تو باہر نکال لائی تھی مگر اس زہرباد کا کیا علاج جو ان کی پوری زندگی میں سرایت کرچکا تھا۔

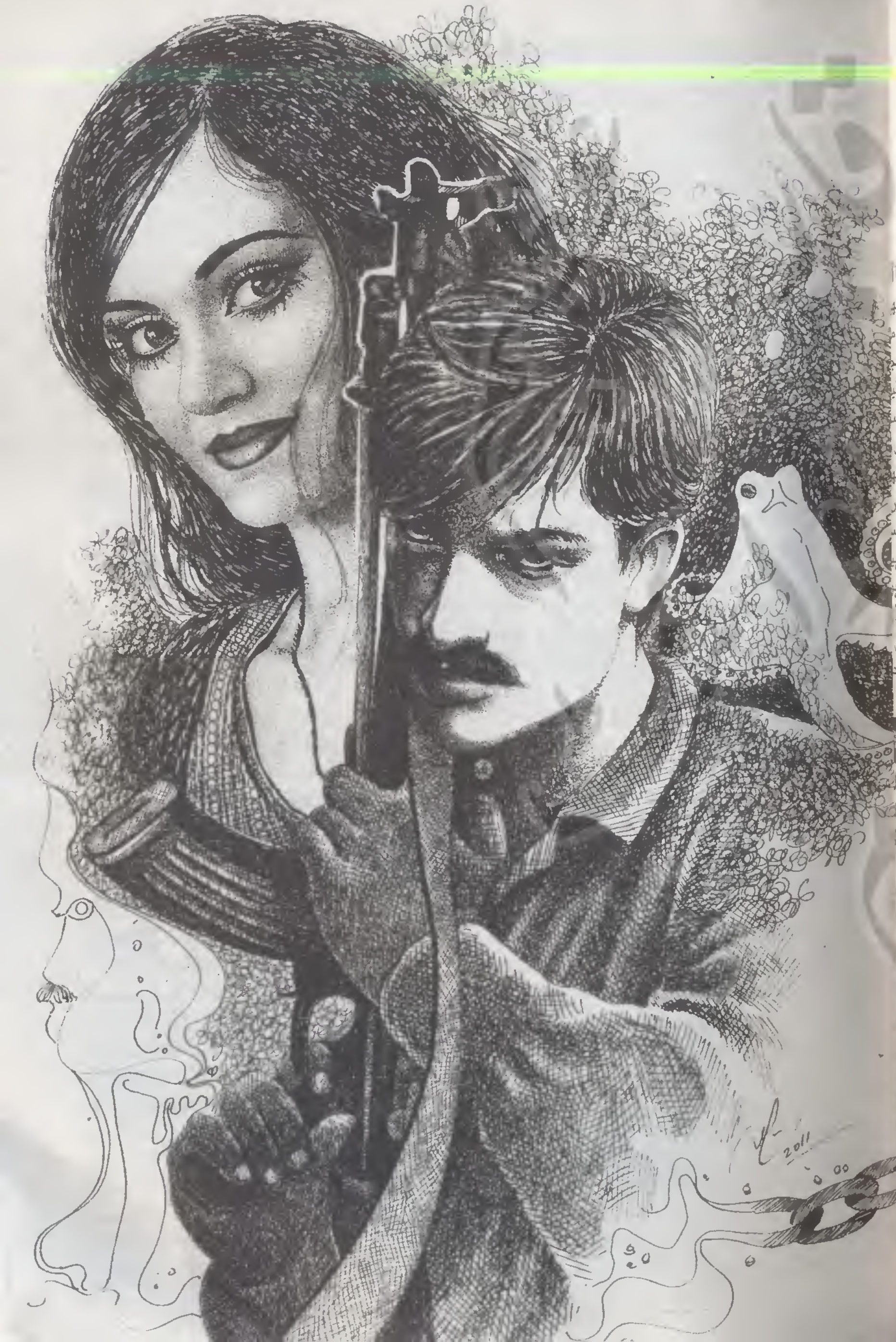

قسط نمبر: 24

[illegible]
میں ایک منفرد [illegible]
طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھ اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ ع فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں ق تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساس اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انس کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلا بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفح پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی یک نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو کے زیور سے آراستہ تھا باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی مگر اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزد دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن و ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت د نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ''بلیک ٹائیگر'' تھا۔ وہ بھی اسی

پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سر فہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اورنگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے

تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بہ دستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے مؤقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ وشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ وشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری تھریسا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شہلا ورما اور جونی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا استعفیٰ منظور نہیں ہو رہا تھا اسے ”کوبرا“ کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کر دے بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کر لیا اور اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان تلخی قائم ہو گئی۔ وشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مفید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو ”شکرہ“ کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایس پی اورنگ زیب اس وقت پوش علاقے کے ایک بنگلے کے ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا سنجیدگی سے کسی کی آمد کا منتظر تھا، بنگلے کے باہر سرجن زینب حسن کی تختی آویزاں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری تھی وہ بھی معنی خیز تھی۔ گیٹ کے چوکیدار نے اس کا کارڈ دیکھ کر انٹرکام پر اندر اطلاع کردی۔ جس کے بعد اسے ڈرائنگ

روم تک پہنچادیا گیا تھا۔

آٹھ دس منٹ کے انتظار کے بعد ہی لیڈی ڈاکٹر سرجن زینب حسن اس کے سامنے موجود تھی۔ ''کیسے زحمت کی آفیسر؟'' اس نے مسکرا کر اورنگ زیب سے دریافت کیا۔ ''کیا کوئی آفیشل معاملہ ہے؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی......'' جواب میں اورنگ زیب نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد جان کر زیادہ خوش نہ ہوں لیکن اس کے باوجود......''

''کم آن آفیسر......'' زینب حسن نے بات کاٹ کر کہا۔ ''جس پروفیشن سے ہم وابستہ ہیں اس میں اس قسم کے تکلفات کا دخل نہیں ہوتا۔''

''میں......اس وقت آپ کی صاحبزادی مس بینا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا۔''

''اوہ......!'' سرجن زینب یکلخت سنجیدہ ہوگئی۔ ''بینا سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟''

''تکلف برطرف......'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس بیوٹی پارلر کو پسند کرتی ہیں اور آخری بار وہاں کب گئی تھیں؟''

''کیا آپ یہ باتیں آفیشل طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''جی نہیں...... فی الحال میں اس بات کو ان آفیشل ہی رکھنا پسند کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے آپ کے اسٹیٹس اور بینا کے مستقبل کا بھی خیال ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' سرجن زینب نے کڑوے انداز میں کھری بات کی۔ ''آپ کی باتیں......''

''پلیز سرجن۔'' اورنگ زیب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر پہلو بدل کر پوچھا۔ ''کیا آپ کے علم ہے کہ تین روز قبل مس بینا اپنی ضرورت کے پیش نظر ہنی مون بیوٹی پارلر گئی تھیں؟''

''جی ہاں...... مگر اس میں قانون درمیان میں کیسے آگیا؟ کیا بیوٹی پارلر جانا کوئی جرم ہے؟''

''آئی سی...... گویا مس بینا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔''

اورنگ زیب کا جواب سن کر سرجن زینب کے چہرے پر کچھ ناگوار سلوٹیں ابھرنا شروع ہوئی تھیں جب سترہ سال کی ایک معصوم لڑکی مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ماں کو کسی ملاقاتی کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس نے مہذب انداز میں اورنگ زیب کو سلام کیا پھر ماں سے بولی۔

''میں اسٹڈی کے لیے......''

''بیٹھ جاؤ......'' سرجن زینب نے بینا سے کہا پھر اس کے بیٹھنے کے بعد سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''دو تین روز قبل تم بیوٹی پارلر گئی تھیں لیکن واپس آنے کے بعد تم نے مجھ سے کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا!''

بینا کے چہرے کی رنگت پل بھر میں اڑ گئی جسے سرجن زینب نے بھی محسوس کیا۔ بینا نے ماں کا سوال سن کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا پھر...... ماں نے جب اورنگ زیب کا تعارف کرایا تو بینا کی نظریں بھی جھک گئیں۔

''کم آن بینا......'' اورنگ زیب نے کسی مشفق بزرگ کی طرح اسے مخاطب کیا۔ ''اس وقت میں ایک دوست کی حیثیت سے تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز، تم مجھے پولیس آفیسر کے بجائے اگر انکل سمجھ کر تعاون کرو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی......''

بینا بہ دستور سر جھکائے ہونٹ چباتی رہی تو سرجن زینب نے اسے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

''تم جانتی ہو کہ مجھے خاموشی سے نفرت ہے...... جو بات ہے اسے کھل کے بیان کرنے میں تم کیوں ہچکچا رہی ہو؟ میں تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں......؟''

''پلیز سرجن......'' اورنگ زیب نے بینا کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے سلجھے ہوئے انداز میں ٹوکا پھر رک رک کر پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''کرنل احتشام کے سلسلے میں بھی آپ مطمئن رہیں۔''

پھر ماں کے اصرار پر بینا نے پوری تفصیل سے تمام باتیں بیان کردیں۔

''کون تھے وہ باسٹرڈ......'' سرجن زینب نے اورنگ زیب سے پوچھا۔ ''اس وقت وہ کہاں ہیں؟'' تفصیل سن کر سرجن زینب کا آپے سے باہر ہوجانا قدرتی بات تھی۔

''پلیز سرجن......آپ پریشان نہ ہوں۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''وہ دونوں پولیس کی تحویل میں ہیں لیکن جو کچھ ہوچکا اس میں براہ راست ان کے ارادوں کو بھی دخل نہیں تھا۔ کسی اور نے قیمت چکا کر ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ کرنل احتشام نے ذاتی طور پر انہیں پولیس کے حوالے کیا ہے...... مس بینا کا نام کہیں بھی درمیان میں نہیں آیا۔''

''پھر......آپ اس وقت کیا معلوم کرنے آئے ہیں......؟''

''مس بینا......'' اورنگ زیب نے سرجن زینب کا سوال نظر انداز کر کے براہ راست بینا کو مخاطب کیا۔ ''کیا بیوٹی پارلر کی وین کے ڈرائیور نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

''جی نہیں......''

''سپر اسٹور پر وین کیوں روکی گئی تھی؟''

''اس کی درخواست میں نے کی تھی...... مجھے ایک دو چیزیں خریدنی تھیں۔''

''جن افراد نے تمہیں لے جانے کی کوشش کی تھی کیا تم نے ان کو پہلے بھی کبھی کہیں دیکھا ہے؟''

''جی نہیں......''

''شیلا ورما کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟...... میرا مطلب ہے کہ کیا اس نے کبھی تمہارے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی......''

''کبھی نہیں......'' بینا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صرف اس کے نام سے واقف ہوں۔ کبھی اس سے ملاقات کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب نے بہ دستور دوستانہ انداز میں کہا پھر اس نے سرجن زینب کو مخاطب کیا۔ ''آپ فکر نہ کریں...... آپ کا یا مس بینا کا نام درمیان میں نہیں آئے گا۔''

''شکریہ آفیسر لیکن وہ دوسرے افراد جو پولیس کی تحویل میں ہیں، کیا ان کی زبانیں بھی بند رہیں گی؟''

اورنگ زیب ایک لمحے کے تامل کے بعد کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔ سرجن زینب سے معذرت طلب کر کے اس نے موبائل آن کرلیا۔ دوسری جانب سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی آواز ابھری۔

''آپ کو ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔ کرنل احتشام نے جن دو افراد کو پولیس کی تحویل میں دیا تھا آج ان کو ہمارے آئی جی صاحب نے اپنے دفتر طلب کیا تھا۔ غالباً کرنل احتشام کے کہنے پر ہی وہ ذاتی طور پر ان دونوں کی زبان کھلوانا چاہتے تھے لیکن اب ان کی بوکھلاہٹ بھی قابل دید ہے۔''

''کٹ شارٹ......'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

''دونوں نے آئی جی کے سامنے ہی دانتوں کے درمیان رکھے ہوئے زہریلے کیپسول چبالیے۔ ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردی گئی ہیں...... اب آپ کی تلاش ہورہی ہے۔ مجھ سے بھی دریافت کیا گیا تھا۔''

''تم نے کیا کہا......؟''

''میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ محترم آئی جی کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔''

''ڈونٹ وری۔'' اورنگ زیب نے سلسلہ منقطع کر کے سرجن زینب سے کہا۔ ''آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ جو دو آدمی پولیس کی حراست میں تھے انہوں نے آئی جی کے کمرے میں خودکشی کرلی ہے۔''

''اوہ......لیکن......انہوں نے ایسا کیوں کیا......؟''

''میں اب اجازت چاہوں گا۔'' اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ اگر.. مس بینا دس پندرہ روز گھر تک ہی محدود رہیں تو مناسب ہوگا۔''

''او۔کے لیکن کیا آپ مجھے خدمت کا......''

''اس وقت میں جلدی میں ہوں۔'' اورنگ زیب نے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''پھر کسی وقت آپ سے کلینک میں ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔''

اورنگ زیب کے جانے کے بعد سرجن زینب نے بینا کی طرف دیکھا جو صوفے پر کسی ایسی معصوم ہرنی کی طرح سہمی بیٹھی تھی جو کسی بھوکے درندے کے چنگل سے بچ جانے کے بعد دل کی بے ترتیب دھڑکنیں سنبھال رہی ہو۔

* * *

شیلا ورما اس وقت اپنی خواب گاہ میں کسی بھوکی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار ابھرنے والا تجسس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔

حسب معمول اس نے اس وقت بھی شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا لیکن خواب گاہ کی تنہائی اسے کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کی الجھن کا سبب جونی تھا جو دو روز سے کہیں چھومنتر ہوگیا تھا، ان دو دنوں میں شیلا ورما نے اس کے موبائل فون پر ان گنت کالز کی تھیں لیکن دوسری طرف سے ہر بار اسے پاورڈ آف کا ریکارڈڈ میسیج ہی ملا تھا۔

یہ پہلا اتفاق نہیں تھا۔ اس سے پیشتر بھی ایک دو خاص موقعوں پر خود شیلا ورما نے اسے بیوٹی پارلر سے دور رہنے کے لیے کہا تھا لیکن دور رہنے کے باوجود وہ موبائل کے ذریعے برابر رابطہ قائم رکھتا تھا مگر اس بار جونی نے از خود پارلر سے دوری اختیار کرلی تھی اور رابطہ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا

سبب یقیناً بینا ہی تھی جو شکاریوں کے جال میں پھنس جانے کے باوجود کسی طرح اغوا کرنے والے دونوں افراد کے ساتھ ملٹری ایجنسی کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے بینا کو جانے کی اجازت مل گئی تھی، دونوں افراد کو پولیس کی تحویل میں دینے کی اطلاع...... پھر آئی جی کے روبرو ان کی خودکشی کی پوری تفصیل بھی شیلا ورما کو اس کے معتبر ذرائع سے مل گئی تھی لیکن جونی کے بارے میں وہ ابھی تک قطعی لاعلم تھی۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ جونی نے خلاف توقع اسے اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے درمیان میں رکھی گول میز کے قریب جا کر گلاس میں بچی شراب بھی اٹھالی، ایک ہی سانس میں اسے حلق کے نیچے اتارنے کے بعد اس نے دوبارہ دستی گھڑی کی طرف دیکھا پھر وہ دل ہی دل میں جونی کو مغلظات سنا کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہی تھی جب اس کے موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ شیلا ورما نے نمبر دیکھے بغیر بڑی عجلت میں کال ریسیو کی لیکن دوسری جانب سے نگینہ کی آواز سن کر اس کی جھنجلاہٹ دوچند ہوگئی۔

’’اس وقت کس مقصد سے کال کیا ہے؟‘‘ اس نے تلملا کر دریافت کیا۔

’’مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔‘‘ دوسری جانب سے نگینہ کی سرسراتی آواز ابھری۔ ’’کسی دشمن نے سکندر علی شاہ کے کان ہمارے خلاف بھر دیے ہیں۔ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیوٹی پارلر کی طرف بھول کر بھی رخ نہ کروں۔‘‘

’’تمہارا شبہ کس پر ہے......؟‘‘

’’میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔‘‘ نگینہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے......‘‘ شیلا ورما نے روکھے انداز میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ ’’تمہارے نہ آنے سے پارلر کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن جو کام تمہارے ذمے ہے اس کی طرف سے غافل نہ ہونا۔‘‘

’’کوشش کروں گی لیکن میرا خیال ہے کہ سکندر علی شاہ کے پالتو شکاری کتے اب مجھے پہلے کی طرح آزادی سے کہیں آنے جانے کا موقع نہیں دیں گے۔‘‘

’’یہ سوچنا تمہارا ذاتی مسئلہ ہے لیکن نجی کاروبار کے لیے لڑکیوں کی تلاش تمہیں ہر قیمت پر جاری رکھنی ہوگی...... یہ بھی نہ بھولنا کہ تم نگینہ بننے سے پہلے کس حیثیت کی مالک تھیں۔ میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ بھی پیشگی دے چکی ہوں اس کے علاوہ میرے پاس تمہارے سلسلے میں کچھ ا ٹرمپ کارڈز بھی ہیں جو تمہیں محلوں سے نکال کر دوبارہ.....

’’کیا بات ہے شیلا......‘‘ نگینہ نے بات کاٹ کر تکلفی سے دریافت کیا ’’تم اس وقت کچھ الجھی الجھی لگ ر ہو۔ سب خیر تو ہے؟‘‘

’’میں اپنے ذاتی معاملات صرف خود تک محدود ر کی عادی ہوں۔‘‘ شیلا ورما نے بہ دستور سپاٹ لہجے م جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ’’کیا تم بتا سکو گی کہ ا وقت جونی کہاں ہوگا؟‘‘

’’کیا مطلب؟ جونی کو کیا ہوگیا؟‘‘

’’وہ دو دن سے غائب ہے......‘‘

’’لیکن......‘‘

’’معصوم مت بنو......‘‘ شیلا نے تلملا کر جواب دیا

’’میں تمہارے اور اس کے مراسم سے بھی ناواقف نہیں ہوں، ہوسکتا ہے کہ اس نے تمہاری طرح اور بھی دو چا ہانڈیوں میں منہ مارنا شروع کر دیا ہو لیکن دو روز ک غیر حاضری جونی کو بھی مہنگی پڑے گی...... محبت اور جنگ میں ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کی چھوٹ ہوتی ہے۔‘‘

’’جانتی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ جونی کہاں ہے۔‘‘

’’اپنے موبائل سے رابطہ قائم کر کے دیکھو...... ہوسکتا ہے تمہارے پاس اس کا کوئی خاص نمبر ہو۔‘‘ شیلا کے لب و لہجے میں شعلے لپک رہے تھے۔

’’ایسا نہیں ہے شیلا...... میری بات کا یقین کرو۔‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن میری ہدایت کا خیال رکھنا...... نئے، چمکتے دمکتے اور تر و تازہ ہیروں کی تلاش میں تمہاری کی کوتاہی کو برداشت نہیں کروں گی...... گڈ بائی۔‘‘ شیلا نے جملہ مکمل کر کے رابطہ بھی ختم کر دیا پھر وہ نیا گلاس تیار کرنے کے ارادے سے کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی مخصوص دستک کی آواز سن کر وہ تیزی سے اٹھ گئی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے خواب گاہ کا درواز کھول دیا...... سامنے جونی کھڑا تھا۔

’’تم...... تم......‘‘ شیلا نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے شکوہ کیا۔ ’’تم دو روز سے کہاں گم تھے؟‘‘

’’سپر اسٹور سے اٹھائی جانے والی لڑکی جہاں پہنچ گئی تھی اس کے بعد احتیاط شرط تھی۔‘‘

’’مجھے کم از کم فون تو کر سکتے تھے؟‘‘

’’حالات سنگین ہوں تو انسان کو اپنی پرچھائیں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔‘‘ جونی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ’’آج ان دونوں کی خودکشی کی اطلاع کے بعد ہی میں نے سکون کا سانس لیا ہے لیکن تمہارے لیے ایک نئی اطلاع بھی ہے۔‘‘

’’وہ کیا......؟‘‘

’’جو لڑکی شکار ہونے سے بچ گئی اس کی ماں بڑی حیثیت کی مالک ہے اور آج...... ایس پی اورنگ زیب بھی اس سے ملنے گیا تھا...... ہمیں کچھ دنوں بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔‘‘

’’اس وقت نہیں جونی...... اس بارے میں صبح بھی سوچا جاسکتا ہے۔‘‘ شیلا ورما نے نشیلی آواز میں جواب دیا۔ پھر اس نے جونی کی گردن میں بانہیں ڈالنے سے پہلے خواب گاہ کی روشنی بھی گل کر دی تھی۔

* * *

تھریسا کو پیش آنے والے حادثے کے بعد میڈم روبی نے اپنے گھر کی سیکیورٹی مزید بڑھا دی تھی۔ اب وہ خود بھی پہلے سے زیادہ محتاط ہوگئی تھی۔

تھریسا کی واپسی سے پیشتر جو کال اسے ملی تھی وہ اس وقت بھی اس کے ذہن میں کچوکے لگا رہی تھی جب ناشتے کے بعد وہ اخبار کے صفحات الٹ پلٹ رہی تھی۔ تھریسا بھی اس کے قریب بیٹھی اس کے چہرے کے تاثرات کے اتار چڑھاؤ کو پڑھ رہی تھی۔

اغوا کرنے والوں نے اسے باعزت چھوڑ دیا تھا لیکن وہ تجربہ بھی اتنا ہولناک تھا کہ تھریسا خود بھی ابھی تک اسے فراموش نہیں کر سکی تھی۔ جن لوگوں نے اسے میڈم کی رہائش گاہ سے اتنی ہوشیاری سے اغوا کیا تھا کہ گھر کے ملازموں اور گیٹ کے چوکیداروں کو بھی اس کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اسے اپنی کمین گاہ تک لے جانے کے بعد مل بانٹ کر بے آبرو کرنے کے لیے بھی قدم اٹھا سکتے تھے لیکن میڈم سے اپنا ایک مطالبہ منوانے کے بعد انہوں نے اسے باعزت طور پر واپس کر دیا تھا۔

تھریسا کے اغوا میں گھر کی ایک ملازمہ شامل تھی جو لاپتا ہوگئی تھی، میڈم نے اس کی کھوج لگانے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی، وہ اس حادثے کو شہرت نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ساتھ اسے اس بات کا احساس بھی ہوگیا تھا کہ تھریسا کو کس مقصد کی خاطر اٹھایا گیا تھا؟ جو لوگ اسے ڈی آئی جی سے شادی نہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے ان کی پشت پر یقیناً شیخ حامد یا اس کے زرخرید شکاری کتوں کا ہاتھ شامل

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787

فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

ہوگا۔ کنول کے اغوا کا خیال بھی اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ اورنگ زیب کے لگژری اپارٹمنٹ کی بربادی کا حال بھی اسے سراج نے فون پر بتایا تھا اور یہ تاکید بھی خاص طور پر کی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر رکھے۔

میڈم بہ دستور وقت کی اس گردش پر غور کر رہی تھی جو یکلخت تیز ہوتی جا رہی تھی جب قریب رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ کال تھریسا نے وصول کی پھر اسے میڈم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میڈم الماس کی کال ہے۔''

''اس وقت کیسے یاد کیا؟'' میڈم نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

''تھریسا نے کچھ بتایا کہ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا تھا؟''

''نہیں......'' میڈم نے تھریسا کی موجودگی کی وجہ سے بات گھما کر جواب دیا۔ ''آج کل کوئی چیز بھی اپنی اصل شکل میں نظر نہیں آتی۔ ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔''

''سمجھ گئی...... شاید وہ اس وقت بھی تمہارے قریب ہی موجود ہے۔''

''ہاں...... کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' میڈم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''سراج صاحب کا کیا حال ہے؟''

''نئے آئی جی کی وجہ سے سراج کے علاوہ اورنگ زیب صاحب بھی الجھے ہوئے ہیں۔''

''کوئی نئی اطلاع......؟''

جواب میں الماس نے بینا کے اغوا اور اس کے اغوا کرنے والوں کی خودکشی کی تفصیل سنائی تو میڈم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ''بینا کو تو کچھ نہیں ہوا......؟''

''نہیں...... اسے کرنل احتشام نے خاموشی سے گھر بھیج دیا تھا لیکن اس کو اغوا کرنے والوں نے آئی جی کے سامنے خود کو موت کی نیند سلا لیا جس کی وجہ سے وہ خود بھی بوکھلا گیا ہے۔''

''کچھ پتا چلا کہ اغوا کرنے والے کون تھے......؟''

''ان کے پاس سے کوئی ایسی شے برآمد نہیں ہوئی جس سے کچھ پتا چلتا۔ کرائے کے غنڈے رہے ہوں گے۔''

''سراج بھائی اور اورنگ زیب صاحب کی الجھن کا کیا سبب ہے......؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن سراج کی کچھ باتوں سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ کچھ ایسے نامعلوم افراد ہیں جو آئی جی کو بھی اس کی کسی خاص کمزوری کے سبب بلیک میل کر رہے ہیں۔'' الماس نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ''اورنگ زیب صاحب کے تبادلے کے پیچھے بھی اسی بلیک میلر کا ہاتھ نظر آتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میڈم روبی نے سرسراتے انداز میں پوچھا۔ ''کون ہوسکتا ہے وہ بلیک میلر؟''

''اس کا علم شاید آئی جی کو بھی نہیں ہے......''

''مجھے تم سے اس جواب کی توقع نہیں تھی......''

''میں سمجھی نہیں......'' الماس نے کھوجنے والے انداز میں کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''تم فرحین اور لیاقت حسین کو پیش آنے والے حادثات کو کیوں فراموش کر رہی ہو۔'' میڈم روبی نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''ان تمام وارداتوں کے پیچھے ایک ہی ہاتھ ہے...... آکٹوپس!'' میڈم نے بات جاری رکھی۔ ''لیاقت حسین کی پراسرار غیبی قوتیں کئی بار اس کا راستہ کھوٹا کر چکی ہیں، باقی کسر اورنگ زیب صاحب پوری کر رہے ہیں جنہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی موت کا یقین نہیں آیا تھا۔ کنول کے اغوا اور اس کی ماں کی موت میں بھی یقیناً اسی موذی کے ہاتھ ہوگا۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے...... اس کی روشنی میں تھریسا کے اغوا کو بھی اسی کے خانے میں ڈالا جاسکتا ہے۔''

''میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے......'' دوسری طرف سے الماس نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں شاید ابھی ایک تازہ واردات کی اطلاع نہیں ملی......''

''اگر تمہارا اشارہ اورنگ زیب صاحب کے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف ہے تو یہ اطلاع تمہارے سراج صاحب مجھے دے چکے ہیں۔'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔ ''انہوں نے یہ تاکید بھی کی تھی کہ یہ اطلاع اپنی ذات تک محدود رکھوں۔''

''اس کی مطلب یہ ہوا کہ ہم عورتیں مفت میں بدنام ہیں۔'' دوسری جانب سے الماس کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔ ''یہ مرد حضرات ہم سے زیادہ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں۔ ایک طرف مجھے بھی زبان بند رکھنے کو کہا تھا اور دوسری طرف خود تمہیں بتا دیا۔''

''سوری الماس!'' میڈم روبی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں سراج بھائی کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوں۔''

''آج شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے۔'' الماس نے کہا۔ ''اگر فارغ ہو تو میری طرف آجاؤ۔ شام کی چائے بھی اپنے سراج بھائی کے ساتھ پی لینا۔''

''او۔ کے۔'' میڈم نے ہامی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے بھی اورنگ زیب صاحب اور سراج بھائی سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں...... خاص طور پر سمندر کے موذی جانور کے سلسلے میں۔''

''کیا ارادے ہیں......؟''

''اینٹ کا جواب اگر پتھر سے نہ دیا جائے تو پھر دشمن اور شیر بن جاتے ہیں۔'' میڈم نے اس بار ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر شام کی چائے کا پروگرام پکا کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھریسا بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔

* * *

ماربل کے ایک کنسائنمنٹ کو جہاز راں کمپنی کے حوالے کرنے کے بعد لیاقت حسین ڈبل کیبن پک اپ میں بیٹھا اس روڈ سے گزر رہا تھا جہاں اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں تھا، عام طور پر اس سڑک کو صرف بندرگاہ جانے آنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب یا تو کھلا میدان تھا یا پھر کہیں کہیں کچی آبادی کے کچھ شکستہ اور میلے کچیلے مکانات ان لوگوں کی غربت کی داستان سناتے نظر آتے تھے جن کے لیے سر چھپانے کے لیے کوئی باقاعدہ ٹھکانا نہیں تھا، بہرحال اس راستے کی خوب صورتی کی خاطر سڑک کے دونوں جانب کچھ مخصوص فاصلوں سے ایسے درخت بھی لگا دیے گئے تھے جو اپنا پانی خود زمین کی تہ سے کشید کرتے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار کارپوریشن والے واٹر ٹینک بھی ان درختوں کی مزاج پرسی کے لیے آجاتے تھے۔ اسی بہانے وہ کچی آبادی کے خانماں برباد لوگوں کو اونے پونے پانی بھی فروخت کر دیتے تھے۔

حسبِ معمول لیاقت حسین اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہوں نے اس کی انیکسی میں داخل ہو کر فرحین کو اغوا کرنے کی جسارت کی تھی۔ انیکسی کے چوکیداروں کو ان لوگوں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لیاقت حسین نے بھی جواب میں ان کے پانچ افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا، ایک دو آدمی نکل بھی گئے تھے۔ لیاقت حسین پر ایک ذرا آنچ نہیں آئی تھی سیٹھ عثمان کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج نے بھی اسے پولیس کی دردسری کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی لیکن

اظہارِ محبت

مرد مختلف طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ مرد اظہارِ محبت کے لیے دنیا بھر میں معروف ان تین انگریزی الفاظ کا سہارا لے۔ محبت جتانے یا اس کے اظہار کی اور بھی بہت سی علامات ہوتی ہیں۔ جن میں چند علامات یہ ہیں......

☆ وہ آپ سے ملنے کی پہلی تاریخ کو یاد رکھے۔

☆ وہ آپ سے ہونے والی پہلی ملاقات پر آپ کے پہنے لباس کو یاد رکھے۔

☆ وہ آپ سے وابستہ ہر شے اور ہر رشتے کو قدر کی نگاہ سے دیکھے۔

☆ وہ کسی پسندیدہ کھیل کے ٹکٹ چھوڑ کر آپ کی سالگرہ کو ترجیح دے۔

☆ وہ کوئی اچھا سا تحفہ دے۔

☆ کوئی مزاحیہ یا اجنبی صورتِ حال کا سامنا اسے کرنا پڑے اور وہ فوراً آپ کے ساتھ شیئر کرنے کے لیے ٹیکسٹ بھیج دے۔

☆ کوئی ایسا کام جو آپ کرنا نہ چاہیں اور اس کی طرف سے کوئی دباؤ نہ ہو تو سمجھ لیں اسے آپ سے محبت ہے۔

☆ وہ یہ کہے کہ آپ کے ہاتھ پاؤں بہت خوب صورت ہیں باوجود اس کے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔

☆ بعض وجوہات کی بنا پر وہ سمجھے کہ وہ آپ کو کھو دے گا اور اس سوچ کے باعث وہ خود کو جسمانی طور پر زخمی کر بیٹھے اور یہ بتانے میں اسے کوئی شرمندگی نہ ہو۔

☆ وہ خوب صورت لڑکی سے بات کر رہا ہو اور اسے بتائے کہ وہ آپ سے جڑا ہوا ہے۔

☆ آپ کے آئی لو یو کہنے سے قبل ہی وہ یہ الفاظ کہہ دے۔

☆ وہ آپ کے بارے میں اتنا سوچتا ہو کہ جب آپ اس کے اردگرد نہ ہوں اور اس کے ساتھی شور مچا رہے ہوں اور وہ آپ کا ذکر کر کے موضوع تبدیل کر دے۔

مرسلہ: سلمان خان، ضلع بونیر

لیاقت حسین اس وقت اس میل نرس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دشمنوں کا ایجنٹ تھا، اسپتال کی وردی پہن کر فرحین کو زہریلا انجکشن لگانا چاہتا تھا۔ قدرت کی غیبی امداد نے اس کی نشاندہی کردی تھی مگر لیاقت حسین کو اب بھی اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے میل نرس کے سلسلے میں ایس پی اورنگ زیب کو اطلاع دے کر غلطی کی تھی۔ اگر وہ خود اس کے ہاتھ پیر توڑ کر دشمنوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیتا تو شاید انہیں بھی اندازہ ہوجاتا کہ لیاقت حسین کی زندگی میں فرحین ان کے لیے تر نوالہ نہیں بن سکتی تھی۔

اسپتال سے واپسی کے بعد راحیلہ بیگم نے فرحین کو کچھ دنوں مکمل آرام کی خاطر اپنے پاس روک لیا تھا، انیکسی کے لیے دوسرا چوکیدار گل خان کی وساطت سے رکھا گیا تھا، اس لیے اس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ سراج نے بھی اسے دبی زبان میں اشارہ دیا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کے کچھ سادہ لباس والے بھی اس کی رہائش پر تعینات کردیے گئے ہیں۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود لیاقت حسین کو اس بات کا غم تھا کہ اس نے دشمنوں کو وہ سبق نہیں دیا جو دینا چاہیے تھا۔ باپ کی طرح وہ بھی اس بات کا قائل تھا کہ مچان پر بیٹھ کر شکار کرنے والوں کو اصل شکاری نہیں کہا جاسکتا۔ مرد شکاری وہ ہوتا ہے جو شکار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کردے۔

لیاقت حسین نے اپنے باپ کی حویلی میں بھی شیر کی کھال دیوار پر لگی دیکھی تھی، شیر کا سر بھی تھا جس میں اس کی آنکھوں کی ساری درندگی بھی موجود تھی لیکن سردار سرفراز خان نے اس درندے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کی نیند سلا دیا تھا جس کی تصویر بھی البم میں محفوظ تھی۔ تصویر میں سرفراز خان اس جنگل کے بادشاہ کے سر پر ایک پیر جمائے سینہ تانے کھڑا نظر آرہا تھا۔ وہی تصویر اس وقت لیاقت حسین کے ذہن میں بار بار ابھر رہی تھی جب اس کی نظریں کچھ دیر بعد معمول کے مطابق عقبی شیشے کی طرف اٹھیں۔ ایک فاصلے سے آنے والا لوڈنگ ٹرک، دیکھ کر اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا لیکن جب اس نے ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کے نگینے پر نظر ڈالی تو چونک اٹھا...... کسی خطرے کے احساس نے اسے کسی ماہر شکاری کی طرح چوکنا کردیا۔

اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی لیکن یہ بات بھی نوٹ کرتا رہا کہ ٹرک آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے کی خاطر رفتار بڑھا رہا تھا، سڑک کا وہ حصہ دونوں طرف سے ویران تھا، ٹرک کے پیچھے بھی سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔

لیاقت حسین پوری طرح سنبھل کر بیٹھ گیا، سیدھے ہاتھ سے اس نے سراج کا دیا ہوا آٹومیٹک ریوالور نکال کر گود میں رکھ لیا پھر وہ بھی اپنی رفتار اس انداز میں کم کرتا ہوا روڈ کے کنارے ہونے لگا جیسے کسی انسانی ضرورت نے اسے مجبور کردیا ہو۔ گاڑی روک کر اس نے اگنیشن سے چابی بھی نکال لی۔ آٹومیٹک ریوالور کو نیفے میں اڑس کر وہ گاڑی سے اترا اور ڈھلان سے گزر کر ایک جھاڑی کی آڑ میں چلا گیا۔ اکڑوں بیٹھ کر اس نے گردن گھما کر دیکھا، اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔

تعاقب میں آنے والا ٹرک اس کی گاڑی کے عقب میں آکر رک گیا۔ یکے بعد دیگرے تین افراد کود کر نیچے آگئے۔ ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ چوتھا شخص جو گاڑی چلا رہا تھا وہ بھی نیچے اترا۔ اس نے فوری طور پر لیاقت حسین کی گاڑی کے قریب جا کر اندر جھانکا پھر پلٹ کر ساتھیوں کو گرین سگنل بھی دے دیا۔ لیاقت حسین کے وجود میں چھپا دلیر شکاری بیدار ہونے لگا، اس نے بیٹھے ہی بیٹھے رائفل والے کو نشانہ بنایا پھر کسی آدم خور چیتے کی طرح اچھل کر سامنے آگیا۔ رائفل والا ڈھیر ہوچکا تھا۔ باقی تینوں افراد ابھی صورت حال کا پوری طرح جائزہ بھی نہیں لے سکے تھے جب لیاقت حسین نے گرج کر کہا۔

''خبردار...... کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ اپنے ہاتھ بھی اٹھا لو ورنہ......''

سڑک کے کنارے کھڑے تینوں افراد کے ہاتھ فضا میں بلند ہوگئے۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھنے کے علاوہ انہیں لیاقت حسین کے ہاتھ میں دبا آٹومیٹک ریوالور بھی نظر آرہا تھا۔ ایک ساتھی کے جہنم رسید ہوجانے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ ان کی ایک ذرا سی غفلت ان کے لیے بھی موت بن کر سامنے آسکتی ہے۔

''تت...... تم...... غلط سمجھ رہے ہو دوست۔'' تینوں میں سے ایک نے کہا۔ ''ہم بھی تمہاری طرح فارغ ہونے کے ارادے سے رکے تھے۔ تم نے ہمارے ایک ساتھی کو گولی مار کر جلد بازی کا ثبوت دیا ہے۔''

''سر پر خون سوار ہو تو پھر قاتل بھی اندھا ہوجاتا ہے۔ تم نے اگر سیدھی طرح میرے سوال کا جواب نہ دیا تو تم تینوں کا انجام زیادہ عبرت ناک ہوگا۔'' لیاقت حسین نے حقارت سے جواب دیا۔

''یہ تمہاری دوسری حماقت ہوگی۔'' دوسرے نے قدرے جھلا کر کہا۔

''شرافت سے اگل دو کہ تم کس کے شکاری کتے ہو......؟'' لیاقت حسین کے تیور خطرناک ہونے لگے۔ ''رائفل والے کے انجام پر غور مت کرنا...... میں تم تینوں کو ماروں گا نہیں...... اس طرح زندہ چھوڑوں گا کہ تم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹنے پر مجبور ہوجاؤ گے۔ ایک بات اور سن لو...... وقت کم ہے...... اس سے پہلے کہ کوئی دوسری گاڑی آئے یا لوگ جمع ہوں، پالتو کتوں کی طرح میرے اشارے پر دم ہلانا شروع کردو...... تم کس کے آدمی ہو؟''

''ہمارے بارے میں تمہارا اندازہ......'' دوسرے شخص نے لیاقت حسین کو گھورتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر وہ بھی حلق پھاڑ کر چیختا ہوا سڑک پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ لیاقت حسین کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا، دوسرے شخص کے داہنی گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔

''خنزیر کے بچو......'' لیاقت حسین کی قہر آلود آواز پھر فضا میں بلند ہوئی۔ ''تم کس کے آدمی ہو؟ کون ہے وہ نامرد جو کھل کر خود سامنے نہیں آتا؟''

''ہم اس کا نام نہیں جانتے۔'' دو آدمی جو کسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئے تھے ایک ساتھ ہی بول پڑے۔ ''ہمیں فون پر تمہیں قابو کر کے ایک مقام پر پہنچانے کا حکم ملا تھا۔''

''فون کرنے والا کون تھا؟'' لیاقت حسین کی نگاہوں میں خون ابلنے لگا۔ ''کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا جس ولد الحرام سے تم واقف ہوگے؟''

''ہاں...... لل...... لیکن ہم نے زبان کھول دی تو وہ بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''پھر میرا انتقام تم کتوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔'' لیاقت حسین نے زہر خند لہجے میں کہا۔ پھر اس کے آٹومیٹک ریوالور سے تیسرا فائر ہوا۔ اس بار ایک شخص چیختا ہوا زمین پر گرا۔ گھٹنے کی ہڈی چور چور ہونے کے بعد وہ بھی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ لیاقت حسین کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوا تو تیسرا آدمی خوف سے ہکلانے لگا۔

''نن...... نن...... نہیں، گولی مت چلانا...... مم...... میں تم کو اس کا نام بتاتا ہوں...... لل...... لیکن وہ جس حیثیت کا مالک ہے تم یا پولیس اس پر شبہ بھی نہیں کرسکتے۔''

''تقریر نہیں...... نام اگل ڈالو کم ذات ورنہ......''

لیاقت حسین اپنا جملہ مکمل نہیں کرسکا۔ آخری شخص نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ لیاقت حسین کو اس کی توقع نہیں تھی، ایک لمحے کو وہ بھی چھلانگ لگانے والے کے ساتھ ہی گرد میں لوٹ پوٹ ہوگیا لیکن پھر وہ اسے بھی قابو کر کے اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ پہلی فرصت میں اس نے پستول والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے پستول کے دستے کو اس کے سر پر پوری قوت سے مارا۔ اس نپے تلے وار نے اس کے مقابل کو بھی بے ہوش کردیا۔ لیاقت حسین نے تیزی سے سنبھل کر پوزیشن سنبھالی پھر اس نے بے ہوش ہونے والے شخص کے گھٹنے پر بھی ایک گولی داغ دی۔ بے ہوشی کے باوجود اس کا جسم پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا۔

سڑک پر دور دور تک ٹریفک کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لیاقت حسین چاہتا تو اپنی گاڑی پر بیٹھ کر وہاں سے نکل جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مرنے والے کے علاوہ اس نے تینوں زخمیوں کو بھی گھسیٹ گھساٹ کر اپنی ڈبل کیبن کے پچھلے حصے میں ڈال لیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ تینوں افراد بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ لیاقت حسین انہیں گاڑی میں چھوڑ کر دو پھول والے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا۔

''تم......'' ایس ایچ او نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''تم لیاقت حسین ہو نا......؟''

''آپ کیسے جانتے ہو صاحب؟'' لیاقت حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہیں یاد نہیں لیکن میں تمہیں ایک بار ایس پی اورنگ زیب صاحب کے دفتر میں دیکھ چکا ہوں۔'' ایس ایچ او نے سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ''اس وقت یہاں کیسے آنا ہوا......؟''

''میں آپ سے ایک درخواست کروں گا......'' لیاقت حسین نے کرسی پر بیٹھے بغیر سنجیدگی سے درخواست کی۔ ''اس وقت آپ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا...... اور...... اور میں کسی اورنگ زیب یا سراج صاحب کو نہیں جانتا...... وہ معزز افسران ہیں صاحب اور میں......''

''کیا تم لیاقت حسین نہیں ہو؟'' ایس ایچ او نے اسے غور سے گھورتے ہوئے دوبارہ دریافت کیا۔

''میرا نام لیاقت حسین ہی ہے صاحب لیکن اس وقت میں مجرم کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' ایس ایچ او چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا جرم کیا ہے تم نے......؟''

''اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا صاحب۔'' لیاقت حسین نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''باہر میری ڈبل کیبن کے پچھلے حصے میں ایک لاش اور تین اپاہج پڑے ہیں۔ مجھے حراست میں لینے کے بعد ان کو بھی دیکھ لیں۔''

ایس ایچ او حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے گھنٹی بجا کر اپنے عملے کے افراد کو بلا کر تصدیق کی تو لیاقت حسین کو بھی فوری طور پر ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ لیاقت حسین نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

لاش اور تینوں زخمیوں کو نمٹانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوا جہاں دو مسلح سپاہی لیاقت حسین کے دائیں بائیں موجود تھے۔ کمرے میں آنے سے پیشتر اس نے اورنگ زیب کو بھی حالات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ دوسری طرف سے ملنے والی ہدایت کے بعد ہی اس نے لیاقت حسین کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔

''تم نے جو اقدام جرم کیا ہے اس کی وجہ کیا تھی؟''

جواب میں لیاقت حسین نے فرحین کے ایکسی سے اغوا ہونے والی تفصیل کے ساتھ ہی میل نرس کی خودکشی کی پوری کہانی بھی دہرا دی۔

''اب تمہیں مرنے والے اور زخمیوں پر کس قسم کا شبہ ہوا تھا؟...... کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی؟''

''اس کی تفصیل بھی اپاہج ہونے والے ہی بتا سکیں گے صاحب۔'' لیاقت حسین نے بہ دستور بے پروائی سے کہا۔ ''ان کو ہوش میں آنے دیں...... پھر آپ جانو اور آپ کا قانون۔''

''ون منٹ......'' ایس ایچ او نے کسی فوری خیال کے پیش نظر کسمسا کر دریافت کیا۔ ''تم نے ان کو کس اسلحے سے قابو کیا تھا؟''

''معاف کرنا صاحب......'' لیاقت حسین نے زہرخند سے جواب دیا۔ ''پستول میری جیب میں ہے، آپ اسے بھی برآمد کرلیں۔''

ایس ایچ او کے اشارے پر ایک سپاہی نے لیاقت حسین کے جیب سے وہ پستول بھی نکال لیا جس کے چیمبر میں اب بھی دو گولیاں موجود تھیں۔

''تم سے جو حرکت سرزد ہوئی ہے اس کی سزا جانتے ہو......؟''

''سزا اور جزا کا حساب تو صرف اوپر والے کا کھرا ہوتا ہے صاحب...... ہم سب تو کٹھ پتلی ہیں۔''

''تم......'' ایس ایچ او نے تھوڑے توقف کے بعد سوال کیا۔ ''موجودہ واردات میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد کیا تم کسی کو اطلاع نہیں دو گے؟''

''نہیں......'' لیاقت حسین نے پہلی بار ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق تم سیٹھ عثمان کے خاص آدمی ہو...... کیا میں انہیں صورت حال سے آگاہ کردوں؟''

''پہلے مجھے حوالات میں بند کردو صاحب پھر...... جو مرضی آئے کرتے رہنا۔''

لیاقت حسین جواب دینے کے ساتھ ہی باہر جانے کے لیے گھوما تو دونوں مسلح سپاہی بھی اس کے ساتھ باہر نکل گئے...... ایس ایچ او کے چہرے پر بھی غور و فکر کے تاثرات پھیل کر اور گہرے ہوتے چلے گئے۔

* * *

اورنگ زیب کے دفتر میں داخل ہوتے ہی عملے کے ایک فرد نے اسے بتایا تھا کہ آئی جی بہت دیر سے اسے یاد کر رہا ہے، وہ سیدھا آئی جی کے کمرے میں چلا گیا۔ سراج کے ذریعے اسے اطلاع مل چکی تھی کہ بینا کے اغوا میں ملوث دونوں آدمیوں نے آئی جی کے سامنے ہی خود کو موت کے حوالے کردیا تھا۔

حسب توقع آئی جی کے چہرے پر اس وقت بھی زلزلے کے تاثرات باقی تھے۔ اورنگ زیب نے سر کی خفیف جنبش سے اسے سلام کیا پھر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ آئی جی نے اسے جن نظروں سے دیکھا اس سے بھی جھلاہٹ ہی ٹپک رہی تھی۔

''آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟''

''ڈیڑھ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔'' آئی جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آپ شاید آج دیر سے دفتر آئے ہیں۔''

''میں نے اس سے پیشتر بھی کبھی حاضری رجسٹر کی طرف توجہ نہیں دی۔'' اورنگ زیب نے شانے اچکائے۔ ''پولیس کے محکمے میں حادثات کبھی انوی ٹیشن دے کر نہیں آتے۔ اچانک ہی کوئی واردات ہوتی ہے اور اہلکار حرکت میں آجاتے ہیں۔''

''آپ کس حادثے کی تفتیش میں مصروف تھے......؟'' آئی جی نے پہلو بدل کر معلوم کیا۔ چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ اسے اورنگ زیب کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے عہدے اور ملازمت سے زیادہ ایسے معاملات سے دلچسپی ہوتی ہے جو ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کر رہے ہیں...... اس وقت بھی ایک ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔''

آئی جی نے الجھنے کی غلطی نہیں کی، ایک لمحے تک اورنگ زیب کو نگاہوں نگاہوں میں تولتے ہوئے بولا۔ ''کل مجھے کرنل احتشام نے چائے پر بلایا تھا...... آپ کا ذکر بھی درمیان میں آیا تھا۔''

''کرنل بھی ایک محب وطن آفیسر ہے...... آفیشل معاملات میں میری اور کرنل کی ملاقاتیں بھی اکثر ہوتی رہتی ہیں۔''

''کیا آپ نے کرنل سے اپنے ہیڈ کوارٹر میں تبادلے کا ذکر کیا تھا؟''

''جی نہیں...... میں نے اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔'' اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کرنل سے گفتگو کے دوران مجھے اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ آپ کے پاس غالباً کوئی ایسا حکم نامہ موجود ہے جس کی بنا پر آپ کسی بھی معاملے میں چھان بین کرسکتے ہیں۔''

''آفس آنے سے کچھ دیر پیشتر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اغوا کے کیس میں ملوث دو مجرموں نے آپ کے سامنے خودکشی کرلی ہے۔'' اورنگ زیب نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ''کون تھے وہ......؟''

''اس اغوا کے معاملے میں بھی کرنل احتشام نے مجھ سے کہا تھا کہ میں براہ راست دونوں مجرموں سے تفتیش کروں لیکن انہوں نے زبان کھولنے کے بجائے خود کو موت کے حوالے کردیا۔''

''فرحین کو انجکشن لگانے کے لیے آنے والے میل نرس نے بھی زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی۔'' اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''صاف ظاہر ہے کہ ان مجرموں کی پشت پر کوئی ایسی بااثر شخصیت ہے جو زبان کھولنے کی صورت میں اپنے شکاری کتوں کو زیادہ اذیت ناک انجام تک پہنچاتی ہوگی......''

''آئی۔ ایگری ود یو لیکن...... ہمارے علم میں صرف ایک ہی نام ہے۔ آکٹوپس، جو مر کر بھی زندہ ہوگیا ہے لیکن...... ابھی تک صرف شبہات سامنے آرہے ہیں...... اس کا پتا اور ٹھکانا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔''

''آپ کنول کے اغوا اور اس کی ماں کی موت کو کس خانے میں ڈالیں گے؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ شیخ حامد کے ہسٹری شیٹر غنڈوں کی حرکت ہو۔'' آئی جی نے جزبز ہو کر جواب دیا۔ ''میں نے اس سلسلے میں کرنل احتشام کو بھی ٹٹولنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے بھی کنول کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔''

''کرنل کا تعلق ملٹری کے حساس شعبے سے ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس نے رازداری سے کام لیا ہو......''

''ایک بات اور دریافت کرنا چاہوں گا۔'' آئی جی نے اس بار دوستانہ انداز میں کہا۔ ''جن دو آدمیوں نے میرے سامنے خودکشی کرلی انہوں نے کس لڑکی کو اغوا کیا تھا......؟''

''اس کا علم بھی کرنل ہی کو ہوگا۔'' اورنگ زیب نے بڑی خوب صورتی سے بات بنائی۔ ''میری اطلاع کے مطابق اس نے صرف دونوں اغوا کنندگان کو سول پولیس کے حوالے کیا تھا۔ لڑکی کا ذکر درمیان میں نہیں آیا تھا۔''

''آکٹوپس کے بارے میں اب آپ کا کیا خیال ہے......؟''

''میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ جب تک اس کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں مردہ نہیں کہوں گا...... اب تو کنول نے بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی کی تصدیق کردی ہے۔''

''میں نے اس ضمن میں بھی کرنل سے بات کرنی چاہی تھی لیکن اس نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔''

اورنگ زیب کچھ کہنا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملے۔ آئی جی سے اشارے میں معذرت طلب کرنے کے بعد اس نے موبائل آن کرلیا۔ دوسری جانب سے بندرگاہ کے علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او بول رہا تھا۔ اس نے لیاقت حسین کے بارے میں جو اطلاع دی اسے سن کر اورنگ زیب بھی وقتی طور پر بوکھلا گیا تھا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لیاقت حسین ہی ہے؟''

''یس سر...... میں اسے مسٹر سراج کے ساتھ بھی دیکھ چکا ہوں۔''

''آپ پرچہ کاٹنے میں عجلت کا مظاہرہ نہ کریں، میں پہنچ رہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا پھر اس نے آئی جی کے استفسار پر اسے بھی ملنے والی اطلاع دے دی۔

''کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟''

''شکریہ سر......'' اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ضرورت ہوئی تو آپ کو بھی زحمت دوں گا۔''

اورنگ زیب کے جانے کے بعد آئی جی کسی سوچ میں

غرق تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، آئی جی نے اس کی لائن لیڈی سیکریٹری کی طرف کردی۔ ایک منٹ بعد ہی لیڈی سیکریٹری نے اندر داخل ہوکر کہا تھا۔

‘‘سر...... کوئی ضروری کال ہے لیکن فون کرنے والے نے نام نہیں بتایا۔’’

‘‘میں دیکھتا ہوں......’’ آئی جی نے کچھ سوچ کر جواب دیا پھر لیڈی سیکریٹری کے جاتے ہی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

‘‘آئی۔ جی...... اسپیکنگ!’’

‘‘کوبرا بول رہا ہوں......’’ دوسری جانب سے سرد لہجے میں کہا گیا۔ ‘‘تمہارے اور اورنگ زیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ مجھ تک پہنچ گئی ہے...... تمہارے پرسنل آفس میں ایک سوئی بھی گرے تو اس کی آواز میرے کانوں تک آجاتی ہے۔’’

‘‘جانتا ہوں لیکن اب تم کیا چاہتے ہو؟’’ آئی جی کے لہجے سے بے بسی چھلک رہی تھی۔

‘‘ہمارے اشاروں پر دم ہلاتے رہو۔ اسی میں تمہاری خیریت ہے۔’’

‘‘وہاٹ نان سنس۔’’ آئی جی تلملا اٹھا۔ ‘‘کیا صرف یہی کہنے کی خاطر اپنا اور میرا وقت برباد کیا ہے؟’’

‘‘بکواس نہیں......’’ دوسری جانب سے بولنے والے کا لب ولہجہ مزید سرد ہوگیا۔ ‘‘ہم تمہاری عاقبت بھی خراب کرنے کی پوزیشن میں ہیں...... تمہاری ایک ذرا سی حکم عدولی بھی تمہیں ان افراد کی طرح خودکشی پر مجبور کرسکتی ہے جس کا ذکر ابھی تم اورنگ زیب سے کررہے تھے......’’

آئی جی جواب دینے کے بجائے کرسی پر کسمسا کررہ گیا۔

‘‘لیاقت حسین نے اب جو قدم اٹھایا ہے اس کی اطلاع تمہیں اپنے ہونہار ایس پی سے مل چکی ہے۔’’

‘‘ہاں لیکن ابھی پوری تفصیل......’’

‘‘تفصیل کے چکر میں پڑنے کی حماقت بھی نہ کرنا......’’ کرخت اور سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ‘‘اس بار لیاقت حسین کو پولیس کے ہاتھوں رہائی نہیں ملنی چاہیے...... سن رہے ہو...... میں کیا کہہ رہا ہوں؟’’

‘‘کیا مرنے والے تمہارے......’’

‘‘شٹ اپ......’’ دوسری جانب سے حقارت سے کہا گیا۔ ‘‘جو کچھ کہا گیا ہے صرف اس پر عمل کرو...... اس کے سوا تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی نہیں ہے......’’

جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کردیا گیا۔ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کے بجائے فضا میں اچھال دیا۔

* * *

سکندر علی شاہ اس وقت بستر پر لیٹا کسی خیال میں گم تھا۔ نگینہ اس کے ساتھ ہی مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کچھ دیر پیشتر دونوں نے ناشتا بھی خواب گاہ میں کیا تھا۔ سکندر علی شاہ ناشتے کے بعد ہی مسہری پر نیم دراز ہوگیا۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب وہ کسی خاص معاملے میں الجھا ہوتا تھا، ان لمحوں میں نگینہ اسے اپنے وجود کی گرمی سے بہلاتی رہتی تھی، آج بھی اس نے ابھی تک شب خوابی کے لباس کو بدلنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ ایسی صورت میں سکندر علی کے ہاتھ بھی حسب ضرورت اس کے جسم سے توانائی کشید کرتے رہتے تھے لیکن آج وہ کسی الجھن سے دوچار تھا۔ نگینہ کچھ دیر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی پھر دبی زبان میں بولی۔

‘‘کیا سوچ رہے ہیں......؟’’

‘‘وہی...... جو اکثر تمہارے ذہن پر بھی اندھیرے کے بھوت کی طرح سوار ہوجاتا ہے۔’’ سکندر علی شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ‘‘دشمن اندھیرے میں ہو تو اس پر کاری ضرب لگانا انسان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔’’

‘‘آپ صحیح کہہ رہے ہیں......’’ نگینہ نے سکندر علی شاہ کا اشارہ سمجھ کر جواب دیا۔ ‘‘میں بھی اندھیرے میں ہی شکار ہوئی تھی۔’’

‘‘ہماری چھوٹی سے چھوٹی حرکتیں بھی اس کے علم میں آجاتی ہیں مگر میں کوئی جوابی کارروائی کرنے سے قاصر ہوں...... یہ بھی سچ ہے کہ آج میں جس مقام پر ہوں اس میں بھی اسی کا مالی تعاون شامل ہے۔ اس کے آدمیوں نے دامے، درمے، سخنے میری مدد کی تھی لیکن وہ خود کبھی سامنے نہیں آیا۔’’

‘‘پھر...... اب سوچنے سے بھی کیا حاصل ہوگا؟’’ نگینہ نے اس کے اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ سکندر علی شاہ نے بھی ذہنی الجھن سے چھٹکارا پانے کی خاطر نگینہ کی طرف کروٹ بدلی لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔

‘‘ہیلو...... کون؟’’ سکندر علی شاہ نے ریسیور اٹھا کر حسب معمول بھاری لہجے میں دریافت کیا۔

‘‘تمہاری دلربا......’’ دوسری جانب سے مدھم لہجے میں ایک مترنم آواز ابھری۔

‘‘ون منٹ......’’ سکندر علی شاہ نے نگینہ کو اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ سکندر علی شاہ کی اس عادت سے واقف تھی کہ اپنے خاص کارندوں سے ہمیشہ تنہائی میں گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

‘‘میں نے تم سے کہا تھا کہ موبائل پر کال کیا کرو...... وہ بھی کسی خاص موقع پر۔’’ نگینہ کے جانے کے بعد سکندر علی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ دلربا کی آواز اس کے لیے غیر مانوس نہیں تھی۔ وہ ایک بار خود شکار ہونے کے بعد اب سکندر علی شاہ کے لیے نئے نئے تازہ شکار فراہم کرتی تھی۔ اسی خدمت کے عوض اسے خاصی چھوٹ دے دی گئی تھی......!!

‘‘مجھے تم سے ایک شکوہ کرنا ہے۔’’ اس بار بھی بہکتی آواز میں کہا گیا۔ ‘‘کسی پرندے کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال بھی احتیاط سے اتارتے ہیں لیکن ماروی بتارہی تھی کہ تم نے تو اس غریب سے کوئی رومانی گفتگو کیے بغیر کسی بھوکے درندے کی طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا...... یہ بھی بتارہی تھی کہ تم نے خواب گاہ سے جاتے وقت زبان بند رکھنے کی دھمکی بھی بڑے خوفناک لہجے میں دی تھی......’’

سکندر علی شاہ دوسری جانب سے کہی جانے والی بات سن کر ہونٹ چبانے لگا، انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے اس کے اجلے کپڑوں پر گند اچھال دی ہو چنانچہ اس کی زبان کا لڑکھڑا جانا بھی قدرتی امر تھا۔

‘‘اور کیا کہا تھا اس...... نے؟’’

‘‘کیا ہوا میرے راجا...... تم اس قدر برہم کیوں ہوگئے؟’’ حیرت سے دریافت کیا گیا۔

‘‘وہ حرامزادی بکواس کرتی ہے۔’’ سکندر علی شاہ نے بہ دستور بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔ ‘‘میں اس روز ایک ضروری کام میں مصروفیت کی وجہ سے فارم ہاؤس نہیں گیا تھا...... وہ آئی ضرور تھی لیکن دوسری صبح واپس چلی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے اس نے تم سے جھوٹی بکواس کردی ہو......’’

‘‘نہیں میرے راجا...... ماروی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اور اگر تم معلومات کرکے اس کی تصدیق کردو تو میں معاوضے کی دوگنی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں...... ہوسکتا ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے کسی کارندے کی نیت اس پر خراب ہوگئی ہو۔’’

‘‘بکومت......’’ سکندر علی شاہ نے اس بار جھلا کر کہا۔ ‘‘میرے کارندے جانتے ہیں کہ میرے کسی حکم کے خلاف پلکیں جھپکانے کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔ تم جو خیال ظاہر کررہی ہو اس کے بارے میں کوئی سوچنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا۔’’

‘‘او۔ کے...... اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کل تک تمہاری رقم واپس کردی جائے گی لیکن ماروی کی غلط بیانی بھی اسے بہت مہنگی پڑے گی...... میں اس سے ایک کی جگہ دس وصول کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔’’

‘‘جلدی نہیں......’’ سکندر علی شاہ نے دوسری جانب سے ملنے والے جواب پر غور کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ‘‘نمک حرام ماں کے پیٹ سے نہیں نکلتے...... ضرورت اور ہوس بھی بدذاتوں کو نمک حرامی پر مجبور کردیتی ہے...... اگر تم کو لڑکی کی بات پر یقین ہے تو پھر مجھے بھی اپنے پالتو کتوں کو چیک کرلینے دو...... ممکن ہے کسی حرامزادے کی موت نے اس کی نیت خراب کردی ہو۔’’

SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books
and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

"میرے لیے کوئی نیا حکم......" سکندر علی شاہ کا جواب سن کر دوسری جانب سے گفتگو کرنے والی کے لہجے میں پھر بانکپن آ گیا۔

"ابھی نہیں لیکن...... میں تمہیں جلدی ہی خدمت کا موقع دوں گا۔"

ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد سکندر علی شاہ کچھ دیر ہونٹ چباتا رہا پھر وہ اٹھ کر لباس تبدیل کر رہا تھا جب نگینہ لہراتی بل کھاتی دوبارہ اجازت لے کر اندر آ گئی۔

"اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" نگینہ نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے ایک ادا سے سوال کیا۔

"لباس تبدیل کر لو...... ہو سکتا ہے کہ مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔"

پھر......! حویلی سے نکل کر اس نے سیدھا فارم ہاؤس کا رخ کیا تھا، پچھلی سیٹ پر بیٹھا وہ دلربا کی شکایت پر غور کرتا رہا، اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ہی اس کا گن مین بھی براجمان تھا۔ حسب معمول کچھ فاصلے سے ایک وین بھی پیچھے پیچھے تھی جس میں اس کے چھ مسلح محافظ موجود تھے۔

فارم ہاؤس کے کارندے بھی خلاف توقع اس کی آمد پر چوکنے ہو گئے۔ سکندر علی شاہ کسی بے تاج بادشاہ کی طرح ملازموں کے سلام کے جواب میں سر ہلاتا اپنے مخصوص ریسٹ ہاؤس میں جا کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا پھر باری باری ڈیوٹی پر موجود کارندوں اور گیٹ کے چوکیداروں کو بلا کر ان سے تفتیش شروع کر دی۔ سب کا ایک ہی بیان تھا کہ مہمان لڑکی سر شام ہی فارم آ گئی تھی، ملازموں نے خاطر خواہ اس کی مہمان نوازی کی تھی۔ صبح وہ واپس ہو گئی تھی۔ مخصوص ریسٹ ہاؤس کے ملازم نے کہا تھا کہ وہ چراغ جلنے کے بعد اسے یہ تاکید کر کے چلا گیا تھا کہ خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے نہ بند کیا جائے۔ گیٹ کے چوکیدار نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ وہ بھی اپنی ڈیوٹی پر چوکس تھا۔ اس کی ڈیوٹی ماروی کے جانے کے بعد ختم ہوئی تھی، اس دوران نہ کوئی اندر آیا نہ باہر گیا۔

سکندر علی شاہ پوری توجہ سے سب کے بیان سنتا رہا پھر اس نے آخر میں گونگے کو طلب کیا۔

حسب معمول گونگے نے سکندر علی شاہ کو دیکھ کر سلام کیا پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ سکندر علی شاہ اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اس بات کو بارہا محسوس کیا تھا کہ گونگا ان دنوں زیادہ خوش تھا جب وہ ڈرائیور کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا، فارم ہاؤس کا نگران اعلیٰ ہونے کے بعد سے وہ کچھ گھٹا گھٹا نظر آتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کا شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔

سکندر علی شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں گونگے سے بھی ماروی کے بارے میں تحقیق کی۔ گونگا غوں...... غاں...... کر کے جواب دیتا رہا، کسی عورت یا لڑکی کے بارے میں گفتگو کرتے وقت گونگے کے چہرے سے اس وقت بھی بیزاری ہی عیاں تھی۔ سکندر علی شاہ نے روز اول سے اس کی اس فطرت کو نوٹ کیا تھا...... پھر بھی سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

"فارم ہاؤس میں تمہاری حیثیت منتظم اعلیٰ کی ہے۔ رات کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے راؤنڈ لگانا بھی تمہاری روزمرہ کی ذمے داری میں شامل ہے...... کیا کل رات تم نے لڑکی کی موجودگی کے دوران کسی کو ادھر آتے جاتے دیکھا تھا؟"

جواب میں گونگے نے نفرت سے شانے اچکا کر یہی کہا تھا کہ اس نے کسی کو نہیں دیکھا۔

"پھر......" یکلخت سکندر علی شاہ نے جھلا کر بلند آواز میں کہا۔ "اگر کوئی ادھر نہیں آیا تو کیا بدروحوں نے یہاں آ کر لڑکی کو بے آبرو کیا تھا۔"

گونگے نے دوبارہ بے پروائی سے شانے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو سکندر علی شاہ نے جھلا کر اس کے گھٹنے پر ایسی ٹھوکر ماری کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کو اس کی نگاہوں میں جوابی کارروائی کے انتقامی شعلے لپکے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سکندر علی شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے پھر یتیمی ٹپکنے لگی۔

"چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے وہ حرامی درکار ہے جس نے میری امانت میں خیانت کی ہے۔ ناکامی کی صورت میں تمہارے علاوہ میں دوسروں کی چمڑی بھی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔" سکندر علی شاہ نے قہر آلود نظروں سے گونگے کو دیکھا۔ "سب نمک حراموں تک میرا پیغام پہنچا دو...... کسی ایک کو بچانے کی کوشش کی تو تم سب کا انجام خطرناک ہی ہوگا۔"

گونگا سہم کر رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر غوں...... غاں...... کر کے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا جب موبائل پر سگنل ملا۔ روشن اسکرین پر نظر آنے والا نمبر سکندر علی شاہ کے لیے نیا تھا پھر بھی اس

نے کسی خیال کے تحت موبائل آن کر کے بھاری بھرکم لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے......؟"

"نئے نمبرز دیکھ کر تیزی سے دم ہلانے کی عادت چھوڑ دو سکندر علی شاہ۔" دوسری طرف سے "شکرہ" کا حوالہ دینے کے بعد سرد مہری سے کہا گیا۔

"تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں دور رہ کر بھی تمہاری سانسوں کی رفتار اور اس کے اتار چڑھاؤ سے باخبر رہتا ہوں۔"

"معذرت خواہ ہوں۔" سکندر علی شاہ نے پل بھر میں کینچلی بدل کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "اس وقت کسی معاملے کی چھان بین کرنے کی وجہ سے میں ذرا الجھا ہوا تھا......"

"جانتا ہوں...... اسی لیے تمہیں فون بھی کیا ہے۔" اس بار بھی سرد لہجے میں کہا گیا۔ "تم ایک گونگے پر اپنی مردانگی کا اظہار کر کے غلطی کر رہے ہو...... جس نے لڑکی کو داغدار کیا وہ گونگا نہیں ہے......"

"پھر...... پھر...... وہ کون تھا؟"

"فی الحال حویلی جا کر آرام کرو...... مجرم جو بھی ہے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس کی اطلاع بھی کسی نہ کسی ذریعے سے تمہیں مل جائے گی۔"

"میں آپ کے اس احسان کو بھی فراموش نہیں کروں گا" سکندر علی شاہ نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ "میری جگہ آپ ہوتے تو شاید آپ بھی......"

"نہیں......" اس بار دوسری جانب سے بولنے والے نے گرج کر تنبیہ کی۔ "دوبارہ کبھی زمین کی خاک کو آسمان سے ملانے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا......"

"میں پھر معذرت خواہ ہوں۔" سکندر علی شاہ نے دل پر جبر کر کے انکساری سے کام لیا۔

"ایک بات اور سن لو...... تم نے گونگے کو ڈرائیوری سے ہٹا کر فارم ہاؤس کیوں منتقل کیا تھا اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہے...... کیا تم گڑھے مردوں کو دوبارہ اکھاڑنا پسند کرو گے؟"

"جج...... جج...... جی...... نہیں۔" جواب میں سکندر علی شاہ کسی وجہ سے ہکلا کر رہ گیا پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سکندر علی شاہ نے موبائل آف کر کے گونگے کو نفرت سے گھورا لیکن اس کے اظہار سے گریز ہی مناسب سمجھا۔

تجویز

ایک صاحب کو لائبریری سے کتابیں چرانے کی عادت پڑی ہوئی تھی اور وہ کافی کتابیں چرا کر اپنے گھر لا چکے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ شاید لائبریرین اس سے لاعلم ہے۔ ایک دن لائبریرین ان کے گھر آیا اور بولا۔ "محترم! میری ایک تجویز ہے اگر آپ پسند کریں اور اجازت دیں تو لائبریری کا بورڈ بھی اتار کر آپ کے گھر پر ہی لگا دیا جائے۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

* * *

* * *

اورنگ زیب کے چہرے پر بڑی گمبھیر سنجیدگی مسلط تھی۔ تھانہ انچارج نے اسے لیاقت حسین کے سلسلے میں جو تفصیل بتائی وہ ایسی نہیں تھی جسے شانے کی ایک جنبش سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ انیکسی سے فرحین کے اغوا کے وقت جو پانچ لاشیں سامنے آئی تھیں اس کا معاملہ کچھ اور تھا لیکن کسی ثبوت کے بغیر ایک آدمی کو گولی مار کر ہلاک کر دینا اور تین کو اپاہج کر دینے والی بات سنگین نوعیت کی تھی۔ اگر ایس ایچ او واقف کار نہ ہوتا...... اطلاع دیے بغیر وہ ضابطے کی کارروائی کر گزرتا تو کاغذات میں ردوبدل کی گنجائش بھی ممکن نہیں تھی۔

اسے علم تھا کہ کچھ غیبی قوتیں لیاقت حسین کو قبل از وقت خطرے سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ شیخ حامد کے فرار ہوتے وقت اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے بھی لیاقت حسین ہی نے گاڑی کا رخ اچانک گڈانی کے ساحلی علاقے کی طرف پھیر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے صرف ایک جملہ کہا تھا جس کی تصدیق بعد میں ہو گئی تھی لیکن اس نے گاڑی کا رخ کیوں موڑا تھا؟ کیا جملہ کہا تھا؟ یہ باتیں بعد میں اسے بھی یاد نہیں تھیں۔ سراج بھی اس کا گواہ تھا لیکن عدالت ان باتوں کو نہیں مانتی۔ وہاں گواہی شہادت اور ٹھوس ثبوت کی بنیادوں پر معاملے نمٹائے جاتے ہیں۔ محض شک کی بنیاد پر سرعام فائرنگ کر کے چار آدمیوں پر گولیاں برسانے والی منطق کسی جج کے حلق کے نیچے نہیں اتر سکتی تھی۔

اس وقت بھی وہ سوچ میں گم تھا جب اس نے آئی جی کے دفتر سے نکلنے کے بعد سراج کو اس کے دفتر سے پک کیا تھا۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے کے بعد سراج نے اورنگ زیب کے چہرے پر سنجیدگی اور غور وفکر کے گہرے تاثرات دیکھے تو اس نے دبی زبان میں کہا۔

’’معاملہ کچھ سنگین معلوم ہوتا ہے؟‘‘

اورنگ زیب نے جواب نہیں دیا وہ بہ دستور لیاقت حسین کے بچاؤ کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

’’ہم اس وقت کہاں چل رہے ہیں؟‘‘ اس بار سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

’’کچھ دیر پیشتر بندرگاہ کے علاقے کے ایس ایچ او نے اطلاع دی ہے کہ ایک شخص نے محض امکان کی بنا پر ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تین افراد کو اس انداز میں گولی ماری ہے کہ وہ تمام زندگی اپاہج رہیں گے۔‘‘

’’پھر...... ہم وہاں کس مقصد سے جا رہے ہیں......؟‘‘ سراج نے سوال کیا۔ ’’ہمارا اس معاملے سے کیا آفیشل تعلق ہے؟‘‘

’’ایس ایچ او ہم دونوں کا واقف ہے۔‘‘ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ’’اس کا خیال ہے کہ جس نے یہ واردات کی ہے وہ بے گناہ ہے......‘‘

’’اور اب ہم محض اس کے خیال کو تقویت پہنچانے کی خاطر وہاں جا رہے ہیں۔‘‘ سراج الجھ گیا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ہمارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا...... ہمیں اس معاملے سے زیادہ اہم کام نمٹانے ہیں۔‘‘

’’تم نے اس شخص کا نام نہیں پوچھا، جس نے یہ جرم کیا ہے؟‘‘

’’ایس ایچ او کا واقف کار ہوگا......‘‘ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

’’مجرم نے ایس ایچ او کو تمہارے نام کا حوالہ بھی دیا ہے......‘‘ اورنگ زیب نے سراج کی جانب دیکھا۔ ’’اب کیا کہو گے......؟‘‘

’’آپ کا اشارہ کیا لیاقت حسین کی طرف ہے؟‘‘ سراج نے اورنگ زیب کے جواب اور بندرگاہ جانے والی روڈ کے حوالے سے چونک کر لیاقت حسین کا نام لیا تو اورنگ زیب مسکرا دیا۔ پھر اس نے ایس ایچ او کی جانب سے ملنے والی سنگین اطلاع سراج کو بھی سنا دی۔ تفصیل سننے کے بعد سراج بھی ہونٹ چبانے لگا۔ اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

’’چپ کیوں ہو گئے......؟‘‘

’’مجھے یقین ہے کہ اگر معاملہ لیاقت حسین کا ہے تو اسے پھر غیبی قوتوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور ملا ہوگا۔‘‘ سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ ’’آپ کا کیا خیال ہے؟...... کیا ایس ایچ او ہماری سفارش پر اتنی سنگین واردات کے سلسلے میں لیپا پوتی پر آمادہ ہو جائے گا؟‘‘

’’نہیں...... میرے کہنے پر اس نے پرچہ کاٹ دیا ہے۔ لاش اور تینوں زخمیوں کو بھی پولیس سرجن کے آفس روانہ کیا جا چکا ہوگا لیکن...... لیاقت حسین ایس ایچ او کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ سراج چونکا۔

’’صورت حال کا اندازہ تھانے پہنچنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔‘‘

سراج کسمسا کر رہ گیا۔ اورنگ زیب کی زبانی تفصیل سننے کے بعد وہ بھی گھبرا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ایس ایچ او کے کمرے میں موجود تھے۔ سراج کے اصرار پر ایس ایچ او نے ایک بار پھر تمام رام کہانی تفصیل سے دہرا ڈالی۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے لیاقت حسین کی ضد کے بعد ہی اسے لاک اپ میں بند کیا ہے۔

’’تم نے جو تعاون کیا ہے میں ذاتی طور پر اس کا شکر گزار ہوں۔‘‘ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

’’آپ شرمندہ کر رہے ہیں سر...... میں آپ ہی کی وجہ سے آج اس سیٹ پر ہوں۔‘‘

رسمی باتوں کے بعد لیاقت حسین کو سامنے لایا گیا...... اس نے ایک نظر اورنگ زیب اور سراج پر ڈالی پھر نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سراج اپنی جگہ سے اٹھ کر لیاقت حسین کے پاس گیا، دوستانہ انداز میں پوچھا۔

’’لیاقت حسین...... میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا خاص آدمی سمجھا ہے، الماس کے حوالے سے تمہارا ایک احسان میرے اوپر بھی ہے...... میں جانتا ہوں کہ تم نے محض تفریحاً گولیاں نہیں چلائی ہوں گی...... کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔‘‘

’’مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب...... لیکن میں نے جو کچھ کیا میں اس کا اقرار کر چکا ہوں۔‘‘ لیاقت حسین نے عجیب انداز میں جواب دیا۔ چاہتا تو فرار بھی ہو سکتا تھا لیکن میں بزدل نہیں ہوں صاحب...... میرا تعلق جس جگہ سے ہے وہاں عزت کی حفاظت کی خاطر زبان کے بجائے گولیاں

چلائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے فرحین پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی ہے میں ان کے پورے خاندان کو بھی تباہ کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ جس پر شبہ ہوگا اس کو آخری سانس لینے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔‘‘

’’جو شخص مارا گیا۔ تین افراد جو زخمی ہوئے، ان پر تمہیں کیا شبہ ہوا تھا......؟‘‘

’’میں نہیں جانتا صاحب......‘‘ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ’’بس، میرے دل میں ایک خیال آیا تھا کہ وہ کسی کے اشارے پر میرے پیچھے آ رہے ہیں پھر...... جو کچھ ہوا میں نے مردوں کی طرح اس کا اقرار بھی کر لیا ہے۔‘‘

’’تم...... میری ایک بات مانو گے......؟‘‘ سراج نے اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔

’’حکم دو صاحب...... آپ میرے محسن ہو...... آپ کے حکم پر اپنی گردن کاٹ کر آپ کے قدموں پر بھی رکھ سکتا ہوں۔‘‘

’’قانون اندھا ہوتا ہے لیاقت حسین...... اس کا پیٹ بھرنے کی خاطر انسان کو وقت اور حالات کی نزاکتوں کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے...... تم بھی اسی دنیا میں رہتے ہو اس لیے تم کو بھی انہی اصولوں پر قدم اٹھانا ہوگا۔‘‘

’’قانون کی باتیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں صاحب...... مجھے کیا کرنا ہوگا......؟‘‘ لیاقت حسین نے سراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’میں جانتا ہوں کہ تم نے جو قدم اٹھایا وہ کسی مصلحت کی بنا پر اٹھایا ہوگا لیکن اب...... اب قانون کا پیٹ بھرنے کی خاطر تمہیں میرے مشورے پر اپنا بیان بدلنا ہوگا۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں صاحب...... میں نے کیا غلط بیان دیا ہے جسے اب بدلنا ہوگا؟‘‘

’’تم شاید بھول رہے ہو کہ جس شخص کو تم نے پہلے گولی ماری اس کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب...... وہ رائفل بھی میں نے ادھر تھانے میں جمع کرا دی ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں لیکن......‘‘ سراج نے اس بار سرگوشی کی۔ ’’رائفل والے نے پہلے تم پر فائر کیا تھا...... تم نے اپنی جان بچانے کی خاطر جوابی کارروائی کی تھی جس کے نتیجے میں......‘‘

’’ایسا نہیں ہوا تھا صاحب۔‘‘ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ’’میں نے اس کو فائر کرنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔‘‘

’’میں قانون کا پیٹ بھرنے کی بات کر رہا ہوں۔‘‘ سراج نے وضاحت کی۔ ’’اگر رائفل سے پہلے فائر نہیں ہوا تو اب کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو جواز پیش کرنا ہوگا۔ تم صرف میرے کہنے پر اپنا سابقہ بیان تبدیل کر دو۔ اس کے بعد قانونی معاملات کو ہم سنبھال لیں گے۔‘‘

’’میں اپنا بیان تبدیل نہیں کروں گا صاحب۔‘‘ لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا۔ ’’آپ اور ایس پی صاحب دونوں میرے محسن ہو...... میں اپنی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔ یہ نمک حرامی ہوگی۔‘‘

’’دوسری شکل میں جانتے ہو کیا ہوگا......؟‘‘ سراج نے جھلا کر لیاقت حسین کو گھورا۔

’’پھانسی......‘‘ لیاقت حسین نے نظریں اٹھا کر بے پروائی سے جواب دیا پھر اس نے سراج کا ہاتھ تھام کر ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک عاجزانہ درخواست بھی کر ڈالی۔ ’’مجھے پھانسی ہونے کے بعد آپ میری فرحین کو عزت سے اس کے گھر چھوڑ آنا صاحب...... بابا سے بھی یہی کہنا کہ اس کا لیاقت حسین بزدل نہیں تھا...... اس نے خود کو بچانے کی خاطر کسی دھوکے یا فریب کا سہارا ابھی نہیں لیا...... یہ بات سن کر بابا کا سر بھی اونچا ہو جائے گا۔ فرحین بھی مجھ پر فخر کرے گی...... ہمارے علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب۔‘‘

’’یہ...... تم پر کس قسم کا دورہ پڑا ہے لیاقت حسین؟ اس سے پیشتر تمہاری یہ کیفیت کبھی نہیں ہوئی۔‘‘

’’اس سے پہلے کسی نے فرحین کے بدن کو ہاتھ لگانے کی غلطی بھی نہیں کی تھی...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو صاحب۔‘‘ لیاقت حسین نے سرد لہجے میں کہا پھر قدم اٹھاتا دوبارہ حوالات کی طرف چلا گیا۔

اورنگ زیب ایس ایچ او کے ساتھ بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کا طرز عمل اس کے لیے تعجب خیز نہیں تھا۔ سراج قریب آیا تو اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

’’میرا خیال ہے کہ اب مسز عثمان یا فرحین لیاقت حسین کی گرم کھوپڑی کو ٹھنڈا کرنے کے کام آ سکتی ہیں۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں سر......‘‘ ایس ایچ او نے کہا۔ ’’جو کچھ ممکن ہوا میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن لیاقت حسین کو بہرحال ہمارا ساتھ دینا پڑے گا، اگر عدالت میں بھی اس نے وہی کہا جو اس وقت کہہ رہا ہے تو پھر......‘‘

فون کی گھنٹی بجی تو ایس ایچ او نے معذرت کر کے

ریسیور اٹھالیا۔ کچھ دیر ''ہوں...... ہاں...... سر...... یس سر...... رائٹ سر۔'' کہہ کر دوسری طرف سے بولنے والے کو جواب دیتا رہا پھر اس نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

''آپ کا کیا حکم ہے میرے لیے؟''

''ہم کوشش کریں گے کہ پولیس سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان دینے سے پیشتر لیاقت حسین کو قانونی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ کرسکیں۔'' اورنگ زیب کے بجائے سراج نے ایس ایچ او سے کہا۔ ''میں صرف ایک درخواست کروں گا۔ آپ لیاقت حسین کا خیال رکھیں۔ اسے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ وہ فرار نہیں ہوگا۔ اگر ہتھکڑی کھول دی جائے تو بھی وہ تھانے سے باہر نہیں جائے گا۔''

''میں جانتا ہوں سر......'' ایس ایچ او نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''اگر اسے فرار ہی ہونا ہوتا تو یہاں آنے کی حماقت ہی نہ کرتا لیکن ...... میں ہتھکڑی کھولنے اور اسے علیحدہ کمرے میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔''

''اوہ......'' اورنگ زیب نے جو فون ریسیو کرنے کے بعد سے ایس ایچ او کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا، بے حد سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ''میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔ تھانے کے عملے میں بھی کالی بھیڑیں ضرور ہوتی ہیں جو ایک ایک لمحے کی خبر ادھر سے ادھر پہنچاتی رہتی ہیں۔''

''آپ میرے محسن بھی ہیں سر...... اور تجربے کار بھی، میری مجبوری کو ضرور سمجھ رہے ہوں گے۔''

''اسی لیے میں تم سے یہی کہوں گا کہ لیاقت حسین کے ساتھ کوئی ایسی رعایت نہ کرنا جو تمہارے لیے بھی مشکل پیدا کردے۔'' اپنی بات کہتے وقت اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ پر بال پین سے کچھ لکھ کر ایس ایچ او کے سامنے کردیا۔ ایس ایچ او نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

''جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر مجھے امید تھی کہ آپ مجھے یہی مشورہ دیں گے۔''

سراج تلملا کر رہ گیا، وہ براہ راست ایس ایچ او سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اورنگ زیب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دوبارہ ایس ایچ او سے قدرے افسرانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے پولیس سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان کی نقل درکار ہوگی۔ یہ گزارش میں لیاقت حسین کے ایک واقف کار کی حیثیت سے کررہا ہوں۔''

پھر ایس ایچ او کے جواب دینے سے پیشتر ہی وہ سراج کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔ اس کے تیور کی اچانک تبدیلی سراج نے بھی محسوس کی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے دبی زبان میں دریافت کیا۔

''آپ نے اچانک جو یوٹرن لیا۔ کیا اس کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں۔''

''ایس ایچ او کو اوپر سے جو ہدایت ملی ہے اس کے بعد وہ مجبور ہوگیا ہے۔'' اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ''تم نے شاید نوٹ نہیں کیا کہ کسی کا فون آجانے کے بعد وہ محتاط ہوگیا تھا۔''

''آپ نے ہاتھ پر کیا لکھ کہ اس کو دکھایا تھا؟''

''آئی۔ جی......''

''اوہ......'' سراج نے ہونٹ چبائے۔ ''گویا لیاقت حسین کو گھیرنے والے آکٹوپس ہی کے افراد تھے؟''

''نہیں...... آکٹوپس کی جگہ جس نے بھی لی ہے۔ آئی جی اس کا حکم ٹالنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تم میرے تبادلے کی بات کیوں فراموش کررہے ہو؟''

''پھر...... اب آپ نے کیا سوچا ہے؟'' سراج نے پہلو بدل کر سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم لیاقت حسین کو موجودہ صورت حال میں بے یارو مددگار بھی نہیں چھوڑ سکتے۔''

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات غمازی کررہے تھے کہ وہ بھی کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، سراج اس کی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا جب اورنگ زیب نے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے سرسراتے لہجے میں کہا تھا۔

''اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔''

''کوئی نئی سچویشن......'' دوسری جانب سے کرنل احتشام کی آواز ابھری۔ جواب میں اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی پوری کہانی دہراتے ہوئے کہا۔

''اس بار بھی کسی نے اوپر سے ہمارے بگ باس کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کی ہے۔''

''ڈونٹ وری...... میں لیاقت حسین کے کیس کو ذاتی طور پر بھی ہینڈل کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔'' کرنل احتشام نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ کے تبادلے کے آرڈر بھی پندرہ منٹ میں تبدیل کرادوں گا۔''

''نو سر...... یہ مناسب نہیں رہے گا۔'' اورنگ زیب نے تیزی سے جواب دیا۔ ''جو چہرے نقاب میں چھپے ہیں انہیں سامنے لانے کی خاطر ہمیں دور اندیشی سے کوئی پلان مرتب کرنا ہوگا۔''

''سول پولیس اور ہمارے کام کرنے کے انداز میں یہی فرق ہے۔'' کرنل احتشام نے الجھ کر کہا۔ ''دشمن سامنے ہو تو ہم پہلی فرصت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں...... ڈھیل دینے کی صورت میں بازی اکثر پلٹ جاتی ہے۔''

''آئی ایگری ود یو سر...... لیکن اس وقت ہم ایک نہیں دو محاذ پر جنگ لڑ رہے ہیں اور...... دشمن بھی پردے میں ہے...... اسے سامنے لانے کی خاطر مجھے آپ سے کچھ تعاون درکار ہے۔''

''نو فارمی لیٹی۔'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''جو مہرہ آپ کی تحویل میں ہے آپ اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کریں۔ جو سانپ سامنے نہیں ہے اب اسے سامنے لانے کی خاطر ہمیں بھی حالات کے پیش نظر کچھ غیر قانونی عمل کرنے کی ضرورت ہے۔''

''گڈ...... میں بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا...... کوئی دشواری پیش آئے تو آپ بلا جھجک میرا حوالہ دے سکتے ہیں۔ جو بھی صورت حال ہوئی میں اسے سنبھال لوں گا۔''

''تھینکس...... سر!'' اورنگ زیب نے موبائل بند کیا تو سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''کیا آپ کو امید ہے کہ وشنو آسانی سے زبان کھول دے گا؟''

''اس کا جواب مجھے کرنل سے بعد میں معلوم ہوگا۔''

''جو شخص آئی جی کو اشارے پر چلنے پر مجبور کررہا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی کلیو نہیں ہے۔''

''اب ہمیں دو اور دو پانچ کے فارمولے پر عمل کرنا پڑے گا۔'' اورنگ زیب نے سڑک پر نظریں جمائے جمائے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟''

''الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں کچھ وقت ضرور ضائع ہوتا ہے مائی ڈیئر۔'' اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ''پہلے جگا کے فرنیچر مارٹ کی تباہی...... رستم علی آغا خانی کو بلیک میل کرنے کی کوشش...... ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کی موت...... آکٹوپس کی رہائش گاہ کی کھنڈر میں تبدیلی پھر...... میرے لگژری فلیٹ پر حملہ اور توڑ پھوڑ...... ہنی مون بیوٹی پارلر میں ہونے والے لڑکیوں کے مذموم کاروبار کی تفصیل اور...... سکندر علی شاہ کی وہ فائل جسے سرد خانے کے

سبق آموز واقعات

☆ بیگم نے خوب صورت نوکرانی کو فارغ کرتے ہوئے کہا۔

''صاحب کو تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب ان کا کیا بنے گا؟''

''آپ ان کی فکر نہ کریں۔'' نوکرانی نے جواب دیا۔ ''وہ بھی میرے ساتھ ہی جارہے ہیں۔''

☆☆☆

☆ صاحب دفتر سے گھر آئے تو بیگم نے شکایت لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس ڈرائیور کو فوری طور پر نکال دیں۔ آج پھر میرا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا ہے۔''

''میرا خیال ہے۔'' میاں نے کہا۔ ''اسے ایک موقع اور دینا چاہیے۔''

☆☆☆

ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ جب قبرستان لے جارہے تھے تو جنازے کی چارپائی گلی کی نکڑ والے کھمبے سے ٹکرائی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چنانچہ اسے گھر واپس لے آئے۔ چند ماہ بعد واقعی اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا جنازہ لے جاتے ہوئے جب گلی کی نکڑ کے قریب پہنچے تو عقب سے خاوند پکار کر بولا۔

''کھمبا بچا کے۔''

☆☆☆

میاں حسب معمول رات کو دیر سے گھر آئے۔ چپکے سے کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہے تھے کہ بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پوچھا۔

''کیا کررہے ہو۔''

''ہاتھ دھو رہا ہوں۔'' میاں نے دھیرے سے جواب دیا۔

''کس لیے؟'' بیوی نے غصے سے پوچھا۔

''سونے کے لیے۔'' میاں نے جواب دیا۔

مرسلہ: ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل
جسووال کھوکھران

حوالے کر دیا گیا تھا...... اب یہ باتیں میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہیں...... ان تمام وارداتوں کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے ضرور ملتے ہیں......“

”ہوسکتا ہے لیکن آپ نے کرنل سے کسی غیر قانونی عمل کی بات کی تھی۔“

”ہاں......“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”سرجن بھی جانتا ہے کہ ہر آپریشن کامیاب نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ سرجری کرتا ہے...... اب ہمیں بھی اسی فارمولے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟“

”سب سے پیشتر ہنی مون بیوٹی پارلر میں معمولی نوعیت کی توڑ پھوڑ اور ہنگامہ۔“

”آئی۔سی......“ سراج چونکا۔ ”کیا آپ شیلا ورما اور جونی......“

”نہیں......“ اورنگ زیب نے سراج کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”یہ دونوں مہرے ہیں لیکن...... ایک نام میرے ذہن میں چبھ رہا ہے۔ سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی نگینہ...... میری اطلاع کے مطابق شیلا ورما سے میل جول کے علاوہ جونی سے بھی اس کے تعلقات تھے مگر کچھ دنوں سے اس نے بھی بیوٹی پارلر آنا جانا ترک کر دیا ہے...... کسی وجہ سے جونی بھی دو دنوں تک انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد سامنے آگیا ہے۔“

”یہ اطلاعات مجھے بھی مل چکی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہم نگینہ کو اہمیت دینے کے بجائے براہ راست سکندر علی شاہ کا پوسٹ مارٹم کریں تو نتائج امید افزا بھی ہوسکتے ہیں......“

”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گا...... میرے پلان میں سکندر علی شاہ کا فارم ہاؤس بھی ہے جہاں ہمارے بڑے بڑے افسران اور حکومت کے ذمے دار عہدے داروں کو بھی داد عیش کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں لیکن جب تک ڈور کا ایک سرا ہاتھ نہ آجائے ہم جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے......؟“ سراج نے پوچھا۔ ”کیا میڈم کی لیڈی سیکریٹری کا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؟“

”ہو بھی سکتی ہے......“

”بیوٹی پارلر پر ہنگامے کے لیے آپ نے کس کا انتخاب کیا ہے؟...... افضل خان اس کام کو بہتر طور پر کر سکتا ہے۔“

”مجھے تم سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”تم یہ کیوں فراموش کر رہے ہو کہ وشنو کی دوبارہ گرفتاری میں افضل خان نے کلیدی کردار ادا کیا تھا...... ایسی صورت میں وشنو کی ہٹ لسٹ پر بھی وہ سرفہرست ہوگا...... اس کی حفاظت کی ذمے داری سے غافل نہ ہونا......“

”آئی جی کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں......“ اورنگ زیب نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”حالات کی بساط پر اس کی حیثیت زیادہ اہم نہیں ہے...... کسی دکھتی رگ کے سبب وہ خود بھی بے بس ہے۔“

پھر گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا...... موبائل پر کسی کال کے آجانے کے سبب اورنگ زیب نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھ کر اسے فوراً ہی آن کر لیا تھا۔

دوسری جانب سے بولنے والا خاص مخبر ”پینتھر“ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سراج کی نظریں بہ دستور اورنگ زیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

* * *

وشنو اس وقت بھی ملٹری انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں ننگے فرش پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک نام رہ رہ کر گونج رہا تھا......

”افضل خان۔“

پچاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کر وہ لوچن کی نظروں میں بھی دھول جھونک کر نکل گیا تھا، کرنل احتشام کے سادہ لباس والے بھی اس کی ہوا نہیں پا سکے تھے...... بعد میں اس کے فرار کی اطلاع نے سب کو ششدر کر دیا ہوگا۔ وشنو اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا، ہنری براؤن کا میک اپ کرنے کے بعد اسے پورا وشواس تھا کہ اب اسے تلاش کرنے والے ٹاپتے رہ جائیں گے۔ اس نے طے کیا تھا کہ بگ باس سے رابطہ ہونے کے بعد وہ پہلی فرصت میں کسی اور زیادہ محفوظ مقام پر منتقل ہو جائے گا لیکن افضل خان نے درمیان میں آکر اس کے سارے خوب صورت سپنوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

وشنو کو یقین تھا کہ افضل خان بھی ذاتی طور پر اس کی نگرانی ضرور کرتا رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اس کے ہوٹل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آمنا سامنا ہونے کے بعد خود وشنو بھی پہلی نظر میں افضل خان کو نہیں پہچان سکا تھا۔ جب پہچانا...... اس وقت دیر ہو چکی تھی پھر...... وہ افضل خان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر دوبارہ کرنل احتشام کے چنگل میں آگیا تھا۔

افضل خان کے حوالے سے وشنو کے ذہن میں ایس

پی اورنگ زیب کا نام بھی گونج رہا تھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس نے اورنگ زیب کو دوسرے پولیس افسروں سے بہت مختلف پایا تھا۔ یقیناً اسی کے اشارے پر افضل خان بھی پوری طرح متحرک تھا جس کی وجہ سے وشنو ایک بار پھر پھنس گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار کرنل نے بھی نگرانی کا سخت انتظام کیا ہوگا۔ اس کے تجربے کار کمانڈوز پوری طرح محتاط ہوں گے۔ ان کے حصار کو توڑ کر نکل جانا آسان نہیں ہوگا مگر...... وشنو کا شاطر ذہن اس وقت بھی ناممکن کو ممکن بنا دینے کے امکانات پر غور کر رہا تھا جب کمرے کے بند دروازے پر ایک ذرا سی آہٹ سن کر وہ پوری طرح محتاط ہوگیا اور اب وہ خود کو اتنا مطمئن ظاہر کرنے لگا جیسے کسی بات کی قطعی پروا نہ ہو۔

کمرے میں داخل ہونے والا ایک میجر تھا، وشنو اسے کئی بار کرنل احتشام کے ساتھ دیکھ چکا تھا، اس کا تعلق وشنو کے خیال کے مطابق ملٹری کے کسی ایسے شعبے سے تھا جہاں زبان کے بجائے ذہن اور تجربے کار نظروں سے دوسرے کو پرکھا جاتا ہے...... بعد میں اس کی تحریری رپورٹ تیار کی جاتی ہوگی۔ اسی کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ بھی کیا جاتا ہوگا۔

میجر کے سامنے آنے کے بعد دو مسلح سپاہی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں فولڈنگ چیئر تھی۔ میجر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی روشن اور چمکدار نظریں اپنے تجربے کی روشنی میں وشنو کے تاثرات کو پرکھنے لگیں۔ ایک لمحے تک وشنو خاموش رہا پھر اس نے میجر کو اپنی فیس ریڈنگ کا موقع نہیں دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”میں اس وقت میک اپ میں نہیں ہوں میجر...... تمہارے آدمیوں نے میرا اصل روپ دیکھنے کے کارن جو لوشن استعمال کیا تھا اس نے میرے سارے روپ بہروپ دھو ڈالے ہیں...... ابھی تک اس کی جلن میرے چہرے پر چیونٹیوں کی طرح ڈنک مار رہی ہے۔“

میجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم بھی ابھرا تھا۔

”تم اپنا اور میرا سمے برباد مت کرو آفیسر۔“ وشنو نے اس کی نظروں کا توڑ کرنے کی خاطر پھر اس کی توجہ میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ”جو من چاہے سوال کرو...... میں تم سے کوئی بات غلط نہیں کہوں گا۔ دو کوڑی کے ملازموں سے جو تالات کھانے کے بعد جو مجرم فر فر بولنے لگتے ہیں میرا شمار ان میں نہ کرو...... جب تک تمہاری قید میں ہوں...... تم مالک ہو اور میں مجبور...... جس دن یہاں سے چھومنتر ہوگیا...... میں مالک ہوں گا اور تم مجبور...... چور سپاہی کا ناٹک اسی طرح چلتا رہتا ہے۔“

میجر بہ دستور مہر بہ لب رہا البتہ ساتھ میں کھڑے دونوں کمانڈوز کے تیور بدلنے لگے۔

”وشنو کو قابو کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے......“ وشنو نے میجر کو مسکرا کر بے پروائی سے مشورہ دیا۔ ”کوئی زہریلا انجکشن...... پھر نہ رہے گا بانس نہ باجے گی بانسریا...... اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کام نہیں کرے گا۔“

”بولتے رہو......“ میجر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تمہاری باتیں بھی میرے لیے کارآمد ہوں گی۔“

”تمہاری مرضی......“ وشنو نے شانے اچکائے پھر بے نیازی سے آنکھیں موند لیں۔

دس پندرہ منٹ تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی پھر دروازہ دوبارہ کھلنے کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری تو وشنو نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ آنے والا کرنل احتشام تھا جسے دیکھ کر میجر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا رہا......؟“ کرنل احتشام نے میجر سے دریافت کیا لیکن اس کی قہر آلود نظریں وشنو پر ہی مرکوز تھیں۔

”میکسی مم ڈوز (MAXIMUM DOSE)“ میجر نے مختصر جواب دیا۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟“ کرنل نے وشنو کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے؟“

”تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی گٹ پٹ میں بھی کر لیتا ہوں۔“ وشنو نے سنبھل کر کہا۔ ”آپ اپنا آخری ارمان بھی پورا کر لو لیکن میرا جواب وہی ہوگا...... مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو جس کی تلاش ہے وہ کہاں ملے گا...... میری اس کی بات صرف موبائل پر ہوتی ہے...... ہر بار وہ نئے نمبر سے کال کرتا ہے...... وہ سب میں اگل چکا ہوں...... اور کیا معلوم کرنا ہے؟“

”آخری بار تم اس سے کہاں ملے تھے......؟“

”ملنے ہی کے کارن موت کے کنویں سے چھلانگ لگا کر گیا تھا مگر ایک چھوٹی سی بھول ہوگئی جو پھر تمہارے سامنے موجود ہوں۔“ وشنو نے بل کھا کر جواب دیا۔ ”پہلی فرصت میں ایک گولی اس کی کھوپڑی میں داغ کر نو دو گیارہ ہو جاتا تو......“

”شٹ اپ......“ کرنل گرج اٹھا۔ ”یہ کہانی میں پہلے بھی سن چکا ہوں...... زندگی چاہتے ہو تو اس کا پتا بتا

دو...... ورنہ تمہارے ساتھ اب جو ہوگا...... اچھا نہیں ہوگا......''

''یہ دھمکی بھی میرے لیے نئی نہیں ہے......'' وشنو نے سپاٹ لہجے میں زہرخند سے جواب دیا۔ ''اپنے آدمیوں سے کہو کہ دوا کی آخری خوراک کا تجربہ بھی کرلیں......''

''باسٹرڈ......'' کرنل کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا پھر اس نے اپنے کمانڈوز کو حکم دیا۔ ''اسے ٹارچر سیل میں لے جاؤ...... اس وقت تک ڈوز دیتے رہو جب تک یہ زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہوجائے......''

وشنو کرنل کا فیصلہ سن کر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے مسلح کمانڈوز کے ساتھ جانے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وشنو کے جانے کے بعد کرنل اپنے آفس میں آگیا، میجر بھی اس کے ساتھ تھا، اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اس نے میجر سے پوچھا۔ ''آپ کی فائنل ریڈنگ کیا ہے......؟''

''سخت جان مجرم ہے...... آسانی سے زبان کھولنے کی امید ٹین پرسنٹ بھی نہیں ہے۔'' میجر نے بات جاری رکھی۔ ''ویسے میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ اصل مجرم کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہے۔''

''آپ نے اس کی فائل بھی ضرور دیکھی ہوگی......'' کرنل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ایسے مجرموں کی موت بھی ہمارے لیے کسی نقصان کا سبب نہیں ہوگی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے......''

میجر کچھ دیر بعد چلا گیا تو کرنل نے کچھ سوچ کر آئی جی سے کال ملائی، اس کے چہرے کے تاثرات میں جو فوری تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ بھی معنی خیز تھی۔

''اس وقت کیسے یاد کیا؟'' رابطہ ہونے پر آئی جی کی آواز ابھری۔

''میری اطلاع کے مطابق ایس پی اورنگ زیب غالباً آج کل پھر کسی اہم کام میں مصروف ہے۔''

''یو آر رائٹ۔'' آئی جی نے کچھ توقف سے کہا۔ ''وہ ایک ذاتی معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

''میری رپورٹ کے مطابق وہ شاید کسی ایسے شخص کو بچانے کی کوشش کررہا ہے جو اس سے پہلے بھی پانچ آدمیوں کو شوٹ کرچکا ہے۔ ان میں تین پولیس کو مطلوب مجرم بھی تھے۔''

''آپ کی انفارمیشن صحیح ہے کرنل...... مسٹر اورنگ زیب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا خیال ہے کہ کچھ غیبی قوتیں اس شخص کو قبل از وقت خطروں سے آگاہ کردیتی ہیں۔ ایک بار میں بھی اس شخص سے مل چکا ہوں......'' آئی جی نے اسپتال میں میل نرس اور زہریلے انجکشن کی تفصیل دہراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے لیے وہ سب کچھ حیرت انگیز ہی تھا لیکن اس بار لیاقت حسین نامی شخص نے محض شبہے کی بنیاد پر ایک آدمی کو ہلاک اور تین کو شدید زخمی کردیا ہے...... عدالت ایسی کہانی کو آسانی سے ہضم نہیں کرے گی۔''

''ایسی صورت میں پولیس کے محکمے کی ساکھ بھی ضرور متاثر ہوگی۔'' پہلی بار کرنل کے لہجے میں کھنچاؤ آگیا۔

''جانتا ہوں لیکن......'' آئی جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا بات ہے......؟'' کرنل نے پوچھا۔ ''آپ اپنے محکمے کے سربراہ ہیں...... اگر کوئی مجبوری ہے تو کھل کر کہیں۔''

''پچھلی ملاقات میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ بھی مسٹر اورنگ زیب پر مہربان ہیں اس کے علاوہ غالباً کوئی مخصوص حکم نامہ بھی ہے جس کی بنا پر اسے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔''

''اوہ......'' کرنل نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''میرے اور آپ کے ایس پی کے تعلقات بے شک ہیں لیکن صرف ذاتی مراسم کی حد تک، محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے میں اپنے آفیشل معاملات میں لچک پیدا کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ کبھی کبھی اوپر والوں کا دباؤ بھی آڑے آسکتا ہے...... ایسی صورت میں کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے...... میری اور ایس پی کی دوستی کے علاوہ آپ پر اوپر والوں یا کسی اور کا دباؤ تو نہیں ہے؟''

''جی...... جی نہیں......'' آئی جی نے دباؤ والی بات کو کسی کڑوی گولی کی طرح حلق کے نیچے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ''آئی جی کی حیثیت سے میں بھی سیاہ وسپید کا مالک ہوں۔''

''گڈ......'' کرنل نے کہا۔ ''اگر آپ کا یہی خیال ہے تو پھر اورنگ زیب کو لیاقت حسین کی بے جا حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ آپ اسے تحریری طور پر اس معاملے سے الگ رہنے کے احکام جاری کردیں۔ اس کے بعد ساری ذمے داری اسی کی ہوگی۔''

''وشنو کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا......'' آئی جی نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''کیا اس نے شیخ حامد کے سلسلے میں......''

''سوری مائی ڈیئر...... میں جس سیٹ پر ہوں اس پر زبان بند رکھنا پہلی شرط ہے۔'' کرنل نے اس بار بھی بڑی خوب صورتی سے بات بنائی پھر دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد رابطہ ختم کردیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر معنی خیز تبسم ابھرنے لگا۔ اورنگ زیب کی زبانی یہ بات معلوم ہوجانے کے بعد کہ آئی جی کی تمام فون کالز کہیں سنی جاتی ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر اس وقت ایسی باتیں کی تھیں جو کال سننے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرسکیں...... یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ آئی جی اورنگ زیب کے سلسلے میں کوئی قانونی قدم اٹھائے گا یا نہیں......؟

* * *

موبائل پر موصول ہونے والی کال ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی تھی جسے شبنم نے ریسیو کیا تھا۔

''افضل خان کہاں ہے......؟ اس کا موبائل مصروف مل رہا ہے......''

''وہ کسی سے بات کررہا ہے سر۔'' شبنم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ''ہمارے لائق کوئی خدمت؟''

''افضل سے بات کراؤ...... اسے کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔''

پھر شبنم کے اشارے پر ہی افضل خان نے اپنی کال ختم کرکے شبنم کا موبائل لے لیا۔

''تم اس وقت کس سے بات کررہے تھے......؟''

''ذاتی نوعیت کی کال تھی جناب...... آپ حکم دیں۔'' افضل خان نے کہا۔

''تم اور شبنم دونوں فلیٹ تک ہی محدود رہنا......'' سراج نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''جب تک ہماری طرف سے کوئی اشارہ نہ ملے محتاط رہنے کی ضرورت ہے...... یہ بھی بتادوں کہ ہمارے سادہ لباس والوں کے علاوہ ملٹری کے کمانڈوز بھی تم دونوں کی حفاظت پر مامور کردیے گئے ہیں۔''

''آپ کی مہربانی ہے جناب...... میں بھی سمجھتا ہوں کہ وشنو کو ہتھیلی لگانے والوں کو بھی اس کا دوبارہ جال میں پھنس جانا اچھا نہیں لگا ہوگا۔ باہر زندہ آنے کے بعد خود وہ بھی مجھے شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''تمہارا اندازہ غلط نہیں۔'' سراج نے اس کے شبہے کی تائید کی۔ ''اسی وجہ سے تم کو کال بھی کیا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں......'' افضل خان نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''جو مر کر زندہ ہوا ہے...... اور اس کے گرگے بھی بخوبی جانتے ہیں کہ میں نے بھی اسی دشت کی سیاحی میں زندگی گزاری ہے۔''

''ہم بھی جانتے ہیں مگر...... یہ بھی مت بھولو کہ انسان کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی اس کے لیے کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے...... اندھیرے سے چھپ کر چلائی جانے والی گولی...... روشنی میں رہنے والوں کا لحاظ بھی نہیں کرتی...... پلک جھپکتے میں آتی جاتی سانس کا سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔'' سراج نے اس بار قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''جو کچھ کہا گیا ہے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی غلطی نہ کرنا۔''

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کیا گیا تو افضل خان نے بے پروائی سے مسکراتے ہوئے موبائل شبنم کو واپس کردیا۔ ''کوئی خاص بات......؟'' شبنم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہاں...... ہمارے سول میرج کے پروگرام کے درمیان کچھ رکاوٹیں پیش آگئی ہیں۔''

''ٹالنے کی کوشش کررہے ہو......؟''

''نہیں...... سچ کہہ رہا ہوں۔'' افضل خان نے شبنم کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ ''ہمیں کچھ دنوں تک فلیٹ میں بند رہنے کا حکم ملا ہے۔''

''سراج صاحب کا فون نہ آتا تو میں بھی تمہیں یہی مشورہ دیتی...... تم نے وشنو پر ہاتھ ڈال کر جو خطرہ مول لیا ہے وہ آسانی سے ختم نہیں ہوگا...... آکٹوپس جہاں بھی ہے اسے بھی یہ اطلاع ضرور مل گئی ہوگی...... اس کے شکاری کتے بھی ہمیں سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔'' شبنم نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس سے علیحدہ ہوجانے کے باوجود بھی یہ بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی کہ جو لوگ اس کے ملازم رہ چکے ہوں وہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت بھی کرسکیں۔''

''سمجھ گیا......'' افضل خان نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''تمہیں اس بات کی زیادہ خوشی ہوگی کہ سول میرج والی بات فی الحال......''

''ایسا مت سوچو......'' شبنم نے قدرے شرما کر کہا۔ ''تم میڈم روبی کو کیوں بھول رہے ہو؟ میں اگر اس سے درخواست کروں تو وہ اس پوزیشن میں ہے کہ کسی مجسٹریٹ کو ہمارے فلیٹ پر بھی بھیج دے...... سول میرج کی قانونی خانہ پری یہاں بھی ہوسکتی ہے۔''

''جانتا ہوں لیکن اس کے علاوہ بھی ایک شخص ہمارے تمہارے درمیان رکاوٹ بنا ہوا ہے۔''

''وہ کون ہے......؟'' شبنم نے اسے سوالیہ نظروں

سے گھورا۔

''جبرو......'' افضل خان نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم نے بھی یہی درخواست کی تھی کہ جبرو کو معاف نہ کرنا۔ تمہیں اپنانے سے پہلے میں اسے اتنی اذیت ناک موت ماروں گا کہ پھر کوئی تمہاری طرف میلی نظر ڈالنے کی بھول بھی نہ کر سکے۔''

''اپنا خیال بھی رکھنا افضل......'' شبنم نے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں درخواست کی۔ ''تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بالکل تنہا رہ جاؤں گی......''

جواب میں افضل خان نے شبنم کو شانوں سے تھام کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تو شبنم نے بھی بے اختیار اس کے کشادہ سینے میں سر چھپا لیا۔

* * *

لیاقت حسین کے اقبالی بیان کے بعد پولیس کی درخواست پر عدالت نے اسے ایک ہفتے کے لیے پولیس کسٹڈی میں دے دیا تھا۔ ریمانڈ گرانٹ کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک کسی تھانے میں مرنے والے کے لواحقین کی جانب سے کوئی ایف آئی آر درج کرائی گئی تھی نہ ہی تینوں زخمی اس پوزیشن میں تھے کہ عدالت کے روبرو پیش ہو کر کوئی بیان دے سکتے۔

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او چکی کے دو پاٹوں کے درمیان سینڈوچ بن گیا تھا۔ نہ وہ آئی جی کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا تھا نہ ہی اورنگ زیب کی سابقہ مہربانیوں کو نظر انداز کر دینا اس کے ضمیر کو گوارا تھا۔ ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے پہلی فرصت میں اورنگ زیب کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

اس وقت لیاقت حسین پھر اس کے سامنے موجود تھا۔ حسب معمول وہ پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن آنکھوں کے تاثرات اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کے وجود کے نہاں خانوں میں کہیں کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی ہو رہی ہے۔

''میری بات توجہ سے سنو لیاقت حسین۔'' ایس ایچ او نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تمہیں یہ جو ایک ہفتے کی مہلت ملی ہے اسے بھی غنیمت جانو، اس کے بعد اگر زخمیوں نے تمہارے خلاف زہر اگلا تو تمہارے بچاؤ کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔''

''جانتا ہوں......'' لیاقت حسین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر بھی تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے...... ہمارا نہیں تو اپنے عزیزوں کا خیال کرو۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہوگا جو تمہیں سزا ہو جانے کے بعد تمہاری کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرے گا۔''

''تم صرف قانون کی بات کرو صاحب۔'' لیاقت حسین نے پہلی بار جھلا کر جواب دیا۔ ''رشتے ناتوں کے چکر میں مت پڑو۔ جو مر جاتا ہے اسے بھی لوگ رو پیٹ کر صبر کر لیتے ہیں...... مقدر میں کیا لکھا ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔''

''پھر سوچ لو...... ریمانڈ ختم ہونے کے بعد تمہیں سوائے پچھتاووں کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

لیاقت حسین جواب میں مسکرا دیا، وہ سمجھ رہا تھا کہ پولیس کی یہ تمام رعایتیں اسے اورنگ زیب اور سراج کی وجہ سے مل رہی تھیں ورنہ پولیس تو ان لوگوں سے بھی ڈنڈے کے زور پر اقبال جرم کرا لیتی ہے جو مطلق بے گناہ ہوتے ہیں۔ اس وقت کسی بے قصور کو بھی یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی کہ کس جرم کی پاداش میں اس کی ہڈیاں کچلی جا رہی ہیں پھر...... اس کے لیے صرف یہی مناسب ہوتا ہے کہ جج کے روبرو بھی پولیس کا زبردستی یاد کرایا ہوا سبق فرفر دہرا دے۔ باقی فیصلہ اندھا قانون سنا دیتا ہے، بے قصور قید و مشقت بھگتنے کے لیے جیل چلا جاتا ہے۔ اصل مجرم کھلی ہوا میں دندناتا پھرتا ہے۔

''تم چپ کیوں ہو......؟'' ایس ایچ او نے سوال کیا۔

لیاقت حسین کھرا جواب دینے کی خاطر پر تول رہا تھا جب ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر ایس ایچ او سے کچھ سرگوشی کی۔ ''ان لوگوں کو بٹھاؤ...... میں آتا ہوں۔''

سپاہی الٹے قدموں چلا گیا تو ایس ایچ او بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ ''کچھ واقف کار تم سے ملاقات کے لیے آئے ہیں...... میرے ساتھ چلو......''

لیاقت حسین نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ہونٹ چباتا ہوا ملاقاتی کمرے میں آ گیا جہاں سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس کے منتظر تھے۔ لیاقت حسین نے کچھ کہنے کے بجائے نظریں جھکا لیں۔ کپکپاتے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

''آپ...... عزت دار لوگ ہیں۔ میرے محسن بھی ہیں لیکن آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''تم بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی خالی ہاتھ واپس جائیں گے۔''

راحیلہ بیگم کی بھرائی ہوئی آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی تو وہ تڑپ اٹھا، اس نے دوبارہ نظریں اٹھا کر دیکھا، سیٹھ عثمان خاموش کھڑے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ حالات نے ان کو بھی جھنجوڑ دیا ہے۔ راحیلہ بیگم اس طرح بے چین اور مضطرب تھیں جیسے ان کا کوئی اپنا جیل میں ہتھکڑیاں پہنے کھڑا ہو۔

''آپ...... آپ کیا حکم دیں گی بیگم صاحب۔'' لیاقت حسین نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آج تک آپ کے کسی حکم کو نہیں ٹالا...... آج...... آج بھی نہیں ٹالوں گا۔''

''کوئی اور بھی ہمارے ساتھ آنے کو مچل رہا تھا لیکن ہم نے اس کا یہاں آنا پسند نہیں کیا۔'' راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کے قریب آ کر مدھم لہجے میں کہا۔

''آپ نے اچھا کیا...... یہ...... یہ جگہ آپ لوگوں کے بھی قابل نہیں ہے۔''

''پھر...... تم یہاں رہنے کی ضد کیوں کر رہے ہو؟''

''میں نے کیا کیا......'' لیاقت حسین پھر جذباتی ہونے لگا۔ ''جو سچ ہے وہی بار بار دہرا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کیا کہوں؟''

''سراج بھائی نے تمہیں جو مشورہ دیا تھا وہ اب بھی مان لو......'' راحیلہ بیگم نے سرگوشی کی۔ ''جو مر گیا اور جو لوگ زخمی ہیں ان کا سابقہ ریکارڈ بھی مل گیا ہے۔ سب افراد مجرم ہیں۔ اب ان مجرموں کو قانون کے جال میں پھنسانے کی خاطر اگر تم بھی مصلحت سے کام لو تو یہ بھی نیکی ہوگی۔''

''راحیلہ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیاقت حسین......'' سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی ذہنی کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''درندوں کو بھی قابو کرنے کی خاطر ان کی راہ میں خندقیں کھودی جاتی ہیں۔ مضبوط جال بنے جاتے ہیں۔''

''میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا صاحب......'' لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''اگر وہ مر جاتے تو ان کا پرانا حساب کتاب میرے حق میں گواہی دیتا...... وہ زندہ ہیں تو میں مجرم کیسے بن گیا؟''

''تمہارا تعلق اگر پولیس کے محکمے یا قانون نافذ کرنے والی کسی ایجنسی سے ہوتا تو اور بات تھی لیکن محض شکوک و شبہات کی بنیاد پر اگر عام آدمیوں کو یہ حق دے دیا جائے تو پھر عدالتوں کے لیے ایسے مقدموں کو نمٹانا بھی آسان نہیں ہوگا۔''

''کل سرفراز خان صاحب کا بھی فون آیا تھا۔'' لیاقت حسین کے کوئی جواب دینے سے پیشتر راحیلہ بیگم نے کہا۔ ''وہ بھی آنے کو کہہ رہے تھے لیکن ہم نے یہ کہہ کر روک

لطائف

میاں بیوی کمرے میں خاموش بیٹھے تھے، بیوی کی سوچ یہ تھی۔

(1) یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا؟
(2) کیا میں موٹی ہو گئی ہوں؟
(3) کیا اس نے میرے چہرے پر کیل دیکھ لیا ہے جو صبح نکلا تھا؟
(4) کیا یہ کسی اور کو چاہتا تھا؟
(5) کیا یہ دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہے؟

شوہر کی سوچ۔

''گل کیتی تے کتھے پیسے ای نہ منگ لیوے چپ ہی رہنا چاہی دا اے۔''

* * *

سورج اور بیوی میں کیا مشابہت ہے؟

Very Simple آپ دونوں کی طرف گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔

* * *

ٹیچر، سردار سے۔ ''فزکس کی تعریف سناؤ۔''

سردار۔ ''سر پوری یاد نہیں آخر سے تھوڑی یاد ہے۔''

ٹیچر۔ ''او۔ کے سناؤ۔''

سردار۔ ''and this is called physics''

* * *

مشہور اداکارہ ''میرا'' اپنا رزلٹ دیکھ کر ''کیا؟ میں فیل ہو گئی وہ بھی انگلش میں......Dispossible''

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال

دیا کہ ہم بھی تمہارے لیے کوئی غیر نہیں ہیں۔''

''بابا نے مجھے برا بھلا تو نہیں کہا......؟'' لیاقت حسین نے سوال کیا۔

''نہیں......'' سیٹھ عثمان نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ تم نے جو کیا وہی مردوں کا شیوہ ہے۔ جس کی پشت پر گولی لگے اسے مرد میدان نہیں کہتے۔''

''بابا نے سچ کہا ہے صاحب۔'' لیاقت حسین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''ہمارے علاقے کا یہی دستور ہے۔''

''جانتا ہوں لیکن......تم اس وقت شہر میں ہو جہاں کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے فارمولے پر عمل کیا جائے۔''

''فرحین نے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟'' لیاقت حسین نے نظریں جھکا کر راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔

''وہ جن حالات سے گزر چکی ہے اس کے بعد تمہاری دوری کے احساس نے اسے بھی گم صم کر دیا ہے۔'' راحیلہ بیگم نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ''اور کسی کا نہ سہی فرحین کا تو خیال کرو لیاقت حسین...... سہارے چھن جائیں تو اچھا بھلا آدمی بھی لڑکھڑا جاتا ہے۔''

''آپ......ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحب۔'' لیاقت حسین اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔

''پھر......تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔

''ابھی ایک ہفتہ ہے صاحب...... زخمیوں کا بیان ہو جانے دیں پھر میں بھی اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرلوں گا۔ ہوسکتا ہے وہ بدذات اپنی زبان سے اپنا جرم قبول کرلیں...... اوپر والے کے ہاں بھی دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔''

''میں تمہاری بات مانتی ہوں لیکن اب ایک آخری فیصلہ میرا بھی سن لو۔'' راحیلہ بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا ''اگر زخمیوں نے اس بات کا اقرار نہ کیا کہ وہ تمہارے تعاقب میں تھے یا ان کا مقصد تمہیں نقصان پہچانا تھا تو پھر تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ تم نے پھر بھی اپنی ضد نہ چھوڑی تو میں یہی سمجھوں گی کہ تمہاری نظروں میں میری کوئی......''

''آگے کچھ نہ کہنا بیگم صاحب۔'' لیاقت حسین نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کے کسی حکم کو ٹال کر نمک حرامی کا ثبوت نہیں دوں گا۔''

''مجھے یقین تھا لیاقت حسین کہ تم میرا کہا نہیں ٹالو گے۔'' راحیلہ بیگم نے پرسکون سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا پھر کچھ دیر بعد وہ واپس چلی گئیں تو لیاقت حسین دوبارہ ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا جو کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھا لیکن اب اس کی نظریں لیاقت حسین کے چہرے کا جائزہ بھی لینے میں مصروف ہوگئی تھیں۔

''سیٹھ عثمان اور ان کی بیگم سے ملاقات کے بعد تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' کال ختم ہونے کے بعد اس نے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

''زخمیوں کا بیان ہو جائے پھر فیصلہ بھی ہو جائے گا۔''

''میں نے اس وقت پولیس اسپتال سے ہی رابطہ کیا تھا۔ عملے کا اندازہ ہے کہ دو ایک گھنٹوں میں وہ بھی ہوش میں آ جائیں گے۔ مگر...... تمہیں ان کے بیان سے کیا سروکار ہے؟'' ایس ایچ او نے وضاحت طلب نظروں سے لیاقت حسین کو گھورا۔

''اوپر والا سب سے بڑا کارساز ہے۔ اس کا جو فیصلہ ہوگا اسے ہم مل کر بھی نہیں ٹال سکیں گے۔'' لیاقت حسین نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ پھر سر پر تعینات سپاہی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ایس ایچ او نے شانے اچکائے۔ کچھ سوچ کر وہ ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

* * *

سکندر علی شاہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تنہا موجود تھا۔ وہاں اس کے سوا کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے گہرے تاثرات دھوپ چھاؤں کی طرح بدل رہے تھے۔ کئی سوال ابھر ابھر کر آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''فارم ہاؤس میں جو لڑکی اس کے لیے لائی گئی تھی اس پر ہاتھ صرف کرنے کی جرأت کس نے کی تھی......؟ لڑکیاں فراہم کرنے والی دلربا نامی لڑکی نے جو اطلاع اسے دی تھی وہ سچ بھی تھی یا نہیں...... اگر نہیں تو اس نے اس قدر سنجیدگی سے جھوٹ بولنے کی جرأت کیوں کی......؟ فارم ہاؤس کے تمام معاملات کی نگرانی گونگے کے ذمے تھی۔ اسے ملازموں پر سختی یا نرمی کرنے کے پورے اختیارات بھی حاصل تھے...... پھر وہ کون تھا جس نے گونگے کی سخت گیر طبیعت کو نظرانداز کر کے شیر کے شکار پر منہ مارنے کی غلطی کی تھی؟

سکندر علی شاہ گونگے کی فطرت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ شروع ہی سے عورت ذات سے نفرت کرنے کا عادی تھا۔ ایسی ہی ایک اہم وجہ سے وہ خود بھی لاوارث ہوگیا تھا پھر ایک عورت ہی کے سبب اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے بعد اسے سکندر علی شاہ کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ سکندر علی شاہ نے اس کو اپنے ڈرائیور ہونے کی اہم ذمے داری سے ہٹا کر فارم ہاؤس بھیج دیا تھا۔ اس موقع پر بھی گونگے کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ اسے پھر ایک عورت کی وجہ سے شہر کے ہنگاموں سے دور ہٹا کر صرف فارم ہاؤس تک محدود کر دیا گیا تھا اور...... جب سکندر علی شاہ نے کچھ دیر پہلے پھر ایک لڑکی کی ہی خاطر اسے ذمے دار قرار دے کر اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری تھی تو گونگے نے لڑکھڑا کر گرتے گرتے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں احتجاج کے ساتھ ساتھ نفرت کے شعلے بھی لپکے تھے مگر اپنی مجبوریوں کی خاطر اس نے پھر سکندر علی شاہ کے قدموں میں پناہ لی تھی۔ یہ تمام باتیں سکندر علی شاہ کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن گونگے کی حمایت میں ''شکرہ'' کے فون اور دھمکی آمیز گفتگو نے سکندر علی شاہ کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ ''شکرہ'' کو اچانک گونگے سے کیا ہمدردی پیدا ہوگئی؟ اس نے گڑھے مردے اکھاڑنے والی بات کہہ کر بھی سکندر علی شاہ کو چونکا دیا تھا۔ یہ ایسی ہی اہم بات تھی جو سکندر علی شاہ کے خیال میں اس کے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ پھر ''شکرہ'' کا کوڈ ورڈ استعمال کرنے والے کو اس کا علم کس طرح ہوگیا؟ وہ کس طرح واقف ہوگیا تھا کہ لڑکی کو کس نے روندا تھا......؟ گونگے کی حمایت اس نے دھمکی آمیز انداز میں کیوں کی تھی؟ کیا ہمدردی تھی اسے گونگے سے؟ اور...... اس نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر لڑکی کی عزت لوٹنے والے کی لاش کی اطلاع دینے کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا تھا؟...... کیا وہ گھر کا کوئی بھیدی تھا جو...... سکندر علی شاہ کی ایک ایک نقل و حرکت سے واقف تھا...... یا...... کوئی بدروح تھی جس نے سکندر علی شاہ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچانے میں مدد کی تھی اور اس کے بدلے وہ اسے اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر رہی تھی......؟

چوبیس گھنٹے کے دعوے کی مدت ختم ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا جب فون کی گھنٹی کی آواز نے سکندر علی شاہ کو چونکا دیا۔ ایک لمحے تک وہ فون کو گھورتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

''سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔'' اس نے حسب معمول بھاری آواز میں کہا۔

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جولائی 2013ء کی جھلکیاں

استاد ادب

سرگودھا کی سرزمین سے ادب کا پرچم بلند رکھنے والی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

فنکار

کراچی کے اس مصور کا تذکرہ جو بیوی کو پالینے کی جستجو میں جرمنی جا پہنچا

ہمت مرداں

زندگی کی آس کی خاطر کیا کیا جتن کیے

محسنہ

ایک عجب انداز کی سچ بیانی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ''ترکی نمی دانم''، لہو رنگ سرگزشت ''سراب''، فلم نگری کی ان کہی روداد ''فلمی الف لیلہ'' اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں!

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

سلام مالک...... دوسری جانب سے بڑی انکساری سے جواب ملا۔ ”میں آپ کا نمک خوار برکت بول رہا ہوں۔“

برکت فارم ہاؤس کے تین چوکیداروں میں سے ایک کا نام تھا...... کسی اہم ضرورت کے بغیر وہ فون کو ہاتھ لگانے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا...... سکندر علی شاہ اس کا نام سن کر چونکا۔

”کس لیے فون کیا ہے......؟“

”ایک ضروری اطلاع دینی تھی مالک......“ اس بار بھی سہمی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ”فضلو چوکیدار نے خودکشی کرلی ہے۔ دس منٹ پہلے شبیر اس کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ کھڑا ہے۔“

سکندر علی شاہ کے لیے کسی ملازم کی موت کی اطلاع کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن شکرہ کے حوالے سے وہ فضلو کی خودکشی کی خبر سن کر ہونٹ چبانے لگا...... مرنے والا اس کے اعتماد کا ملازم تھا، گزشتہ تین سال سے وہ بھی دوسرے پالتو کتوں کی طرح دم ہلا رہا تھا پھر اس نے اچانک خودکشی کیوں کرلی؟ کیا شکرہ نے کسی لاش کی اطلاع ملنے کا جو دعویٰ کیا تھا اس کا کوئی تعلق فضلو کی موت سے بھی تھا؟ ایک لمحے کو متعدد خیال ذہن میں ابھرے پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”خودکشی کا اندازہ تمہیں کیسے ہوا......؟“

”اس کے منہ سے جھاگ اٹھ رہے ہیں مالک۔ سارا جسم نیلا پڑ گیا ہے۔ ہاتھ میں ایک پرچہ بھی دبا ہے۔ ہم نے ابھی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا......“

”ہاتھ کا پرچہ نکال کر پڑھو۔ اس میں کیا لکھا ہے۔“ سکندر علی شاہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ایک منٹ بعد ہی دوسری جانب سے برکت کی آواز ابھری...... ”مالک...... وہ...... فضلو نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔“

”کیا مطلب......؟“

”پرچے میں یہی لکھا ہے مالک کہ جو...... لڑکی یہاں آئی تھی اسے......“

”میرا حکم غور سے سنو......“ سکندر علی شاہ نے لڑکی کا حوالہ سننے کے بعد تیزی سے کہا۔ ”پرچے کو احتیاط سے رکھو اور...... فضلو کو خاموشی سے دفنا دو...... اس کی اطلاع فارم ہاؤس سے باہر نہیں جانی چاہیے۔“

”نہیں جائے گی مالک......“

سکندر علی ریسیور کریڈل پر رکھ کر اٹھ گیا۔ فضلو کی موت کا سن کر شکرہ کے آخری جملے پھر اس کے کانوں میں تو بجنے لگے۔ یہ خیال بھی بار بار کسی نیون سائن کے مانند اندھیرے اور اجالے کا تاثر پیش کر رہا تھا کہ جو بات فارم ہاؤس کے ملازموں اور گھوتگے کے علم میں بھی نہیں تھی اس کی بھنک فارم ہاؤس سے نکل کر شکرہ تک کس طرح پہنچ گئی......؟ فضلو نے کس کے خوف سے خودکشی کرلی جبکہ کسی دوسرے ملازم کو لڑکی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے سکندر علی شاہ کے اندر سلگنے والے بارود کو اور ہوا دے دی...... سب جانتے تھے کہ اسٹڈی میں اسے ڈسٹرب کرنا کسی سنگین جرم سے کم نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دروازے کی طرف لپکا...... ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا...... سامنے نگینہ کھڑی تھی۔

”تم......“

”سوری ڈارلنگ......“ نگینہ نے اس کے تیور دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”جو خبر مجھے ملی ہے وہ بھی آپ تک پہنچانی ضروری تھی۔“

”اب کون مر گیا......؟“ خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

”شیلا ورما کی کال آئی تھی...... وہ آپ سے براہ راست بات کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے اسٹڈی کا نمبر نہیں دیا۔“

”اچھا کیا......“ سکندر علی شاہ نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ”میں ایسی عورتوں کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتا۔“

”جانتی ہوں لیکن اس نے مجھے آپ کے کانوں تک ایک خبر پہنچانے کی ذمے داری سونپی ہے۔“

”کیا خبر ہے......؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے اس کے بیوٹی پارلر پر کچھ نامعلوم لوگوں نے توڑ پھوڑ کی ہے۔ شیلا ورما کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے گئے ہیں۔“

”پھر...... میں کیا کروں؟“ سکندر علی شاہ نے بہ دستور لاتعلقی کا اظہار کیا پھر اس نے اسٹڈی کا دروازہ بند کرلیا لیکن...... اب اس کے ذہن میں ایک سوال گونج رہا تھا۔

لڑکی کو بے آبرو کرنا...... شکرہ کی کال اور اب...... ہنی مون بیوٹی پارلر پر ہنگامہ...... ان سب کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید
واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

خوف محبت

کاشف زبیر

ہمدردی، ایثار، محبت، احساس ذمہ داری اور فرض شناسی... کہنے کو تو بہت خوب صورت جذبوں کے نام ہیں مگر جب ان کے میزان پر کھرا کھوٹا پرکھا جائے تو بہت کم لوگ ان کے معیار تک پہنچ پاتے ہیں... اس نے بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنے ایک خوب صورت رشتے کو قربان کر دیا تھا، کیونکہ معاملات کی رنگینی حالات کی سنگینی میں اضافہ کرتی جا رہی تھی اور پھر یہی ایثار اسے ایک روز سرخ رو کر گیا۔

خوابوں کے منظر میں حقیقی پناہ کی متلاشی ایک حسینہ کی سادگی

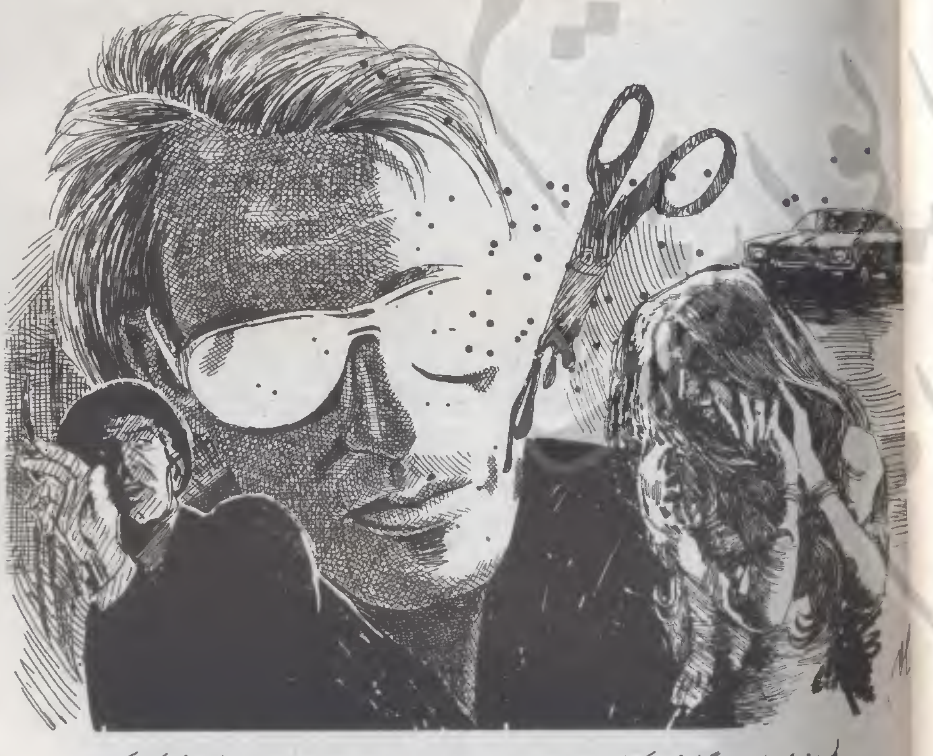

لمبے سنہری بالوں اور گول فریم کی عینک والا نوجوان نیویارک بس ٹرمنل کے لاؤنج میں داخل ہوا۔ قد کسی قدر طویل اور چہرہ بھرا ہوا مگر کسی قدر لمبوترا بھی تھا۔ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ نروس لگ رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے انداز میں وہاں موجود ایک ایک فرد کو دیکھ رہا تھا۔ ویٹنگ لاؤنج میں خاصا رش تھا۔ اسی طرح وہ ٹکٹ اسٹال پر پہنچا۔ اس وقت بھی اس کی توجہ ایک کونے میں بیٹھے سیاہ چھوٹے بالوں والے لڑکے پر مرکوز تھی۔ ٹکٹ کلرک نے

دوسری بار زور سے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

تب وہ چونکا۔ "مجھے اٹلانٹا سٹی کا ٹکٹ دیدو۔"

کلرک نے اسے ٹکٹ بنا کر دیا اور اس نے مطلوبہ رقم نکال کر کلرک کے حوالے کر دی۔ وہ بہ دستور ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بس میں داخل ہوا تو سیاہ مختصر بالوں والا لڑکا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے مسکرا کر سنہری بالوں والے کی طرف دیکھا اور بے تکلفی سے بولا۔ "ہائے، میں سام ہوں۔"

"کرسٹن۔" سنہری بالوں والے نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے اپنا خاندانی نام نہیں بتایا تھا۔

"تم اٹلانٹا سٹی جا رہے ہو؟"

کرسٹن نے سر ہلایا، وہ اپنا بیگ سامان والے خانے میں رکھ رہا تھا۔ "اور تم؟"

سام نے شانے اچکائے۔ "میں پتا نہیں کہاں جا رہا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے سوتیلے باپ کے چنگل سے نکلنے کا موقع ملا ہے اور میں اس سے زیادہ سے زیادہ دور جانا چاہوں گا۔"

کچھ دیر میں دونوں میں خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ بس ابھی نیویارک سے نکلی تھی کہ اچانک اس کے انجن میں ایک دھماکا ہوا اور بس رک گئی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور نے اعلان کیا کہ بس کا انجن خراب ہو گیا ہے اور اگر مسافر انتظار کر سکتے ہیں تو دوسری بس ڈھائی گھنٹے میں پہنچ جائے گی بہ صورت دیگر ان کے ٹکٹ کی رقم واپس کر دی جائے گی۔ نصف مسافروں نے دوسری بس کا انتظار کرنے کو ترجیح دی تھی اور نصف کسی اور ذریعے سے سفر جاری رکھنا چاہتے تھے۔ وہ دونوں بھی بس سے اتر آئے۔ کچھ دور واقع ایک قصبے میں موجود کار شوروم سے سام نے ایک شیورلیٹ پسند کی۔ یہ پندرہ سال پرانا ماڈل تھا لیکن کار بہت اچھی حالت میں تھی اور صرف ساڑھے تین سو ڈالرز میں مل رہی تھی۔ لیکن سام کے پاس رقم اتنی نہیں تھی۔ اس نے اپنے باپ کا کریڈٹ کارڈ دیا لیکن شوروم کے مالک نے کریڈٹ کارڈ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"لعنت ہو۔"

"یہ میرے پاس کچھ رقم ہے۔" کرسٹن نے اپنی جیب سے رقم نکالی۔ "میں بھی تو سفر کروں گا۔"

باقی رقم کرسٹن نے دی اور وہ کار لے کر روانہ ہوئے۔ سام بہت خوش تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے کرسٹن کو ڈرائیو کا موقع دیا۔ کار میں ریڈیو موجود تھا وہ میوزک سنتے اور بیئر سے لطف اندوز ہوتے ڈرائیو کر رہے تھے۔ اچانک کار کا پہیہ برسٹ ہوا اور کار لہرانے لگی لیکن کرسٹن نے نہایت مہارت سے اسے سنبھال لیا اور سڑک کے کنارے روک لیا۔ وہ اس وقت ایک ذیلی سڑک سے گزر رہے تھے۔ یہاں دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ دونوں نیچے اتر آئے برسٹ ٹائر کا معائنہ کیا۔ سام نے ڈکی کھولی اور اسپیئر وہیل نکالنے لگا۔ کرسٹن نے معذرت کی کہ اسے ٹائر بدلنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سام خود ہی اس کام میں جت گیا۔ اس نے ٹائر تبدیل کیا اور ابھی وہ اس کے نٹ بولٹ کس رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک ویگن نمودار ہوئی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ سام نٹ کستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

وہ کرسٹن سے اس کے مستقبل کے بارے میں پوچھ تھا اور بے خبر تھا کہ کرسٹن کا اس وقت کیا ارادہ ہے۔ جیسے ویگن قریب آئی کرسٹن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ " ارادہ ہے۔"

اس نے اچانک سام کو لات ماری اور وہ پیچھے گرا، ویگن سر پر آ گئی تھی۔ بچنے کا وقت ہی نہیں تھا تیز رفتار ویگن نے اسے ٹکر ماری اور پھر خود ڈرائیور سے بے قابو ہو کر سڑک سے اتر گئی۔ کچے میں آتے ہی وہ الٹ کر قلابازیاں کھانے لگی۔ تیس سیکنڈ بعد وہ ایک گڑھے میں الٹی پڑی تھی اور اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ کرسٹن نے آ کر ویگن میں جھانکا۔ ڈرائیور مر چکا تھا اس کی گردن غیر معمولی مڑ گئی تھی۔ وہ واپس پلٹا اور سڑک کے کنارے پڑے سسکتے سام کے پاس آیا۔ وہ شدید زخمی تھا اور کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔ کرسٹن نے نرمی سے اس کے زخمی سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کی جیب سے پرس نکال لیا۔ اس میں سام کے باپ کا کریڈٹ کارڈ تھا۔ آخر میں اپنا پرس نکال کر اس نے سام کی جیب میں ڈال دیا اور پھر آس پاس دیکھ کر ایک بڑا پتھر اٹھا لیا۔

☆☆☆

نیویارک پولیس ہومی سائڈ کا لیفٹیننٹ ال ورتھ جیک پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ رپورٹ گزشتہ دنوں ملنے والی ایک پرانی لاش کی تھی۔ یہ لاش کم سے کم پندرہ مہینے پرانی تھی اور زمین سے کھدائی کے دوران میں اتفاقیہ نکل آئی تھی۔ لاش کا چہرہ بگڑا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے غائب تھے۔ لاش نواحی علاقے سے ملی تھی اور یہاں نئی تعمیرات کے لیے کھدائی کی جا رہی تھی کہ یہ لاش نکل آئی۔ ال ورتھ سخت چہرے اور سرد آنکھوں والا تقریباً پچاس برس کا شخص تھا۔ وہ اچھا پولیس مین تھا اور اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچا تھا۔ اس کے ماتحت جان بیرا اور رسٹ ہارڈی بدمزہ ہو رہے تھے۔ ان کے پاس پہلے ہی کام کم نہیں تھا کہ یہ لاش بھی ان کے گلے پڑ گئی تھی۔ کیپٹن کریمر کا خیال تھا کہ یہ قتل بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی جس میں ایک سیریل کلر لوگوں کو مار کر ان کی شناخت کسی ذریعے بگاڑ دیتا تھا۔ ال ورتھ نے انہیں آگاہ کیا۔

"اسے سر پر ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا اور مرنے کے بعد اس کا چہرہ بگاڑا گیا اور ہاتھ کاٹے گئے۔"

"کیا یہ بھی اسی کیس کی ایک کڑی ہے؟" رسٹ نے سوال کیا۔

"بالکل اسی لیے یہ کیس ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔"

پچھلے بیس سالوں میں نیویارک اور اس کے آس پاس کم سے کم ایک درجن قتل ایسے ہو چکے تھے جن میں قاتل نے مقتول کی شناخت ختم کر دی تھی اور اس کا آغاز کرسٹن ریف نامی نوجوان سے ہوا تھا۔ وہ گھر سے نکل گیا تھا اور پھر اس کی لاش ایک سڑک پر پائی گئی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے حادثہ پیش آیا ہے لیکن جلد پولیس نے پتا چلا لیا کہ اسے قتل کیا گیا تھا لیکن قاتل کون تھا اور اس نے کرسٹن کو کیوں قتل کیا پولیس اس سے بے خبر رہی۔ پھر وقفے وقفے سے ایسی ہی لاشیں ملتی رہیں۔ تقریباً تمام مقتول اکیلے مرد تھے اور ان کا لوگوں سے ملنا جلنا کم تھا۔ جن کا کوئی جاننے والا تھا، وہ بھی ان سے بے خبر تھا۔ کیونکہ کسی نے ان کی گم شدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائی تھی اس لیے پولیس کسی ایک لاش کی شناخت کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح قاتل کے بارے میں وہ مکمل تاریکی میں تھے کیونکہ وہ نہایت مہارت سے خود کو چھپائے ہوئے تھا اور پولیس اب تک اس کا معمولی سا نشان بھی تلاش نہیں کر سکی تھی۔ درحقیقت پولیس قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ال ورتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں الجھا ہوا تھا کہ جان نے اس کی توجہ آنے والی عورت کی طرف دلائی۔ وہ تقریباً تیس برس کی خوب صورت اور متناسب جسامت کی حامل تھی۔ سفید شرٹ اور سیاہ پتلون میں اچھی لگ رہی تھی لیکن جب اس نے اپنا کارڈ آگے کیا تو ال ورتھ کا منہ بن گیا تھا۔

"ایلس فرام ایف بی آئی۔"

ال ورتھ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ایک طرف رکھ دی۔ "ویل ایجنٹ ایلس، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں تمہاری مدد کے لیے آئی ہوں۔" ایلس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "غالباً تم ہی اس کیس کو دیکھ رہے ہو، میرا اشارہ بہروپیے کی طرف ہے۔"

"پولیس نے مدد کی کوئی درخواست نہیں کی۔"

"ایف بی آئی ہمیشہ بغیر درخواست کے مدد کے لیے آتی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "مجھے اس کیس پر تمہاری معاونت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر تم مل کر کام نہیں کرنا چاہتے تو میں اکیلے کام کروں گی۔ اس صورت میں تمہارا ایک آدمی درکار ہوگا۔"

جان ناپسندیدہ نظروں سے ایلس کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ویسے ہی ایف بی آئی سے چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ محکمہ صرف پولیس کے کاموں میں مداخلت کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ ال ورتھ نے سوچا اور اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس نے ایلس کے لیے کافی نکالی۔ "تم لوگوں کے پاس کچھ ہے؟"

"شاید اتنا ہی جتنا پولیس کے پاس ہے۔"

"تب تم کیا مدد کر سکو گی؟"

"ممکن ہے میرے پاس کچھ نظریے ہوں جن سے تمہیں مدد مل سکے۔" ایلس بولی۔ "میں گزشتہ چھ مہینے سے اس کیس پر انڈر کور کام کر رہی ہوں اور میں نے بہت کچھ جمع کر لیا ہے۔"

ال ورتھ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ایک ایک لفظ رکتے اور سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ "ایجنٹ ایلس یہ کیس بہت پیچیدہ ہے۔"

"نہیں بہت آسان ہے صرف اس شخص تک پہنچنا ہے جو اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار ہے۔"

ال ورتھ جھنجلا گیا تھا۔ "یہی تو اصل مسئلہ ہے۔"

جان نے اس کے دفتر میں جھانکا۔ "باس ایک خاتون اور آئی ہے اسی کیس کے سلسلے میں۔"

کچھ دیر میں ال ورتھ اور ایلس کے سامنے ایک بوڑھی عورت موجود تھی اسے ایک پولیس والا یہاں لایا تھا۔ وہ چند گھنٹے پہلے یورپ سے آنے والے کروزر شپ سے اتری تھی۔ لباس اور حلیے سے وہ اوپری طبقے کی لگ رہی تھی مگر اس وقت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی اعلیٰ افسر سے بات کرے۔ ال ورتھ نے نرمی سے پوچھا۔ "مام میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "وہ زندہ ہے، میں نے خود اسے دیکھا ہے۔"

"کون مام، آرام سے بتاؤ۔" ال ورتھ نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"ایک منٹ۔" ایلس نے کہا۔ "کیا میں اس سے

بات کرسکتی ہوں؟''

ال ورتھ نے شانے اچکائے اور ذرا دور ہوگیا۔ ایلس نے بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ایک طرف لے آئی۔ ''میں ایلس ہوں، ایف بی آئی ایجنٹ، تم مجھے سب بتا سکتی ہو۔''

عورت نے خود پر قابو پالیا تھا۔ ''میرا نام ریٹا ریف ہے اور میں نے کچھ دیر پہلے اپنے بیٹے کو دیکھا ہے۔ بائی گاڈ! یقین کرو وہ میرا بیٹا ہی تھا۔''

''ٹھیک ہے آپ نے اپنے بیٹے کو دیکھا ہے۔'' ایلس نے سمجھنے والے انداز میں کہا۔ ''پھر؟''

ریٹا ریف نے تھوک نگلا اور بولی۔ ''وہ مرچکا تھا۔''

☆☆☆

صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی آگئی تھی جو کیس گزشتہ بیس برس سے حل نہیں ہو رہا تھا اچانک اس میں پیش رفت ہوئی تھی۔ ریٹا ریف کرسٹن ریف کی ماں تھی اور جب اس کی سڑک پر مسخ شدہ لاش ملی تو ریٹا نے ہی اس کے پاس سے ملنے والی چیزوں سے تصدیق کی تھی کہ وہی کرسٹن ریف تھا وہ چند مہینے پہلے اچانک گھر سے غائب ہوگیا تھا۔ ریٹا نے ایلس کو بتایا۔ ''اس کی موت سے مجھے دکھ ہوا تھا لیکن میں نے سکون کا سانس بھی لیا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں نے ایک عفریت کو جنم دیا تھا۔ میرا بیٹا بہت خطرناک آدمی تھا۔ جب سے میں نے اسے زندہ دیکھا ہے تو میرا سکون غارت ہوگیا ہے۔''

ایلس نے ریٹا کا بیان لیا۔ وہ نیوجرسی میں اپنے عالی شان پیلس میں رہتی تھی۔ ریف خاندان نے ایک زمانے میں اسٹاک ایکسچینج میں بہت نام پیدا کیا تھا۔ ریٹا کا شوہر مارٹن ریف مشہور اسٹاک بروکر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ریف خاندان اس بزنس سے نکل گیا۔ اگرچہ اب بھی ان کا بڑا سرمایہ اسٹاک مارکیٹ میں لگا ہوا تھا لیکن وہ خود بزنس نہیں کر رہے تھے۔ کوئی بچا ہی نہیں تھا جو بزنس چلاتا۔ مارٹن کے دو بیٹے تھے اور دونوں اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ریٹا کے جانے کے بعد ایلس نے ال ورتھ سے کہا۔ ''تو اصل قاتل کرسٹن خود ہے۔''

''بکواس۔'' جان تند لہجے میں بولا۔ ''تم ایک بوڑھی عورت کی بات پر یقین کر رہی ہو۔ بہ قول اس کے اس شخص نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا بیٹا اسے دیکھتا تھا۔ نہ کوئی حلیہ اور نہ کوئی وضاحت۔''

''ہوسکتا ہے یہ ٹھیک نہ ہو اور مسز ریف کو سچ مچ دھوکا ہوا ہو۔'' ایلس نے تحمل سے کہا۔ ''لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ سچ بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''تب تم اسے سچ سمجھتی رہو۔'' جان نے تلخی سے کہا۔

''جان، ہمیں اس پر کام کرنا ہوگا۔'' خلافِ توقع ورتھ نے ایلس کی حمایت کی تو جان کا منہ کھلا رہ گیا اور پھر وہاں سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ ال ورتھ نے معذرت کی۔ ''جان ذرا جذباتی ہے لیکن بہت اچھا پولیس افسر ہے۔''

''یقیناً ہوگا۔'' ایلس نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''ملنے والی لاش کہاں ہے؟''

''سرد خانے میں۔'' رسٹ نے کہا۔

''میں دیکھنا چاہوں گی۔''

وہ چاروں پولیس کار میں سرد خانے پہنچے جہاں مٹی میں پندرہ مہینے سے دبی لاش ایک ایگزام ٹیبل پر موجود تھی۔ ال ورتھ نے کہا کہ وہ معائنہ کرچکا ہے جب کہ جان اور رسٹ مزید اس لاش کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایلس اکیلی اند آئی۔ اس نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس نے خاص طور سے اس کے بالوں کا نمونہ لیا۔ باقی جسم گل سڑ چکا تھا اور شناخت کے قابل کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ ایلس کا تعلق واشنگٹن سے تھا او وہ اس کیس پر گزشتہ چھ مہینے سے کام کر رہی تھی۔ جہاں جہاں ناقابلِ شناخت لاشیں ملی تھیں وہ وہاں گئی تھی اور سار ریکارڈ جمع کیا تھا۔ ایلس باہر آئی تو ال ورتھ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ موبائل رکھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے ایلس کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے بالوں کا نمونہ لے لیا ہے۔''

ال ورتھ نے سر ہلایا۔ ''میں نے ڈی این اے میچ کے لیے سینٹرل ڈیٹا کو بھیج دیا ہے۔ اگر وہاں ریکارڈ ہوا تو ہمیں مقتول کے بارے میں پتا چل جائے گا۔ بہرحال ایک تاز واردات ہوگئی ہے اور ایک مشکوک آدمی بھی ہاتھ آیا ہے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ عینی گواہ ہے لیکن اصلیت پوچھ گچھ کے بعد سامنے آئے گی۔''

وہ پہلے جائے واردات پر پہنچے جہاں ہومی سائڈ اور فارنسک ڈیپارٹمنٹ نے اپنا کام کرلیا تھا۔ فوٹو گرافر تصویریں لے چکا تھا۔ لاش ایک سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ال ورتھ نے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ یہ کوئی اچھا منظر نہیں تھا۔ پتھر سے چہرہ بگاڑ دیا گیا تھا۔ نقوش قطعی ناقابلِ شناخت ہوگئے تھے۔ یہ جوان آدمی تھا۔ ایلس نے ذرا جھک کر اس کے ہاتھوں سے کپڑا ہٹایا۔ دونوں ہاتھ جھلسے ہوئے تھے اور انگلیوں کی کھال اتر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تیزاب...''

ال ورتھ نے کپڑا منہ پر ڈال دیا۔ ''یہ اسی کا کام ہے۔''

ال ورتھ نے لاش اسپتال بھیجنے کا حکم دیا اور خود واپس ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایلس اس کے ساتھ تھی۔ اس نے راستے میں کہا۔ ''تمہارے آتے ہی کیس میں تیزی سے پیش رفت ہو رہی ہے۔''

''لیکن قاتل اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔'' ایلس باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ جون میں نیویارک سردی سے نجات حاصل کرکے خوب صورت اور ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ ''ہم صرف اس کی شناخت تک پہنچے ہیں، اس شناخت تک جسے وہ بیس سال پہلے ترک کرچکا تھا۔''

ال ورتھ سمجھ رہا تھا۔ ایلس کا کہنا ٹھیک تھا، کرسٹن ریف کی شناخت سے انہیں صرف مشتبہ شخص کو جانچنے میں آسانی ہوتی۔ اگرچہ بیس سال میں انسان بہت بدل جاتا ہے۔ وہ نوجوان لڑکے سے پختہ کار مرد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ظاہری طور پر بہت فرق آتا ہے۔ مشتبہ افراد کے لیے مخصوص کمرے میں ایک جوان آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دبلا اور طویل قامت تھا۔ آنکھیں میچی ہوئیں اور ہونٹ گداز تھے۔ چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ ظاہر ہے وہ مبینہ مجرم کی حیثیت سے آیا تھا، اسے فکر مند ہونا چاہیے تھا۔ ایلس نے شیشے کے پار سے دیکھا۔ ال ورتھ اسے وہیں چھوڑ کر اس سے ملنے اندر گیا۔ ایلس نے مائک آن کرلیا تھا اور اب وہ اندر ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔ ال ورتھ نے اس سے سوالات شروع کیے۔

''تمہارا نام....''

''رچی نیلسن۔''

''کام کیا کرتے ہو؟''

''میں مصور ہوں، مشہور تصاویر کی نقل بھی تیار کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مشہور نہیں ہوں۔''

ال ورتھ اس کے پاس سے برآمد ہونے والی دستاویزات کا معائنہ کر رہا تھا۔ ''سان فرانسسکو سے آئے ہو؟''

''ہاں یہاں کنٹریکٹ پر کام کر رہا ہوں، میرا کام تقریباً مکمل ہونے والا ہے۔''

''اوکے۔ اب اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ ہمیں ایک لاش ملی ہے جو ناقابلِ شناخت ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

رچی کے چہرے پر خوف نمودار ہوا اور اس نے تھوک نگل کر کہا۔ ''میں نے اسے قتل کرتے دیکھا تھا۔''

''کیسے؟''

''وہ آدمی تھا، اس نے مقتول کو زمین پر گرایا ہوا تھا اور پتھر سے اس کے چہرے پر وار کر رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے ایک اسپرے بوتل نکال کر مقتول کے دونوں ہاتھوں پر اسپرے کیا۔''

''تم نے اسے روکنے کی کوشش کی؟''

''نہیں، میں بہت خوف زدہ ہوگیا تھا۔ میں چھپا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ وہاں کوئی نہیں تھا یہ پارک کا بہت دور کا حصہ تھا اور درختوں کی وجہ سے عام لوگ شاید اس طرف نہیں آتے ہیں۔''

''تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''میں مصور ہوں کسی اچھے منظر کی تلاش میں وہاں گیا تھا، تب میں نے یہ سب دیکھا۔''

''تم نے قاتل کو دیکھا؟''

''اچھی طرح تو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے خدوخال میرے ذہن میں محفوظ ہیں اگر تم کہو تو میں اس کا اسکیچ بنا سکتا ہوں۔''

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کوئی اور قاتل ہے۔''

''تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''میں نے پولیس کو کال کی تھی۔ اگر میں اسے قتل کرتا تو پولیس کو کال کیوں کرتا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔''

''اوکے، قتل کے بعد قاتل نے کیا، کیا؟''

''وہ یہ کام کرتے ہوئے بالکل پُرسکون تھا۔'' رچی نے بتایا۔ ''میرا خیال ہے اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور نہ میری طرف آیا۔ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ میرے قدم جم گئے تھے، میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چلتا ہوا دوسری طرف غائب ہوگیا۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے اپنے سیل فون سے نائن ون ون کو کال کرکے اس واردات کی اطلاع دی اور اس کے نتیجے میں یہاں بیٹھا ہوں۔'' اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا۔ ''جس وقت پولیس آئی میں نے اسے بتایا تھا کہ قاتل کس طرف گیا ہے لیکن انہوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''پولیس نے اس ساری جگہ کو چھانا لیکن وہاں کوئی شخص نہیں ملا۔''

''چھانا لیکن ایک گھنٹے بعد کیونکہ ایک گھنٹے تک تو میں وہاں موجود رہا تھا اور اس دوران میں پولیس کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔''

ال ورتھ اور جان کھسیا گئے تھے لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ ایلس مسکرانے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد ال ورتھ اور جان اندر آئے۔ ایلس نے کہا۔ ''بیکار ہے، اس کے خلاف کوئی چارج

نہیں لگا سکتے سوائے اس کے کہ یہاں اجنبی ہے۔''

''اجنبی نہیں ہے رینبو آرٹ گیلری والے اسے جانتے ہیں، یہ ان کے لیے ہی کام کر رہا ہے۔'' جان نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' ال ورتھ نے ایلس کی طرف دیکھا۔

''میں اس سے بات کرنا چاہوں گی۔''

ال ورتھ نے شانے اچکائے۔ ''کر کے دیکھ لو۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کب تک آئے گی؟''

''شاید دو گھنٹے میں۔'' ال ورتھ نے کہا۔ ''ویسے مقتول کی شناخت ہوگئی ہے۔ اس کے پاس سے دستاویزات نکلی ہیں۔ اسٹیو ڈینش ایک مقامی کار ڈیلر ہے اور نزدیک ہی رہتا تھا۔ وہ جاگنگ کے لیے نکلا تھا کہ پارک میں قاتل کے ہتھے چڑھ گیا۔''

''اس صورت میں یہ پہلا واقعہ ہوگا جب مقتول کی شناخت ہوگئی۔''

''اس کی وجہ شاید یہ شخص ہے۔'' ال ورتھ نے رچی کی طرف دیکھا۔ ''قاتل نے اسے دیکھا اور فرار میں عافیت سمجھی۔''

اس کا امکان تھا کیونکہ قاتل کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا اور اگر وہ مقتول اسٹیو کا روپ دھارتا یا اس کی دستاویزات اور کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا تو پکڑا جاتا۔ ایلس کا خیال تھا کہ کرسٹن ایک جنونی سیریل کلر تھا۔ اس کا شکار ایسے آدمی ہوتے تھے جو اکیلے ہوں اور جن کے بارے میں زیادہ لوگ نہ جانتے ہوں اور اگر وہ اچانک گم ہو جائیں تو ان کی پروانہ کی جائے، سب سے بڑھ کر کوئی ان کی گم شدگی کی رپورٹ درج نہ کرائے۔ اس کے بعد کرسٹن آرام سے ان کی شخصیت اختیار کر لیتا تھا۔ ریٹا ریف نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو بتایا تھا اس سے وہ ایک نہایت چالاک اور موقع سے فائدہ اٹھانے والا سفاک شخص لگتا تھا جو اپنے مفاد کے لیے کسی کو بھی قتل کر سکتا تھا۔ کرسٹن نفسیاتی مریض تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنا دفاع کرنا بھی جانتا تھا۔ وہ ہر قتل خوب سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر کرتا تھا۔ قتل کے بعد وہ لاش چھپا دیتا تھا، ساتھ ہی اس کی شناخت ختم کر دیتا تھا۔ یقیناً وہ شکار دیکھ بھال کر منتخب کرتا ہوگا جس کا روپ آسانی سے دھار سکے۔

ایلس کمرے میں آئی تو رچی اسے دیکھ کر چونکا تھا، اس کی آنکھوں میں ستائش چمکی تھی لیکن فوراً ہی تفکر نے قبضہ کر لیا۔ ایلس نے ڈرائنگ شیٹ اور پنسل اس کے سامنے رکھی۔ ''میں ایف بی آئی ایجنٹ ایلس ہوں۔ تم مبینہ قاتل کا حلیہ بیان کر سکتے ہو؟''

رچی نے سرہلایا۔ ''میں نے اتنی بار اس کا حلیہ بیان کیا ہے کہ اب مجھے ازبر ہوگیا ہے اور میں آنکھیں بند کرکے اسے دیکھ سکتا ہوں۔'' اس نے ڈرائنگ شیٹ اپنی طر کھسکائی اور پنسل سے اسکیچ بنانے لگا، ساتھ ہی وہ زیر لب بو بھی رہا تھا۔ ''کسی قدر لمبا چہرہ مگر بھرا ہوا، ستوار ناک، چھوٹی آنکھیں لیکن ممکن ہے دور سے میں نے ٹھیک سے نہ دیکھا ہو اور وہ آنکھیں میچے ہوئے ہو، بھرے ہوئے ہونٹ، قد کسی قدر طویل اور جسم نہ تو دبلا اور نہ بھرا ہوا تھا۔ سر کے بال سامنے سے کسی قدر اڑے ہوئے اور سنہری مائل سفید تھے۔''

ایلس نوٹ کر رہی تھی کہ یہ حلیہ اس پر بھی پورا آتا تھا بس کچھ فرق تھا۔ اس کا چہرہ بھرا ہوا نہیں تھا۔ اور جسم دبلا تھا مگر اسے کمزور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اسے خوف تھا کہ پولیس اسے ہی قاتل نہ سمجھ لے۔ اس نے چند منٹ میں کاغذ پر ایک اسکیچ تیار کر دیا تھا۔ یہ مبینہ قاتل کا اسکیچ تھا۔ ایلس نے اسکیچ دیکھا اور بولی۔ ''یہ قاتل سے کسی حد تک ملتا ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، بنیادی طور پر میں مصور ہوں اور خدوخال سے زیادہ چہرے کے تاثرات کو اہمیت دیتا ہوں۔ ممکن ہے میں نے اس کے تاثرات کو اسکیچ کیا ہو۔''

ایلس نے دیکھا اسکیچ کے تاثرات سخت تھے۔ آنکھیں، ہونٹ اور ماتھے کی بناوٹ سے بے رحمی جھلک رہی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ رچی کا تخیل تھا، قاتل سچ مچ ایسا نہیں تھا۔ رچی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا کرو گے... مجھے روکیں گے یا جانے کی اجازت ہوگی؟''

''اس کا فیصلہ ال ورتھ کرے گا وہی اس کیس کا انچارج ہے۔'' ایلس نے کہا اور کمرے سے باہر آگئی جہاں ال ورتھ اپنے ماتحتوں سے الجھ رہا تھا۔ جان اور رسٹ کا خیال تھا کہ اس شخص کو باقاعدہ گرفتار کر لیا جائے لیکن ال ورتھ اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اس صورت میں ہمیں اسے عدالت میں پیش کرنا پڑے گا اور عدالت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایلس نے کہا تو جان گرم ہوگیا۔

''تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ تمہارا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

ایلس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے تم اسی طرح تفتیش کے قائل ہو۔ حیرت ہے اب تک قاتل نہیں پکڑا گیا۔''

''جان۔'' ال ورتھ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ابھی مارے پاس کچھ نہیں ہے اور اسے رہا کر کے ہم اس کی نگرانی کریں گے اگر یہ قاتل ہے تو غلطی ضرور کرے گا۔''

''اس غلطی کو پکڑے گا کون؟'' ایلس نے معصومیت سے پوچھا تو جان بھنا کر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر میں ال ورتھ نے رچی نیلسن کو طلب کیا اور اسے خبردار کرتے ہوئے جانے کی اجازت دیدی کہ وہ فی الحال نیو یارک کی حدود سے باہر نہیں جائے گا۔ شام کے وقت ایلس ہوٹل جانے کے لیے نکلی تو ال ورتھ نے اسے لفٹ پیش کی۔ ایلس کے پاس فی الحال گاڑی نہیں تھی۔ اس نے ال ورتھ سے کہا۔ ''میرے لیے رینٹ پر کار منگوا دو۔''

''میں کہہ دوں گا کار کل صبح تک تمہارے ہوٹل پہنچ جائے گی۔''

سینٹرل پارک کے نزدیک کا برائے ہوٹل پرانی طرز کا لیکن شاندار ہوٹل تھا۔ ایلس کا کمرا دوسرے فلور پر تھا۔ ایلس نے ال ورتھ کو کافی کے لیے روک لیا۔ روم سروس کو کافی کا کہہ کر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے رچی سب کچھ سچ کہہ رہا ہے؟''

ال ورتھ نے سرہلایا۔ ''میں نے رسٹ سے کہا ہے وہ سان فرانسسکو میں اس کے بارے میں چھان بین کرے۔ ویسے آج کل رینبو آرٹ گیلری میں ہونے والی نمائش میں اس کی تصاویر بھی شامل ہیں۔''

''علاقے میں موجود کیمروں سے مدد لی گئی ہے؟''

''یہ کام جان کر رہا ہے۔'' ال ورتھ نے جواب دیا۔ کافی پی کر وہ کھڑا ہوگیا۔ ''میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر دینا۔''

''میرا خیال ہے فی الحال میں نے سب حاصل کر لیا ہے۔'' ایلس نے گتے کے ڈبے کی طرف دیکھا جس میں وہ اس کیس کا تمام ریکارڈ لے کر آئی تھی۔ ال ورتھ کے جانے کے بعد اس نے شاور لیا اور ڈنر طلب کیا، کھانے کے بعد وہ کیس کی فائلیں دیکھنے لگی۔ ہر کیس کی الگ فائل تھی۔ ان میں تصاویر بھی تھیں اور انہیں دیکھنا عام آدمی کے لیے بھی آسان نہیں تھا مگر اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ اس نے تمام تصاویر جمع کیں اور اپنے بیڈ کے اوپر بنے لکڑی کے چھپر کھٹ پر پنوں سے لگا دیں۔ جب وہ لیٹی تو یہ تصویریں اس کے سامنے تھیں۔ وہ سوچنے لگی کہ انسانوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے والا کس فطرت کا آدمی تھا؟ اس نے بنا کسی دشمنی کے صرف اپنے مفاد کی خاطر ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو اسے جانتے بھی نہیں تھے۔ مسز ریف کے دعوے کے بعد صورتِ حال بدل گئی تھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل صبح سب سے پہلے مسز ریف سے ملے گی اور اس سے کرسٹن ریف کے بارے میں معلومات حاصل کرے گی۔

صبح وہ ناشتا کر کے نیچے آئی تو ایک نئے ماڈل کی کار باہر کھڑی تھی اس کی چابیاں ہوٹل استقبالیہ پر دیدی گئی تھیں۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ ال ورتھ اور اس کے آدمی ڈیوٹی پر آ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں دور جانا تھا اس لیے وہ روانہ ہو گئے۔ ال ورتھ نے کہا کہ وہ راستے میں اسے بتائے گا۔ جان اور رسٹ دوسری کار میں تھے۔ ال ورتھ نے اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دی، اس کے مطابق پارک کے مقتول کی موت دماغ پر ضرب لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ اگرچہ اس کے فنگر پرنٹس اور ڈینٹل اسٹرکچر ضائع ہو گئے تھے لیکن ڈی این اے سے تصدیق ہو گئی کہ وہ اسٹیو ڈینش ہی ہے۔ پارک میں نصب کیمروں سے کوئی مدد نہیں ملی سوائے ایک مشکوک شخص کے جو اپر پہنے ہوئے تھا۔ مگر اس کی جھلک ایک کیمرے میں صرف ایک لمحے کے لیے دکھائی دی تھی۔

وہ شخص اس سے پہلے کیمروں میں نہیں آیا تھا جو پاتھ وے پر مرکوز تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ شخص کیمروں سے بچ کر پارک میں آیا اور گیا تھا بس اتفاق سے ایک کیمرے کی زد میں آ گیا مگر سوائے ایک اپر کے اور کچھ نظر نہیں آیا تھا ڈھیلے اپر کی وجہ سے آدمی کی جسامت کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایلس تصویریں دیکھ رہی تھی۔ وقت صبح دس بج کر سات منٹ کا تھا جب کہ رچی نے پولیس کو دس بج کر دو منٹ پر کال کی تھی۔ یعنی اپر پوش مشکوک شخص اس وقت پارک سے باہر جا رہا تھا۔ سان فرانسسکو سے رپورٹ آ گئی تھی۔ وہاں رچی نیلسن کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی پولیس یا کسی تحقیقاتی ادارے نے اسے کسی کیس میں ملوث پایا تھا۔ حد یہ کہ اس کا ٹریفک خلاف ورزی پر چالان بھی نہیں ہوا تھا۔

''یہ تو بہت صاف ستھرا آدمی ہے۔'' ایلس نے کہا۔

''وہ یقیناً محتاط زندگی گزارتا ہے۔'' ال ورتھ نے کہا۔

''لیکن سیریل کلر بھی محتاط زندگی گزارتا ہے تبھی وہ آج تک پولیس کے قابو میں نہیں آیا۔''

مسز ریف کا گھر ریف ہاؤس نیو جرسی کے ایک خوب صورت نواحی علاقے میں ایک بلند ہوتی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ یہ پہاڑی بھی ریف مکان کا حصہ تھی۔ لکڑی، پتھر اور شیشے سے بنا ریف ہاؤس قدیم اور جدید جرمن طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ ریف خاندان ایک صدی پہلے جرمنی سے آ کر یہاں

آباد ہوا تھا۔ وہ پورچ میں رکے اور ال ورتھ نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تم اندر جا کر مسز ریف سے بات کرو۔ اس دن بھی وہ تم سے کھل کر بات کر رہی تھی۔''

جان نے یہ سن کر برا سا منہ بنایا کہ صرف ایلس اندر جائے گی۔ نہ جانے اسے ایلس سے کیا خار تھی۔ ''تو ہم بلاوجہ یہاں آئے ہیں؟''

''ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔'' ال ورتھ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم بھول رہے ہو یہ ایک مبینہ سیریل کلر کا گھر بھی ہے۔''

ایلس کار سے اتری، مرکزی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی گھنٹی لگی تھی۔ ایلس نے گھنٹی بجائی تو ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ اس نے مخصوص ایپرن باندھ رکھا تھا۔ مسز ریف لاؤنج میں اس کی منتظر تھی۔ اس نے گرم جوشی سے ایلس سے ہاتھ ملایا۔ ''تم یقیناً کرسٹن کے بارے میں پوچھنے آئی ہو؟''

''یہ ضروری ہے۔ اگر ان وارداتوں کے پیچھے وہی ہے تو اسے گرفتار کرنے کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہوگی۔''

''میں تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتی کہ تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں۔''

''اس کی کوئی تصویر؟'' ایلس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے جب وہ یہاں سے گیا تھا؟''

مسز ریف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ اس وقت بیس برس کا تھا لیکن وہ جاتے ہوئے اپنی تمام تصاویر ساتھ لے گیا تھا۔ میرے پاس رہنے والی تصاویر بارہ سال تک کی ہیں۔''

مسز ریف اپنا خاندانی البم لے آئی۔ ایلس نے دیکھا کرسٹن خوب صورت نقوش اور سنہری بالوں والا لڑکا تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے تاثرات سے شوخی عیاں تھیں۔ جب کہ اس کا بڑا بھائی ایسٹن کسی قدر کھردرے نقوش والا سنجیدہ لڑکا تھا۔ وہ کرسٹن سے دو برس بڑا تھا۔ ایلس نے ایسٹن کے بارے میں پوچھا تو مسز ریف کے چہرے پر غم چھا گیا تھا۔ ''وہ سترہ برس کا تھا کہ ہنٹنگ کے دوران کسی دوسرے شکاری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔''

ایلس چونکی۔ ''یہ حادثہ... کہاں پیش آیا تھا؟''

''یہیں نیوجرسی میں... ایلی پائن ہنٹنگ ریزروٹ میں۔''

ایلس نے نظریں جما کر مسز ریف کو دیکھا۔ ''کیا کرسٹن بھی اس کے ساتھ تھا؟''

مسز ریف نے سر ہلایا۔ ''مجھے اس وقت شبہ نہیں ہوا تھا کیونکہ کرسٹن ہتھیار چلانا نہیں جانتا تھا۔ مگر بعد میں، میں نے خود اسے نشانے بازی کی مشق کرتے دیکھا۔''

''دونوں بھائیوں میں تعلقات کیسے تھے؟''

مسز ریف نے گہری سانس لی۔ ''سچ کہوں تو ا
تھے۔ ایسٹن ذمے دار اور سب کا خیال رکھنے وا
تھا جب کہ کرسٹن بے پروا اور صرف اپنی ذات
رہنے والا لڑکا تھا اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ میں اس
مقابلے میں ایسٹن کو ترجیح دیتی ہوں۔''

مسز ریف البم رکھنے گئی تو ایلس ایک طرف لگے
عریض شیلف پر رکھی ریف خاندان کی تصاویر دیکھنے لگی
میں کئی تصاویر میں کرسٹن موجود تھا۔ ایک تصویر میں
فیملی تھی۔ ایلس اسے اٹھا کر دیکھ رہی تھی کہ اسے کہیں
آہٹ سنائی دی۔ اسی اثنا میں مسز ریف واپس آ
تھی۔ اسے دیکھ کر ایلس نے تصویر واپس رکھ دی۔ مسز
اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ اسے تصاویر کے بارے
بتانے لگی۔ ایلس نے کرسٹن کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ
طرح کا لڑکا تھا؟''

''بہت خطرناک اور انتقامی مزاج رکھنے والا،
اسے کسی سے کوئی عناد ہو جاتا تو وہ کبھی اسے معاف نہیں
تھا۔ اس کے اسکول کا ساتھی جس سے اس کا کسی لڑکی پر
ہوا تھا جب بائک حادثے کا شکار ہوا، پولیس کو شک تھا
حادثہ ترتیب دیا گیا تھا لیکن وہ کسی کے خلاف شبہ
سکی۔ جب وہ کالج میں تھا تب بھی اسی طرح کا ایک
پیش آیا۔ شکار ہونے والا لڑکا اس سے بہتر گٹار بجاتا تھا
لیے کالج بینڈ میں منتخب ہو گیا، ایک دن ریہرسل کے دور
اس کے گٹار میں کرنٹ آ گیا۔ جب تک کرنٹ بند کیا جا
مر چکا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں نے پہلی بار کرسٹن
کھل کر بات کی اور اس سے پوچھا کہ سارے حادثات
کی ذات سے کیوں منسوب ہوتے ہیں۔ میں نے ا
ایسٹن کا قاتل بھی قرار دیا تھا۔ اس کے چند دن بعد
سے غائب ہو گیا اور میں نے برسوں بعد اسے
نیویارک کی بندرگاہ پر دیکھا۔''

ایلس نوٹ نہیں کر رہی تھی کیونکہ وہ ریکارڈ کر
تھی۔ ساتھ ہی تمام باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہو
تھیں۔ جب اس نے محسوس کیا کہ مسز ریف کے پاس ا
بتانے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے تو وہ اٹھ گئی۔ اس نے مسز ریف
سے کہا کہ وہ اپنی حفاظت پر توجہ دے اور اگر اسے اپ
میں کوئی خلافِ معمول بات محسوس ہو تو فوری پولیس سے ر
کرے۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ''تمہارا مطلب ہے کر

یہاں آ سکتا ہے؟''

ایلس نے سر ہلایا۔ ''آپ کیوں بھول رہی ہیں یہ گھر جتنا آپ کا ہے اتنا ہی کرسٹن کا بھی ہے۔''

''میں خیال رکھوں گی۔''

ایلس جاتے جاتے پلٹی اور اس نے اپنے بیگ سے رچی نیلسن کی بنائی تصویر نکال کر مسز ریف کو دکھائی۔ ''کیا آپ کو اس میں کرسٹن کی شباہت محسوس ہوتی ہے۔''

اس نے غور سے دیکھا۔ ''ہونٹ اور ناک ویسی ہی ہے لیکن آنکھوں کی بناوٹ میں کچھ فرق ہے البتہ آنکھوں کا تاثر کرسٹن جیسا ہی ہے۔ بالوں کا اسٹائل بھی ویسا ہی ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''

ایلس اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئی۔ ال ورتھ اور اس کے آدمی انتظار کر رہے تھے۔ راستے میں ایلس نے اپنی اور مسز ریف کی گفتگو کی ریکارڈنگ اسے سنائی۔ یہ گفتگو اس نے اپنے آئی فون میں ریکارڈ کر لی تھی۔ ال ورتھ نے ریکارڈنگ سن کر کہا۔ ''کیا مسز ریف کو بیٹے سے خطرہ ہو سکتا ہے؟''

''میرا خیال ہے اب تک تو نہیں تھا کیونکہ اگر کرسٹن اس کے خلاف دل میں کوئی بات رکھتا تو بیس سال کا عرصہ کارروائی کے لیے بہت ہوتا ہے۔ اسے اصل خطرہ نیویارک میں دیکھے جانے کے بعد ہوا ہے۔ کرسٹن نے اگر محسوس کیا کہ وہ ماں کی وجہ سے پکڑا جا سکتا ہے تو وہ اس کے خلاف کچھ کر بھی سکتا ہے۔''

''اس صورت میں مجھے مقامی پولیس کو ہوشیار کر دینا چاہیے۔''

ایلس نے تائید کی۔ ''ضرور اور مجھے راستے میں رینبو آرٹ گیلری پر اتار دینا۔''

ال ورتھ نے اسے آرٹ گیلری پر اتار دیا۔ ''کیا تم ہیڈ کوارٹر آؤ گی؟''

''ہاں، وہاں میری کار موجود ہے۔''

''میں کسی کو بھیج دوں گا۔''

''نہیں میں ٹیکسی سے آ جاؤں گی۔''

آرٹ گیلری خاصی بڑی تھی اور اس کے تیسرے ہال میں مقامی اور درمیانے درجے کے مصوروں کے فن پاروں کی نمائش جاری تھی۔ رچی ایلس کو وہیں ملا۔ وہ گیلری کے منیجر سے بات کر رہا تھا۔ ایلس اس کے پاس نہیں گئی۔ اس نے اپنا ایف بی آئی کا کارڈ بھی پرس، میں ڈال لیا تھا۔ رچی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ منیجر سے بات کر کے وہ خود اس کے پاس آیا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں آرٹ سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

رچی نے شانے اچکائے۔ ''میرا اندازہ ہے۔''

ایلس نے غور سے اسے دیکھا۔ ''شاید تم دوسروں کے بارے میں اندازے بہت لگاتے ہو۔ بہرحال تمہارا یہ اندازہ غلط ہے۔ میں اسکول کے زمانے میں بہت اچھی ڈرائنگ کرتی تھی اور میری اسکیچ بک خاصی موٹی ہو گئی تھی۔''

''پھر تم ایف بی آئی میں آ گئیں۔'' رچی مسکرانے لگا۔ ''ایجنسی اور آرٹ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں۔'' بولتے بولتے اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''سنو، اس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔''

ایلس نے اپنے تاثرات نارمل رکھے تھے۔ رچی بھی یوں بات کر رہا تھا جیسے کوئی معمول کی گفتگو ہو۔ ''کب... کیسے؟''

''آج صبح... مجھے گیلری کی ریسیپشن پر ایک لفافہ ملا۔ لفافہ رات کو آیا تھا اور کلرک کو دینے والا یاد نہیں ہے۔''

''لفافے میں کیا تھا؟''

رچی اس کے قریب ہوا اور اس نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر ایلس کو یوں دیا کہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ رقعے پر تحریر تھا۔ ''تم میری نظروں میں ہو... آج رات مجھ سے میگنا بار کلب میں ملو۔''

''میگنا بار کلب کہاں ہے؟''

''اسی سڑک پر دو بلاک آگے ہے۔'' رچی کسی قدر پریشان نظر آنے لگا۔ ''اس کا مطلب ہے اس نے مجھے تلاش کر لیا ہے اور وہ اب میری تاک میں ہے۔''

''تم فکر مت کرو پولیس والے تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔''

''حفاظت کر رہے ہیں یا مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' رچی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''میرا نہیں خیال کہ یہ مجھے قاتل سے بچا سکیں گے جب کہ یہ خود مجھے قاتل سمجھ رہے ہیں۔''

''اگر یہ تمہیں قاتل بھی سمجھ رہے ہیں تب بھی تم پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' ایلس نے اسے تسلی دی۔

''اب مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جب سے یہ رقعہ ملا ہے میں بہت پریشان ہوں۔''

''تم جاؤ گے اور فکر مت کرو، تمہاری پوری حفاظت کی جائے گی۔'' ایلس نے کہا۔ ''ابھی تم میرے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلو گے۔''

''ابھی مجھے کچھ دیر یہاں رکنا ہے۔'' رچی بولا۔ ''کل نمائش کا آخری دن ہے میری ایک درجن تصاویر فروخت ہوئی ہیں۔ ان میں چار نقول اور آٹھ میری اپنی تصاویر ہیں۔ مجموعی فروخت بارہ ہزار سات سو بیس ڈالرز کی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم اچھے مصور ہو۔''

''شاید۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''تم کچھ پیو گی؟ یہاں سروس ہے۔''

ایلس نے سر ہلایا تو رچی اس کے لیے کافی لے آیا۔

''نمائش کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''گیلری کی جانب سے مجھے کچھ کام ملا ہے لیکن وہ میں سان فرانسسکو جا کر کروں گا اگر مجھے جانے کی اجازت ملی تو۔''

''تمہارے خلاف کوئی چارج نہیں ہے اور اسٹیو ڈینش مرڈر میں بھی تم کلیئر ہو اس لیے میرا نہیں خیال کہ تمہیں روکا جائے گا۔''

''یہ تو تم کہہ رہی ہو، ممکن ہے پولیس کا خیال مختلف ہو۔''

وہ دوپہر تک فارغ ہوا تھا۔ ایلس نے محسوس کیا کہ وہ خاصا سہما ہوا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ شاید قاتل یہاں موجود ہے۔ ایلس بہ ظاہر تصاویر دیکھ رہی تھی لیکن اصل میں وہ وہاں موجود افراد کا جائزہ لے رہی تھی، خاص طور سے ان لوگوں کا جو اکیلے تھے اور دوسروں سے دور تھے۔ ایک گول چہرے، سنہری بالوں اور گول عینک والے آدمی نے ایلس کی توجہ حاصل کی تھی وہ خاص طور سے رچی کی بنائی تصاویر کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ ایلس نے اسے نوٹ کیا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ غائب ہو گیا تھا۔ ایلس نے غیر محسوس انداز میں اپنے آئی فون سے اس کی تصویر لی تھی۔ مگر تصویر صاف نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ رچی سے ملی تو اسے تصویر دکھائی۔

''اس شخص کو جانتے ہو؟''

رچی نے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اس شخص کی سی شباہت آ رہی ہے جسے میں نے پارک میں اسٹیو کو قتل کرتے دیکھا تھا۔''

رچی دوپہر تک فارغ ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے نزدیکی ریستوران میں لنچ کیا۔ اس دوران میں رچی اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اس کا تعلق سان فرانسسکو سے تھا، اس کا باپ ویت نام وار میں مارا گیا تھا۔ چند سال پہلے اس کی ماں بھی کینسر سے انتقال کر گئی تھی۔ کوئی رشتے دار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گرل فرینڈ تھی۔ اس نے ہائی اسکول کے بعد آرٹ کالج میں داخلہ لیا لیکن وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کالج چھوڑنا پڑا تھا۔ پھر وہ زندگی کے لیے جدوجہد کرتا رہا اور اس نے بڑی مشکل سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے تو ال ورتھ ان کا منتظر تھا۔ ایلس پہلے ہی موبائل پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر چکی تھی اور ال ورتھ نے پلان بنا لیا تھا۔ اس نے رچی سے کہا۔ ''میرے آدمی تمہارے لباس میں ایک مائک چھپا دیں گے۔ اس کی مدد سے ہم تمہاری بات سن سکیں گے۔''

''بات۔'' رچی نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میرا نہیں خیال کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، وہ میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے کیونکہ میں اس کے خلاف عینی گواہ ہوں۔''

''وہ بھرے بار میں کوئی ایسی حرکت کرنے سے گریز کرے گا۔ پھر میرے آدمی سادہ لباس میں ہوں گے۔''

رچی بادل ناخواستہ تیار ہوا تھا۔ ایلس اسے سمجھا رہی تھی کہ کس صورتِ حال میں اسے کیا کرنا ہے۔ اپنی حفاظت کیسے کرنی ہے اور خطرے کا سامنا ہونے پر اپنی کیسے جان بچانی ہے۔ جان طنزیہ انداز میں بولا۔ ''یہ بچہ نہیں ہے جسے تم سمجھا رہی ہو۔''

ایلس رچی کو پولیس کے پاس چھوڑ کر واپس ہوٹل آئی تھی۔ وہ شام کے وقت نکلی۔ پولیس رچی کو لے کر میگنا بار کلب پہنچ گئی تھی۔ براڈوے اسٹریٹ پر یہ ذرا اوپری درجے کا بار کلب تھا۔ بغلی گلی میں ال ورتھ اور اس کے آدمی رچی کو تیار کر رہے تھے۔ اس کی قمیص میں طاقتور مائک چھپا دیا تھا اور ال ورتھ اسے سمجھا رہا تھا کہ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ انہیں آواز دے۔ رچی نے سر ہلایا۔ ''اگر مجھے اس کا موقع ملا تو۔''

''میں بھی اندر جاؤں گی۔'' ایلس نے کہا۔

''یہ ٹھیک نہیں...''

''ٹھیک ہو گا۔'' ایلس نے ال ورتھ کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔''

مجبوراً ال ورتھ نے سر ہلایا۔ ایلس نے اپنا کوٹ اتار دیا اور پستول بیگ میں رکھا، اس نے اپنے بال کھول لیے اور شرٹ کے اوپری بٹن بھی کھول دیے۔ رچی مسکرایا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب تم مزید اچھی لگ رہی ہو۔ میرا خیال ہے ایجنسی میں تم سے زیادہ خوب صورت عورت اور نہیں ہو گی۔''

وہ اندر آئے، ایلس ایک کونے کی طرف چلی گئی جہاں سے وہ رچی پر نظر رکھ سکتی تھی۔ رچی کاؤنٹر پر نمایاں جگہ آ گیا۔ اس نے اپنے لیے سوڈا مانگا۔ اس کی بے چین نگاہیں چاروں طرف تھیں۔ وہ پُرہجوم بار میں کسی جانے پہچانے چہرے کو تلاش کر رہا تھا مگر ابھی تک کوئی نظر نہیں آیا۔ ایلس بھی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ رچی کی بیئر کی بوتل آ گئی تھی، وہ اسے پیتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے بوتل اٹھانی چاہی تو اس کے نیچے دبے چھوٹے سے کاغذ نے اسے چونکا دیا۔ اس پر ''ٹوائلٹ'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے آس پاس دیکھا مگر اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی وہ کسی پر

شک نہ کرسکا کہ وہی کاغذ رکھ کر گیا ہوگا۔ ایلس بھی غائب تھی، مجبوراً وہ کاغذ لے کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ بار میں جتنا ہجوم تھا باتھ روم والا حصہ اتنا ہی سنسان تھا۔ وہ اندر آیا یہاں صرف ایک ادھیڑ عمر شرابی تھا جو ہاتھ دھو رہا تھا اور وہ بھی چلا گیا۔ رچی نے لیٹرین کے کیبنوں کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ سے پہلے کیبن کی طرف آیا اور اس کا دروازہ کھینچا۔ اس میں کوئی نہیں تھا اسی لمحے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح چونکا لیکن یہ ایلس تھی۔ اس نے پستول لیا ہوا تھا۔

’’تم نے مائک کیوں آف کیا ہوا ہے؟‘‘

’’میں نے۔‘‘ وہ حیران رہ گیا۔ ’’نہیں تو میں نے اسے چھوا بھی نہیں ہے۔‘‘

’’تب شاید اس میں کوئی خرابی آئی ہوگی۔‘‘ ایلس نے کہا۔ ’’میں نے دیکھا کہ تم اچانک غائب ہو گئے ہو۔ ال ورتھ نے بتایا کہ تم باہر نہیں نکلے ہو، مجھے واش روم کا خیال آیا، تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟‘‘

جواب میں رچی نے اسے کاغذ تھما دیا۔ کاغذ دیکھتے ہی ایلس نے واکی ٹاکی پر کہا۔ ’’وہ یہاں موجود تھا۔‘‘

’’یعنی اب نہیں ہے۔‘‘ رچی نے بے چینی سے پوچھا۔

’’ظاہری بات ہے۔ وہ دیکھ رہا ہوں گا کہ تمہارے پیچھے کون ہے اور مجھے دیکھ کر وہ یہاں سے جا چکا ہوگا۔ ہم سے حماقت ہوئی ہے۔‘‘

وہ باہر آئے تو رچی غصے میں تھا اس نے اپنی قمیص تلے موجود مائک اور اس کی تار کھینچ کر نکالی اور مارنے کے انداز میں جان کو تھما کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ’’یہ تم لوگوں کا کیس ہے اس سے خود نمٹو، اب مجھے مزید قربانی کا بکرا مت بناؤ۔‘‘

’’ہم تمہاری حفاظت کے لیے موجود تھے۔‘‘ ال ورتھ نے نرمی سے کہا۔ ’’اگر ہم نہ ہوتے تو وہ یقیناً اتنی خاموشی سے واپس نہ جاتا۔‘‘

رچی کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ ’’تم لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ میں اس کے لیے خطرہ ہوں اب وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اندھیرے کا تیر ہے اور ہم میں سے کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔‘‘

’’پولیس تمہاری حفاظت کرے گی۔‘‘ ایلس نے اسے تسلی دی۔

’’ساری عمر۔‘‘ وہ تلخی سے بولا۔

ال ورتھ نے اسی وقت دو پولیس مین بلوا لیے تھے۔ رچی نیلسن کی رہائش براڈوے اسٹریٹ کے ساتھ ہی پرانے علاقے میں ایک انیسویں صدی کی عمارت میں تھی۔ اس فرنچ اسٹائل کی عمارت میں پتھروں کی سیڑھیاں تھیں اور یہ آج بھی روزِ اول کی طرح مضبوط تھیں۔ دو منزلوں پر دو بڑے ہال نما کمرے تھے۔ دونوں کمرے رچی کے زیرِ استعمال تھے۔ اوپری کمرے میں مصوری کا سامان بھی تھا۔ ایزل لگے تھے اور ان پر مختلف ادھوری تصاویر تھیں۔ ال ورتھ اور اس کے ساتھی پولیس اہلکار عمارت کی سیکیورٹی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایلس رچی کے ساتھ اوپر آئی۔ اس نے تصویروں کا جائزہ لیا۔ ’’تم بیک وقت کئی تصویروں پر کام کرتے ہو؟‘‘

’’ہاں، یہ میری عادت ہے میں بیک وقت کئی تصویروں پر کام شروع کرتا رہتا ہوں۔ پھر موڈ کے حساب سے انہیں مکمل کرتا رہتا ہوں۔‘‘

’’کل نمائش کا آخری دن ہے؟‘‘

رچی نے سر ہلایا۔ ’’دو دن بعد میری فلائٹ ہے۔‘‘

ال ورتھ مطمئن ہو کر اپنے دو آدمی وہاں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ ایلس اس کے ساتھ ہی نکلی تھی۔ اس نے ال ورتھ سے کہا۔ ’’تم لوگوں کو کوئی مشکوک شخص نظر نہیں آیا۔‘‘

’’نہیں، حالانکہ ہم عقبی دروازے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔‘‘

’’تب وہ وہیں موجود تھا اور جب ہم روانہ ہوئے تب بھی وہیں تھا۔‘‘ ایلس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’وہ بہت شاطر انسان ہے، ہمیں مسلسل غچے دے رہا ہے۔‘‘

’’کوئی مجرم مسلسل قانون کو غچے نہیں دے سکتا۔ وہ پکڑا جاتا ہے یا پھر قانون کی حد سے دور بھاگ جاتا ہے۔‘‘

’’مجھے بھی لگ رہا ہے وہ بھاگ جائے گا۔‘‘ ایلس نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ’’اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اسے رچی کے خلاف کچھ کرنے کے لیے جلدی نہیں ہے۔‘‘

’’یہ رچی۔‘‘ ال ورتھ اس کی کار پر جھکتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے لگ رہا ہے یہ تمہاری طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہے۔‘‘

ایلس نے جلدی سے چہرہ پھیر لیا۔ ’’ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

ال ورتھ کی بات نے اسے نروس کر دیا تھا اس لیے وہ جلدی سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ رچی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ایلس کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک آ جاتی تھی۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اس کی نظر چھت پر لگی تصاویر پر گئی تھی۔ وہ بے چین ہو گئی اگر قاتل کامیاب رہا تو ان تصاویر میں رچی کی تصویر کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ وہ قاتل کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ شاید کرسٹن ہے۔ اس رات اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ صبح سویرے ال ورتھ کی کال نے اسے بیدار کیا وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ’’جلدی سے تیار ہو جاؤ میں لینے آ رہا ہوں۔‘‘

’’کیا ہوا ہے؟‘‘

’’تم نے جس آدمی کی تصویر لی تھی۔ پولیس نے اس کی مدد سے آس پاس کے علاقے میں چھان بین کی تو وہ شخص ایک عمارت میں مقیم نکلا۔ منیجر نے تصویر دیکھ کر شناخت کر لیا ہے۔ ہم چھاپہ مارنے جا رہے ہیں۔‘‘

ایلس عجلت میں تیار ہوئی۔ ابھی وہ کافی پی رہی تھی کہ ال ورتھ آ گیا۔ اس نے ایلس کا ہاتھ تھاما۔ ’’وقت نہیں ہے جلدی کرو۔ پولیس نے عمارت کو گھیر لیا ہے۔‘‘

عمارت براڈوے سے کچھ ہی فاصلے پر بندرگاہ کے نزدیک تھی۔ اندر باہر پولیس والے موجود تھے۔ ایلس، ال ورتھ، جان اور رسٹ اندر آئے۔ عمارت کا منیجر پریشان تھا اس نے ال ورتھ سے کہا۔ ’’اس نے دو ہفتے پہلے یہ فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔‘‘

’’وہ اندر ہے؟‘‘

’’میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔‘‘ منیجر چابیاں لے کر ان کے ساتھ اوپر آیا۔ اس نے خاموشی سے تالا کھولا اور جیسے ہی تالا کھولا رسٹ اسے بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف لے گیا۔ ال ورتھ نے جان کی طرف دیکھا اور دونوں بیک وقت دروازہ کھولتے ہوئے اندر آئے۔ پہلا کمرا خالی تھا۔ یہ لاؤنج تھا۔ ایلس بھی پیچھے آئی۔ جان نے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اشارے سے بتایا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایلس نے باتھ روم میں جھانکا۔ ایک منٹ کے اندر انہوں نے پورا اپارٹمنٹ دیکھ لیا تھا۔ جان نے صوفے کو لات ماری اور باہر چلا گیا۔ ایلس بیڈ روم کا معائنہ کر رہی تھی۔ وہاں جا بہ جا بند کھانوں کے خالی ٹن پڑے تھے اور ان سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ اپارٹمنٹ کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کئی دن سے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہ جگہ فرنش تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے قاتل سے منسوب کیا جاتا، وہ اپنا سارا سامان لے گیا تھا۔ ایلس ہوٹل سے روانہ ہوتے ہوئے جتنی پُرجوش تھی اب اتنی ہی مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ال ورتھ سے کہا۔

’’بس ایک آخری چانس ہے۔ وہ آج تصویروں کی نمائش میں آئے گا۔‘‘

’’تمہیں یقین ہے؟‘‘

’’نوّے فیصد... ہم اسے وہیں گھیر سکتے ہیں۔‘‘ ایلس نے کہا۔ ’’اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید وہ کبھی ہاتھ نہ آئے۔‘‘

’’تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ وہاں آئے گا۔‘‘

’’ایک تو وہ رچی کے پیچھے ہے۔‘‘ ایلس نے کہا اور ایک کاغذ ال ورتھ کے سامنے کر دیا۔ اس پر رچی کا اسکیچ بنا ہوا تھا۔ ’’اسے بھی مصوری سے دلچسپی ہے اس لیے وہ ضرور وہاں آئے گا۔ یہ مجھے صوفے کے نیچے پڑا ہوا ملا ہے شاید وہ بے دھیانی میں یہیں چھوڑ گیا تھا۔‘‘

نمائش شام تین سے رات بارہ بجے تک تھی۔ جب ایلس آرٹ گیلری پہنچی تو اس کے سامنے شائقین کا ایک بہت بڑا ہجوم پہلے ہی موجود تھا۔ ال ورتھ کے ساتھ سادہ لباس میں ایک درجن پولیس مین تھے۔ ایلس اور ال ورتھ اندر آئے جہاں رچی گیلری منیجر اور سیکیورٹی آفیسر کے ساتھ موجود تھا۔ منیجر پولیس کی اس طرح موجودگی سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے اپنی نمائش اور گیلری کی ساکھ کی فکر تھی۔ ال ورتھ نے اس سے کہا۔ ’’تم فکر مت کرو یہ ایک بہت اہم سیریل کلر کا معاملہ ہے وہ پکڑا گیا تو تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔‘‘

’’مالکان یہ سب کہاں دیکھتے ہیں۔‘‘ منیجر نے تلخی سے کہا۔ ’’یہاں نمائش کے دوران کچھ بھی معمول سے ہٹ کر ہوا تو ذمے دار میں قرار پاؤں گا۔‘‘

کچھ دیر میں نمائش شروع ہوئی۔ لوگ قطار بنا کر اندر آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نمائش کے لیے مخصوص تمام ہال بھر گئے تھے۔ ایلس نے شانے پر موجود ریڈیو میں آہستہ سے ال ورتھ سے کہا۔ ’’یہاں تو بہت زیادہ ہجوم ہے۔‘‘

’’تم فکر نہ کرو میرے آدمی ہر طرف موجود ہیں۔‘‘

ایلس ہال نمبر چار اور پانچ کے سنگم پر آ گئی یہاں سے وہ کئی طرف دیکھ سکتی تھی۔ رچی اپنی ایک تصویر کے پاس موجود چند شائقین سے بات کر رہا تھا۔ اچانک ایلس کی نظر اس طرف بڑھنے والے ایک گروہ پر پڑی۔ اس نے دیکھا ایک کسی قدر طویل قامت شخص خود کو جھکا کر چل رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی تو وہ شخص اچانک راستہ بدل کر چار نمبر میں داخل ہو گیا۔ رچی پانچ نمبر میں تھا۔ ایلس نے ریڈیو پر کہا۔ ’’ایک مشکوک فرد چار نمبر میں داخل ہوا ہے۔ سرمئی کوٹ میں ہے۔‘‘

’’میں اس طرف موجود جوانوں کو خبردار کر رہا ہوں۔‘‘ ال ورتھ نے کہا۔ ایلس کمرے میں آئی۔ کہنے کو یہ کمرا تھا لیکن وسعت میں کسی ہال سے کم نہیں تھا اور یہاں آنے

جانے کے کئی راستے تھے۔ وہ لوگوں میں دیکھ رہی تھی لیکن اسے سرمئی کوٹ والا پھر نظر نہیں آیا۔ ایلس نے کہا۔

”وہ شاید فرار کی کوشش کر رہا ہے اس نے پولیس کی موجودگی بھانپ لی ہے۔“

اسی اثنا میں باہر جانے والے راستے پر ایک پولیس مین نے مشکوک آدمی کو روکنے کی کوشش کی تو وہ اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا تھا۔ اب پولیس والے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایلس خود بھی باہر کی طرف لپکی مگر اس طرف آنے والوں کا ہجوم تھا، اسے لوگوں کو دھکا دینا پڑ رہا تھا۔ جب تک وہ گیلری سے باہر آتی۔ پولیس والے سڑک پر پھیل کر مشکوک فرد کو تلاش کر رہے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہاں ایک فیسٹول جا رہا تھا جس میں لوگ بہروپ بھر کر مختلف آلات موسیقی سے شور برپا کر رہے تھے۔ یہ شاید سیاہ فام اور ویسٹ انڈین فیسٹول تھا۔ سڑک پر دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ یہی نہیں بلکہ آس پاس کی گلیاں بھی لوگوں سے خالی نہیں تھیں۔ پولیس نصف گھنٹے تک سرگرمی سے فرار ہونے والے کو تلاش کرتی ... رہی مگر وہ ایک بار پھر پولیس کو جل دے گیا تھا۔ اس ناکامی نے ٹھنڈے مزاج کے ال ورتھ کو بھی چراغ پا کر دیا تھا اور وہ اپنے آدمیوں پر برس پڑا تھا۔

ایلس اسے چھوڑ کر اندر آئی تو رچی قاتل کے فرار کا سن کر زرد پڑ گیا تھا۔ ایلس کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی، وہ جانتا تھا کہ اگر قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی زندگی مشکوک رہے گی۔ قاتل بھی وہ جو گزشتہ بیس سال سے پولیس کو بیوقوف بنائے ہوئے تھا اور یہاں بھی مسلسل اسے غچے دے رہا تھا۔ ایلس نے اس سے کہا۔ ”کل طیارے میں سوار ہونے تک پولیس تمہاری حفاظت کرے گی۔“

”اور اس کے بعد؟“

ایلس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے جانے سے پہلے کہا۔ ”میں کل صبح آؤں گی۔“

رچی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”چلو اس سفر میں کوئی تو خوشگوار یاد ہوگی۔“

ایلس نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا تھا۔ برسوں پہلے جب اس نے نوعمری میں شادی کی اور ایک سال بعد ہی یہ شادی بہت تکلیف دہ انداز میں ختم ہوئی تب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی تو ایک طرف رہی اب وہ کسی مرد سے متاثر بھی نہیں ہوگی۔ اس نے اپنی جاب کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ لیکن اب اسے اپنا عہد متزلزل ہوتا لگ رہا تھا۔ رچی بتدریج غیر محسوس انداز میں اس کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور وہ لاشعوری طور پر پسپا ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ال ورتھ اکیلا آیا تھا وہ خود رچی کو ائرپورٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس نے حفاظت کے لیے موجود پولیس والوں کو چھٹی دیدی۔ اس کے خیال میں اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ رچی سامان جمع کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بیگ ال ورتھ کی کار کی ڈکی میں رکھوائے۔ ال ورتھ نے پوچھا۔ ”سارا سامان آ گیا ہے؟“

”ہاں...“ رچی کہتے ہوئے چونکا۔ ”نہیں، ایک بیگ رہ گیا ہے میں لاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ ال ورتھ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ رچی اندر چلا گیا۔ سگریٹ ختم ہوئی تو ال ورتھ چونکا۔ رچی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اب تک اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا اور سگریٹ پھینک کر جوتے سے اسے مسلا اور سڑک پار کر کے عمارت کی طرف بڑھا تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ یہ ایلس تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”رچی تیار ہے؟“

”ہاں۔“ ال ورتھ بولا۔ ”میں اسے ائرپورٹ چھوڑنے جا رہا ہوں۔ وہ اندر ہے۔“

”میں بھی آ رہی ہوں۔“ ایلس نے کہا۔ اسی لمحے عمارت کے اندر سے فائر کی آواز آئی۔ ”یہ... یہ کیا ہے؟“

ال ورتھ فکرمند ہو گیا اس نے پستول نکالتے ہوئے ایلس کو بتایا۔ ”فائر...... کسی نے عمارت میں فائر کیا ہے میں دیکھتا ہوں۔ تم ایمرجنسی کو کال کرو۔“

☆☆☆

ایلس نے ایمرجنسی کو کال کی تھی اور پھر کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ وہ رچی کی رہائش سے کچھ ہی دور تھی۔ دو منٹ بعد وہ ال ورتھ کی کار کے پیچھے رکی اور اسی لمحے اسے عمارت کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ وہ پستول نکالتے ہوئے اتری اور دوڑتے ہوئے دروازے تک آئی تھی۔ اس نے احتیاط سے اندر جھانکا تھا۔ سیڑھیوں سے آگے اسے کوئی فرش پر پڑا دکھائی دیا تھا۔ مگر نچلے ہال میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اندر آئی اور یہ دیکھ کر اسے صدمہ ہوا تھا کہ فرش پر ال ورتھ پڑا تھا۔ اس کے سینے میں دو سوراخ تھے اور ایک عین دل پر تھا، وہ مر چکا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ہال کا جائزہ لیا۔ ذرا آگے فرش پر خون کا ایک دھبا اور تھا لیکن رچی یا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی کہ اسے باہر سے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

”شٹ۔“ اس کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ وہ بھول گئی تھی کہ عمارت کا بغلی گلی میں بھی ایک دروازہ کھلتا تھا۔ وہ باہر نکلی اور اسی لمحے ایک سیاہ کار اس کے سامنے سے گزری۔ ڈرائیونگ سیٹ پر رچی تھا اور اس کے برابر میں وہی شخص بیٹھا تھا جسے ایلس نے آرٹ گیلری میں دیکھا تھا اور اس کی تصویر بھی لی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا تھا اور اس کا رخ رچی کی طرف تھا۔ وہ رچی کو یرغمال بنائے لے جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے رچی نے اسے بے بسی سے دیکھا تھا۔ ایلس اپنی کار کی طرف دوڑی۔ جب تک وہ کار گھما کر روانہ ہوتی دوسری کار سڑک سے مڑ چکی تھی۔ اس دوران میں پولیس کاروں کے سائرن کی آواز آنے لگی تھی۔ ایلس نے رفتار بڑھاتے ہوئے موبائل سے ایمرجنسی کو کال کی اور ال ورتھ کے بارے میں بتایا۔

”پولیس کو خبردار کر دو ہم ساؤتھ ویسٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ سیاہ رنگ کی کار ہے۔“

ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرنا مشکل تھا کیونکہ اگلی کار مسلسل مڑ رہی تھی اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس دوران میں ایک پولیس ہیلی کاپٹر نے سیاہ کار دیکھ لی تھی اور اب اس کے اوپر اڑ رہا تھا۔ ایلس نے موبائل رکھ دیا اور پوری توجہ سے ڈرائیو کرنے لگی۔ سیاہ کار اس سے کوئی سو گز آگے جا رہی تھی۔ اس کا رخ نیویارک کے مشہور برج کی طرف تھا۔ چند منٹ بعد وہ برج پر تھی۔ یہاں ٹریفک بے پناہ تھا مگر سیاہ کار خطرناک انداز میں اوورٹیکنگ کر رہی تھی۔ ایلس کے لیے تعاقب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ درمیان میں پل کی مرمت کا کام جاری تھا اور نیلے رنگ کے ڈرم رکھے تھے۔ اچانک کار ان ڈرموں کی طرف گھومی۔ وہ ڈرموں سے ٹکرائی۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا میں اچھلی اور پھر دو قلابازیاں کھا کر ایک کنکریٹ مکسر سے ٹکرائی تھی۔ تصادم شدید تھا۔ ایلس نے کار روکی اور اتر کر بھاگی۔ اس نے رچی کو کار سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا، قاتل ونڈ شیلڈ توڑ کر نصف باہر آ گیا تھا۔

”یہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔“ رچی نے چلا کر کہا اور کار میں گھس کر پستول نکال لیا اور اس سے پہلے کہ ایلس اسے روکتی اس نے ساکت پڑے قاتل پر کئی فائر کر دیے تھے۔ ایلس چلائی۔

”پستول پھینک دو۔“

رچی اس کی آواز پر چونکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کیے اور پستول نیچے پھینک دیا۔ اسی لمحے ایلس کی نظر کار سے ٹپکتے پیٹرول پر گئی اور اس نے آگ پکڑ لی تھی۔ ایلس بھاگی اور رچی کو لیتے ہوئی چند فٹ اونچی کنکریٹ کی دیوار کے دوسری طرف گری۔ اسی لمحے کار نے دھماکے سے آگ پکڑ لی۔ اگر رچی اپنی جگہ کھڑا رہتا تو یقیناً دھماکے کی زد میں آ جاتا۔ فضا میں پولیس سائرن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جلد ہی آگ بجھانے والا عملہ آ گیا اور اس نے چند منٹ کی جدوجہد کے بعد آگ پر قابو پا لیا تھا۔ رچی زخمی تھا اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ ایلس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں، کچھ لگا ہے۔“ وہ بولا پھر ایلس کا ماتھا چھوا۔ ”تمہیں بھی چوٹ آئی ہے۔ ایک منٹ رکو۔“ اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور بہت احتیاط اور نرمی سے ماتھے کا زخم صاف کرنے لگا۔ ایلس اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پا لیا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“

”میں آخری بیگ لینے اندر گیا تھا، یہ پہلے سے اندر موجود تھا۔ یہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے مزاحمت کی تو اس نے تشدد کیا، مجھے ڈرانے کے لیے ایک فائر بھی کیا۔ اتنے میں ال ورتھ اندر آیا تو اس نے اس پر دو فائر کیے اور پھر مجھے پستول کے زور پر دوسرے دروازے سے باہر لے آیا۔ اس نے اپنی کار میں بٹھایا اور ڈرائیو کرنے ... کا حکم دیا۔ میں اس کے آگے مجبور تھا۔ اسی وقت تم دروازے سے باہر آئیں جب یہ مجھے لے جا رہا تھا۔ تم اور پولیس پیچھے لگے تو مجھے اُمید ہوئی کہ شاید تم لوگ مجھے اس سے چھڑا لو لیکن اس نے مجھے دھمکی دی کہ جہاں میں نے کار روکی یہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ اس لیے مجھے اچانک ہی خیال آیا اور میں نے کار ڈرمز پر چڑھا دی۔ اس کی سیٹ بیلٹ کھلی تھی اور میری بندھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے میں بچ گیا۔“

”میرا خیال ہے وہ حادثے میں ہی مارا گیا تھا تم نے بلاوجہ اس پر گولیاں برسائیں۔“

پولیس آ گئی تھی۔ اس نے کار، قاتل کی لاش اور رچی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایلس کو ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر جانا تھا۔ اسے ابھی تک ال ورتھ کی موت کا دکھ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں کا دکھ یقیناً اس سے زیادہ ہی ہوگا۔ پولیس والے

رچی کو اس کے زخموں کی پروا کیے بغیر ہیڈ کوارٹر لے آئے تھے۔ ایلس کو غصہ آ گیا اس نے جان سے کہا۔ ''پہلے اسے اسپتال لے جانا چاہیے تھا۔''

''تمہیں اس کی کچھ زیادہ ہی فکر ہے۔'' جان سرد لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''مجھے ال ورتھ کا افسوس ہے۔'' ایلس نے کہا۔ ضروری کارروائی کے بعد وہ خود رچی کو اسپتال لے گئی جہاں اس کے بازو کے زخم پر ٹانکے لگے۔ حادثے کے دوران اسے بھی چوٹ آئی تھی۔ جب وہ اسپتال سے نکلے تو ایلس نے پوچھا۔

''تم کہاں رکو گے؟''

''شاید کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑے۔ ابھی مجھے اگلی فلائٹ بھی دیکھنا ہوگی۔''

ایلس ہچکچائی پھر اس نے کہہ دیا۔ ''تم میرے ساتھ کیوں نہیں رک جاتے۔ تمہارا سامان بھی ابھی پولیس کی تحویل میں ہے۔''

رچی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اگلی صبح ایلس بیدار ہوئی تو رچی اس کے برابر میں سو رہا تھا۔ وہ اتنا معصوم لگ رہا تھا کہ ایلس کو بے اختیار اس پر پیار آنے لگا۔ وہ اٹھ کر واش روم جانے لگی تھی کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ رسٹ کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے۔''

''موت کی وجہ؟''

''واضح نہیں ہے۔ سر پر شدید چوٹ بھی آئی ہے اور سر ہی پر گولی بھی لگی ہے دونوں میں سے کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔''

''حتمی رپورٹ کب آئے گی؟''

''دو دن میں اور مسز ریف لاش کی شناخت کرنے آ رہی ہے۔ تم بھی گیارہ بجے تک آ جانا۔''

''ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔'' ایلس نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ رچی جاگ گیا تھا اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ایلس بولی۔ ''مسز ریف لاش شناخت کرنے آ رہی ہے۔ مجھے جانا ہوگا، تم چلو گے؟''

''نہیں میں ذرا کام سے جاؤں گا۔'' رچی نے انکار کر دیا۔

وہ دونوں آرام سے تیار ہوئے۔ ناشتے کے بعد رچی رخصت ہو گیا تھا۔ ایلس گیارہ بجے سے ذرا پہلے اسپتال پہنچ گئی۔ مسز ریف آ گئی تھی لیکن اس سے پہلے ایلس نے لاش کا معائنہ کیا۔ وہ بری طرح جھلس گئی تھی چہرہ بھی تقریباً ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ''مسز ری
اسے کس طرح شناخت کرے گی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے شانے اچکائے۔

کچھ دیر میں رسٹ مسز ریف کو وہاں لایا۔ اس
تاثرات عجیب ہو رہے تھے وہ دکھی بھی تھی اور خوف زدہ بھی
ایلس سوچ رہی تھی کہ اسے خوف کس بات کا تھا۔ لاش چا
سے ڈھکی ہوئی تھی، مسز ریف نے مطالبہ کیا۔ ''اس
چہرے سے چادر ہٹاؤ۔''

ڈاکٹر نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ چہرہ دیکھ کر
ریف جھجکی تھی لیکن پھر ہمت کر کے اس کے پاس آئی۔ جا
نے عقب سے کہا۔ ''اسے چھونا مت۔''

مسز ریف نے برہمی سے اسے دیکھا۔ ''مجھے مت
مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ اگر یہ میرا بیٹا ہے تو اسے میں
شناخت کر سکتی ہوں۔''

جان چپ ہو گیا۔ مسز ریف نے ہمت کر کے لاش
دائیں آنکھ کا پپوٹا کھولا اور پھر اسے ذرا اوپر چڑھایا۔ وہ کچھ
اسے دیکھتی رہی پھر پپوٹا چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ ایلس
محسوس کیا اس بار اس کے تاثرات میں خوف نمایاں تھا۔ اس
نفی میں سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔ ''تم احمق لوگ...''

وہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ جان نے ہاتھ
... اور بولا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''

ایلس مسز ریف کے پیچھے لپکی۔ وہ تیز قدموں
لفٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اسے آوازیں دے رہی
لیکن مسز ریف ان سنی کر کے لفٹ تک پہنچی اور اس کا
دبا دیا۔ اتفاق سے فوراً ہی دروازہ کھل گیا جیسے لفٹ اسی
پر تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی اور اس نے گراؤنڈ فلور کا بٹن
جیسے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا کسی نے سرگوشی
کہا۔ ''مام...''

اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں پھیل
تھیں۔ پھر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''کرسٹن تم مجھے
کر سکتے ہو لیکن مجھے ڈرا نہیں سکتے، میں تمہاری ماں ہوں۔

☆☆☆

جب تک ایلس لفٹ تک آتی اس کا دروازہ بند
چکا تھا۔ دوسری لفٹ کا انتظار بیکار تھا۔ مسز ریف نکل
اور وہ ہر صورت اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس
کس بنا پر لاش کو شناخت کرنے سے انکار کیا تھا۔
سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ تیزی سے سیڑھیاں
ہوئے وہ پانچویں فلور سے تقریباً لفٹ کے ساتھ

اس کا دروازہ کھلنے سے پہلے وہ سامنے آ گئی تھی۔ دروازہ کھلا اور اس نے رچی کو اس حالت میں وہاں موجود پایا کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا اور مسز ریف اپنے ہی خون میں ڈوبی فرش پر پڑی تھی۔ رچی نے اسے دیکھا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ ''یہ ہمیشہ مجھے نظر انداز کرتی تھی ایسٹن کو مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔''

ایلس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے۔ رچی نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا اور لفٹ بیسمنٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اچانک ایلس کو ہوش آیا اور اس نے جلدی سے موبائل نکال کر رسٹ کو کال کی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے انداز میں بڑی مشکل سے اسے بتا پائی تھی کہ اصل قاتل رچی ہے اور اس نے اپنی ماں کو بھی قتل کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی رسٹ حرکت میں آیا تھا۔ وہ اور جان تیزی سے نیچے آئے تھے۔ لفٹ بیس منٹ میں رکی ہوئی تھی۔ خون کی لکیر نکل کر واشنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی اور وہاں رچی کا خون آلود لباس پڑا تھا لیکن وہ خود غائب تھا۔ اسپتال میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ دس منٹ کے اندر پولیس کی ڈھیروں نفری وہاں آ گئی تھی اور اس سارے علاقے میں رچی کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ ایلس شاک کی کیفیت میں تھی۔ رچی کی تلاش میں ناکامی پر جان اور رسٹ کا غصے سے برا حال تھا۔ انہیں بہر صورت اپنے باس کا قاتل درکار تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ ہیڈ کوارٹر میں رچی کا سامان کھنگال رہے تھے۔ لیکن اس میں ایسا کوئی کلیو نہیں ملا جس سے رچی کا سراغ لگ سکتا۔ وہ عیار آدمی ایک بار پھر سب کو جل دے کر نکل گیا تھا۔

دو دن بعد ایلس واپس واشنگٹن روانہ ہو گئی۔ وہاں اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کر سکی تھی اس لیے وہ استعفیٰ دے رہی ہے۔ استعفیٰ دے کر وہ اپنے آبائی علاقے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایلس کا تعلق میری لینڈ سے تھا۔ اس کا باپ ایک کسان تھا۔ اس کا فارم ہاؤس اب تک موجود تھا۔ لیکن کسی کے نہ ہونے سے ویران پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس فارم کو آباد کر سکتی تھی۔ اس کے استعفے کی خبر ٹی وی پر بھی آئی تھی اور اکثر نیوز چینلز نے کرسٹن سیریل کلر کیس کی تفصیلی رپورٹنگ کی تھی۔ اس کی تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں اور عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اگر اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو پولیس کو اطلاع دیں مگر کرسٹن عرف رچی سرے سے غائب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آٹھ مہینے بعد ایلس اپنے آبائی قصبے جیمز ٹاؤن کے میریا میڈیکل اسٹور میں داخل ہوئی۔ میریا رشتے میں اس کی دور کی پھوپھی لگتی تھی۔ وہ ایلس کو دیکھ کر مسکرائی۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''بہتر ہے۔'' ایلس جواباً مسکرائی۔ ''لیکن سردی جان نہیں چھوڑ رہی ہے۔''

''ہاں مارچ کا مہینا ہے اور برف ابھی تک جمی ہوئی ہے۔'' میریا نے دکان کے پاس مکان کی چھت پر جمی برف دیکھ کر کہا۔ ''آج ریڈیو پر بتا رہے تھے کہ مارچ کے آخر میں مزید برف باری کا امکان ہے۔''

''میرا سامان تیار ہے؟''

میریا نے اس کے سامنے ایک بڑا سا کارٹن رکھا۔ ''اس میں سب کچھ ہے لیکن تم ایک بار چیک کر لو ہو سکتا ہے کچھ میرے ذہن سے نکل گیا ہو۔ عمر بھی خاصی ہو گئی ہے۔''

ایلس نے کارٹن کھول کر چیزیں دیکھیں اور بولی۔ ''آنٹی تم اب بھی جوان ہو، سب موجود ہے۔''

وہ کارٹن اٹھا کر باہر اپنی پک اپ تک لائی۔ کارٹن فرنٹ سیٹ پر رکھ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کا فارم اور گھر جیمز ٹاؤن سے باہر تھا۔ آس پاس چند مکان اور فارم مزید تھے۔ شام قریب تھی اور آسمان سرمئی ہو رہا تھا۔ پک اپ مکان کے سامنے روک کر وہ اندر آئی۔ پتھر، لکڑی اور کنکریٹ سے بنا یہ دیہی طرز کا مکان اس کے باپ نے خود بنایا تھا۔ ایلس نے اپنی عمر کے ابتدائی اٹھارہ برس اسی گھر میں گزارے تھے۔ پھر وہ واشنگٹن یونیورسٹی چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو ایف بی آئی میں ملازمت کر لی۔ اسے بس چھٹیوں میں گھر آنے کا موقع ملتا تھا۔ مکان کے نچلے حصے میں ایک بڑا سا ہال نما لاؤنج، ایک بڑا کچن اور اس کے ساتھ ڈائننگ ایریا تھا۔ ایک کمرا اسٹڈی کے لیے تھا۔ یہاں اس کے باپ کی جمع کی ہوئی کتابیں موجود تھیں۔ اوپر دو بڑے بیڈ روم، باتھ رومز اور اسٹور تھا۔ مکان سینٹرلی ہیٹڈ تھا اس لیے اندر باہر کی سردی کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس نے بھاری بھرکم کوٹ اتارا تو اس کا بڑھا ہوا پیٹ نمایاں ہو گیا۔ وہ امید سے اور آخری دنوں سے تھی۔ وہ کارٹن لے کر اوپر آئی۔ کارٹن اس نے اسٹور میں رکھ دیا جہاں اس جیسے کئی کارٹن اور رکھے ہوئے تھے۔ وہ

تھکے ہوئے انداز میں بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی صحت ان آٹھ مہینے میں گری تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے رات کا کھانا کھایا اور تمام کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کرسٹن عرف رچی کا خوف اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی اور وہ باتھ روم سے ہو کر نیچے آئی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن پہلے اس نے کافی کا پانی رکھا اور لاؤنج میں آ کر ٹی وی آن کر کے خبریں دیکھنے لگی۔ موسم کی خبر یہ تھی کہ اگلے دو دن میں برف باری کا نیا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ خبریں دیکھتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ ابھی تک کیتلی نے سیٹی نہیں بجائی جبکہ پانی کھول جانا چاہیے تھا۔ وہ کچن میں آئی، کیتلی کے پاس آ کر اسے پتا چلا کہ چولہا تو بجھا ہوا تھا جبکہ وہ خود چولہا جلا کر گئی تھی گیس کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ سوئچ ہی بند تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹی تھی کہ کسی سے ٹکرائی پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی کیونکہ سامنے کرسٹن کھڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی پھر اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر کرسٹن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال تھام لیے اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ رویے کے برعکس اس کا لہجہ نرم تھا۔

”ایلس کیسی ہو؟“

”تم... تم۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

کرسٹن کی نظر اس کے ابھرے ہوئے پیٹ پر گئی۔ اس نے بہ دستور نرم لہجے میں کہا۔ ”اوہ، تم اُمید سے ہو... کیا یہ کرسٹن جونیئر ہے۔“

ایلس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں کسی کرسٹن کو نہیں جانتی، یہ رچی نیلسن کا بچہ ہے۔“

”رچی نیلسن کون ہے؟“ وہ بولا اور اچانک ایلس کے بال گھما کر اسے دھکا دیا۔ وہ فرش پر جا گری تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ وہ بہ مشکل کھڑی ہوئی اور ہاتھ پیچھے کر کے بہ ظاہر میز پکڑ لی لیکن اصل میں وہ اس کے نیچے کی سطح ٹٹول رہی تھی جہاں اس نے ٹیپ سے ایک تیز دھار خنجر باندھ رکھا تھا لیکن اس کی انگلیاں صرف ٹیپ سے لگی تھیں، وہاں خنجر نہیں تھا۔ کرسٹن نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں خنجر دبا ہوا تھا۔ ”شاید تم اسے تلاش کر رہی ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے اچانک خنجر پھینک کر مارا تو وہ ایلس کے پاس سے ہوتا ہوا عقب میں لکڑی کی دیوار میں جا گڑا۔ ایلس کے منہ سے چیخ نکلی۔ کرسٹن اس کی طرف آنے لگا۔ ”میز کے نیچے خنجر، باتھ روم میں پستول اور تکیے کے نیچے الیکٹرک وائزر یہ سب میرے ہی لیے تھے نا؟“ اس نے نزدیک آتے ہوئے اپنا ہاتھ ایلس کے نازک گلے پر رکھا، وہ جی جان سے کانپ رہی تھی۔ ”ان سب کو استعمال کرنے کے لیے طاقت چاہیے اور تم بہت کمزور ہو رہی ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اسے بے رحمی سے دھکا دیا اور وہ پیٹ کے بل فرش پر جا گری۔ اس بار اس کی چیخ میں کرب تھا۔ اسے چوٹ آئی تھی۔ اس سے اٹھا نہیں گیا تھا، کرسٹن سے بچنے کے لیے وہ گھسٹ کر آگے بڑھی۔ کرسٹن قریب آیا اور اس نے جھک کر اسے شانوں سے تھاما اور ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

”یہ بچہ کس کا ہے؟“

”کرسٹن ریف کا...“ ایلس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر نرمی آ گئی۔ ”گڈ... تم جان گئی ہو مجھے اپنی ذات کی نفی کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ میری ماں ساری عمر یہی کرتی آئی تھی۔ آخر میں اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔“

”تم... تم کیا چاہتے ہو؟“

کرسٹن نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ ”اس دنیا میں مجھے کسی سے دلی لگاؤ ہے تو وہ تم ہو۔ افسوس تم ایف بی آئی کی ایجنٹ تھیں۔ لیکن اب تم آزاد ہو۔ مجھے معلوم ہے تم مجھ سے محبت کرنے لگی تھیں۔ شاید اب نہیں کرتی ہو۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“

”یہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔“ ایلس نے ہمت کر کے کہا۔ ”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں پورے چھ مہینے سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ بہت کوشش اور وقت ضائع کر کے میں یہاں پہنچا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا تم ماں بننے والی ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ اس بچے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ایک بار پھر ایلس کو دھکا دیا اور وہ ڈائننگ ٹیبل سے جا ٹکرائی۔ کرسٹن کے رویے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ رحم کے موڈ میں نہیں تھا۔ درجنوں انسانوں کا سفاک قاتل ویسے ہی رحم سے نا آشنا تھا۔ ایلس نے کن انکھیوں سے نزدیک ہی رکھی قینچی کی طرف دیکھا اور بولی۔

”وہ شخص کون تھا جسے تم نے قربانی کا بکرا بنایا تھا؟“

”جیسن لیگر۔“ کرسٹن نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ بے چارہ مصور تھا۔ اسی نے وہ ساری پینٹنگز بنائی تھیں جو میں نے اپنے نام سے آرٹ گیلری میں پیش کی تھیں۔ میں اس کی شخصیت نہیں اپنا سکا تھا کیونکہ اسے بہت سارے لوگ جانتے تھے لیکن اس کا فن ضرور حاصل کر لیا تھا اور وہ اسی کے لیے میرے پیچھے آیا تھا۔“

”تم اسے پہلے ہی قتل کر چکے تھے؟“ ایلس گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے سے تکلیف جھلک رہی تھی۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آیا تھا کہ وہ کار کے حادثے سے پہلے مر چکا تھا۔“

”ہاں، کار میں بٹھانے سے پہلے میں اسے شوٹ کر چکا تھا جب تم نے دیکھا تو ایک لاش پستول ہاتھ میں لیے ہوئے تھی۔“

”پھر تم نے چالاکی سے حادثے کا انتظام کیا، تم سب پہلے سے سوچ چکے تھے۔ آخر میں تم نے اس پر گولیاں برسا کر پہلی گولی کا نشان بھی اسی فائرنگ میں شامل کر دیا۔“

کرسٹن نے سر ہلایا۔ ”میں کامیاب رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا میری ماں مجھے شناخت کر سکتی ہے وہ اسے میری لاش تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی کیونکہ...“ اس نے دائیں آنکھ کی پتلی اوپر کی تو ڈیلے کے اندر ایک سیاہ تل نما نشان نظر نہ آیا۔ ”یہ میری نشانی ہے۔“

”اس لیے تم نے اسے قتل کر دیا۔“ ایلس نے آہستہ سے ہاتھ قینچی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، وہ میرے سر پر خطرے کی تلوار کی طرح لٹک رہی تھی میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا مناسب سمجھا۔“ کرسٹن بولا۔

ایلس نے تیزی دکھائی اور قینچی اٹھا لی اس کا خیال تھا کہ کرسٹن اس پر جھپٹے گا، اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ سکون سے اپنی جگہ کھڑا رہا، ایلس نے قینچی کا رخ اس کی طرف کیا۔ ”میرے پاس مت آنا۔“

”میں تو اپنی جگہ کھڑا ہوں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”تم مجھے اب دھوکا نہیں دے سکتے۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے قتل کرنے آئے ہو۔“ ایلس نے کہتے ہوئے قینچی گھمائی۔ کرسٹن اچھل کر پیچھے ہٹا۔

”اے... اے یہ کیا کر رہی ہو۔ احتیاط سے، قینچی لگ جائے گی۔“

ایلس اس پر وار کر رہی تھی۔ کرسٹن بچ رہا تھا پھر اس نے ایلس کا قینچی والا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھما کر عقب سے جکڑ لیا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن کرسٹن کی مضبوط گرفت کے آگے بے بس تھی۔ قینچی بہ دستور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ کرسٹن نے اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ”آرام سے ڈیئر، آرام سے... میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں قتل کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔“

رفتہ رفتہ ایلس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ کرسٹن اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ”تب تم کیوں آئے ہو؟“

”میں اس بچے کو قتل کرنے آیا ہوں۔“ کرسٹن نے کہا اور ایلس کا قینچی والا ہاتھ گھما کر خود اس کے پیٹ میں قینچی گھونپ دی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ کرسٹن نے سرگوشی کی۔ ”میں اسے مارنے آیا ہوں کیونکہ میں اس دنیا میں اپنے جیسا کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔“

ایلس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں، وہ آگے جھکی تھی۔ کرسٹن نے اسے چھوڑ دیا اور ذرا پیچھے ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں اچھا خاصا گیسولین ہے مجھے اُمید ہے فائر بریگیڈ کے آنے تک یہاں سوائے راکھ کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔“

اچانک ایلس نے اپنے پیٹ سے قینچی نکالتے ہوئے گھوم کر کرسٹن کے سینے میں بائیں طرف دل سے اوپر گھونپ دی۔ وار پوری قوت سے کیا گیا تھا اور قینچی دستے تک اندر اتر گئی تھی۔ کرسٹن کی آنکھیں حیرت اور تکلیف سے پھیل گئی تھیں۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا پھر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ ایلس نے اس کے سینے پر لات ماری تو وہ فرش پر چت ہو گیا۔ کرسٹن ہکلایا۔ ”یہ... یہ کیا ہے؟“

ایلس نے اپنی ڈھیلی فراک کے اندر ہاتھ ڈالا اور مصنوعی پیٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ ”یہ ہے۔“

کرسٹن کی بجھتی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”تم پریگننٹ نہیں تھیں۔ تم... نے دھوکا دیا۔“

ایلس اس کی طرف جھکی۔ ”ہاں، تم جیسے شخص کو دھوکا دینا ہی ٹھیک تھا۔ میں آٹھ مہینے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی تھی اور یہ وقت میں نے بہت مشکل اور صبر سے گزارا۔“

قینچی نے کرسٹن کی شریان کاٹ دی تھی اسے مرنے میں ایک منٹ لگا تھا۔ اب تک ایلس مسکرا رہی تھی لیکن اس کے مرتے ہی اس کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ اس نے کچن کی دیوار پر لگا فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا، رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”جان، میں بات کر رہی ہوں... سب پلان کے مطابق ہوا... ہاں وہ زندہ نہیں ہے۔“

کال کاٹ کر وہ کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ چند لمحے کرسٹن کو دیکھتی رہی پھر اس نے پولیس کا نمبر ملایا تھا۔

* * *

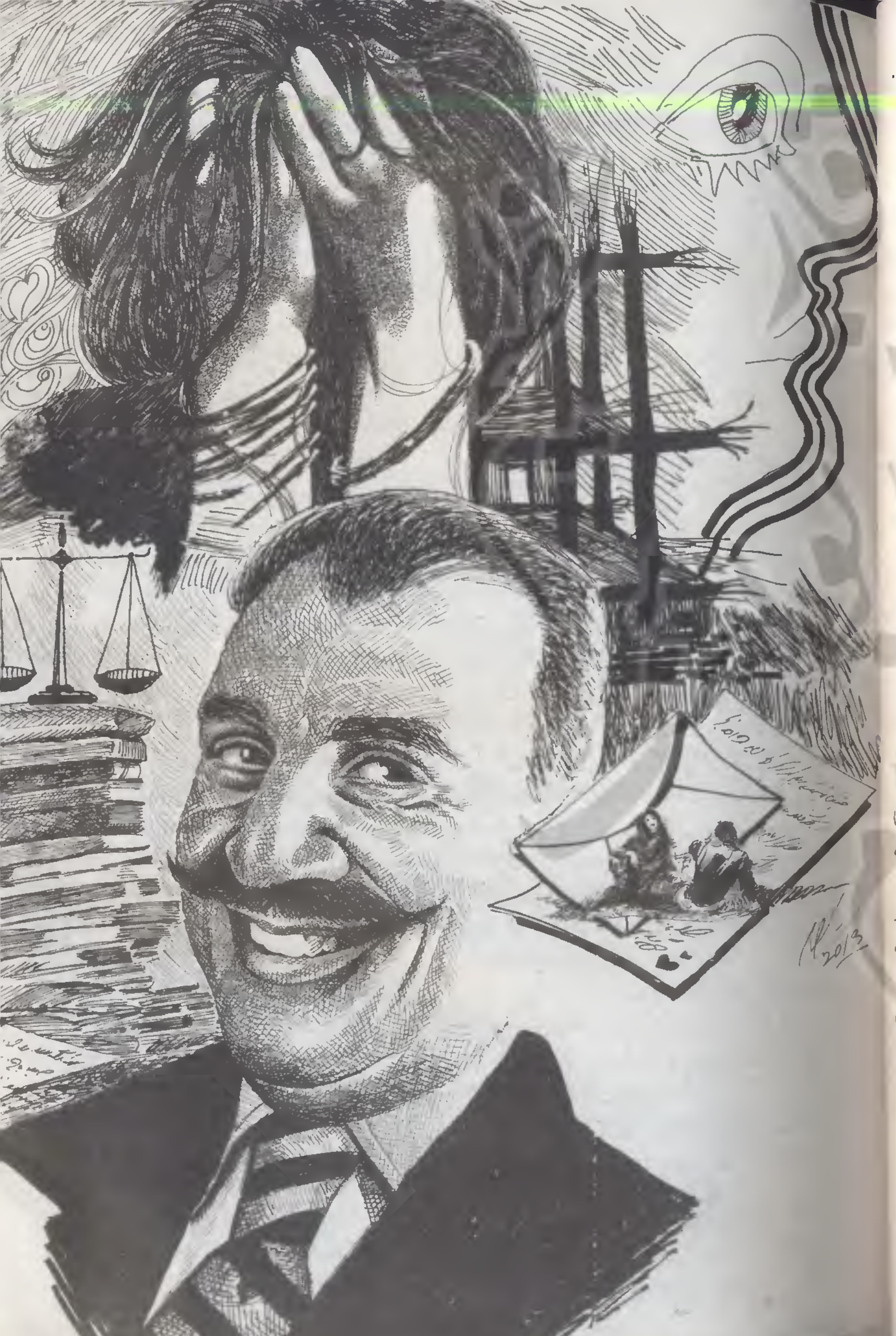

منہ زور

مرزا امجد بیگ

ہر چیز اپنی حد میں اچھی لگتی ہے اور جو حد سے گزر جانے کو کوئی ہنر سمجھتے ہیں کہیں نہ کہیں نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ فارمولا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا... محبت تو بے شمار لوگ کرتے ہیں لیکن رسوائیاں ہر ایک کا دامن داغدار نہیں کرتیں۔ جبکہ یہاں تو گویا موقع کی تاک میں رہنے والے ہوس پرستوں کا بازار گرم تھا، ایسے میں اگر کسی کا گھر جل کر خاکستر ہو بھی گیا تو کیا ہوا... البتہ جلتی آگ کو بجھانے کے لیے مرزا امجد بیگ جیسے لوگ کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتے ہیں۔ یہاں بھی دلائل کی برسات نے بھڑکتے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

محبت کی راکھ میں
سلگتے جذبات کی
کارفرمائیاں

منگل کی شام میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میری سیکریٹری فوزیہ نے بہ ذریعۂ انٹرکام مجھے اطلاع دی۔ ''سر! زیب النسا آئی ہیں......!''

''کون زیب النسا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''سر! وہ جو پہلے بھی دو تین بار آپ کا پوچھ کر گئی ہیں۔'' فوزیہ نے بتایا۔

''اوہ...... اچھا وہ۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دو۔''

آج جب میں عدالتی بکھیڑوں سے نمٹ نمٹا کر اپنے آفس آیا تو میری سیکریٹری فوزیہ نے مجھے بتایا تھا کہ کورنگی سے زیب النسا نامی کوئی عورت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے کچھ دیر میرا انتظار کیا، پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر کہیں چلی گئی تھی اور وہ اب آئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد زیب النسا میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بائیس تئیس سال کی ایک دبلی پتلی لڑکی بھی تھی۔ فوزیہ یا تو مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی یا پھر ہو سکتا ہے، پہلے پھیرے میں زیب النسا اکیلی ہی آئی ہو......

میں نے انہیں بٹھایا اور رسمی علیک سلیک کے بعد زیب النسا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی، فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

زیب النسا کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک عام سی گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ اس کے ہمراہ آنے والی لڑکی کے نقش و نگار بڑی حد تک زیب النسا سے مشابہت رکھتے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ زیب النسا کی بیٹی ہو سکتی تھی۔

''وکیل صاحب! عباسی صاحب نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' اس نے پریشانی بھرے انداز میں کہا۔ پھر وہ میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری بیٹی ہے، نورین!''

میں نے نورین کی طرف دیکھتے ہوئے زیب النسا سے پوچھا۔ ’’آپ کون سے عباسی صاحب کا تذکرہ کر رہی ہیں؟‘‘

’’خورشید عباسی صاحب۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’وہ جو اخبار میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ آپ ہمارا مسئلہ حل کر دیں گے۔‘‘

مجھے فوراً یاد آ گیا، وہ خاتون کس عباسی کا ذکر کر رہی تھی۔ خورشید عباسی صاحب ایک سینئر صحافی تھے اور ان کی رہائش بھی کورنگی ہی کے علاقے میں تھی۔ خورشید عباسی سے میری بہت پرانی یاد اللہ تھی۔

میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’آپ کا مسئلہ کیا ہے؟‘‘

’’مسئلہ دراصل کاشف کا ہے......!‘‘ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

’’کاشف کون؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’کاشف محمود میرے بیٹے کا نام ہے جناب!‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’کاشف کو کیا ہو گیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کاشف کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔‘‘ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

’’کس الزام میں......؟‘‘ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

’’کاشف پر پولیس نے الزام عائد کیا ہے کہ اس نے نادرہ کو قتل کیا ہے۔‘‘ وہ روہانسی ہو گئی۔ ’’وکیل صاحب، میں جانتی ہوں، کاشف اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کی گرفتاری کے پیچھے مجھے کوئی گہری سازش نظر آ رہی ہے......‘‘

’’ہوں......‘‘ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ’’یہ نادرہ کون تھی اور آپ کے بیٹے کاشف سے اس کا کیا کنکشن تھا؟‘‘

’’نادرہ......‘‘ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بتانے لگی۔ ’’نادرہ بھی کورنگی ہی میں رہتی تھی۔ ہم سے دو گلیاں چھوڑ کر اس کا گھر ہے اور جہاں تک کاشف سے اس کے کنکشن کا تعلق ہے تو......‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

’’کاشف، نادرہ کو پسند کرتا تھا......‘‘

’’یعنی یہ محبت والا معاملہ تھا؟‘‘

’’کچھ ایسا ہی سمجھ لیں وکیل صاحب۔‘‘ زیب النسا اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

’’اگر آپ کا بیٹا مقتولہ نادرہ سے محبت کرتا تھا تو پھر اسے قتل کیسے کر سکتا ہے؟‘‘ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’جناب! میں تو پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوں کہ کاشف ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔‘‘ وہ بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’یا تو پولیس کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر کاشف کو اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میرا بیٹا بالکل بے گناہ ہے......‘‘

’’پولیس کی غلط اور خوش فہمیاں تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’البتہ کسی سازش کے ذریعے پھنسانے والی بات کسی خفیہ دشمنی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ آپ کی نظر میں کاشف کا دشمن کون شخص ہو سکتا ہے؟‘‘

’’کوئی نہیں جی۔‘‘ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’آج تک کسی سے اس کا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ کام سے کام رکھنے والا بچہ ہے وکیل صاحب۔ صبح ڈیوٹی پر جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے۔‘‘

میرے استفسار پر زیب النسا نے بتایا کہ کاشف صدر کے علاقے میں واقع جیولر کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ وہ انگوٹھیاں وغیرہ بنانے کا ماہر کاریگر تھا۔ اس کی ڈیوٹی دن کے گیارہ بجے سے شام سات بجے تک ہوتی تھی۔ وہ گھر کا واحد کفیل بھی تھا یا پھر اس کے مرحوم والد کی پینشن کی مخصوص رقم آتی تھی۔ کاشف کا باپ افتخار حسین ایک سرکاری محکمے سے ریٹائر ہوا تھا اور ریٹائرمنٹ کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ صرف تین افراد کی فیملی تھی۔ کاشف، اس کی بہن نورین اور ان کی والدہ زیب النسا، افتخار حسین نے دورانِ ملازمت میں سب سے اچھا کام یہ کیا تھا کہ ایک چھوٹا سا ذاتی گھر بنا لیا تھا جو ایک پلس پوائنٹ تھا۔

میں نے زیب النسا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’کیا نادرہ کے گھر والوں کو اس عشقیہ معاملے کی خبر تھی؟‘‘

’’جی...... یہ معاملہ کوئی چھپا ہوا نہیں تھا۔‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

’’مقتولہ نادرہ کے گھر والوں کی کاشف کے بارے میں کیا رائے تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’میرا اشارہ نادرہ اور کاشف کے معاملات محبت کی طرف ہے......‘‘

’’وہ لوگ کاشف کو پسند نہیں کرتے تھے......‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’نادرہ، کاشف کے ساتھ سنجیدہ تھی؟‘‘

’’جی بالکل!‘‘ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ’’اور یہی بات تو نادرہ کے گھر والوں کو پسند نہیں تھی اسی لیے انہوں نے......‘‘

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ’’اسی لیے انہوں نے کیا......؟‘‘

’’اسی لیے انہوں نے نادرہ کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا تھا۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’ایک ماہ بعد نادرہ اور فیصل کی شادی ہونے والی تھی۔‘‘ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھہری پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔

’’فیصل، نادرہ کا کزن ہے۔ وہ لوگ ادھر لالوکھیت (لیاقت آباد) میں رہتے ہیں۔ نادرہ، فیصل کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اس رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن گھر والوں نے زبردستی پہلے اس کی منگنی اور بعد میں شادی کی تاریخ پکی کر دی تھی۔‘‘

’’مقتولہ نادرہ کی شادی اس کے کزن فیصل سے ہونے والی تھی اور مقتول، آپ کے بیٹے کاشف سے محبت کرتی تھی۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’اور شادی سے ایک ماہ پہلے نادرہ کا قتل ہو گیا۔ الزام آپ کے بیٹے کے سر ہے...... نادرہ کو کب اور کہاں قتل کیا گیا ہے؟‘‘

’’ہمارے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر، ایک زیرِ تعمیر عمارت ہے۔ نادرہ کی لاش اسی عمارت میں سے ملی ہے۔‘‘ زیب النسا نے جواب میں بتایا۔ ’’اسے گزشتہ رات کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے......‘‘

’’نادرہ کا گھر آپ کے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جائے وقوعہ یعنی وہ زیرِ تعمیر عمارت بھی نادرہ کے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر ہے۔‘‘ میں نے سوالیہ انداز میں زیب النسا کی طرف دیکھا۔ ’’اگر مذکورہ عمارت میں سے نادرہ کی لاش دریافت ہوئی ہے تو اس کے قتل کے الزام میں آپ کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا گیا......؟‘‘

’’یہ سب کارروائی صوفیہ کے بیان پر کی گئی ہے وکیل صاحب!‘‘ نورین نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ’’نادرہ کی لاش ملنے پر جب پولیس موقع پر پہنچی تو اس نے نادرہ کے گھر والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ صوفیہ نے پولیس کو جو بیان دیا اس کی روشنی میں آج دوپہر میں بھائی کو دکان پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ ہمیں سہ پہر میں گرفتاری والے اس واقعے کی خبر ہوئی۔ ہم جو بھاگ دوڑ کر سکتے تھے وہ کی، پھر عباسی صاحب نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا اور ہم آپ کے پاس آ گئے......‘‘

نورین ایک ہی سانس میں بہت کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا ’’یہ صوفیہ کون ہے؟‘‘

’’صوفیہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے وکیل صاحب!‘‘ نورین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ’’اس کا گھر، ہمارے گھر اور زیرِ تعمیر عمارت کے بیچ میں ہے اور یہ صوفیہ، نادرہ کی بہت گہری دوست ہے۔ نادرہ اکثر صوفیہ سے ملنے اس کے گھر آتی رہتی تھی۔‘‘

’’ہوں......!‘‘ میں نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

’’صوفیہ نے پولیس والوں کو بتایا ہے کہ نادرہ اور کاشف اکثر رات کی تاریکی میں اس زیرِ تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔‘‘ زیب النسا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ’’اس کے اسی بیان پر پولیس والوں نے ہمارا دروازہ بجایا۔ ہم سے نادرہ کے قتل کے بارے میں سوالات کیے۔ جب ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو وہ سیدھے کاشف کی دکان پر پہنچے اور اسے نادرہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کاشف کی گرفتاری کے بارے میں دکان والوں نے سہ پہر میں فون کر کے ہمیں بتایا اور ہم ماں بیٹی پریشانی میں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے بالآخر آپ تک پہنچ گئے ہیں۔‘‘

’’اس کے علاوہ آپ اس واقعے کے بارے میں اور کیا جانتی ہیں؟‘‘ میں نے قلم کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے سوال کیا۔

’’ہمیں جو کچھ معلوم تھا وہ آپ کو بتا دیا۔‘‘ زیب النسا بڑی رسان سے بولی۔ ’’اس کے علاوہ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کاشف قاتل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو نادرہ سے محبت کرتا تھا، اس کی جان کیسے لے سکتا ہے۔‘‘

ایک بیٹے کے لیے اس کی ماں کے جذبات کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن عدالت جذبات و احساسات کے بجائے ٹھوس ثبوت اور منطقی دلائل کو اہمیت دیتی ہے لہٰذا میں نے توجہ سے زیب النسا کی بات سنی اور سوال کیا۔

’’نادرہ کی فیصل سے منگنی ہو جانے پر کاشف کا ردعمل کیا تھا؟‘‘

’’اسے اس منگنی اور بعد ازاں شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کا دکھ ہوا تھا۔‘‘ زیب النسا نے جواب دیا۔ ’’وہ بہت ہی اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔‘‘

’’اور نادرہ کی کیا کیفیت تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ظاہر ہے جناب...... اسے بھی یہ شادی پسند نہیں تھی۔‘‘ زیب النسا نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ ’’وہ کاشف کو چاہتی تھی اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرنے کی خواہاں تھی

لیکن بے چاری گھر والوں کی مرضی کے سامنے مجبور تھی۔‘‘

’’کیا کاشف نے نادرہ کو کسی جرأت مندانہ اقدام کے لیے اکسانے کی کوشش نہیں کی تھی؟‘‘ میں نے معنی خیز انداز میں باری باری دونوں کی جانب دیکھا۔

’’میں کچھ سمجھی نہیں وکیل صاحب!‘‘ زیب النسا نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

نورین میرا اشارہ بہ خوبی سمجھ گئی تھی، جلدی سے بولی۔ ’’بھائی بہت ہی صلح پسند انسان ہیں۔ ان کے اندر کسی انقلابی اقدام کی جرأت نظر نہیں آتی۔ اس موقع پر انہوں نے نادرہ ہی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جو قسمت میں لکھا ہوگا، ہونا تو وہی ہے۔ کسی احتجاج یا واویلے کا کوئی فائدہ نہیں......!‘‘

’’اگر کاشف اس انداز میں سوچنے کا عادی ہے تو پھر واقعی وہ انتہائی امن پسند اور صلح جو انسان ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’عرف عام میں فی زمانہ ایسے لوگوں کو بے وقوف یا بزدل بھی کہا جاتا ہے۔‘‘ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ورنہ ایسے مواقع پر تو عموماً لڑکا اسٹینڈ لیتا ہے اور اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ کاشف نے نادرہ کو یہ سمجھایا کہ اس کے گھر والے جہاں چاہتے ہیں، وہ چپ چاپ شادی کر لے...... ہیں نا؟‘‘

میں نے سوالیہ نظر سے نورین کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

میں نے زیب النسا سے سوال کیا۔ ’’گزشتہ رات کاشف کتنے بجے گھر آیا تھا؟‘‘

’’یہی کوئی آٹھ بجے......‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’دکان سے اس کی چھٹی سات بجے تک ہو جاتی ہے۔ وہ ساڑھے سات یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے گھر پہنچ جاتا ہے۔‘‘

’’کاشف گزشتہ رات آٹھ بجے گھر آ گیا تھا۔‘‘ میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر زیب النسا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’اس کے بعد وہ گھر سے باہر تو نہیں گیا تھا؟‘‘

’’جی گیا تھا......‘‘ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ ’’کہاں گیا تھا؟‘‘

’’اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’یہ اس کا معمول ہے کہ دکان سے آنے کے بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہوتا ہے، پھر ہم لوگ مل کر ایک ساتھ رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ محلے کے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے کے لیے گھر سے نکل جاتا ہے۔‘‘

’’اور اس کی واپسی کب تک ہوتی ہے؟‘‘

’’وہ دس ساڑھے دس بجے تک واپس آ جاتا ہے۔‘‘

’’کیا گزشتہ رات بھی وہ دس، ساڑھے دس بجے تک واپس آ گیا تھا؟‘‘

’’میں بہت تھکی ہوئی تھی۔‘‘ زیب النسا نے جواب دیا۔ ’’اس لیے رات کے کھانے کے فوراً بعد سو گئی تھی۔‘‘ پھر اس نے نورین کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ’’پچھلی رات وہ کب واپس آیا تھا، تمہیں پتا ہوگا......‘‘

’’بھائی آدھی رات کو واپس آئے تھے۔‘‘ نورین نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ’’میں اس وقت جاگ رہی تھی اور میں نے ہی ان کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔‘‘

’’کیا آپ نے بھائی سے پوچھا تھا کہ وہ اتنی رات تک کہاں تھا؟‘‘ میں نے نورین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ’’روٹین کے مطابق تو وہ دس، ساڑھے دس بجے تک واپس آ جایا کرتا تھا۔‘‘

’’جی نہیں۔‘‘ نورین نے نفی میں گردن ہلائی۔ ’’میں نے اس بارے میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔‘‘

میں نے زیب النسا سے پوچھا۔ ’’کیا آپ کاشف کے ان دوستوں کو گواہی کے لیے آمادہ کر سکتی ہیں، گزشتہ رات جن کے ساتھ وہ گپ شپ کر رہا تھا؟‘‘

’’جی...... میں یہ کام کر لوں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے......!‘‘ میں نے مطمئن انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ’’کاشف کو کس تھانے کی حوالات میں رکھا گیا ہے؟‘‘

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

’’کیا آپ لوگ کاشف سے ملاقات کے لیے تھانے گئی تھیں؟‘‘

’’گئے تھے...... مگر پولیس والوں نے ہمیں اس سے ملنے نہیں دیا۔‘‘

’’انہوں نے کیا کہا تھا؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔

’’وہ کہتے ہیں، کل صبح کاشف کو عدالت میں پیش کیا جائے گا تو وہاں جس کو ملنا ہو، اس سے مل لے......‘‘ زیب النسا نے جواب دیا۔

میں نے شفاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’دیکھیں خاتون! میں ایک بات واضح کر دوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں، میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔ آگے اللہ کو جو بھی منظور ہو......!‘‘

’’بہت بہت شکریہ وکیل صاحب......!‘‘ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

اس کے بعد میں نے زیب النسا سے اپنی فیس وصول کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’میں آج رات ہی کسی وقت تھانے جا کر کاشف سے ملاقات کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے کوئی نئی بات پتا چل جائے۔ اب ہماری ملاقات کل صبح عدالت ہی میں ہوگی۔‘‘

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے، اپنی بیٹی کے ساتھ میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

XXX

بعض قارئین کو اس بات پر اعتراض ہے کہ میں اپنے آفس کے چیمبر کو ہی عدالت کا کمرا بنا لیتا ہوں۔ جو بھی شخص کلائنٹ کی حیثیت سے میرے پاس آتا ہے، میں اس پر ہی جرح شروع کر کے درجنوں سوالات پوچھ ڈالتا ہوں...... تو اس سلسلے میں وضاحتی عرض کرتا چلوں کہ ہر شخص کا اپنا ایک اسٹائل ہوتا ہے، کام کرنے کا۔ سو، میرا بھی ہے، چونکہ یہ دوسرے وکلا سے بہت مختلف ہے، اس لیے بھی لوگوں کو عجیب سا لگتا ہے۔

اللہ کا مجھ پر لاکھ لاکھ کرم رہا ہے کہ اپرنٹس شپ کے زمانے ہی سے میرے پاس کلائنٹس کی کبھی کمی نہیں رہی لہٰذا میں ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کا کیس نہیں پکڑتا۔ جب تک میں خود اپنے کلائنٹ سے مطمئن نہ ہو جاؤں، میں اس کا کیس ہاتھ میں نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کسی بے گناہ کو سزا دلوائی ہے اور نہ ہی کوئی گناہ گار میری وکالت کے نتیجے میں بری ہوا ہے۔ میں اس احسان کے لیے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے۔

آفس کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں کاشف سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی کار کو تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ پارک کیا اور بڑے سکون کے ساتھ ٹہلتے ہوئے انچارج صاحب کے کمرے تک رسائی حاصل کر لی۔

تھانہ انچارج اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ مذکورہ کمرے میں بیٹھے ایک اے ایس آئی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

’’انچارج صاحب کہاں ہیں؟‘‘

جواب دینے سے پہلے اے ایس آئی نے سرتاپا گہری نظر سے میرا جائزہ لیا پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ’’آپ کون...... اور انچارج صاحب سے آپ کو کیا کام ہے؟‘‘

’’میرا نام امجد ہے......!‘‘ میں نے دانستہ اپنا ادھورا تعارف کرایا۔ ’’اور کام تو میں انچارج صاحب ہی کو بتاؤں گا۔‘‘

’’انچارج صاحب اس وقت راؤنڈ پر ہیں۔‘‘ وہ سرسری لہجے میں بولا۔ ’’ان سے ملنا ہے تو رات میں کسی وقت آ جائیں......‘‘

مجھے تفریح کی سوجھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’تو آپ کے خیال میں اس وقت دن ہے......؟‘‘

اس نے خفگی آمیز نظر سے مجھے گھورا اور بولا۔ ’’میرا مطلب تھا، جب انچارج صاحب تھانے میں موجود ہوں، آپ اس وقت آ جائیں......‘‘

’’جب تک تو بہت دیر ہو جائے گی......!‘‘ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

’’کیا مطلب ہے آپ کا؟‘‘ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ’’کس بات کی دیر ہو جائے گی......‘‘

’’کاشف سے ملاقات میں دیر ہو جائے گی۔‘‘ میں نے سنجیدگی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

’’کاشف!‘‘ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ’’کون کاشف......؟‘‘

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ’’وہ نوجوان جسے آپ لوگوں نے آج سہ پہر دو بجے صدر میں واقع ایک جیولر کی دکان سے گرفتار کیا ہے...... قتل کے الزام میں۔‘‘

’’آ...... آپ اس ملزم سے نہیں مل سکتے۔‘‘ وہ انتہائی روکھے لہجے میں بولا۔

’’میں کاشف کا وکیل ہوں، مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’آپ مجھے ملزم سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔‘‘

یہ سنتے ہی کہ میں ایک وکیل ہوں وہ بے حد محتاط ہو گیا اور خاصے جارحانہ لہجے میں بولا۔ ’’آپ جو کوئی بھی ہیں، رات میں آ جائیں جب انچارج صاحب تھانے میں موجود ہوں۔ ان کی اجازت نہیں ہے۔‘‘

میں نے میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’اجازت کا مسئلہ بھی ابھی حل کر لیتے ہیں۔‘‘

وہ گڑبڑا گیا۔ ’’آپ انچارج صاحب کو فون کریں گے......‘‘

’’نہیں......!‘‘ میں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

’’پھر......؟‘‘ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''میں آپ کے انچارج صاحب کے انچارج صاحب کو فون کروں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس مسئلے کو آئی جی صاحب ہی حل کریں گے۔''

''او جناب...... یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔'' اس نے میرے ہاتھ سے ریسیور جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو حوالاتی سے ملنا ہے، مل لیں...... اللہ اللہ، خیر سلا......!'

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''واقعی، آئی جی صاحب کی بڑی پاور ہے۔ فون کرنے سے پہلے ہی میرا مسئلہ حل ہوگیا۔''

اے ایس آئی نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور دروازے کی جانب منہ کرکے آواز لگائی۔ ''خادم حسین......!''

اگلے ہی لمحے ایک کانسٹیبل کمرے کے اندر حاضر ہوگیا۔ یقیناً وہ خادم حسین ہی تھا۔ اے ایس آئی نے مذکورہ کانسٹیبل سے کہا۔

''خادم حسین...... امجد صاحب کو اس حوالاتی کے پاس لے جاؤ جسے آج دن میں قتل کے الزام میں گرفتار کرکے تھانے لایا گیا ہے۔''

خادم حسین نے اثبات میں سر ہلایا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں کاشف کے سامنے کھڑا تھا۔ آہنی سلاخوں کی دوسری جانب وہ حوالات کی برہنہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کاشف کی عمر ستائیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند شخص تھا۔ اسے بلاشبہ وجیہہ وشکیل کہا جاسکتا تھا تاہم اس وقت وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں، اکڑوں بیٹھا اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے نگاہ اٹھائی پھر وہ کانسٹیبل خادم حسین کی جانب سوالیہ انداز میں تکنے لگا۔ کانسٹیبل نے اس سے کہا۔

''تمہاری ملاقات آئی ہے۔ ان سے بات کرو......''

ظاہر ہے، وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس سے پہلے ہمارا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ فرش سے اٹھا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد چلتے ہوئے آہنی سلاخوں کے قریب آگیا۔ میں نے گردن گھما کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ ہپ پاکٹ کی طرف لے جاتے ہوئے اس سے کہا۔

''خادم حسین! سنا ہے، آج کل بہت مہنگائی ہوگئی ہے......؟''

''جی صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''د چار سے چھ روپے لیٹر اور گوشت آٹھ سے دس روپے ہوگیا ہے۔ باقی چیزوں کا بھی کچھ نہ پوچھیں جناب......!''

میں نے جیب میں سے بٹوا برآمد کیا اور بٹوے سے پچاس کا ایک کرارا سا نوٹ نکال کر اس کی طر بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خادم حسین! یہ تمہارا انعام ہے، رکھ لو۔ یہ حوالاتی سے دس منٹ تک تنہائی میں بات کرنا چا ہوں۔ اتنی دیر میں تم باہر گھوم پھر آؤ اور ایک کڑک دودھ پتی بھی پی لینا......''

اس نے خوش ہوکر میرے ہاتھ سے پچاس کا نو پکڑ لیا اور جانے کے لیے پلٹا۔ میں کانسٹیبل کی جانب مطمئن ہوکر کاشف کی جانب متوجہ ہوگیا اور اپنا تعار کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہار والدہ نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں ا مصیبت سے نجات دلاؤں گا جس میں اس وقت تم گر ہو لیکن......''

اس نے تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''لیک کیا وکیل صاحب......؟''

''لیکن یہ کہ...... میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، تم ا سچا اور سیدھا جواب دو گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر ز دیتے ہوئے کہا۔

''جی...... بالکل......!'' وہ جلدی سے اثبات م گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنے بریف کیس میں سے چند کاغذات نکا کر اس کی جانب بڑھائے اور مخصوص مقامات کی نشاند کرکے اس سے دستخط کرنے کے لیے کہا۔ ان کاغذات م وکالت نامہ اور درخواست ضمانت سرفہرست تھیں۔

جب اس نے میری ہدایت کے مطابق دستخط کرد تو میں نے وہ کاغذات واپس بریف کیس میں رکھ دیے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھ

''کاشف مجھے بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے......؟''

''اصل معاملہ......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بو ''اصل معاملہ یہ ہے جناب کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نادرہ کو قتل نہیں کیا......''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے تائیدی اند میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے نادرہ کو قتل کیا ہوتا تو میں تمہارا کیس ہرگز ہرگز نہیں لیتا......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب تم نادرہ کے قاتل نہیں ہو تو پھر پولیس نے کس بنیاد پر تمہیں اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟''

''پولیس والوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے جناب۔'' وہ بیزاری سے سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اور ان کا دماغ صوفیہ نے خراب کیا ہے۔''

''یہ صوفیہ وہی لڑکی ہے نا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جو نادرہ کی رازدار سہیلی ہے۔ وہ تمہارے اور نادرہ کے عشقیہ معاملات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسی صوفیہ نے پولیس کو بتایا ہے کہ تم، نادرہ سے زیرِ تعمیر عمارت میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟''

''جی ہاں...... یہ ساری آگ اسی صوفیہ کی لگائی ہوئی ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم اس زیرِ تعمیر عمارت میں نادرہ سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے جہاں سے اس کی لاش دریافت ہوئی ہے؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! یہ بات درست ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے اور نادرہ کے بیچ خاصا سنجیدہ تعلق تھا؟''

''جی...... ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے سنا ہے، نادرہ کے گھر والے تم دونوں کی محبت کے سخت خلاف تھے۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور انہوں نے نادرہ کا رشتہ اس کے کزن فیصل سے طے کردیا تھا اور...... ایک ماہ کے بعد ان کی شادی ہونے والی تھی؟''

''جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔''

''اور مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ نادرہ، فیصل کو سخت ناپسند کرتی تھی؟''

''جی ہاں، آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے......''

میں نے کاشف کے دل کا حال ٹٹولنے کے لیے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پولیس نے موقف اختیار کیا ہے کہ تم نادرہ اور فیصل کے رشتے کے سخت خلاف تھے۔ تم نے نادرہ کو فیصل کے خلاف خوب بھرا تھا اور اسے اکساتے رہتے تھے کہ وہ تمہارے ساتھ کہیں فرار ہوجائے؟''

''یہ سراسر بکواس اور جھوٹ ہے۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''میں نے ہمیشہ نادرہ کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی۔ بھاگ جانے کا آئیڈیا اسی کا تھا لیکن میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ وکیل صاحب......!'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں ایک جوان بہن کا بھائی ہوں۔ میں کسی لڑکی کو گھر سے بھگانے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں......؟''

''یہ میرا نہیں، پولیس کا خیال ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز یعنی گزشتہ رات کھانا کھانے کے بعد تم اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنے گھر سے باہر نکلے تھے۔ میں تمہارے ان دوستوں کے نام جاننا چاہتا ہوں؟''

''ان دوستوں کے نام وسیم، آفتاب اور عارف ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہاری چھوٹی بہن نورین نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ رات تم لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے گھر واپس آئے تھے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اتنی دیر تک تم اپنے دوستوں کے ساتھ کون سی گپ شپ کرتے رہے تھے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پچھلی رات وسیم، آفتاب اور عارف کے ساتھ تو بس تھوڑی دیر تک گپ شپ کی تھی پھر میں عارف کے ساتھ چلا گیا تھا......''

''کہاں...... تم عارف کے ساتھ کہاں چلے گئے تھے؟''

''پکچر دیکھنے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کون سی پکچر دیکھنے گئے تھے؟''

اس نے ایک انگلش پکچر کا نام بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا عارف اس بات کی گواہی دینے کو تیار ہوجائے گا کہ تم گزشتہ رات اس کے ساتھ آخری شو دیکھنے پکچر ہاؤس گئے تھے؟''

''کیوں نہیں...... وہ ضرور گواہی دے گا۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔

''اور وسیم و آفتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے استفساریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ دونوں اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کے سامنے تم دونوں پکچر دیکھنے کے لیے گئے تھے اور اس سے پہلے انہی کے ساتھ گپ شپ کررہے تھے......؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اس سے مزید دو چار اہم سوالات پوچھے۔ پھر کانسٹیبل خادم حسین واپس آگیا اور مجھے کاشف کو فارغ کرنا پڑا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے تسلی دلاسا دیا اور وہاں سے واپس آگیا۔

XXX

آیندہ روز پولیس نے ملزم کاشف کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لینے کی کوشش کی۔ اس موقع پر میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے لیے زور مارا لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوسکی جس بات کا مجھے پہلے سے بہ خوبی اندازہ تھا۔ عدالت نے دونوں جانب کے دلائل سننے کے بعد ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے سات روز کے ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں دے دیا۔

گزشتہ رات جب میں کاشف سے ملاقات کرنے تھانے گیا تھا تو یہ بات میرے ذہن میں موجود تھی کہ اس کی ضمانت کی درخواست مسترد بھی ہوسکتی ہے لہٰذا میں نے اسے پولیس کی ”خاطرداری“ سے محفوظ رہنے کے کئی ایک مفید گر بتادیے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں وہ پولیس کی مشق ستم بننے سے خود کو بچالے گا۔

اس ایک ہفتے میں، میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرتا رہا اور اس سلسلے میں، میں نے اپنے دیرینہ دوست اور زیب النسا کے خیر خواہ معروف صحافی خورشید عباسی سے بھی بہت مدد لی۔ عباسی صاحب ایک چلتا پرزہ قسم کے انسان تھے۔ اگر ان کے ذمے کوئی کام لگا دیا جاتا تو وہ اس کے بارے میں پاتال سے بھی معلوماتِ نکال کر لے آتے تھے۔

اس دوران میں دو مرتبہ زیب النسا بھی مجھ سے ملنے دفتر آئی۔ ایک دفعہ اکیلی اور ایک مرتبہ نورین کے ساتھ۔ وہ خاصی پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس بے چاری کا پہلی مرتبہ پولیس اور عدالتی معاملات سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے اس کی تسلی اور اطمینان کے لیے اسے کیس کے مختلف زاویوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ میری وضاحت سے اسے خاصی حد تک سکون حاصل ہوا تھا۔

XXX

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ استغاثہ کے گواہان کے بیانات کے ساتھ ہی ملزم کا بیان بھی شامل تھ ریمانڈ کے دوران میں پولیس کسٹڈی میں ملزم جو بھی ریکارڈ کراتا ہے اسے ملزم کا ”اقبالی بیان“ کہا جاتا میں نے اپنے موکل کو پولیس کی ”مہربانیوں“ سے محفوظ ر کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کے نتیجے میں میرے موک نے پولیس کے حسبِ منشا بیان لکھوا دیا تھا۔ یہ بات آ جانتے ہیں کہ پولیس کی تحویل میں دیے گئے کسی بیان عدالت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ عدالت کے کام اپنا ایک مخصوص طریقۂ کار ہے جہاں واقعاتی شہادتوں گواہوں کے بیانات، ٹھوس حقائق، ناقابل تردید ثبوت ا وکلا کے زوردار دلائل کی روشنی میں فیصلے کیے اور سنا جاتے ہیں۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی نہایت ہی غیر دلچسپ اور خشک ہوتی ہے لہٰذا میں آپ کو بوریت سے بچاتے ہوئے دو چار قدم آگے لے جاتا ہوں یعنی عدالت ک باقاعدہ کارروائی کی جانب۔ کوئی دو ماہ کے بعد اس مرحلے کی نوبت آئی تھی۔

اس روز عدالت کے کمرے میں، اس کیس سے متعلق تمام افراد موجود تھے۔ جج اپنی مخصوص نشست انصاف پر براجمان ہوچکا تو اس کے حکم پر کارروائی کا آغا ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ نے نصف درجن سے زیادہ گواہان کی فہرست عدالت میں دائر کی تھی لیکن میں ان صفحات پر صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کا بیان یا گواہی کسی اہمیت ک حامل ہوگی...... اور اس سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ استغاثہ کے موقف اور ملزم کے بیان کا مختصراً تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوعہ کی رات دس اور بارہ بجے کے دوران میں واقع ہو تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ مقتولہ کو موت کے حوالے کرنے سے پہلے مجرما حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مقتولہ کے بدن پر موجود لباس کی ابتری سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل نے اسے اپنی ہو

کا نشانہ بنانے سے قبل بے رحمی سے رگیدا بھی تھا۔ مقتولہ کے جسم کے بعض حصوں پر زدوکوب کے آثار بھی پائے گئے تھے۔ ان متذکرہ بالا رپورٹس میں چند اور انکشافات بھی کیے گئے تھے مگر اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ یوں کھلے عام انہیں ضابطہ تحریر میں نہ لایا جائے۔

پولیس نے استغاثہ کی زبان اور چالان کی شکل میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مقتولہ نادرہ ملزم کاشف سے محبت کرتی تھی لیکن ملزم اس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ مقتول، ملزم کے ساتھ شادی کر کے ایک معتبر اور باعزت زندگی گزارنے کی خواہاں تھی مگر ملزم نے کبھی اس معاملے میں سنجیدہ دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اسی دوران میں جب مقتولہ کے گھر والوں نے اس کی شادی، اس کے کزن فیصل سے کرنے کا نہ صرف فیصلہ کرلیا، بلکہ اس شادی کی تاریخ بھی مقرر کردی تو ملزم کو یقین ہوگیا کہ مقتولہ بہت جلد اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ یہ لوگ زیر تعمیر عمارت (جائے وقوعہ) پر اکثر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ جب مقتولہ کی شادی میں ایک ماہ کا عرصہ باقی رہ گیا تو ملزم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوعہ کی رات مقتولہ سے ملاقات کا پروگرام سیٹ کیا۔ جب مقتولہ حسبِ پروگرام، ملزم سے ملنے زیر تعمیر عمارت میں پہنچی تو پہلے وہ اس سے پیار محبت کی باتیں کرتا رہا پھر اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا اور اس نے اپنی طاقت کے بل پر مقتولہ کو زیر کر کے بالجبر اپنی ناپاک اور مذموم خواہش کی تکمیل کرلی۔ یہ اس کے منصوبے کا پہلا حصہ تھا۔ دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے اس نے پکڑے جانے کے خوف سے بعدازاں مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے سپرد کردیا۔ ملزم کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ مقتولہ کی شادی ہو اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے لہٰذا اپنے ہوس ناک عزائم کی تکمیل کے بعد مقتولہ کو ٹھکانے لگا کر اس نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔

عدالت کے روبرو اپنے بیان کو ریکارڈ کراتے ہوئے اس کیس کے ملزم اور میرے موکل کاشف محمود نے بتایا تھا کہ وہ مقتولہ سے سچی اور سنجیدہ محبت کرتا تھا۔ اس نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ وہ زیر تعمیر عمارت میں چھپ چھپ کر مقتولہ سے ملاقات کیا کرتا تھا لیکن مقتولہ کے حوالے سے کبھی اس کے ذہن میں شیطانی خیالات کا گزر نہیں ہوا۔ اس کی محبت پاکیزہ تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنی محبت کو داغدار کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ملزم نے اس امر کی تصدیق بھی کی کہ مقتولہ کی گہری سہیلی صوفیہ ان کے معاملات محبت کی رازدار تھی۔ اپنے بیان میں اس نے ایک انکشاف یہ بھی کیا کہ مقتولہ کی منگنی سے پہلے اس نے مقتولہ کے والدین کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے واضح کیا تھا کہ وہ مقتولہ کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مقتولہ کے والدین نے اس کے خط کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ چند روز کے بعد پتا چلا کہ انہوں نے مقتولہ کو اس کے کزن فیصل سے منسوب کردیا ہے۔ اس بات کا ملزم کو دکھ تو بہت ہوا تھا لیکن وہ چونکہ فطری طور پر ایک صلح پسند انسان تھا اس لیے اس نے کوئی جارحانہ ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے حالات سے سمجھوتا کرلیا اور مقتولہ کو بھی یہی سمجھایا کہ وہ تقدیر کے سامنے سپر ڈال دے لیکن مقتولہ شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مقتولہ نے ملزم کو یہ راہ سجھائی کہ وہ دونوں چپ چاپ کہیں بھاگ جاتے ہیں لیکن ملزم اس آئیڈیا پر عمل کرنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ وقوعہ کی رات بھی انہوں نے زیر تعمیر عمارت میں ایک مختصر سی ملاقات کی تھی اور اس (کاشف) نے مقتولہ کو ایک بار پھر اچھا برا سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔

وکیل استغاثہ کی فرمائش پر ملزم کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ ملزم نے جیسے ہی اپنا بیان ریکارڈ کرایا، وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچ گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا یہ صحیح ہے کہ تم چھپ چھپ کر مقتولہ سے زیر تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟''

''جی ہاں...... یہ صحیح ہے۔'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''میں اپنے بیان میں اس بات کی وضاحت کرچکا ہوں۔''

''کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتولہ کی شادی، اس کے کزن کے ساتھ طے ہونے کا سن کر تمہیں بہت دکھ ہوا تھا؟''

''فطری بات ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں مقتولہ کے ساتھ سچی اور کھری محبت کرتا تھا۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی شادی کہیں اور ہونے کا سن کر مجھے یقیناً دکھ تو ہونا چاہیے تھا......''

''سچی اور کھری محبت!'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مقتولہ کے ساتھ وقوعہ کی رات زیر تعمیر عمارت میں جو کچھ پیش آیا وہ تمہاری سچی اور کھری محبت کا نتیجہ تھا...... ہیں نا؟''

ملزم نے قدرے بہادری سے جواب دیا۔ ''وکیل صاحب! جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے اب...... آپ اس سے جو بھی نتیجہ اخذ کریں، آپ کی مرضی ہے۔''

''تم نے اپنے حلفیہ بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ تم نے مقتولہ کا اس کے کزن فیصل سے رشتہ طے ہوجانے کے بعد مقتولہ کے والدین کو کوئی خط لکھا تھا؟''

''جی ہاں......'' ملزم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے خط ضرور لکھا تھا مگر مقتولہ کا رشتہ طے ہونے سے پہلے!''

وکیل استغاثہ نے اس کے جواب پر کوئی توجہ نہیں دی اور سلسلہ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس خط میں تم نے مقتولہ کے والدین کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں......؟''

''اس بات میں کوئی حقیقت نہیں۔'' ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ''میں نے مقتولہ کے والدین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں ان کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہوں اور مقتولہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتی ہے لہٰذا وہ لوگ ہماری محبت سے دشمنی کرنے کے بجائے ہمیں ایک معتبر رشتے میں باندھنے کی کوشش کریں۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا......!'' وکیل استغاثہ نے شک بھری نظر سے ملزم کی جانب دیکھا۔ ''جبکہ مقتولہ کے والدین کا موقف اس کے برعکس ہے۔ تم نے انہیں جن خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کی تھی، وقوعہ کی رات بالآخر تم نے ان پر عمل بھی کر ڈالا......؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں مقتولہ کو کانٹا چبھونے کے برابر بھی تکلیف دینے کا تصور نہیں کرسکتا۔ اسے بے آبرو کر کے قتل کرنا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس گھناؤنے فعل کے بارے میں سوچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں، مجھے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اس کیس کا ملزم اور میرا موکل بڑی بہادری کے ساتھ وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس اعتماد کا مظاہرہ کر پائے گا۔

''جب کوئی شخص قانون کے جال میں پوری طرح جکڑا جاچکا ہوتا ہے اور اسے فرار کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''وہ سارے کا سارا الزام کسی نامعلوم شخص کی سازش پر ڈال دیتا ہے اور خود کو معصوم و بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایسی کہانیاں گھڑ لیتا ہے جس سے وہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ سکے لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن عدالت لوگوں کے جذباتی بیانات کی روشنی میں فیصلے صادر نہیں کرتی بلکہ عدالت کی کسوٹی ہر بات کو ٹھوس حقائق اور دلائل کی بنا پر پرکھتی ہے۔''

وکیل استغاثہ کی اس تقریر پر ملزم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی ایک سہیلی تمہارے پڑوس میں رہتی ہے؟''

''جی ہاں...... یہ سچ ہے۔'' ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس لڑکی کا نام صوفیہ ہے۔ صوفیہ کا ہمارے گھر میں بھی آنا جانا ہے......''

''صوفیہ نامی وہ لڑکی تم دونوں کے معاملات محبت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی صوفیہ کے توسط سے تم لوگوں کی ملاقات طے ہوا کرتی تھی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ملزم نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''کیا وقوعہ کی رات بھی تم دونوں صوفیہ کے توسط سے ملے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے بڑے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

''جی ہاں......!''

وکیل استغاثہ نے اسی طرح کے مزید دو تین تیز و تند سوالات کیے پھر جرح ختم کردی۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے ملزم سے نہایت ہی مختصر سی جرح کی۔

''کاشف! تم نے معزز عدالت کے روبرو مقتولہ کے والدین کو کوئی خط لکھنے کا اقرار کیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارا موقف یہ ہے کہ تم نے اس کے والدین کو اپنی اور مقتولہ کی شادی کے لیے ہموار کرنے کا مشورہ دیا تھا جبکہ استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک دھمکی آمیز خط تھا۔ یہ کیا قصہ ہے؟''

''قصہ یہ ہے جناب کہ......'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے جو کہا وہ سچ ہے۔ استغاثہ کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ اگر میں نے مقتولہ کے والدین کو کوئی دھمکی آمیز خط لکھا تھا تو وہ ثبوت کے طور پر اس خط کو عدالت

میں پیش کردیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے تعریفی نظر سے ملزم کی طرف دیکھا پھر روئے سخن وکیل استغاثہ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کے لیے ملزم نے بڑی عمدہ تجویز دی ہے۔'' پھر میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔

''جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں مقتولہ کے والدین کے نام بھی شامل ہیں۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ جب وہ گواہی کے لیے عدالت میں پیش ہوں تو وہ مذکورہ خط بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔''

جج نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے وکیل استغاثہ کو خط کے حوالے سے ہدایات جاری کردیں۔ میں دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کاشف محمود! تم نے بتایا ہے کہ تم اور مقتول، صوفیہ نامی کسی لڑکی کے توسط سے زیرِ تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تم اس لفظ ''توسط'' کی کچھ وضاحت کرو گے؟''

''توسط......!'' اس نے زیرِلب دہرایا اور بتانے لگا۔ ''جناب، بات دراصل یہ ہے کہ صوفیہ میرے پڑوس میں رہتی ہے اور اس کے گھر میں مقتولہ کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ مقتولہ، صوفیہ کی رازدار اور گہری سہیلی بھی تھی چنانچہ صوفیہ کو ہم دونوں کے معاملات کا بہ خوبی علم تھا اور جہاں تک ملاقات اور توسط کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دراصل، ملاقات کے بارے میں تو میں اور نادرہ ہی آپس میں طے کرتے تھے بس، صوفیہ نادرہ کو اخلاقی طور پر ایک مضبوط کور فراہم کرتی تھی۔ نادرہ، صوفیہ سے ملنے کا بہانہ کرکے گھر سے نکلتی تھی۔ اس طرح نادرہ کے گھر والے مطمئن رہتے تھے کہ وہ اپنی سہیلی کے گھر میں محفوظ ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''اچھا......!'' میں نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ ملاقاتیں رات کی تاریکی ہی میں ہوا کرتی تھیں یا......؟''

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''زیادہ تر رات کی تاریکی میں اور کبھی کبھار دن میں بھی۔''

''وقوعہ کی رات زیرِتعمیر عمارت میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم دونوں نے تقریباً نو بجے رات زیرِتعمیر عمارت میں ملاقات کی تھی۔'' ملزم نے بتایا۔ ''دس پندرہ منٹ تک ہم دونوں میں بحث و تکرار ہوتی رہی پھر میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف نکل گیا تھا۔''

''بحث و تکرار......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں میں کس بات پر بحث ہوئی تھی؟''

''نادرہ کی ایک ماہ کے بعد شادی ہونے والی تھی۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اور وہ اس بات پر سخت پریشان تھی۔ وہ اپنے کزن فیصل سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے وہ ایک سنسنی خیز آئیڈیا لے کر میرے پاس آئی تھی۔''

''آئیڈیا......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیسا آئیڈیا؟''

''گھر سے فرار ہونے کا آئیڈیا۔'' ملزم نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''اس کا خیال تھا کہ ہمیں گھر سے فرار ہوجانا چاہیے......''

''پھر......تم نے اس کا آئیڈیا سننے کے بعد کیا کہا؟''

''میں نے سختی کے ساتھ اس کے آئیڈیا کی مخالفت کی تھی۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''میں نے بڑے واضح الفاظ میں اسے سمجھا دیا تھا کہ گھر سے فرار ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا وہ چپ چاپ گھر چلی جائے اور خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دے۔''

''کیا مقتولہ نے تمہاری بات مان لی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہارے سمجھانے پر وہ واپس چلی گئی تھی؟''

''میں اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیوں......؟''

''کیونکہ میں اسے وہیں چھوڑ کر عمارت سے نکل گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نہیں جانتا، وہ میرے جانے کے فوراً بعد اس عمارت سے چلی گئی تھی یا وہاں کچھ دیر ٹھہری تھی۔ اس کی باتیں سن کر میرا ذہن الجھ گیا تھا۔''

''تم مقتولہ کو زیرِتعمیر عمارت میں چھوڑ کر کہاں گئے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''دوسری گلی میں اپنے دوستوں کے پاس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دس پندرہ منٹ تک میں نے ان سے بات چیت کی لیکن میرا ذہن بہ دستور الجھن کا شکار رہا۔ پھر

میں اپنے ایک دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے سینما چلا گیا تھا۔''

''کس دوست کے ساتھ......؟''

''میرے اس دوست کا نام عارف ہے۔''

''کیا تمہارا دوست عارف اس بات کی گواہی دینے الت میں آسکتا ہے کہ وقوعہ کی رات تم لوگوں نے کسی نگش پکچر کا آخری شو دیکھا تھا......؟''

''مجھے یقین ہے، وہ گواہی سے انکار نہیں کرے گا۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' میں نے وئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی پورٹ کے مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوعہ کی رات دس ور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور یہ وہی وقت ہے ب میرا موکل اور اس کیس کا ملزم کاشف محمود اپنے دوست ے ہمراہ فلم دیکھنے پکچر ہاؤس گیا ہوا تھا۔ اگر معزز عدالت کا کم ہوگا تو ڈیفنس کی جانب سے ملزم کے دوست عارف کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور وکیل استغاثہ کی انب دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ استغاثہ کا اگلا گواہ پیش کیا ئے۔ قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ جج کی نگاہ کے اشارے ی تعمیل کرتا، میں نے بہ آواز بلند کہا۔

''یور آنر......اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے بلاتاخیر اجازت دے دی۔ کسی بھی کیس کے نکوائری آفیسر کو ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے۔ جج کے حکم پر آئی۔او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تفتیشی افسر صاحب! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''بشیر احمد......!'' اس نے جواب دیا۔

''بشیر صاحب!'' میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا تو بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہوگا......؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوعہ کی رات دس اور بارہ بجے کے دوران میں واقع ہوئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب...... آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس رپورٹ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل مقتولہ کو بے آبرو بھی کیا گیا تھا۔'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور جائے وقوعہ پر مقتولہ کی لاش جس لباس میں ملی اس کی حالت بھی یہی بتاتی ہے کہ مجرمانہ حملے کا نشانہ بنانے سے قبل مقتولہ کو زدوکوب بھی کیا تھا......؟''

''جی ہاں...... آپ بجا فرماتے ہیں۔'' آئی او نے معاندانہ نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب دیکھا۔ ''قاتل نے اپنی ہوس کی تسکین کے بعد بڑی بے دردی سے مقتولہ کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ مقتولہ کی موت، سانس کی آمدوشد کے منقطع ہونے سے واقع ہوئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یعنی مقتولہ کو گلا گھونٹ کر فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں......؟''

''میں......'' اس نے عجیب سی نظر سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں بھی وہی کہوں گا جو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا ہے۔''

''جن ماہرین نے پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کی ہے انہوں نے تو باقاعدہ مقتولہ کے جسم کی چیر پھاڑ اور مختلف ٹیسٹ کیے تھے جبھی وہ مقتولہ کی موت کے حوالے سے اس نتیجے میں کامیاب ہوسکے تھے۔'' میں نے خاصے تیکھے انداز میں کہا۔ ''آپ نے اس سلسلے میں کون سا کارنامہ انجام دیا تھا......؟''

میرے اس طنزیہ استفسار پر وہ چیں بہ جبیں ہوا پھر بڑے فخر سے بولا۔ ''میں نے بڑی بھرپور تفتیش کی تھی۔''

''بھرپور تفتیش!'' میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''کیا آپ اس تفتیش کی تفصیلات معزز عدالت کے سامنے لانا پسند کریں گے؟''

آنے والے پانچ منٹ میں تفتیشی افسر نے اپنی پیشہ وارانہ کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی تو مزید طوالت سے بچنے کے لیے مجھے مجبوراً اسے روکنا پڑا۔

''بشیر صاحب! آپ کی اس محکمہ جاتی تقریر سے میری تشفی نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ معزز عدالت کے لیے تسلی بخش ہے۔''

''پھر......'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

"بات میرے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں ہے آئی او صاحب۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پھر کس چیز کی بات ہے......؟"

"استغاثہ کے نامکمل اور ادھورے پن کی بات ہے۔"

"کیا مطلب......؟" اس نے تحیر آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئی او صاحب! یہ بات آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ جب گلا دبا کر کسی شخص کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو قاتل کو اچھی خاصی جان ماری کرنا پڑتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"جب قاتل، مقتولہ کا گلا دبانے کے لیے جان ماری کرتا ہے تو اس کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات مقتولہ کی گردن کے مختلف حصوں پر گویا "چھپ" جاتے ہیں جنہیں فنگر پرنٹس یا آسان زبان میں "ایف پی" کہا جاتا ہے......" میں نے اپنے مقصد کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "مقتولہ نادرہ کو بھی گلا گھونٹ کر موت سے ہمکنار کیا گیا ہے لہٰذا قاتل کے فنگر پرنٹس مقتولہ کی گردن کے مختلف حصوں پر لازماً پائے جانا چاہئیں......" میں نے لمحاتی توقف کر کے معنی خیز انداز میں یکے بعد دیگرے وکیل استغاثہ اور جج کی طرف دیکھا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے دوبارہ انکوائری آفیسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بشیر صاحب! استغاثہ کی رپورٹ میں ملزم کے فنگر پرنٹس کا نہ تو کہیں ذکر ہے اور نہ ہی فنگر پرنٹس سے متعلق کوئی رپورٹ موجود ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ ذرا اس کی تو وضاحت فرمائیں......؟"

پہلے تو اس نے گھبراہٹ بھرے انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ دراصل...... اس کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔"

"ویری گڈ......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "اتنے بڑے اور اہم ٹیسٹ کی آپ نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ آپ کی اس بات سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں یوں اضافہ کیا۔ "قتل کی اس واردات میں آپ کو چشم دید گواہ کا مقام حاصل ہے جب ہی آپ نے مقتولہ کی گردن پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔"

میری اس چوٹ کے جواب میں انکوائری آ کچھ نہیں کہا اور بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اِدھر اُدھ لگا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پ

"آئی او صاحب! اس واقعے کی اطلاع آپ اور کس نے دی تھی؟"

"مقتولہ کے گھر والوں نے تھانے فون کر واقعے کی اطلاع دی تھی۔" اس نے بتایا۔ "وقو دوسرے روز، صبح کے وقت......"

میں نے انکوائری آفیسر کو مزید ایک دو سوالات فارغ کر دیا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے

"جنابِ عالی! مقتولہ کی گردن کے مختلف حصو قاتل کے فنگر پرنٹس نہ اٹھائے جانا اور ملزم کی انگلیو نشانات سے ان کا موازنہ نہ کرنا استغاثہ کا ایک بنیاد ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس اس غفلت نما کوتاہی کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیا جائے...... آل یور آنر......!"

عدالت نے میری درخواست کو منظور کرتے آیندہ پیشی کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عد برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

XXX

استغاثہ کی جانب سے اگلی پیشی پر مقتولہ کا یعقوب علی گواہی کے لیے سب سے پہلے عدالت میں ہوا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس قریب پہنچ گیا۔

یعقوب علی کی عمر پچاس کے آس پاس تھی۔ وہ عا شکل وصورت کا مالک ایک سیدھا سادا انسان تھا۔ استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد اسے فارغ کیا تو میں جج کی اجازت سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر سے پہلے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا ضروری جا

"یعقوب صاحب!" میں نے اسے مخاطب کر ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے آپ کی بیٹی کی المناک مو گہرا صدمہ ہے لیکن جرح بھی ضروری ہے......"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، بس گھائل نظر سے مجھ چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کو کب پتا چلا کہ آپ کی موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟"

"اس کی گمشدگی کی اگلی صبح......"

"گمشدگی......" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"نادرہ اپنی سہیلی صوفیہ سے ملنے اس کے گھر گئی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ وقوعہ والی رات کی بات ہے۔ وہ پہلے بھی صوفیہ سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ صوفیہ بھی اکثر و بیشتر نادرہ سے ملنے آتی رہتی تھی......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وقوعہ کی رات جب نادرہ واپس نہیں آئی تو ہمیں تشویش ہوئی۔ وہ ہماری اکلوتی اولاد تھی۔ میں نے اپنی بیوی سلطانہ سے گھر میں رکنے کو کہا اور خود نادرہ کو دیکھنے صوفیہ کی طرف چلا گیا۔ صوفیہ کا گھر دو گلیوں کے فاصلے پر ہے۔ جب میں نے صوفیہ سے نادرہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ نادرہ لگ بھگ دس بجے رات اس کے گھر سے واپس چلی گئی تھی۔"

"پھر...... پھر آپ نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم رات بھر نادرہ کو اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے۔" اس نے بتایا۔ "اپنے علاقے میں اور شہر بھر میں جہاں جہاں بھی ہمارے رشتے دار تھے، ہم نے فون کے ذریعے اور خود جا کر بھی نادرہ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تھک ہار کر صبح ہم نے تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔ پولیس موقع پر پہنچی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پولیس والوں نے زیرِتعمیر عمارت میں سے نادرہ کی لاش برآمد کر لی۔"

"دیکھتے ہی دیکھتے......!" میں نے یعقوب کے کہے ہوئے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا پولیس والوں نے کوئی جادو منتر کیا تھا جو انہیں پتا چل گیا کہ نادرہ کی لاش زیرِتعمیر عمارت کے اندر سے دستیاب ہو سکتی ہے......؟"

"نہیں جناب، جادو ٹونا تو نہیں کیا تھا۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس سلسلے میں دو افراد کے بیانات نے پولیس کی بھرپور مدد کی تھی۔"

"دو افراد......!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کون دو افراد؟"

"صوفیہ اور بشارت مرزا۔" یعقوب نے جواب دیا۔

"صوفیہ تو نادرہ کی سہیلی ہے۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "یہ بشارت مرزا کون ہے......؟" پھر میں نے ایک فوری خیال کے تحت استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اس شخص کا نام تو گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔"

"جی ہاں۔" یعقوب نے اثبات میں گردن ہلائی اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بشارت مرزا کا مکان، زیرتعمیر عمارت کی عقبی جانب واقع ہے یعنی دونوں گھروں کی پشت آپس میں ملی ہوئی ہے۔ یہ بندہ پراپرٹی کا کام کرتا ہے اور گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے۔"

مجھے کرید ہوئی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "یعقوب علی! اس بندے نے پولیس کی کس انداز میں بھرپور مدد کی تھی؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ......" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "پولیس نے ہمارے گھر پہنچ کر جب تفتیش کا آغاز کیا تو صوفیہ کا نام سامنے آیا۔ پولیس نے صوفیہ سے پوچھ گچھ کی اور پندرہ بیس منٹ کی "محنت" کے بعد صوفیہ سے یہ اگلوالیا کہ وقوعہ کی رات نادرہ اور ملزم کاشف کو زیرتعمیر عمارت میں ملاقات کرنا تھی۔ یہ ایک بہت بڑا انکشاف تھا۔ ملزم کاشف کی گرفتاری بھی صوفیہ کے اسی بیان کا نتیجہ تھی لیکن یہ دوپہر کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے پولیس نے زیرتعمیر عمارت کے اندر سے نادرہ کی لاش برآمد کر لی تھی۔"

"معزز عدالت یہی تو جاننا چاہ رہی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے تھما تو میں نے سوال داغ دیا۔ "پولیس نے زیرتعمیر عمارت کا رخ کیسے کیا تھا؟"

"میں وہی بتانے جا رہا ہوں جناب۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "صوفیہ کے بیان پر یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی تھی کہ نادرہ اور کاشف رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر زیرتعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ اس نشاندہی پر پولیس نے فوراً مذکورہ عمارت کی تلاشی لی اور پھر انہیں نادرہ کی لاش دریافت کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بعدازاں......" وہ سانس درست کرنے کے لیے رکا تو میں منتظر نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بعدازاں جب پولیس نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی تو بشارت مرزا نے گواہی دی کہ وقوعہ کی رات اس نے ملزم کو افراتفری کے عالم میں زیرتعمیر عمارت میں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مقتولہ کے باپ کی وضاحت کے بعد اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے اپنی بیٹی کی سہیلی صوفیہ سے یہ نہیں پوچھا کہ

اس نے مقتولہ اور ملزم کی محبت والے معاملے کو آپ سے کیوں چھپائے رکھا، خصوصاً زیرِ تعمیر عمارت کے اندر ملاقاتوں کے سلسلے کے بارے میں۔""

""پوچھا تھا۔"" وہ ایک مضمحل سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ""وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئی تھی۔ اس نے دانستہ ان کی ملاقاتوں والا راز ہم سے چھپایا تھا۔ وہ نادرہ کی سہیلی تھی اس لیے اس نے اس معاملے کو آؤٹ نہیں کیا تھا۔""

""یعقوب صاحب!"" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ""اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آپ لوگوں کو مقتولہ اور ملزم کے تعلقات کا علم، مقتولہ کی موت سے بہت پہلے ہوگیا تھا جب ملزم نے ایک خط لکھ کر آپ کو بتایا تھا کہ وہ مقتولہ سے شادی کا خواہاں ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟""

""آپ غلط نہیں کہہ رہے۔"" اس نے جواب دیا۔ ""لیکن خط کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں ہیں......""

""کیسی غلط فہمیاں؟"" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ""ملزم کا دعویٰ ہے کہ اس نے خط نادرہ کی منگنی اور شادی کی تاریخ طے ہوجانے سے پہلے لکھا تھا اور اس میں اپنی اور نادرہ کی باہم پسندیدگی کا ذکر کیا تھا جبکہ ہمارے مطابق وہ خط نادرہ کی شادی کی بات پکی ہونے کے بعد موصول ہوا تھا جس میں ملزم نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے نادرہ کی شادی اس کے ساتھ نہیں کی تو ہمیں خطرناک نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔""

""ایک منٹ......"" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ""ملزم نے اپنے خط کے ذریعے آپ لوگوں کو کس نوعیت کے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی؟""

""یہی کہ...... اگر ہم نے اس کی خواہش پوری نہیں کی تو وہ کوئی بھی سنگین قدم اٹھانے پر مجبور ہوسکتا ہے۔"" استغاثہ کے گواہ یعقوب نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ""مثلاً نادرہ کا اغوا اور کوٹ میرج وغیرہ......""

""کیا واقعی یہ دھمکی دار باتیں اس خط میں لکھی ہوئی تھیں؟"" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔ ""یعقوب صاحب! کیا آپ نے خود وہ خط پڑھا تھا؟""

""نہیں جناب......"" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ""میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ وہ خط میری بیوی سلطانہ نے مجھے پڑھ کر سنایا تھا۔""

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد جرح کردی۔

استغاثہ کی جانب سے اگلا گواہ مقتولہ کی والدہ سلط تھی۔ سلطانہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا ریکارڈ کرادیا۔ وکیل استغاثہ نے رسمی سی جرح کے سلطانہ کو فارغ کردیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

سلطانہ ایک ادھیڑ عمر اور فربہ اندام عورت تھی۔ اس آنکھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی چنٹ تیز طرار عورت ہے۔ جب وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرار تھی تو اندازِ تکلم سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک زبا دراز اور منہ پھٹ عورت تھی۔

سلطانہ نے اپنا بیان دیتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ ملزم ایک آوارہ اور لفنگا شخص تھا۔ وہ ہاتھ دھو کر اس کی کے پیچھے پڑ گیا تھا اور ہر وقت اسے ورغلانے کی کوشش رہتا تھا۔ نادرہ پوری طرح اس کی مٹھی میں تھی۔ اس دور میں جب انہوں نے مقتولہ نادرہ کی منگنی اس کے کزن فیص سے کردی تو ملزم چراغ پا ہوگیا اور مقتولہ کی شادی کی تار طے ہوجانے کے بعد تو ملزم نے انہیں ایک خطرناک د بھرا خط لکھ مارا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں ہمیں یہ بار کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر ہم نے نادرہ کی شادی ا کے کزن فیصل سے کرنے کی کوشش کی تو ہمیں بڑ بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ......""

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ""سلط صاحبہ! میں آپ سے یہ بحث نہیں کروں گا کہ ملزم نے د دھمکی والا خط مقتولہ کی شادی کی تاریخ طے ہوجانے کے بعد لکھا تھا یا بہت پہلے میں......""

""جناب! اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجا نہیں کہ اس نے خطرناک نتائج کی دھمکی والا خط شادی کی تاریخ طے ہوجانے کے بعد لکھا تھا۔"" وہ قطع کلامی کر ہوئے تیز لہجے میں بولی اور ناپسندیدہ انداز میں ملزم گھورنے لگی۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ میرے موکل سے شدید نوعیت کی نفرت کرتی تھی، میں اس کی قطع کلامی کا برا منائے بغیر معتدل لہجے میں کہا۔

""ٹھیک ہے، میں آپ کی بات کو تھوڑی دیر کے درست مان لیتا ہوں۔ ملزم نے آپ لوگوں کو ویسا ہی خ

ہوگا جیسا آپ نے اپنے بیان میں حلفیہ ریکارڈ کرایا ہے۔ کیا آپ مذکورہ خط کو معزز عدالت میں پیش کرسکتی ہیں......؟""

پھر سلطانہ کا جواب سنے بغیر میں نے جج کی جانب دیکھا اور نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ کچھ اس طرح اضافہ کیا ""جنابِ عالی! پچھلی پیشی پر، میری درخواست کو راسنت جانتے ہوئے معزز عدالت نے استغاثہ کو اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اس پیشی پر ملزم کے لکھے ہوئے خط کو عدالت میں پیش کرے......""

جج نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر ایک نگاہ ڈالی پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ""وکیل صاحب! کیا متذکرہ خط عدالت میں پیش کردیا گیا ہے؟""

""نہیں جنابِ عالی......"" وکیل استغاثہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ ""بدقسمتی سے وہ خط ضائع ہوچکا ہے۔""

جج کی پیشانی پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ""بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ......""

میں استغاثہ کی معزز گواہ اور مقتولہ کی والدہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ""سلطانہ صاحبہ!"" میں نے بڑی کراری آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ""ملزم کے بھیجے ہوئے خط کے ضائع ہونے کی ہسٹری کیا ہے؟""

""وہ جناب...... وہ جناب......"" وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔ ""وہ ایسا بے ہودہ اور واہیات خط تھا کہ میں نے نادرہ کے ابا کو پڑھ کر سنایا پھر پرزے پرزے کر کے اسے چولھے میں ڈال دیا تھا۔""

""خط گیا چولھے میں۔"" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ""اب اس بات کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہا کہ ملزم نے اس خط میں کیا لکھا تھا بہرحال......"" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

""سلطانہ صاحبہ! آپ نے ابھی اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم ہاتھ دھو کر آپ کی بیٹی نادرہ کے پیچھے پڑ گیا تھا اور بسا اوقات مقتولہ کو ورغلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ آپ نے یہاں تک بھی کہا کہ مقتولہ پوری طرح ملزم کی مٹھی میں تھی۔ اس سے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مقتولہ ملزم کو پسند کرتی تھی اور اس کے ساتھ شادی کر کے ایک پُرسکون زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟""

""آپ غلط نہیں کہہ رہے، صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔"" اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر خونخوار انداز میں کاشف محمود کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ""میری بچی تو معصوم اور نادان تھی۔ اس شیطان نے اسے پوری طرح اپنے چنگل میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی تھی اور ہماری نصیحت پر بالکل کان نہیں دھرتی تھی۔ اس منحوس نے پتا نہیں، میری بچی کے ذہن میں کیسا زہر بھر دیا تھا کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچنے لگی تھی۔ یہ کسی درندے سے کم نہیں......"" بات ادھوری چھوڑ کر سلطانہ نے بڑے غضب ناک انداز میں کاشف کی جانب انگلی سے اشارہ کر دیا اور پھر جذباتی بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

""اس بدبخت کی نیت شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھی۔"" اس نے ایک مرتبہ پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کاشف محمود کی طرف اشارہ کیا۔ ""اس نے بڑی صفائی سے نادرہ کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ہم نے اس کی اوچھی حرکتوں سے تنگ آکر ہی نادرہ کی فیصل سے منگنی کردی تھی اور پھر شادی کی تاریخ بھی طے کردی تھی۔ جب اس کمینے کو محسوس ہوا کہ نادرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکلنے والی ہے تو اس نے دھوکے بہانے سے اسے زیرِ تعمیر عمارت میں بلایا اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد میری بچی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہمارا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔"" وہ روہانسی ہوگئی۔ ""یہ درندہ سخت سے سخت سزا کا حق دار ہے۔ میں تو کہتی ہوں، اس مردود کو سرِعام پھانسی دی جائے۔""

میں نے اس کی جذباتی تقریر کے جواب میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جب وہ قدرے معتدل ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ""سلطانہ صاحبہ! جب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ملزم، مقتولہ کو کسی غلط راہ پر چلا رہا ہے تو پھر آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کی آمد و شد کا تنقیدی جائزہ کیوں نہیں لیا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مقتولہ کی سہیلی صوفیہ کا گھر ملزم کے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ مقتولہ کو صوفیہ کے گھر جانے سے روک دیتے۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟""

""ہم نے اسے روکا تھا، بہت روکا تھا۔"" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ""اور نادرہ بڑی حد تک باز بھی آگئی تھی لیکن وقوعہ کی رات پتا نہیں، وہ کس وقت نکل گئی۔ مجھے صبح سے بخار تھا۔ ڈاکٹر نے ملیریا بتایا تھا۔ میں رات کو جلدی سو گئی تھی اور......"" وہ سانس درست کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

""اور...... یہ بات تو نادرہ کی موت کے بعد کھلی ہے

کہ ملزم کے ساتھ وہ زیر تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کرتی تھی۔ صوفیہ نے اگر ہمیں پہلے بتایا ہوتا تو شاید یہاں تک نوبت ہی نہیں آتی۔ صوفیہ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر نادرہ سے اپنی دوستی نبھاتی رہی اور...... اور......'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''صوفیہ نے آپ لوگوں کو اندھیرے میں رکھ کر نادرہ سے اپنی دوستی نبھائی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جس کے نتیجے میں بالآخر نادرہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ سلطانہ صاحبہ! آپ کے خیال میں کیا صوفیہ کو بھی کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے؟''

''ہاں، ضرور ملنی چاہیے۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''صوفیہ کو بھی ضرور کوئی سزا ملنی چاہیے۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں سلطانہ کے الفاظ دہرائے پھر دوبارہ استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''سلطانہ صاحبہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے ملزم کے خط کو چولھے میں ڈال کر ایک جیتا جاگتا ثبوت جلا کر خاکستر کر دیا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ خط کس کس نے پڑھا تھا؟''

''میں نے اور نادرہ نے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔ ''اور نادرہ کے ابا کو میں نے خود پڑھ کر سنایا تھا۔''

''خط نذر آتش ہو چکا اور نادرہ زمین اوڑھ کر سو گئی ہے۔'' میں نے سلطانہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کسی ایسے شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر سکتی ہیں جس نے آپ لوگوں کے علاوہ خط پڑھا ہو؟''

''آبجیکشن یور آنر......!'' وکیل استغاثہ نے نیم احتجاجی انداز میں آواز بلند کی۔ ''استغاثہ کی معزز گواہ دو ٹوک الفاظ میں معزز عدالت کے روبرو بتا چکی ہے کہ مذکورہ خط کے بارے میں صرف گھر کے انہی تین افراد کو علم تھا۔ وکیل صفائی الٹے سیدھے سوالات کر کے خوامخواہ گواہ کو کنفیوز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے......؟''

''بیگ صاحب!'' وکیل استغاثہ کے زخموں پر مرہم لگاتے ہوئے جج نے مجھ سے کہا۔ ''کیا استغاثہ کی گواہ سلطانہ کے جواب سے صورتِ حال واضح نہیں ہو جاتی......؟''

''اٹس او کے یور آنر۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''سلطانہ صاحبہ!'' میں نے اپنی جرح میں تنز بھرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بڑے زوردار انداز میں معز عدالت کے سامنے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ملزم نے نہایت ہی چال بازی سے آپ کی بیٹی نادرہ کو ورغلا رکھا تھا اور گاہے بہ گاہے مقتولہ کے ذہن میں زہر بھر کر اسے آپ لوگوں سے متنفر کر رہتا تھا۔ کیا آپ اس الزام کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت یا غیر جانب دار عینی گواہ عدالت میں پیش کر سکتی ہیں؟''

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ غصیلی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میری بات کے ثبوت کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اس شخص کے ورغلانے پر ہی میری بیٹی کا دماغ خراب ہوا تھا اور وہ چھپ چھپ کر اس سے ملا کرتی تھی؟''

''واقعتاً یہ کافی نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی آپ نے جو کچھ فرمایا، یہ آپ کا ذاتی خیال ہے لیکن ملزم کا دعویٰ اس سے قطعی مختلف بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے مطابق مقتولہ اس سے سچی محبت کرتی تھی اور اس سے شادی کی خواہاں تھی لیکن آپ لوگوں کی مخالفت نے انہیں ایک نہیں ہونے دیا۔ آپ نے مقتولہ کی منگنی اس کے کزن سے کر دی اور مقتولہ اس شادی کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ ملزم کے ساتھ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ملزم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر...... آپ کی بیٹی کو قتل کر دیا گیا۔''

''یہ وہ کہانی ہے، جو ملزم نے آپ کو سنائی ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''جبکہ حقیقت وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے......''

''اور اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کوئی معتبر گواہ نہیں ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب میں کہا۔ ''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ عدالت کسی بھی بات کی صحت جاننے کے لیے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ملزم کا لکھا ہوا خط آپ نے نذر آتش کر دیا۔ ملزم کی ذات سے دیگر شکایات کے حوالے سے آپ کے پاس کوئی شہادت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، آپ ایسا کوئی بھی ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش نہیں کر سکیں جو ملزم کو آپ کی بیٹی کا قاتل ثابت کرتا ہو......'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یور آنر! تمام تر حالات و واقعات معزز عدالت کے سامنے ہیں۔ مجھے استغاثہ کی گواہ سلطانہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اس کے ساتھ ہی معزز عدالت کا وقتِ مقررہ ختم

ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

XXX

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کی ایک اہم گواہ اور مقتولہ کی رازدار سہیلی صوفیہ کھڑی تھی۔ صوفیہ کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ پرکشش خدوخال کی مالک ایک دبلی پتلی اور سانولی سلونی لڑکی تھی۔

سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا بیان ریکارڈ کرتے وقت معزز عدالت کو بتایا کہ وہ مقتولہ نادرہ کو بچپن سے جانتی تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور یہ کہ نادرہ اس کی رازدار سہیلی تھی۔ وہ صوفیہ سے اپنی کوئی بات چھپاتی نہیں تھی۔ صوفیہ نے اپنے بیان میں اس بات کا کھلم کھلا اقرار کیا کہ وہ مقتولہ اور ملزم کی محبت کے معاملات سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ ان دونوں کی زیر تعمیر عمارت میں ہونے والی خفیہ ملاقاتوں سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ صوفیہ نے عدالت کو بتایا کہ اپنی موت سے چند دن پہلے نادرہ بہت پریشان اور الجھی ہوئی رہنے لگی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے گھر والوں نے اس کے کزن فیصل سے اس کی شادی کی تاریخ پکی کر دی تھی۔ وقوعہ کے روز بھی مقتولہ پہلے صوفیہ کے گھر آئی تھی اور پھر وہاں سے زیر تعمیر عمارت میں ملزم سے ملاقات کرنے چلی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس قتل کی واردات کے بارے میں وہ اور کچھ نہیں جانتی تھی۔

صوفیہ کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''صوفیہ صاحبہ! آپ اس بات کی گواہ ہیں نا کہ ملزم اور مقتولہ کے درمیان بڑا دھانسو قسم کا عشق چل رہا تھا اور وہ دونوں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر رات کی تاریکی میں چوری چوری ملاقاتیں کیا کرتے تھے......؟''

''جی ہاں یہ بات بالکل درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''اور میں اس کی حلفیہ گواہی دے چکی ہوں۔''

''کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتولہ کو جب بھی ملزم سے ملاقات کرنا ہوتی تھی وہ آپ سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' صوفیہ نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''وہ صرف ملزم سے ملاقات کرنے ہی نہیں بلکہ ویسے بھی مجھ سے ملنے میرے گھر آتی رہتی تھی۔''

''وقوعہ کے روز بھی وہ ملزم سے ملنے کے لیے ہی آپ کے پاس آئی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد سے تم نے اپنی سہیلی کو زندہ نہیں دیکھا......؟''

''جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔'' صوفیہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے مزید چند سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ سے کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کر وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''صوفیہ صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو تھوڑی دیر پہلے بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ مقتولہ آپ کی بچپن کی دوست تھی۔ آپ دونوں نے اسکول میں ایک ساتھ پڑھا اور ایک دوسرے کی رازدار تھیں۔ آپ مقتولہ اور ملزم کی عشقیہ داستان سے بھی اچھی طرح واقف تھیں اور انہیں چوری چھپے ملاقاتوں کے لیے مواقع بھی فراہم کرتی تھیں۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جناب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا یہ بات درست ہے کہ مقتول، ملزم کو دل و جان سے پسند کرتی تھی اور اس سے شادی کی خواہاں تھی؟''

''جی ہاں...... یہ بات درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور کیا یہ بھی درست ہے کہ ملزم نے اپنی پسند کے حوالے سے خط کے ذریعے مقتولہ کے والدین کو آگاہ کر دیا تھا؟'' میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔

''خط کا تو مجھے کوئی علم نہیں۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ''البتہ، یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ نادرہ کے والدین تک ان کی محبت کا معاملہ ضرور پہنچ چکا تھا اور وہ ان دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھے۔''

خط کے ذکر پر اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے میں نے وضاحت ضروری سمجھی اور کہا۔ ''میں اس خط کے بارے

میں پوچھ رہا ہوں جو ملزم کے مطابق ایک درخواست کی حیثیت رکھتا تھا کہ وہ مقتولہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جبکہ مقتولہ کی والدہ کے مطابق وہ ایک دھمکی آمیز خط تھا جس میں ملزم نے انہیں خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔“

”میں ایسے کسی خط کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ وہ نظر چراتے ہوئے بولی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ مذکورہ خط کے حوالے سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مقتولہ کو اس خط کی خبر ہو اور اس نے اپنی رازدار سہیلی صوفیہ کو نہ بتایا ہو۔ صوفیہ کے رویے سے واضح ہوتا تھا کہ وہ مقتولہ کی ماں سے تعاون کی پالیسی پر کاربند تھی۔ اس سے ایک بات کھل کر سامنے آجاتی تھی کہ خط کے معاملے میں ملزم کا موقف ہی درست تھا۔

”خط کو تو مقتولہ کی والدہ نے پرزے پرزے کرکے چولھے میں ڈال دیا تھا لہٰذا اس کے ذکر پر مٹی ڈالتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اس امر کی تو آپ تصدیق کرتی ہیں نا کہ مقتولہ اور ملزم ایک دوسرے کی محبت میں گردن گردن تک دھنس چکے تھے اور ان کی اوّلین خواہش یہی تھی کہ وہ جلد از جلد شادی کرلیں......؟“

”جی ہاں، ایسے ہی حالات تھے۔“

”مگر مقتولہ کے والدین ملزم کو ناپسند کرتے تھے۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لہٰذا انہوں نے پہلی فرصت میں نہ صرف یہ کہ مقتولہ کی منگنی اس کے کزن فیصل سے کردی بلکہ ایک ماہ کے بعد ان کی شادی کی تاریخ بھی مترر کردی تھی؟“

صوفیہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

”فیصل سے شادی کی تاریخ طے ہونے پر مقتولہ سخت پریشان ہوگئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس موقع پر ملزم کا کیا ردِعمل تھا؟“

”جہاں تک، میری معلومات ہیں، ملزم کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔“

”آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟“

”مجھے سب کچھ مقتولہ کی زبانی پتا چلتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ملزم کو صرف دکھ ہوا تھا یا اس نے کسی شدید ردِعمل کا اظہار بھی کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے میری توقع کے برخلاف اور ملزم کی حمایت میں جواب دیا۔ ”ملزم نے کسی منفی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ الٹا اس نے مقتولہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ والدین کی خواہش کے سامنے سر جھکا دے۔“

”پھر ملزم کی اس نصیحت پر مقتولہ نے کیا جواب دیا تھا؟“

”مقتولہ اپنے کزن فیصل کو سخت ناپسند کرتی تھی۔“ گواہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ملزم کی بزدلانہ پالیسی کے باعث وہ مجبور ہوگئی تھی ورنہ وہ تو ایک سنگین قدم اٹھانے کو بھی تیار تھی......“

”صوفیہ صاحبہ!“ میں نے نہایت ہی نرمی کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ”معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ مقتولہ کس نوعیت کا سنگین قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ آپ کی رازدار سہیلی تھی۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ اس کے ارادے سے واقف نہ ہوں......؟“

”وہ ملزم کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔“ صوفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اس نے وقوعہ کے روز مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی خواہش کے بارے میں آج رات ملزم کو بتائے گی اور اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ لوگ گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کرلیتے ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

”مقتولہ کے اس باغیانہ منصوبے پر ملزم نے کس ردعمل کا اظہار کیا تھا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”وقوعہ کی رات جب مقتولہ میرے گھر سے رخصت ہوئی تو پھر اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اگلی صبح مجھے پتا چلا کہ اسے قتل کردیا گیا ہے۔“

”آپ کی مقتولہ سے ملاقات نہیں ہوسکی لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وقوعہ کی رات مقتولہ نے ملزم کے سامنے اپنی تجویز رکھی تھی مگر ملزم نے ایسی حماقت سے صاف انکار کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے زیرِتعمیر عمارت میں چھوڑ کر وہ اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا تھا۔ جب ملزم مقتولہ سے رخصت ہوا تو وہ زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک تھی۔“

وہ لاتعلقی کے سے انداز میں بولی۔ ”ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔“

”صوفیہ صاحبہ! آپ کو مقتولہ اور ملزم کے عشقیہ مراسم کی پل پل کی خبر تھی۔“ میں نے قدرے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ”جب آپ کو یہ صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے ایک ہونے کے امکانات نہیں ہیں اور مقتولہ کی اس کے کزن سے شادی کی تاریخ بھی طے ہوچکی ہے تو ایسی صورتِ حال میں جب مقتولہ نے گھر سے بھاگ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ کا فرض بنتا تھا، آپ فوری طور پر مقتولہ کے والدین کو اس کے خطرناک منصوبے سے آگاہ کرتیں۔ آپ نے اس معاملے کو کیوں چھپائے رکھا۔ ہوسکتا ہے، آپ اس بات کو کھول دیتیں تو مقتولہ جان سے نہ جاتی......؟“

”موت کا ایک وقت مقرر ہے وکیل صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے اس معاملے کو کھولنے یا چھپانے سے وہ وقت بدل نہیں سکتا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو میری زبان نہ کھلنے کا سبب یہ تھا کہ مقتولہ نے اس سلسلے میں مجھے بڑی پکی قسم دے رکھی تھی۔“

”کیا مقتولہ کی وہ قسم اس کی زندگی سے زیادہ اہم تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں!“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”اگر مجھے پتا ہوتا کہ وقوعہ کی رات میری سہیلی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا تو میں کبھی اور کسی قیمت پر اسے زیرِتعمیر عمارت میں نہ جانے دیتی اور اگر وہ زبردستی ملزم سے ملنے کی ضد کرتی تو میں فی الفور اس کے والدین کو صورتِ حال سے آگاہ کردیتی۔“

”ٹھیک ہے...... اپنی سہیلی مرحوم نادرہ کے لیے میں آپ کے دلی جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں مقتولہ اور ملزم کے درمیان یہ پیار و محبت کا سلسلہ کتنے عرصے سے چل رہا تھا؟“

”لگ بھگ ایک سال سے۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”ایک سال اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”مقتولہ آپ کی گہری اور رازدار سہیلی تھی۔ وہ اپنے اور ملزم کے مابین ہونے والی پیار بھری باتوں کے بارے میں یقیناً آپ کو بتاتی ہوگی؟“

”جی ہاں، وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”جبھی تو میں یقین کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی شدت کے ساتھ چاہتے تھے۔“

”مقتول، ملزم کے مزاج، عادات اور عمومی رویے کا بھی ذکر کرتی ہوگی۔“ میں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے مقصد کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”کیا کبھی تنہائی میں ملزم نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی...... مطلب یہ کہ مقتولہ نے کبھی آپ کو ملزم کے جارحانہ فعل یا طرزِعمل کے بارے میں بھی کچھ بتایا تھا۔“

”نہیں۔“ اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکی۔ ”مقتولہ نے ملزم کی ایسی کسی حرکت کے بارے میں مجھ سے کبھی کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!“ میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کی معزز گواہ کے بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ملزم ہوس پرست یا شیطانی ذہنیت کا مالک ہرگز ہرگز نہیں۔ ملزم اور مقتولہ کے درمیان کم و بیش ایک سال تک عشق و محبت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں وہ دونوں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر تنہائی میں بھی وقت گزارتے رہے لیکن ملزم نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر کبھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ملزم کی طرف سے کسی بےہودگی یا بدتمیزی کا ریکارڈ بھی نہیں ملتا۔ دست درازی اور مجرمانہ حملہ تو بہت دور کی بات ہے، ملزم نے کبھی تنہائی میں مقتولہ سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ استغاثہ کی گواہ صوفیہ کا بیان ملزم کے شریف النفس اور باکردار ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ایسا امن پسند اور صلح جو انسان اپنی محبت کو نہ تو داغ دار کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”جنابِ عالی! اس کیس میں پے در پے سامنے آنے والے متعدد جھول سے ثابت ہوتا ہے کہ میرا موکل ملزم کاشف محمود بالکل بےگناہ اور محبت کرنے والا ایک صلح جو اور باکردار شخص ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثال کے طور پر......“

میں نے ایک مرتبہ پھر تھوڑا توقف کرکے یکے بعد دیگرے وکیل استغاثہ اور اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر بشیر احمد کی جانب طنزیہ نظر سے دیکھا اور اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مثال کے طور پر استغاثہ کی جانب سے جو چالان

پیش کیا گیا ہے اس کے ساتھ فنگر پرنٹس کی رپورٹ منسلک نہیں ہے جبکہ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جب کسی شخص کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو مقتولہ کی گردن پر قاتل کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات بن جاتے ہیں۔ ان فنگر پرنٹس کو مخصوص طریقے سے اٹھا کر گرفتار شدہ کسی بھی مشتبہ شخص کے فنگر پرنٹس سے میچ کیا جاسکتا ہے لیکن زیر سماعت کیس میں استغاثہ کی طرف سے ایسی کوئی زحمت نہیں کی گئی اور جب میں نے معزز عدالت کے روبرو اس کیس کے تفتیشی افسر سے یہی سوال کیا تو اس کا جواب تھا...... ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی...... میری اور قانون کی نظر میں یہ خاصا نامعقول جواب ہے، بہر حال، آگے بڑھتے ہیں......‘‘ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’مقتولہ کے والدین خصوصاً مقتولہ کی والدہ سلطانہ کا یہ دعویٰ ہے کہ ملزم نے انہیں ایک دھمکی آمیز خطرناک خط لکھا تھا جس میں اس نے مقتولہ کے والدین کو خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر انہوں نے مقتولہ کی شادی اس سے نہ کی تو انہیں زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔ افسوس کا پہلو یہ ہے کہ استغاثہ کی جانب سے اس خط کے متن کو بنیاد بنا کر ملزم کو قاتل ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملزم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے پہلے مقتولہ کی عزت کو پامال کیا پھر گلا گھونٹ کر اسے موت سے ہمکنار کردیا تاکہ اس کے والدین کو نمونۂ عبرت دکھا سکے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ استغاثہ ملزم سے منسوب اس خط کو دستاویزی ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مذکورہ خط مقتولہ کی موت سے کئی روز پہلے نذر آتش کردیا گیا تھا اور آخری بات......‘‘ میں نے ایک مرتبہ پھر ڈراماائی انداز میں رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

’’آخری بات ملزم کے کردار اور فطرت کے حوالے سے ہے۔ استغاثہ کی معزز گواہ صوفیہ کا بیان اس امر کا ثبوت ہے کہ ملزم اور مقتولہ کو کئی مرتبہ تنہائی میں ملاقات کے مواقع میسر آئے مگر ملزم نے کبھی ان مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی جو اس کے مضبوط کردار کو ثابت کرتی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری پُرزور اپیل ہے کہ حالات و واقعات کی روشنی میں میرے موکل کو بے گناہ و بے قصور جانتے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر کیے جائیں۔‘‘

’’آبجیکشن یور آنر!‘‘ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کو ظاہر کرنے کے لیے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

جج نے چونک کر سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

وہ اپنے ’’آبجیکشن‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’یور آنر! میرے فاضل دوست نے قبل از وقت دلائل کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ ابھی استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ مکمل نہیں ہوا۔‘‘

جج نے استغاثہ کی جانب سے دائر گواہوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ’’بشارت مرزا کی گواہی ابھی باقی ہے......‘‘ پھر اس نے گردن اٹھا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور استفسار کیا۔

’’وکیل صاحب! آپ اپنے گواہ بشارت مرزا کو کب پیش کررہے ہیں؟‘‘

’’آئندہ پیشی پر جنابِ عالی!‘‘ وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ’’بیگ صاحب! آپ ڈیفنس میں کتنے گواہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟‘‘

’’میں سمجھتا ہوں، ایک ہی گواہ سے کام چل جائے گا۔‘‘ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

’’او کے......!‘‘ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’استغاثہ اور ڈیفنس آئندہ پیشی پر ان مذکورہ گواہوں کو عدالت میں پیش کردے تاکہ اس کیس کا فیصلہ جلد از جلد سنایا جاسکے۔‘‘

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت اختتام پذیر ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

XXX

آئندہ پیشی پر میں نے صفائی کے گواہ اور ملزم کے دوست عارف کو پہلے بھگتانے کی درخواست کی جسے عدالت نے فوراً قبول کرلیا۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ گواہ کا آج بروقت اپنی نوکری پر پہنچنا ضروری ہے لہٰذا اس کا بیان پہلے ریکارڈ کرلیا جائے۔ عدالت نے اس بات کی بخوبی اجازت دے دی تھی۔

عارف وہی نوجوان تھا، ملزم جس کے ساتھ وقوعہ کی رات ایک انگلش فلم کا آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم

کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوعہ کی رات دس اور بارہ کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب ملزم، عارف کے ساتھ ایک مقامی پکچر ہاؤس میں بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا لہٰذا اس کے نادرہ کے قتل میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عارف سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو میں ضروری جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں سوال کیا۔

’’عارف صاحب! جس رات مقتولہ نادرہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا وہ رات آپ کی یادداشت میں محفوظ تو ہوگی؟‘‘

’’جی ہاں، مجھے سب یاد ہے۔‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

’’وقوعہ کی رات ملزم کاشف سے آپ کی ملاقات کتنے بجے ہوئی تھی؟‘‘

’’لگ بھگ سوا نو بجے رات۔‘‘

’’آپ اس سے ملنے گئے تھے یا یہ آپ کے پاس آیا تھا۔‘‘

’’یہ ہمارے پاس آیا تھا۔‘‘

’’ہمارے پاس......‘‘ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں جواباً پوچھا۔ ’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ......‘‘ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں اس وقت اپنے دو دوستوں وسیم اور آفتاب کے ساتھ اپنی گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ کاشف ہمارے پاس آیا اور ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہونے لگی۔ یہ مجھے خاصا اداس اور الجھا ہوا نظر آیا۔ میں بھی اس دن کافی بور ہو رہا تھا۔ میں نے کاشف کی اداسی اور اپنی بوریت دور کرنے کے لیے اس کے سامنے پکچر کا منصوبہ رکھا۔ یہ فوراً تیار ہوگیا پھر ہم وسیم اور آفتاب کو وہیں چھوڑ کر پکچر دیکھنے چلے گئے تھے۔‘‘

’’اس رات تم لوگوں نے کون سی پکچر دیکھی تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہ ایک انگلش پکچر تھی۔‘‘ گواہ نے بتایا۔ ’’بروس لی کی...... مار دھاڑ سے بھرپور...... فلم کا نام تھا، وے آف دی ڈریگن......!‘‘

’’او کے......‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے استفسار کیا۔ ’’وقوعہ کی رات تم لوگ کتنے بجے پکچر ہاؤس پہنچے تھے؟‘‘

’’میرا خیال ہے، اس وقت رات کے پونے دس بجے ہوں گے۔‘‘ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ’’کیونکہ جب ہم ٹکٹ لے کر ہال کے اندر داخل ہوئے تو اسکرین آن ہوچکا تھا اور آنے والی فلموں کے ٹریلر دکھائے جارہے تھے۔‘‘

’’تم لوگ فلم دیکھ کر کتنے بجے پکچر ہاؤس سے باہر نکلے تھے؟‘‘

’’بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے......‘‘

’’تم لوگ اس رات گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟‘‘

’’کم و بیش ساڑھے بارہ بجے رات۔‘‘

’’ذرا سوچ کر بتائیں عارف صاحب!‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔ ’’وقوعہ کی رات ملزم کاشف سوا نو بجے سے لے کر ساڑھے بارہ بجے تک آپ کے ساتھ رہا تھا۔ کیا اس دوران میں تھوڑی دیر کے لیے وہ آپ سے جدا بھی ہوا تھا؟‘‘

’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘ وہ پوری قطعیت سے بولا۔

’’یعنی آپ حلفیہ یہ بات کہنے کو تیار ہیں کہ وقوعہ کی رات......‘‘ میں نے ڈراماائی انداز میں پوچھا۔ ’’ملزم کاشف رات دس بجے سے بارہ بجے کے درمیان ایک لمحے کے لیے بھی آپ کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوا تھا؟‘‘

’’جی ہاں، میں اس حقیقت کے بیان کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔‘‘ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

’’آخری سوال......!‘‘ میں نے صفائی کے گواہ عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’وقوعہ کی رات ملزم کاشف نے لگ بھگ تین گھنٹے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہونا چاہیے کہ مذکورہ رات آپ کے دوست اور اس کیس کے ملزم کاشف محمود نے کس قسم کا لباس پہنا ہوا تھا؟‘‘

’’جی ہاں...... اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ اس نے بڑے وثوق سے اثبات میں گردن ہلائی۔

’’معزز عدالت کے سامنے اس لباس کی تفصیل بیان کریں؟‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’کاشف نے اس رات سیاہ پینٹ اور چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔‘‘ گواہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ’’شرٹ والے چیک کی دھاریاں سبز اور جامنی رنگ کی تھیں۔‘‘

’’آر یو شیور......؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یس!" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "آئی ایم شیور......!"

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! صفائی کا گواہ اس امر کا دعویدار ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم کاشف دس اور بارہ بجے کے دوران میں جائے وقوعہ سے کافی دور ایک مقامی پکچر ہاؤس میں سو فیصد اس کے ساتھ تھا لہٰذا اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کسی بھی زاویے سے مقتولہ نادرہ کے قتل میں ملوث رہا ہو۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیٹس آل یور آنر......!"

صفائی کے گواہ عارف کو عدالت سے جانے کی اجازت مل گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وٹنس باکس میں استغاثہ کا گواہ بشارت مرزا آ کر کھڑا ہو گیا۔

بشارت مرزا کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ پستہ قامت کا مالک ایک فربہ انداز شخص تھا۔ سر کے بال کھچڑی اور توند باہر کو نکلی ہوئی۔ پیشے کے اعتبار سے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وہ ایک پراپرٹی ایجنٹ تھا۔ اس کی پراپرٹی کی دکان لانڈھی کے علاقے میں واقع تھی جبکہ رہائش زیر تعمیر عمارت کے پچھواڑے تھی۔ اس کے مکان کی پشت زیر تعمیر عمارت کی پشت کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ بشارت مرزا اس مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی فیملی اندرونِ سندھ کے علاقے میر پور خاص میں تھی۔

استغاثہ کے آخری اور سب سے اہم گواہ بشارت مرزا نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا دیا تو جرح کی غرض سے وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں کہ ملزم کے ایک خیر خواہ معروف اور جید صحافی خورشید عباسی نے اس کیس کے سلسلے میں مجھ سے گراں قدر تعاون کیا تھا اور کیس کے جن مختلف کرداروں کے حوالے سے اس نے مجھے معلومات فراہم کی تھیں ان میں سرفہرست استغاثہ کا گواہ بشارت مرزا ہی تھا۔

"بشارت صاحب!" وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ درست ہے کہ ملزم کو آپ پہلے سے جانتے تھے؟"

"جی ہاں، میں تو اسے اکثر ادھر محلے میں دیکھا کرتا تھا۔" گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن کبھی میرے اس کے ساتھ مراسم وغیرہ نہیں رہے۔"

"یہاں مراسم وغیرہ کا کوئی تذکرہ بھی نہیں۔" وکیل استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے وقوعہ کی رات ملزم کو جائے واردات سے جاتے ہوئے دیکھا تو آپ کو پہچاننے میں کوئی دشواری یا مغالطہ تو نہیں ہوا تھا؟"

"مغالطے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جناب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"بشارت صاحب! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ جب آپ نے وقوعہ کی رات ملزم کو زیر تعمیر عمارت سے نکلتے دیکھا اس وقت رات کا کیا بجا تھا؟" وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے، اس وقت رات کے ساڑھے دس یا گیارہ بجے کا وقت تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔

"زیر تعمیر عمارت سے نکلتے ہوئے ملزم کی کیفیت کیا تھی......؟"

"یہ بہت گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔" گواہ نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے اور سر کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایسی افراتفری کے عالم میں زیر تعمیر عمارت سے نکلا تھا جیسے اسے کہیں جانے کی جلدی ہو۔"

اس دوران میں میرا موکل اور اس کیس کا ملزم کاشف چپ چاپ اکیوزڈ باکس میں کھڑا تھا۔ کسی بھی کیس کی سماعت کے وقت ملزم کی کیفیت بڑی حسرت ناک ہوتی ہے۔ اس کا جی تو بہت کچھ کہنے کو مچل رہا ہوتا ہے مگر اپنے خلاف ہر تلخ و ترش بات سن کر اسے خاموش رہنا پڑتا ہے۔ یہ دراصل اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ عدالت کی جانب سے اسے ازخود کچھ بھی بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ عام زندگی میں انسان اپنے خلاف جھوٹ سن کر چند سیکنڈ کے لیے بھی خاموش نہیں رہ سکتا لیکن کٹہرے میں کھڑے ملزم کو اپنے خلاف ہر جھوٹ اور الزام چپ چاپ اور صبر و تحمل سے سننا پڑتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میری ہدایت کے عین مطابق، کاشف بڑے عزم کے ساتھ بادِ مخالف کے سامنے ثابت قدم کھڑا تھا۔

وکیل استغاثہ نے مزید دو چار سوالات کے بعد جر ختم کی تو جج کی اجازت پا کر میں نے بشارت مرزا کو گھیر لیا۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کیا اور اسے ذرا بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ آگے چل کر میں اسے دھوبی سوڈا سے دھونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

"بشارت مرزا صاحب!" میں نے اسے دوستانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میں آپ کو مرزا صاحب کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟"

"میں بھلا کیوں اعتراض کروں گا وکیل صاحب!" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "اکثر لوگ مجھے مرزا صاحب ہی کہتے ہیں۔"

"مرزا صاحب! ادھر میر پور خاص کا کیا حال احوال ہے؟"

میرے سوال پر وہ چونک اٹھا۔ "کیا مطلب جناب......؟"

"مطلب صاف اور واضح ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق آپ کراچی میں بالکل اکیلے رہتے ہیں۔ آپ کی فیملی ادھر میر پور خاص میں ہے۔"

"جی...... جی ہاں۔" وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"آپ کتنا عرصہ پہلے میر پور خاص اپنی فیملی سے ملنے گئے تھے؟"

"کوئی دو ماہ پہلے......" اس نے جواب دیا اور الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "اگر مائنڈ نہ کریں تو اپنی بیوی اور بچوں کے نام بتا دیں؟"

"میری بیوی کا نام عروسہ اور بچوں کے نام شفقت اور صبا ہیں؟" اس نے تعامل کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہیں...... یا...... تھے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

"کک...... کیا...... مطلب......" وہ بوکھلا گیا۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"بچے تو ہر حال میں باپ ہی کے رہتے ہیں۔" میں نے خورشید عباسی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔ "چاہے وہ ماں کے پاس پروان چڑھیں یا باپ کی نگرانی میں پرورش پائیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عروسہ پچھلے ایک سال سے آپ کی بیوی نہیں رہی۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......؟" وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ایک سال پہلے عروسہ نے آپ سے طلاق لے لی تھی...... آپ کی بدکرداری کے سبب......!"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "جنابِ عالی! اس وقت عدالت میں نادرہ مرڈر کیس زیر سماعت ہے اور میرے فاضل دوست استغاثہ کے معزز گواہ کے خانگی حالات کا ذکر چھیڑ کر غیر متعلقہ بحث میں عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں...... یہ گواہ کی عزت کو سرِعدالت اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب عالی!" میں نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں جج سے کہا۔ "میں

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

نے ایک تلخ حقیقت کی تصدیق چاہی ہے۔ اگر استغاثہ کا گواہ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تو میں اصرار نہیں کروں گا کیونکہ سبزی منڈی میر پور خاص والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ عروسہ نے کن وجوہات کی بنا پر بشارت مرزا سے طلاق لی تھی......"

جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ گواہ کے ماضی کو ایک طرف رکھ کر زیر سماعت کیس کے حوالے سے گواہ پر جرح کریں۔"

میں نے جج کی تازہ ترین ہدایت کے مطابق استغاثہ کے گواہ بشارت مرزا سے پوچھا۔ "مرزا صاحب! آپ کا مکان زیر تعمیر عمارت کے پچھواڑے واقع ہے۔ جس وقت آپ نے ملزم کو زیر تعمیر عمارت سے نکلتے دیکھا، آپ کہاں تھے؟"

"میں اپنے مکان کی چھت پر ٹہل رہا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔

"چھت پر ٹہل رہے تھے...... خیریت؟"

"اس رات بہت زیادہ گرمی اور حبس تھا۔" اس نے بتایا۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لہٰذا میں تازہ ہوا کی تلاش میں چھت پر چڑھ گیا تھا"

"آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ جب آپ نے ملزم کو زیر تعمیر عمارت سے نکلتے دیکھا، اس وقت رات کے ساڑھے دس یا گیارہ بجے تھے......؟"

"جی ہاں...... میں نے یہی بتایا ہے۔" وہ تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس وقت تو ملزم اپنے ایک دوست عارف کے ساتھ مقامی سینما میں بیٹھا ایک انگلش پکچر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اور مذکورہ پکچر ہاؤس جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر واقع ہے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"مرزا صاحب! آپ نے وقوعہ کی رات زیر تعمیر عمارت میں سے کسی اور کو تو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا......؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!" وہ بڑے قطعی لہجے میں بولا۔ "میں اس کو پہچاننے میں غلطی کر ہی نہیں سکتا۔"

"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کے دوست عارف نے غلط بیانی سے کام لیا ہے......؟"

"جی...... بالکل...... ظاہر سی بات ہے......"

"لیکن مرزا صاحب......!" میں نے غیر محسوس انداز میں اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ "عارف کے علاوہ وسیم اور آفتاب نامی دو ایسے افراد بھی اس دنیا میں موجود ہیں اور ضرورت پڑنے پر عدالت میں گواہی دینے بھی آ سکتے ہیں جنہوں نے وقوعہ کی رات سوا نو سے ساڑھے نو بجے کے درمیان ملزم سے گپ شپ کی تھی اور ملزم کو عارف کے ساتھ پکچر ہاؤس کی جانب روانہ ہوتے دیکھا تھا......؟"

"یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "عارف، وسیم اور آفتاب چونکہ ملزم کے گہرے دوست ہیں اس لیے وہ اسے بے گناہ ثابت کرنے کی خاطر کوئی بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔"

"لیکن آپ کی نظر میں ملزم بے گناہ نہیں۔" میں نے اسے پھانسنے کے لیے جال پھینکا۔ "آپ کے خیال میں نادرہ کو بے آبرو کر کے اسی شخص نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟"

"جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"کیا آپ نے ملزم کو مقتولہ کی آبرو ریزی کرتے ہوئے یا اسے قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟" میں نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

"نن...... نہیں......" وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ "مم...... میں نے...... ایسا کب کہا ہے......!"

"ابھی...... چند سیکنڈ پہلے!" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ ملزم نے مقتولہ نادرہ کو بے آبرو کر کے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آپ کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس دہری سنگین واردات کے یا تو چشم دید گواہ ہیں یا پھر اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے......؟"

"ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب......!" وہ کنی کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں نے بس اس رات ملزم کو زیر تعمیر عمارت سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا......"

"آپ کے بیان کے مطابق ملزم جب وقوعہ کی رات زیر تعمیر عمارت میں سے نکلا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔" میں نے آہستہ آہستہ پھندا کستے ہوئے کہا۔ "اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے اور سر کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ افراتفری کے عالم میں تھا جیسے اسے کہیں جانے کی بہت جلدی ہو...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟"

"نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "ملزم کی یہی کیفیت تھی۔"

"ملزم کو دیکھ کر فوری طور پر آپ کے ذہن میں کیا خیال آیا تھا؟"

"یہی کہ اس نے...... زیر تعمیر عمارت میں کوئی گڑبڑ کی ہوگی۔" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ "جبھی وہاں سے جلدی میں فرار ہو رہا تھا۔"

"ملزم کے جانے کے بعد آپ نے زیر تعمیر عمارت میں جا کر صورتِ حال جاننے کی کوشش کی تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"نن...... نہیں!" اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔ "یہ تو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ جس انداز میں ملزم وہاں سے نکلا تھا اس سے آپ کے اندر بے پناہ تجسس بیدار ہو جانا چاہیے تھا۔ انسانی فطرت سے مجبور ہو کر یا تو آپ کو زیر تعمیر عمارت کے اندر جا کر خود صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے تھا یا کسی اور شخص کو اس واقعے سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ کو تو ویسے بھی وقوعہ کی رات نیند نہیں آ رہی تھی پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"وہ جناب...... بات دراصل یہ ہے کہ......!" وہ برا سا منہ بنا کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے پرائے پھڈوں میں ٹانگ پھنسانے کا بالکل شوق نہیں۔ یہ تو پولیس نے پوچھ گچھ کی تو مجھے زبان کھولنا پڑی۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "آپ سے آخری سوال مرزا صاحب......!"

وہ چونک کر ہوشیاری سے سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ میں نے سنسنی خیز انداز میں پوچھا۔

"مرزا صاحب! وقوعہ کی رات جب آپ گرمی، حبس اور بے خوابی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے گھر کی چھت پر ٹہل رہے تھے اور آپ نے اپنے مکان کے پچھواڑے واقع زیر تعمیر عمارت کے اندر سے ملزم کو کافی افراتفری کے عالم میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا تو اس وقت ملزم کے بدن پر کون سا لباس تھا؟"

"مم...... میرا خیال ہے......" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔"

"تو یہ آپ کا خیال ہے...... یقین نہیں؟" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

اسی لمحے حاضرین عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، بعض سامعین اور ناظرین کی ہنسی بھی چھوٹ گئی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے صفائی کا گواہ عارف، ملزم کے لباس کی تشریح کر کے جا چکا تھا۔ حاضرینِ عدالت کے طرزِ عمل نے گواہ کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ وہ پریشان ہو کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"ادھر نہیں، ادھر دیکھو!"

وہ گھبرا کر میری جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے آپ سے تم پر آتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے وقوعہ کی رات ملزم کو سفید شلوار قمیص میں ملبوس زیر تعمیر عمارت سے افراتفری کے عالم میں نکلتے دیکھا تھا......؟"

"جج...... جی...... جی ہاں۔" وہ پیشانی کا پسینا پونچھتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولا۔

"لیکن ملزم کا تو دعویٰ ہے کہ وقوعہ کی رات اس نے نیلے رنگ کا شلوار قمیص پہنا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور صفائی کے گواہ عارف نے ملزم کے بیان کی تصدیق بھی کی ہے۔"

"یہ...... دونوں...... جھوٹ بولتے ہیں۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"سائنسی اور میڈیکل ریسرچ کے مطابق جب کوئی شخص دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوتا ہے تو اس کے منہ کے اندر پایا جانے والا اسلائیوا (لعاب دہن) خشک ہو جاتا ہے اور اسے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت آپ کے ساتھ ہو رہا ہے......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ "جبکہ تھوڑی دیر پہلے صفائی کے گواہ عارف نے بڑی رسان سے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم کاشف محمود سیاہ پتلون اور چیک دار شرٹ میں ملبوس تھا......"

"لل...... لیکن آپ نے تو...... ابھی بتایا ہے کہ...... ملزم نے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔

"میں نے جو بھی کہنا تھا وہ کہہ دیا۔" میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ "اب آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ وقوعہ کی رات آپ نے ملزم کو کس لباس میں زیر تعمیر عمارت سے نکلتے دیکھا تھا کیونکہ لباس کے حوالے سے آپ کی آنکھیں تو دھوکا کھا ہی نہیں سکتیں...... آپ نے تو اس رات اپنے مکان کی چھت پر کھڑے کھڑے ملزم کے چہرے پر سجے پریشانی کے تاثرات اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھ لیا تھا......؟"

وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"پپ...... پانی......!"

"پانی ملے گا مگر...... میرے سوال کے جواب کے

بعد......!''

''مجھے......سوچنے دیں۔'' وہ سراسیمہ نظر سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مم......میں ابھی بتاتا ہوں......''

''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''استغاثہ کے گواہ بشارت مرزا کی دروغ گوئی روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مرزا صاحب کو تفتیش کی غرض سے اگر حوالہ پولیس کیا جائے تو نہایت ہی کارآمد معلومات حاصل ہوسکتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کارآمد معلومات کی روشنی میں نادرہ کے اصل قاتل کا چہرہ بھی چمک اٹھے گا......''

پولیس کے حوالے کرنے کا سن کر بشارت مرزا بری طرح ہراساں ہوگیا۔ وہ کٹہرے سے باہر نکلتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''مم...... میں نے نادرہ کو...... قتل نہیں کیا...... مجھے جانے دیں...... میں خود کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گا...... میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے...... میں جا رہا ہوں۔''

جج نے بدلتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر حکم دیا کہ استغاثہ کے گواہ بشارت مرزا کو فوراً گرفتار کیا جائے۔

جج کا حکم سن کر ایک جانب پولیس حرکت میں آئی تو دوسری طرف پٹے والوں نے آناً فاناً میں عدالت کا دروازہ بند کردیا۔ اگلے ہی لمحے پولیس نے فوری کارروائی کرکے بشارت مرزا کو گرفتار کرلیا۔

XXX

جب کوئی شخص اپنے جرم کے ٹھوس شواہد کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانے کے لیے پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ بشارت نے بھی نادرہ کے قتل کا اقبال کرلیا تھا۔

واقعات کے مطابق بشارت مرزا کو اس راز سے آگاہی ہوگئی تھی کہ مقتولہ اور ملزم زیر تعمیر عمارت میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ اس نے اپنے گھر کی عقبی دیوار کا ایک بلاک توڑ کر چھوٹا سا روزن بنا لیا تھا جہاں کان لگا کر وہ ان کی محبت بھری باتیں سنا کرتا تھا۔ وقوعہ کی رات مقتولہ اور ملزم کی گفتگو نے بشارت مرزا کو چونکا دیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مقتول، ملزم کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے پر اصرار کررہی تھی لیکن ملزم اسے سمجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، بالآخر ان کے بیچ ہلکی سی تلخ کلامی بھی ہوئی اور پھر ملزم، مقتولہ کو زیر تعمیر عمارت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ مقتولہ اسے بزدلی کے طعنے دیتے ہوئے وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

اسی لمحے بشارت مرزا پر شیطان سوار ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ مقتولہ زیر تعمیر عمارت سے نکل کر اپنے گھر کا رخ کرتی، وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اپنے گھر کے اندر رہتے ہوئے مرزا نے نہ تو ملزم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے لباس کے بارے میں کچھ جانتا تھا لہٰذا چھت پر سے ملزم کو دیکھنے اور اس کی کیفیت اور لباس کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی بیان کیا تھا وہ جھوٹ کا پلندا تھا اور یہ جھوٹ اس نے اپنی بلا ملزم کے سر ڈالنے کے لیے بولا تھا۔

جب بشارت مرزا مقتولہ کے پاس پہنچا تو اس کی خواہش اور حواس مکمل طور پر شیطان کے قبضے میں تھے۔ مقتولہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جانے ہی والی تھی کہ بشارت نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ مقتولہ نے چیخنے چلّانے اور بشارت کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن بشارت کے اندر جاگتے چنگھاڑتے شیطان نے اس کی پیش نہ چلنے دی۔ بشارت نے ایک ہاتھ کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کے منہ اور ناک پر جما رکھا تھا تاکہ اس کی آواز اس عمارت سے باہر نہ نکل سکے، دوسرے ہاتھ سے وہ مقتولہ کو زیر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس چھینا جھپٹی میں مقتولہ کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا اور اسے چوٹیں بھی آئیں۔ سانس کی آمدوشد معطل ہونے کے باعث مقتولہ بے دم سی ہوکر ڈھے گئی۔ اس کے بعد بشارت مرزا کو اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

جب بشارت مرزا کے حواس ٹھکانے پر آئے تو وہ پکڑے جانے کے ڈر سے یک دم ہل کر رہ گیا۔ مقتولہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں سب کو بتاتی پھر اس کا بچنا ممکن نہ رہتا۔ پکڑے جانے کے خوف سے اس نے اضطراری انداز میں، گلا گھونٹ کر مقتولہ نادرہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر میرے موکل کو باعزت بری کردیا۔ بشارت مرزا کے اقبالِ جرم کے بعد عدالت کے لیے فیصلہ سنانا بہت آسان ہوگیا تھا۔

نادرہ ایک خودسر اور منہ زور لڑکی تھی۔ اگر اس نے کاشف کی بات مان لی ہوتی تو ایسی عبرت ناک موت اس کے حصے میں نہ آتی۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ مقدر میں جو دکھ اور پریشانی لکھی ہو، وہ بالآخر مل کر رہتی ہے......!

(تحریر: حُسام بٹ)

تہ دام

سلیم انور

دانہ ڈال کر پنچھی قید کرنے والے صیاد جب خود جال میں الجھتے ہیں تو بے بسی انہیں پھڑپھڑانے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایسے میں زمانہ ان پر ہنستا ہے اور گردش دوراں ان کے دائرہ اختیار کو تنگ کردیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتا ہوا حبس انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔

تہ دام آنے والے ایک بلند پرواز پنچھی کی روداد

میں عام طور پر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران اکتاہٹ دور کرنے کے لیے مسٹری اسٹوری میگزین خرید لیتا ہوں اور پُراسرار کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں لیکن اس مرتبہ مجھے کہانیاں پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ جہاز میں میرے برابر کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہوا شخص کسی بھی میگزین کے مطالعے سے کہیں زیادہ دلچسپ لگ رہا تھا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے روایتی لباس زیب

تن کیا ہوا تھا لیکن قدرے بے احتیاطی کے ساتھ۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹکا ہوا تھا اور پُرسکون براؤن آنکھوں کے اوپر بھویں خاصی گھنی تھیں۔

ٹیک آف سے قبل جب میں نے اس کے برابر میں درمیانی راستے کے ساتھ والی سیٹ سنبھالی تو اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں آغاز نہ کرسکا اور وہ بھی اس وقت تک خاموشی اختیار کیے رہا جب تک جہاز ہوا میں بلند نہیں ہوگیا پھر اشارہ ملنے پر ہم نے اپنے سیٹ بیلٹ کھول لیے۔

تب گفتگو کا آغاز اسی نے کیا۔ انداز دوستانہ اور رسمی تھا۔ ’’میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پُراسرار کہانیوں کے شیدائی ہو۔‘‘ اس نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے مسٹری اسٹوری میگزین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’میں حقیقت میں ان کہانیوں کا رسیا تو نہیں ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن ہوائی سفر کے دوران وقت گزاری کے لیے یہ کہانیاں میرے لیے خوش گوار ثابت ہوتی ہیں۔‘‘

’’میں بھی اصل میں پُراسرار کہانیوں کا حقیقی شیدائی تو نہیں ہوں لیکن میں یہ کہانیاں اس لیے پڑھتا ہوں کہ مجرموں کی نت نئی مجرمانہ ٹیکنکس سے باخبر رہو۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’یہ بات بہت سے لوگوں کو غلط رائے قائم کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کو خوش مزاجی میں لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ’’وہ سمجھ سکتے ہیں کہ تم کوئی عادی مجرم ہو جو اپنے ٹریڈ جنرلز کا مطالعہ کررہا ہے۔‘‘

میرے تبصرے پر وہ دھیمے انداز میں مسکرا دیا۔ ’’یہ بات ایسی بری نہیں ہے جیسی کہ تم سمجھ رہے ہو۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔ بینک پیسے کا کاروبار کرتا ہے اور پیسا مجرموں کی توجہ کھینچتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ میں ہر مشکل وقت کے لیے خود کو ریڈی رکھنا چاہتا ہوں، اگر وہ اس بینک میں کسی کارروائی کی کوشش کرتے ہیں جہاں میں کام کرتا ہوں۔‘‘

میں نے اس بات پر اثبات میں سرہلا دیا۔ تب وہ ملنسارانہ لہجے میں بولا۔ ’’میرا نام کولبائی ہے۔‘‘

’’اور میرا نام ڈکسن ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم سے مل کر خوشی ہوئی۔‘‘

’’میں خود بھی ایک مرتبہ مرچنٹس نیشنل بینک میں بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں مکس اپ ہوچکا ہوں۔‘‘ اس نے کیلی فورنیا کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ’’سو مجھے معلوم ہے کہ ایسے واقعات کیسے غیر متوقع طور پر رونما ہوتے ہیں۔‘‘

’’یہ تو بڑی دلچسپ داستان لگتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

یہ سن کر اس نے شانے اچکا دیے۔ ’’تم اسے دلچسپ کہہ سکتے ہو، آل رائٹ۔‘‘ پھر اس نے اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور بہ ظاہر لاتعلق سا ہوگیا۔

لیکن میں اس سے یہ کہانی اگلوانا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ خود اسے بیان کرے۔ ’’مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تم بور ہوجاؤ گے۔‘‘ اس نے کہا اور دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

’’میں بور نہیں ہوں گا۔‘‘ میں نے اپنے لہجے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’’تو پھر ٹھیک ہے، یہ کوئی طویل داستان بھی نہیں ہے۔ یہ واقعہ آج سے بیس برس پہلے پیش آیا تھا۔‘‘ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں جیسے اس واقعے کو اپنے ذہن میں تازہ کررہا ہو۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔

’’میں اس وقت بینک میں اسسٹنٹ کیشیئر تھا۔‘‘ اس نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ’’بلکہ درحقیقت ایک کلرک تھا۔ ہمارے بینک میں شبینہ ڈیپازٹ کی سہولیت مہیا تھی جہاں پر اس ٹاؤن کے تاجرات کو اپنے اسٹور بند کرنے کے بعد اپنے کیش کو محفوظ رکھنے کے لیے بینک میں ڈیپازٹ کرادیا کرتے تھے۔ ان دنوں میں تمام اسٹور جمعرات کی شب نو بجے تک کھلے رہتے تھے اس لیے جمعے کی صبح ہماری نائٹ ڈیپازیٹری میں اچھا خاصا کیش موجود ہوتا تھا۔‘‘

’’مجھے اس بارے میں بہ خوبی معلومات حاصل ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں فریسنو میں ایک اسپورٹنگ گڈز کا مالک ہوں۔‘‘

’’اوہ، واقعی؟ یہ اس ملک کا ایک عمدہ علاقہ ہے۔ بہرحال، بینک میں مجھے تفویض کردہ فرائض میں سے ایک صبح سویرے بینک میں پہنچنا، رات بھر کی جمع شدہ رقوم کو سمیٹنا، اس کی گنتی کرنا اور جب اسسٹنٹ کیشیئر بینک کھلنے کے وقت آجاتا تو تمام رقم اس کی میز پر اس کے سپرد کردینا شامل تھا لہٰذا ہمیشہ یہ میں ہی ہوتا تھا جو سب سے پہلے بینک پہنچتا تھا۔ دیگر بینک ملازم بینک کھلنے کے مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے سے آنا شروع ہوتے تھے لیکن میں ہر روز صبح آدھے گھنٹے سے بھی پہلے بینک میں موجود ہوتا تھا اور جانتے ہو، مجھے یہ کام پسند تھا اور بہت اچھا لگتا تھا۔ اس سے مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ کسی کے پہنچنے سے قبل میں ہی اس پورے بینک کا ذمے دار تھا اور اپنی مرضی سے آزادانہ نقل وحرکت کرسکتا تھا۔‘‘ میں نے قابل فہم انداز میں سرہلا دیا۔

’’بہرحال، ایک روز میں معمول کے مطابق صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں اپنے ریگولر کارنر پر بس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا جس میں بیٹھ کر میں اپنی ڈیوٹی پر جایا کرتا تھا۔ اتنے میں ایک گرے رنگ کی فورڈ سیڈان کار آئی اور بس اسٹینڈ کے برابر میں آکر میرے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ مجھے شہر جانے کے لیے لفٹ چاہیے؟ میں نے جواب دیا کیوں نہیں۔ تب ڈرائیور نے میرے لیے اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ میں فوراً ہی کار میں بیٹھ گیا۔‘‘

’’ایک مسٹری کہانی میں تمہیں اسی وقت شبہ ہوجانا چاہیے تھا کہ ایک اجنبی بلاوجہ تمہیں لفٹ کی پیشکش کررہا ہے جبکہ تم نے اس سے لفٹ لینے کا اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہیں نو تھینک یو کہہ کر اپنی بس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’غالباً مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن یہ بات قطعی میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں آئی کہ اس روز کوئی چال میرے خلاف زیرعمل ہے۔ فورڈ میں سوار ہونے کے بعد تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اور ڈرائیور کے عقب میں دو اور افراد پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں اور جس بات سے مجھے انتہائی زبردست جھٹکا لگا وہ یہ تھی کہ جو شخص داہنی جانب بیٹھا ہوا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لمبے بیرل والا ریوالور تھاما ہوا تھا اور اس ریوالور کا رخ عین میری جانب تھا۔ مجھ پر صدمے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی جو مجھے یاد رہ گئی تھی کہ اس گن کے سامنے بیرل پر وہ ابھار نما پرزہ نہیں لگا ہوا تھا جس سے نشانہ لیا جاتا ہے۔‘‘

’’لگتا ہے کہ کسی ماہر چوب کار نے اسے ریتی سے ہموار کردیا ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ایک قسم کا ٹارگٹ پستول۔ ایسے پستول میں اپنے اسٹور میں فروخت کرتا ہوں۔ وہ جوکر یقیناً دماغ چلا تھا جو اس قسم کی اسپورٹنگ گن کے ساتھ کوئی کام سرانجام دینے نکل کھڑا ہوا تھا۔‘‘

’’جہاں تک میرا تعلق تھا، وہ یقیناً دماغ چلا ہی تھا۔ اپنی حالت پر توجہ دلانے کے لیے میں نے نہ تو کچھ کہا اور نہ ہی کوئی واحد حرکت کی۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ جس شخص نے گن تھامی ہوئی تھی اس نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں نہ تو کسی قسم کی حرکت کروں اور نہ ہی میری کوئی آواز نکلے اور میرے لیے یہی ایک وجہ کافی تھی۔

ہم خاموشی سے بینک کی جانب رواں تھے لیکن نہایت متوازن رفتار کے ساتھ۔ ڈرائیور نے فورڈ بینک کے عقب میں وہاں کار روک دی جہاں سے میں ہمیشہ بینک کے اندر جایا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے روز کے معمول سے بہ خوبی واقف تھا۔ بینک کا عقبی حصہ ایک پتلی سی گلی میں واقع تھا اور عقبی دروازہ صرف بینک کے ملازمین استعمال کرتے تھے اور اتنی صبح پوری گلی سنسان پڑی تھی۔‘‘

’’ریوالور بردار شخص نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ’’ہم پہنچ گئے ہیں دوست۔ اب باہر نکل آؤ۔‘‘ اس نے مجھے کار سے نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ اور اس کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا ہوا اس کا ساتھی بھی باہر نکل آئے۔

تب میں نے پہلی مرتبہ ان دونوں کا چپکے سے جائزہ لیا۔ جس شخص نے ریوالور تھاما ہوا تھا وہ دراز قامت اور خاصا دبلا پتلا تھا۔ اس کے بالوں کی رنگت سنہری تھی۔ اس کا ساتھی موٹا تھا اور اس کے بال سیاہ گھنگھریالے تھے اور گردن کے عقب میں کالر تک آئے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

پھر دراز قامت ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ ’تم گاڑی کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔‘ اس کے بعد مجھ سے بولا۔ ’’اگر تم مائنڈ نہ کرو تو اب دروازہ کھول کر اندر چلتے ہیں۔‘ اس کا لہجہ نرم، شائستہ اور عجلت سے عاری تھا جیسے کہ وہ اس قسم کے کاموں کا روزمرہ کا عادی ہو یا ہوسکتا ہے کہ عادی رہا ہو۔

مجھے کسی قسم کی بحث کرنے کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیا کیونکہ لمبے بیرل والی گن میری پیٹھ پر چبھ رہی تھی لہٰذا میں نے اپنی چابیاں نکالیں اور دروازہ کھول دیا۔ جب میں تالے میں چابی لگا رہا تھا تو میری آستین اوپر ہوگئی اور میری نگاہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑگئی۔ اس وقت صرف سوا آٹھ بجے تھے۔ ابھی بینک کے گارڈ یا کسی دوسرے ملازم کے آنے میں خاصا وقت باقی تھا۔ مجھے کسی کے جلد آنے کی توقع بھی نہیں تھی لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ والٹ پر لگا ہوا ٹائم لاک بینک کھلنے کے وقت سے صرف چند منٹ پہلے پر سیٹ تھا اور مجھے یقین واقعی تھا کہ وہ والٹ کے بارے میں کچھ بھی

نہیں کرسکیں گے تا آنکہ وہ اوپننگ ٹائم تک انتظار کریں۔ ہم بینک کے اندر چلے گئے۔ اگر مجھے کسی قسم کی کوئی موہوم سی اُمید بھی تھی تو اسے دراز قامت کے چار الفاظ نے پارہ پارہ کردیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''دی نائٹ ڈیپازیٹری، جونیئر۔'' اور تب مجھے احساس ہوا کہ انہیں اس بات کا بہ خوبی علم ہے کہ میری روٹین کیا ہے۔ وہ یقیناً چند صبحوں تک یہ جائزہ لیتے رہے ہیں کہ میں بینک میں داخل ہونے کے بعد کیا کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کام کو اپنی زبان میں، کیسنگ دی جوائنٹ، یعنی ڈاکے کی غرض سے جائزہ لینا کہتے ہیں، یہی کہتے ہیں نا مسٹر ڈکسن؟''

کولبائی نے یہ کہہ کر متوقع نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے جرائم پیشہ طبقے کی مخصوص بولی کے الفاظ ادا کرنے پر ستائش کا خواہاں ہوں۔ یہ بولی بلاشبہ پُراسرار کہانیوں کے مطالعے سے اس کے علم میں آئی ہوگی۔

''ہاں۔'' میں نے کہا البتہ ایک باوقار ادھیڑ عمر بینک کلرک کے ہونٹوں سے اس قسم کے تاثرات سن کر مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

''وہ مجھے بہ زور طاقت بینک میں داخلی دروازے کے اندر دیوار میں بنی ہوئی نائٹ ڈیپازیٹری کی جگہ پر لے گئے۔'' کولبائی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان دنوں شیشے کے بنے ہوئے کیوبیکلز اور دروازوں پر کیمرے یا الیکٹرک آئی دروازے نہیں ہوا کرتے تھے جیسے کہ آج کل بینکوں میں ہوتے ہیں۔ ہمارے بینک کا داخلی دروازہ ریگولر اسٹیل فریم کا تھا اور نیچے کی جانب گھٹنوں تک کی اونچائی پر شیشہ لگا ہوا تھا جیسے کہ کسی بھی اسٹور کا دروازہ ہوتا ہے اور اس دروازے پر اندر کی جانب پٹیوں والی چلمن لگی ہوئی تھی تاکہ سہ پہر کی دھوپ سے ہمارے وائس پریذیڈنٹس میں سے ایک مسٹر جونسن کی آنکھوں کو بچایا جاسکے جن کی میز داخلی دروازے کے عین داہنی جانب ہوتی تھی۔ وہ جگہ سہ پہر براہ راست دھوپ کی زد میں آجاتی تھی اور روزانہ جب یہ وقت آتا تھا تو یہ چلمن گرادی جاتی تھی تاکہ مسٹر جونسن کی آنکھیں دھوپ سے محفوظ رہ سکیں اور یہ چلمن اسی طرح گری ہوئی چھوڑ دی جاتی تھی حتیٰ کہ اگلے روز جب میں صبح بینک پہنچتا تو میرا سب سے پہلا کام اس چلمن کو اوپر اٹھا دینا ہوتا تھا پھر میں نائٹ ڈیپازیٹری کو اکٹھا کرتا تھا۔''

یہ کہہ کر مسٹر کولبائی نے اپنی پُرسکون نظریں میری جانب گھمادیں اور قدرے ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔ ''تم دیکھ سکتے ہو کہ مجھے بینک کے اندر کس قسم کے بے تکے کام کرنے پڑتے تھے مسٹر ڈکسن۔ میں حقیقت میں ایک طرح کا دربان تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''اپنی پشت پر گن کی موجودگی کے باوجود میری چلمن اٹھانے کی عادت اتنی پختہ ہوچکی تھی کہ اس روز صبح میرے قدم خود بہ خود داخلی دروازے کے پاس مسٹر جونسن کی چلمن کی جانب اٹھ گئے۔ تب میرے عقب میں موجود ریوالور بردار نے فوراً ہی مجھے ٹوک دیا۔ ''تمہارے خیال میں تم کیا کرنے جارہے ہو، رک جاؤ۔'' میں اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ تب میں نے کہا۔ میں ہر روز صبح اس وینیشن بلائنڈ کو اوپر اٹھا دیتا ہوں۔ میں تو بس اسے اٹھانے جارہا تھا۔''

'آج ہم اس وینیشن بلائنڈ کو اوپر نہیں اٹھائیں گے۔ جونیئر اگر تم مائنڈ نہ کرو۔ تمہارے خیال میں ہم یہ گوارا کرسکتے ہیں کہ باہر فٹ پاتھ سے گزرنے والے ہر آدمی کو یہ دیکھنے کا موقع مل جائے کہ یہاں اندر کیا ہورہا ہے؟'

میں نے سوچا کہ ان ڈاکوؤں سے مزاحمت کے لیے مجھے تھوڑی بہت تو کوشش کرکے دیکھنی چاہیے۔ سو جب ہم شبینہ ڈیپازٹ والے حصے کے پاس پہنچے تو میں نے کہا۔ 'میں اسے کھول نہیں سکتا۔ اس کی ایک مخصوص چابی ہے اور وہ چابی صرف اسسٹنٹ کیشیئر کے پاس ہے اور وہ بینک کھلنے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا۔' میں نے یہ بات کہہ تو دی لیکن میرا لہجہ خوف کے باعث کچھ زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔

پستہ قد نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے بس اپنی جیب میں سے ایک گن نکال لی اور داخلی دروازے کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہ چلمن کی آڑ سے باہر سڑک کا اس طرح جائزہ لینے لگا کہ باہر سے کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑسکے لیکن دراز قامت، دبلے پتلے شخص نے اپنی گن کی نال اور زیادہ شدت سے میری ریڑھ کی ہڈی میں گھبودی اور قدرے غراتے ہوئے بولا۔ 'مجھے بنانے کی کوشش مت کرو، بسٹر! مجھے معلوم ہے کہ ہر روز صبح اسے کون کھولتا ہے۔ سو اس پر لپک لو اور مجھے انتظار مت کروانا۔ میرے اعصاب خاصے جھنجنا رہے ہیں۔' لیکن مجھے تو وہ کسی طرح نروس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔''

''لیکن تم ضرور نروس ہورہے ہوگے؟'' میں نے لقمہ دیا۔

مسٹر کولبائی نے پُرزور انداز میں سر ہلادیا۔ ''میں خوف زدہ تھا۔ ڈر کے مارے میرا جسم تقریباً اکڑ گیا تھا۔ میں نے ڈیپازیٹری بکس کی اپنی چابی نکالی اور نہایت عاجزی کے ساتھ اس کا تالا کھول دیا۔ بھلا میں اور کیا کرسکتا تھا؟''

''تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''وہ جمعے کی صبح تھی اور ڈیپازیٹری میں جمعرات کی رات کی تاجروں کی جمع کردہ نقد رقم کی ایک بڑی مقدار کے علاوہ بہت سارے چیک بھی موجود تھے۔ دراز قامت نے جب یہ رقم اور چیک دیکھے تو اس کے حلق سے اطمینان بھری غراہٹ سی بلند ہوئی۔

''اسے اکٹھا کرو۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔ ''اور اس میں رکھ دو۔'' اس نے ایک سیاہ بریف کیس میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا لیکن اس ممکن حد تک سستی سے کام کررہا تھا کہ ان پر ظاہر بھی نہ ہونے پائے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انہیں تھوڑی دیر کرواسکتا ہوں لیکن جب تمام نقد رقم اور تمام چیک میں نے بریف کیس میں رکھ دیے تو اس وقت گھڑی ابھی ساڑھے آٹھ ہی بجارہی تھی۔

اب مجھے یہ فکر لاحق ہورہی تھی کہ یہاں سے جاتے ہوئے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ میں اس معاملے میں کچھ زیادہ خوداعتمادی محسوس نہیں کررہا تھا۔ میں ان کے چہرے دیکھ چکا تھا۔ میں پولیس کو ان کا حلیہ بتاسکتا تھا۔ میں انہیں شناخت کرسکتا تھا اور میں نے ان کی فورڈ میں سواری کی تھی۔ میں ان کی کار کو شناخت کرسکتا تھا اور جب ہم بینک کی عقبی گلی میں کار سے نیچے اترے تھے تو میں نے کار کی لائسنس پلیٹ کا نمبر بھی زبانی یاد کرلیا تھا۔

دراز قامت مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اب فرش پر لیٹ جاؤ۔ بڑی اپنی پیٹھ کے بل۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔ ماربل کی لابی کے عین وسط میں فرش پر لیٹے ہوئے میں خود کو بے انتہا بے وقوف محسوس کررہا تھا اور میں پوری طرح خطرے کی زد میں تھا۔ دروازے پر کھڑا ہوا پستہ قد نہ صرف اپنی گن سے مجھے کور کیے ہوئے تھا بلکہ ساتھ دروازے کی نگرانی بھی کررہا تھا۔

دراز قامت نے ایک نگاہ اپنی دستی گھڑی پر ڈالی۔ عین اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ٹیلی فون داخلی دروازے کے پاس مسٹر جونسن کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ خالی بینک میں فون کی گھنٹی کی آواز فائر الارم کے مانند محسوس ہوئی۔ میں اس بری طرح سے چونکا تھا کہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اگر تم تصور کرسکتے ہو تو فرش پر پیٹھ کے بل لیٹا ہوا شخص کس طرح اچھلا ہوگا۔ وہ دراز قامت مجھ پر جھکا اور اپنے ریوالور کی نال میرے پیٹ میں چبھوتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ فون دیکھو۔'' اس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ اب اس کے لہجے کی نرمی اور ملائمت بالکل غائب ہوچکی تھی۔ ''فون کا جواب دو اور اپنا لب ولہجہ نارمل رکھنا، بسٹر ورنہ تم کوئی دوسری فون کال ریسیو کرنے کے لیے بھی زندہ نہیں رہو گے، اٹھو۔''

فون کی گھنٹی اب تیسری بار بج رہی تھی۔ ''ریسیور اپنے کان سے پرے رکھنا۔'' دراز قامت نے مجھ سے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''تاکہ میں بھی گفتگو سن سکوں۔''

میں فرش پر سے اٹھا اور میز کے پاس جاکر فون اٹھالیا۔ دراز قامت میرے ساتھ ساتھ تھا۔ پستہ قد نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی گن اب مجھے اپنے نشانے پر لیے ہوئے تھی۔ میں نے کھنکارتے ہوئے گلا صاف کیا اور صاف اور بلند آواز میں ریسیور میں کہا۔ ''ہیلو؟''

''کیا یہ مرچنٹس نیشنل بینک ہے؟'' دوسری جانب سے باریک سی آواز میں پوچھا گیا۔ میں نے ریسیور اپنے کان سے دور رکھا ہوا تھا تاکہ دراز قامت کو بھی آواز سنائی دے جائے۔ اس کی گن بہ دستور میری پیٹھ میں چبھ رہی تھی۔

''یس سر۔'' میں نے فون پر جواب دیا۔

'آج سہ پہر آپ کا بینک کس وقت تک کھلا رہے گا؟'' اس آواز نے پوچھا۔ میں نے بھویں اچکاتے ہوئے اس دراز قامت کی جانب دیکھا۔

''اسے بتادو۔'' دراز قامت نے سرگوشی کی۔

میں نے فون پر کہا۔ ''ہم ساڑھے تین بجے تک بینک بند کردیتے ہیں، سر۔''

''شکریہ۔'' دوسری جانب سے کہا گیا اور پھر ہم دونوں کو کلک کی تیز آواز سنائی دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا ہے۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے تھے اور میں خود کو بیمار سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے پستہ قد کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس نے صرف پانچ فٹ کے فاصلے سے اپنی گن سے میرے جسم کے درمیانی حصے کا نشانہ لیا ہوا تھا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ دراز قامت نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔

''اوکے شائنز۔'' اس دراز قامت نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''واپس دروازے پر چلے جاؤ۔'' پھر مجھ سے بولا۔ ''اور تم وہیں پہنچ جاؤ جہاں پر تھے، بسٹر۔'' اس نے میری جانب اپنی گن کو لہراتے ہوئے کہا۔ میں

دوبارہ فرش پر جا کر لیٹ گیا۔

''ابھی خاصا وقت پڑا ہے، شائنر۔'' وہ اپنے پارٹنر سے مخاطب ہوا۔ 'اس لڑکے پر نگاہ رکھو میں کیشیئرز کے کٹہروں کو ایک نظر دیکھ کر آتا ہوں۔'' پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اب میرے کانوں میں کیش کی درازیں کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی اس کے کوسنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں جو یقیناً اس بات کا اشارہ تھا کہ ان درازوں میں اسے کچھ نہیں مل رہا تھا۔

فرش پر لیٹے ہونے کے باوجود میں نیو اکاؤنٹس ڈیسک کے اوپر لگے ہوئے بڑے سے وال کلاک کو بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے منٹ کی سوئی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور اس کا ہر جھٹکا مجھے ایک ہزار سال کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ جب منٹ کی سوئی نے چار جھٹکے لے لیے تو تب دراز قامت کو اطمینان ہو گیا کہ کیشیئر کی کوئی دراز ایسی نہیں رہ گئی جو اس نے چیک نہ کر لی ہو جبکہ میں اسے بتا سکتا تھا کہ ہم تمام کیش ہمیشہ والٹ میں رکھتے ہیں لیکن اس نے پوچھا تک نہیں۔

وہ دوبارہ اس لابی میں آ گیا جہاں شائنر اور میں موجود تھے۔ اس کا بریف کیس اس کے بائیں ہاتھ میں تھا اور ریوالور دائیں ہاتھ میں۔ اس نے شائنر کو بینک کے اس عقبی دروازے کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا جس سے ہم بینک کے اندر آئے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ والٹ کے ٹائم لاک کے کھلنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ وہ اب نکل جانا چاہتے ہیں۔ مجھے ماربل کے فرش پر اپنے دل کی دھڑکن یوں سنائی دے رہی تھی جیسے فرش ایک ساؤنڈ بورڈ ہو۔

شائنر نے دروازے پر سے اپنی نگرانی ختم کر دی۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے اپنی گن سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے دراز قامت سے پوچھا۔

''اسے ٹھکانے لگا دو۔'' دراز قامت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ 'اسی طرح جیسے میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

مسٹر کولبائی نے گردن گھمائی اور اس انداز سے مسکرا دیا کہ اس کی آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ ''میں تمہیں کیا بتاؤں مسٹر ڈکسن کہ اس موقع پر میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا مطلب مجھے ہلاک کر دینے سے تھا یا صرف بے ہوش کرنا مقصد تھا یا کچھ اور۔ ٹھکانے لگا دو کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میں نے شائنر کو اپنی گن کا رخ پلٹتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی گن کی نال ہاتھ میں دبوچ لی پھر وہ مجھ پر جھکا اور اس نے اپنی گن کے دستے سے میری کھوپڑی پر ایک زوردار ضرب لگا دی۔ بس مجھے اتنا یاد ہے پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''بینک کے کاروبار میں اس سے کہیں زیادہ خطرات ہیں جتنے کہ میں سمجھ رہا تھا۔''

''یقینی طور پر ایسا ہی ہے۔'' مسٹر کولبائی نے کہا۔ ''مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان ڈاکوؤں کی ایک اور کار بینک سے نصف میل کے فاصلے پر ان کا انتظار کر رہی تھی اور وہ جس فورڈ کار میں مجھے لے کر بینک آئے تھے وہ چوری کی تھی۔ ان ڈاکوؤں کا تعلق ہماری ریاست سے نہیں تھا اور وہ ہمارے ٹاؤن میں بالکل اجنبی تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے شناخت سے بچنے کے لیے مجھے ہلاک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے راہ فرار اختیار کرتے وقت مجھے صرف بے ہوش کرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔''

''سو پھر آگے کیا ہوا؟'' میں نے ایک اچھے سامع کی طرح پوچھا۔

''وہ جوں ہی بینک کے عقبی دروازے سے باہر نکلے پولیس نے آسانی سے انہیں دھر لیا۔'' کولبائی نے کہا۔ ''فورڈ کے ڈرائیور کو پولیس نے پہلے ہی اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ پولیس بینک کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔''

ہمیں جہاز کے انجنوں کی آواز تبدیل ہوتی سنائی دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ جہاز لینڈنگ کے لیے اب نیچے جانا شروع ہو گیا ہے۔

''پولیس۔'' میں ہکا بکا رہ گیا۔ ''وہ کہاں سے آ گئی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''انہیں جونی سیمپسن نے بھیجا تھا۔''

میں خالی نگاہوں سے کولبائی کی صورت تکنے لگا۔ ''جونی سیمپسن کون تھا؟'' میں نے مزید حیرت سے سوال کیا۔

''ہم ہائی اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے۔'' کولبائی نے بتایا۔ ''وہ بینک میں کیشیئر اور میرا سب سے بہترین دوست تھا۔''

''اسے کس بات نے پولیس کو بینک بھیجنے پر آمادہ کیا تھا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''جب اس نے بینک میں فون کر کے بینک کے بند ہونے کا وقت پوچھا تھا تو میں نے اسے ساڑھے تین بجے کا بتایا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ بینک بند ہونے کا وقت تین بجے کا تھا۔ سو یہ اس کے لیے سگنل تھا کہ وہ پولیس کو طلب کرے۔''

میں نے دیکھا کہ ائرپورٹ کا رن وے نزدیک آ رہا ہے اور جہاز کے پہیے رن وے کو چھونے والے ہیں۔ میں نے اپنا ہیٹ اور کوٹ اٹھا لیا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ ٹیلی فون کال ایک چال تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے سیمپسن کے ساتھ سب کچھ پہلے سے طے کیا ہوا تھا؟''

''یقیناً۔'' میری حیرانی پر وہ خوش ہو کر مسکرا دیا۔ ''میرا یہی مطلب تھا جب میں نے کہا تھا کہ مجھے بینک میں کسی بھی خطرے کے لیے پہلے سے تیار رہنے سے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ سیمپسن اور میں نے ایسے موقعوں کے لیے پہلے ہی طے کر رکھا تھا۔''

''ایک منٹ رک جاؤ۔'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''اگر ایسا تھا تب بھی سیمپسن کو یہ کیوں کر معلوم تھا کہ وہ اس مخصوص صبح میں تمہیں لازمی فون کرے گا؟ کیا وہ روزانہ اسی طرح تمہیں فون کیا کرتا تھا؟''

''اوہ، نہیں۔ سیمپسن اس وقت کنوارا تھا۔'' کولبائی نے بتایا۔ ''وہ بینک میں اپنی ڈیوٹی پر آنے سے پہلے ناشتا ہمیشہ کارنر پر واقع مدر ہیگز کافی شاپ میں کیا کرتا تھا۔ اپنے گھر سے کافی شاپ جاتے ہوئے وہ ہر روز صبح اپنے مخصوص وقت پر بینک کے داخلی دروازے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ روزانہ صبح آٹھ بج کر بیس منٹ پر اور اگر ناشتے کے لیے جاتے ہوئے وہ یہ دیکھتا تھا کہ بینک کے داخلی دروازے کی چلمن بہ دستور گری ہوئی ہے تو پھر اس کے لیے لازم تھا کہ وہ بینک میں ٹیلی فون کرے اور پوچھے کہ بینک کس وقت بند ہوتا ہے۔ اگر جواب میں دیتا ہوں اور اسے بینک بند ہونے کا غلط وقت بتاتا ہوں تو وہ پولیس کو فون کر دے۔ اگر میرے علاوہ کوئی اور فون کا جواب دیتا ہے تو وہ پولیس کو فون کر دے۔ اگر کوئی بھی فون کا جواب نہیں دیتا تو وہ پولیس کو فون کر دے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ طریقہ کتنا سادہ اور آسان تھا؟''

''واقعی بے حد آسان تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی چیز اتنی پیچیدہ جیسی کہ یہ تھی، ہو سکتی ہے تو واقعی یہ بے حد آسان تھی۔ اگر تم بیمار پڑ جاتے اور کسی صبح اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونے سے قاصر رہتے تو ایسی صورت میں بینک کے داخلی دروازے پر لگی چلمن گری رہتی پھر کیا ہوتا؟''

''اگر میں بیمار پڑ جاتا تو میری بیوی سیمپسن کو اس کے

MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074

بذریعہ ڈاک

معقول فیس میں ہنرمند بنیں

موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے

صبح 9 بجے
تا
شام 5 بجے

ہنر سیکھیے روزگار لیجیے

Registered with CBR
Govt. of Pakistan

اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اسکا سرٹیفکیٹ آپکے پاس موجود نہیں ہے سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپکی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہو رہی ہے ہم آپکا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کردینگے نیچے دیئے ہوئے ایڈریس پر خط لکھکر تفصیلات منگائیں

ڈینٹل ٹیکنیشن
لیبارٹری ٹیکنیشن
کشیدہ کاری
لیڈیز ٹیلرنگ
حکمت
ڈسپنسر
ایکوپنکچر
نرس میل/فی میل
جینٹس ٹیلرنگ
میڈیکل اسسٹنٹ
ای سی جی ٹیکنیشن
U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی
ڈریس ڈیزائنر
میکینو تھراپی
مڈوائفری
معالج حیوانات
بیوٹی سلمنگ
فیملی پلاننگ
کیمیکل
عینک سازی
شمسی توانائی
[illegible]
بزنس مینجمنٹ
یوگا
انٹیریر ڈیکوریشن
ایڈوانس میک اپ
ایروبک
بیوٹی پارلر
ائرٹکٹنگ
مہر سازی
کوکنگ بیکنگ
[illegible]
سروئیر
کمپیوٹر
کمپیوٹر ہارڈ ویئر
میٹل ورکر
ابتدائی طبی امداد
ہوٹل مینجمنٹ
[illegible]
امپورٹ ایکسپورٹ
جینٹس بیوٹی سیلون
آٹو الیکٹریشن
شارٹ ہینڈ
[illegible]
[illegible]
جنریٹر ٹیکنیشن
اردو عربی خطاطی
فارمیسی
ہومیو پیتھک کورس
بوائلر ٹیکنیشن
آیورویدک علاج
لیتھ مشین ٹیکنیشن
انگلش لینگویج
ٹیکسٹائل ڈیزائننگ
فلاور میکنگ
ویلڈنگ
الٹرا ساؤنڈ
فن مصوری
میجک
[illegible]
فزیوتھراپی
ڈائنگ بلیچنگ
آٹو سروسنگ
[illegible]
جیولری میکنگ
بلڈنگ سپروائزر
فش فارمنگ
کورین لینگویج
پائپ فٹنگ سپروائزر
موبائل فون ریپیرنگ
فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ
خراد کا ہنر
اسٹیل فکسنگ
جدید مرغبانی
باغبانی
سیٹ ڈیزائنر
نیٹ ورکنگ
مونٹیسوری ٹیچنگ
[illegible]
چائلڈ کیئر کورس
ٹیلی کمیونیکیشن
ریفریجریشن ایئر کنڈیشنر

دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

ناشتے کے لیے نکلنے سے پہلے اس کے گھر پر فون کر کے کہہ دیتی کہ آج جب وہ بینک کے سامنے سے گزرے گا تو اسے چلمن گری ہوئی دکھائی دے گی کیونکہ میں بیمار ہونے کی وجہ سے بینک نہیں جاسکوں گا۔"

"اور سیمپسن کے بارے میں کیا ہوتا؟ فرض کرو کہ ڈکیتی والے اس مخصوص دن وہ خود بیمار پڑ جاتا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ ایک غیر متوقع اتفاق ہوتا۔" کولبائی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ ایسی صورت میں یہ میرے اور نائٹ ڈیپازٹس کے لیے بہت برا ثابت ہوتا۔"

جب میں نے جہاز کے پہیے رن وے سے چھوتے محسوس کیے تو اپنا سیٹ بیلٹ کھول دیا۔ "میں تو یہ کہوں گا کہ وہ تمہارے لیے واقعی بہت برا دن ثابت ہوا تھا، ٹھیک ہے ناں؟ تم اپنے لائیو برگلر الارم سسٹم کے 'ان سائیڈ' مین تھے۔ تم نے خود ہی خطرہ مول لینے کا چانس لے رکھا تھا۔ ان ڈکیتوں نے تمہارے سر پر ضرب لگا کر تمہیں بے ہوش کر دیا تھا جبکہ تمہارا دوست سیمپسن مدر ہیگو کافی شاپ میں بیکن اور انڈے کھا رہا تھا۔" جہاز رک گیا تو ہم اپنی نشستوں پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں، میرے خیال سے یہ بات درست ہے۔" کولبائی نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت ہم جوان تھے اور جیسا کہ تم نے پہلے تبصرہ کیا تھا، یہ سب خاصا ہیجان خیز اور پُرجوش رہا تھا۔ تمہیں اس بات کا ذرا سا بھی آئیڈیا نہیں ہوگا مسٹر ڈکسن کہ یہ کتنی سنسنی خیز بات تھی کہ آپ نے اپنی کھوپڑی کو ایک ریوالور کے دستے کا نشانہ بنتے دیکھا اور آپ کو کچھ پتا نہیں چلا کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے حتیٰ کہ دو گھنٹے بعد آپ کو ہوش آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ آپ کو قتل نہیں کیا گیا، آپ زندہ ہیں۔ یہ سب بے حد سنسنی خیز تھا مسٹر ڈکسن۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم اب بھی مرچنٹس نیشنل بینک سے وابستہ ہو؟"

"ہاں ابھی تک اسی پرانے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوں اور جونی سیمپسن بھی۔ وہ اب بھی اس بینک کا پریذیڈنٹ ہے۔" کولبائی نے جواب دیا۔

"یہ تو اس کے لیے بہت اچھا ہوا۔ اسے نیکی اور صبر کا پھل کہا جاتا ہے اور آج کل تم کیا جاب کر رہے ہو، مسٹر کولبائی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں اس بینک کا بورڈ چیئر مین ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "میں بہ دستور خطرات مول لے رہا ہوں۔"

"اب پوری کہانی میری سمجھ میں آگئی۔" میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ "شروع سے لے کر حال تک کی کہانی۔"

ہم ریمپ پر چلتے ہوئے ایک ساتھ ایئرپورٹ ٹرمینل پر آگئے۔ میں اس سے قدرے پیچھے چل رہا تھا۔ میرا ٹاپ کوٹ میرے دائیں بازو پر لٹکا ہوا تھا۔ جب ہم ٹرمینل کی لابی میں پہنچے تو میں نے بے اختیار اپنے ٹاپ کوٹ کی آڑ سے اپنی شہادت کی انگلی اس کی کمر میں گاڑ دی اور بولا۔ "بائیں طرف گھوم جاؤ مسٹر کولبائی اور سیدھے مردانہ واش روم میں داخل ہو جاؤ، کیا سمجھے؟"

اس نے خاصے پُرسکون انداز میں ردِعمل کا اظہار کیا۔ جب وہ میری طرف گھوما تو اس کی آنکھیں قدرے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم بھی قدرے تن گیا تھا اور اس کی پشت کی مسلز مجھے اپنی انگلی تلے لرزتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں تب وہ بولا۔ "واش روم میں، کیوں؟" البتہ اس کے قدم نہیں رکے۔

"اب مجھ سے یہ مت کہنا کہ اس کی چابی صرف تمہارے اسسٹنٹ کیشیئر کے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "لو ہم پہنچ گئے۔ اب اندر چلو۔" ہم واش روم میں داخل ہوگئے۔ یہ رش کا وقت نہیں تھا جیسا کہ مجھے اُمید تھی، واش روم خالی پڑا تھا۔

جب واش روم کا دروازہ ہمارے پیچھے ایک زناٹے کے ساتھ بند ہوگیا تو میں نے اپنی شہادت کی انگلی کولبائی کی پشت پر سے ہٹا دی۔ کولبائی میری جانب گھوم گیا۔ اس بار اس کی نگاہیں حقیقت میں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ سر کو پیچھے کی جانب خم دیتے ہوئے میرے چہرے کے نقوش کا بغور جائزہ لینے لگا اور تب پوری بات بلاتاخیر اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔

"تم نے اس کے بعد اپنا خاصا وزن بڑھا لیا ہے، ڈکسن۔" اس نے کہا۔ "اور نام بھی تبدیل کر لیا ہے۔" میں مسکرا دیا۔

"کیا تم واقعی فریسنو میں کھیلوں کے سامان کے اسٹور کے مالک ہو؟" کولبائی نے جاننا چاہا۔

"میں نے اس سلسلے میں اُمید باندھی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ایک اسپورٹنگ گڈز اسٹور میں کلرک ہوں اور مجھے اسے خریدنے کا ایک شاندار موقع مل رہا ہے، اگر اس ہفتے کے آخر تک میں ایک لاکھ ڈالرز کا انتظام کرلوں۔"

"اوہ۔" کولبائی نے کہا۔ "تب تو تم جرم سے تائب ہو کر شریفانہ زندگی گزار رہے ہو گے؟"

"رہائی پانے کے بعد سے میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اب میں اپنی گن کی نال پر نشانہ لینے والے ابھار کو ریتی سے نہیں گھستا۔"

"تم قرض کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا تم کسی ایسے ادارے سے واقف ہو جو سابقہ مجرم کو ادھار رقم دیتا ہو؟ میں نے تو کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے ہمارے بینک میں کوشش نہیں کی؟"

"میں کرنے جا رہا تھا بلکہ آج صبح اس بارے میں ذاتی طور پر اپیل کرنے کے لیے تمہارے پاس جانے کے ارادے سے وہاں گیا بھی تھا یہ سوچ کر کہ شاید تم اب بھی وہاں کام کر رہے ہوگے۔"

"تو پھر تم میرے پاس آئے کیوں نہیں؟"

"میری ہمت جواب دے گئی جب میں نے وہاں قرض دینے والے آفیسرز اور وائس پریذیڈنٹ کے ناموں کی ایک قطار دیکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یقینی طور پر انکار کر دیں گے۔ یہ تم ہی ہو سکتے تھے یا کوئی بھی نہیں۔"

"تو تم نے جہاز تک میرا پیچھا کیا، ایسا ہی ہے ناں؟" کولبائی نے جاننا چاہا۔

"ہاں، میں نے اتفاقاً تمہیں بینک سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تمہارا ہیٹ اور اوور کوٹ اور اوور نائٹ بیگ تمہارے پاس تھا اور تم ایئرپورٹ کی ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی تمہیں پہچان لیا تھا سو میں نے ائرپورٹ تک تمہارا پیچھا کیا اور اسی فلائٹ کا ٹکٹ خرید لیا جس میں تم سفر کرنے والے تھے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ "ایک لاکھ ڈالرز۔" اس نے دہرایا۔

"بس اتنی ہی رقم درکار ہے اور میرے پاس قرض کے لیے ضمانت پر رکھنے کے لیے کوئی شے بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک سخت سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "تم نے اس روز شائنر کو مجھے ٹھکانے لگانے کو کہا تھا، ڈکسن۔ اس نے اپنی گن کے دستے سے میری کھوپڑی پر وار کیا تھا اور یاد رہے کہ اس وقت میں نوعمر تھا۔"

"مجھے معلوم ہے اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے لیکن اس معاملے کو دوسری نظر سے دیکھو مسٹر کولبائی۔ کیا بینک ڈکیتی کا کامیابی کے ساتھ ناکام بنانے کی تمہاری وہ کوشش یہ پہلا اتفاق نہیں تھا کہ جب تمہاری بینک انتظامیہ تمہارے اور سیمپسن کی جانب واقعی متوجہ ہوئی تھی؟ کیا یہی واقعہ دیگر واقعات کو راہ دینے کا سبب نہیں بنا تھا جس کے نتیجے میں تم دونوں آج ان اعلیٰ ترین عہدوں پر براجمان ہو؟"

میں تیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں عارضی طور پر سانس لینا بھول گیا ہوں۔ میرے پاس یہی وہ واحد ہتھیار تھا جو میں مسٹر کولبائی کو دوسری مرتبہ اپنا شکار بنانے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے ایک منٹ تک کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا پھر اس کے ہونٹوں نے معمولی سی حرکت کی تو میں نے دوبارہ سانس لینا شروع کر دیا۔

"تم جانتے ہو۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ڈکسن۔ یہ تمہاری بدولت ہوا تھا جب بینک نے پہلی بار مجھے قابلِ توجہ سمجھا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس بارے میں تصور بھی نہیں کیا تھا پھر اس کے بعد ہی سے بینک ہم پر مائل بہ کرم ہونا شروع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک طریقے سے میں اور سیمپسن دونوں ہی تمہارے مقروض ہیں۔"

"تو پھر دونوں کی جانب سے پچاس پچاس ہزار ڈالر کیوں نہ ہو جائیں؟ تم اسے ذاتی قرض کہہ سکتے ہو مسٹر کولبائی اور میں یہ قرض لوٹا دوں گا۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

اس نے فوراً ہی ارادہ کرلیا۔ "مجھے پختہ یقین ہے کہ تم قرض لوٹا دو گے۔" اس نے جواب دیا پھر اس نے چیک بک نکالی اور ایک لاکھ ڈالرز کا چیک لکھ دیا۔ وہ چیک میرے حوالے کرنے کے بعد ہم دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" اس نے متجسس لہجے میں کہا۔ "تم اس بات کے لیے مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟ تم مجھ سے جہاز میں یا باہر لابی میں بھی تقاضا کر سکتے تھے؟"

میں نے واش روم میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے سفید ٹائلز سے آراستہ خالی دیواروں کا جائزہ لیا اور اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "یہاں کوئی چلمن نہیں ہے، مسٹر کولبائی۔"

* * *

محفلِ شعر و سخن

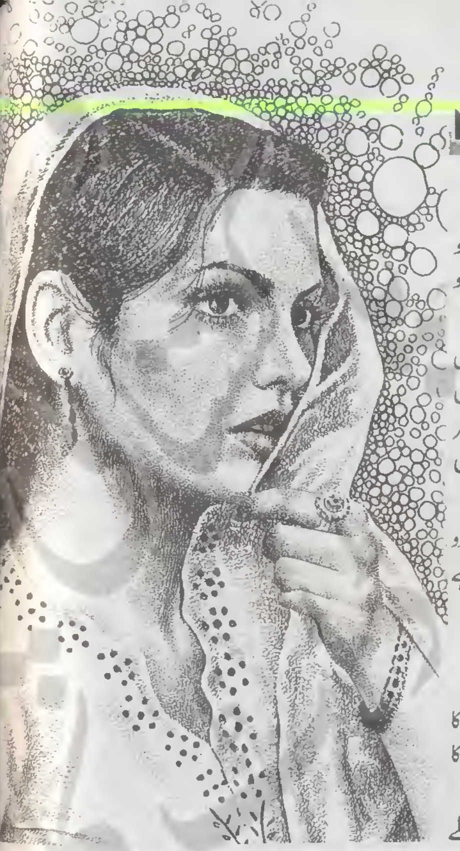

❄ رضوان تنولی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
تم محبتوں کے سودے بھی عجیب کرتے ہو
بس مسکراتے ہو اور دل خرید لیتے ہو

❄ سوہا جی......لاہور کینٹ
مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

❄ قیصر اقبال گچھ......کلول، ضلع بھکر
جو کاری زخم لگا ہے دل پر پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا یہ کس کی کارگزاری ہے

◆

❄ حسیب احمد چنائے......الگڈی کرک
کل تک تھا احساس کسی کے ہونے کا
آج ہے صرف درد کسی کے کھونے کا

❄ اطہر حسین پچار،......ہزاری
وہی راستے وہی منزل، وہی کاررواں وہی مرحلے
لیکن اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

❄ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ
قربِ جاناں کی آرزو کرکے!
کربِ کون ومکاں سے گزرے ہیں
زندگی تیری تلاش میں ہم!
موت کے درمیاں سے گزرے ہیں

❄ حافظ شاہد عمران چدھڑ......سینٹرل جیل گوجرانوالہ
ہم کو ان سے ہے ''وفا'' کی امید
جو نہیں جانتے کہ وفا کیا ہے

❄ جاوید شبیر بربرہ......مظفر گڑھ
سب فسانے ہیں دنیاداری کے
کس نے کس کا سکون لوٹا ہے
سچ تو یہ ہے اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا ہوں تو بھی جھوٹا ہے

❄ ابرار وارث......سندیلیانوالی
آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کرلیے
آج میں رویا تو مرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

❄ حیات خان......رحیم یار خان
مجھے کسی سے بھلائی کی اب توقع نہیں ہے تابش
میں عادتاً سب سے کہہ رہا ہوں مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا

❄ عادل عاصی خان ......ڈسٹرکٹ کرک
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

❄ عاقب اقبال......سالم جیل سرگودھا
بزم وفا میں میری غریبی نہ پوچھ غالب
اک درد دل ہے وہ بھی کسی کا دیا ہوا

❄ ایم کامران خالد......اٹک
دبا کے قبر میں سب چل دیے، دعا، نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو

❄ عون عباس بابر......اوکاڑہ
چشم تصور میں جب مجھ کو وصل تمہارا ہوتا ہے
تیری بکھری بکھری زلفوں کو خود ہاتھ سے میں سلجھاتا ہوں

❄ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

❄ عاصم اقبال جسپال......ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
کتنی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

❄ حسنین ہاشمی صاحب......سینٹرل جیل گوجرانوالہ
ہم نئے ہی آج اے صیاد کیا پکڑے گئے
بارہا چھوٹے قفس سے بارہا پکڑے گئے
زلف کو چھیڑا صبا نے ہے ہماری کیا خطا
ہم گرفتار بلا ہیں بے خطا پکڑے گئے

❄ حسنین عباس، کمیل عباس......کھاریاں
اک وفا کو پانے کی کوشش میں!
زخمی ہوتی ہیں وفائیں کتنی؟
کتنا معصوم سا لگتا ہے لفظ محبت؟
اور اس لفظ سے ملتی ہیں سزائیں کتنی؟

❄ محمد رشید سیال......روہڑی، ضلع سکھر
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں عیب ہے اک محسن
میں جس سے ہاتھ ملاتا ہوں وہ میرا نہیں ہوتا

❄ مہرین ناز......حیدر آباد
نہ بجھا چراغ دیار دل، نہ بچھڑنے کا تو ملال کر
تجھے دے گی جینے کا حوصلہ، میری یاد رکھ لے سنبھال کر
میرے درد کا، میرے ضبط کا، میری بے بسی میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

❄ اعجاز احمد راحیل......ساہیوال
خوابوں میں کسک دل میں دعا چھوڑ گئے
وہ یہ کیسا محبت کا جہاں چھوڑ گئے
اب تو دھڑکنے کی صدا بھی نہیں سنائی دیتی
وہ میرے سینے میں دل ہی کہاں چھوڑ گئے؟

❄ صوبیہ تفسیر......اوکاڑہ
اچھے تھے وہ دن جب میری ماں زندہ تھی
ایک دروازۂ جنت میرے دالان میں تھا

❄ کائنات مریم......حیدر آباد
لگا کر آگ دل میں اب چلے ہو تم کہاں
ابھی تو راکھ اڑنے پر تماشا اور بھی ہوگا

❄ منشی عاشق حسین......پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ضبطِ گریہ نے مجھے تھام تو رکھا ہے مگر
مجھ سے تاوان میں آنکھوں کی جلن مانگتا ہے

❄ کنول کامریڈ، سلیم کامریڈ......کھاٹاں
ہم وفائیں کرکے رکھتے ہیں وفا کی آرزو
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے

❄ سلیم شہزاد ورائے......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ
چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

❄ ریحانہ......سکھر
وہ میری روح کی چادر میں آکے چھپ گیا ایسے
کہ روح نکلے تو وہ نکلا، جو وہ نکلا تو روح نکلے

❄ بابر عباس......گلیانہ روڈ
کچھ تسلی ہو چاہتا ہوں میں
اشک خونیں کا بانٹ دوں حصہ
جس کو دیکھوں اسے سنا ڈالوں
اپنے دورِ شباب کا قصہ

❄ مسز بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
میرے ہمراہ بنتے میری جستجو رکھتے
ایک نئی صبح کی طرح میری آرزو رکھتے
اپنے دل میں چاہے مجھے کوئی مقام نہ دیتے
زمانے کی نظر میں تو میری آبرو رکھتے

❄ ملک افضال نادر......جنڈانوالہ کھاریاں
میں جب بھی دل سے پوچھوں تیرے ہو
بے قرار اس دل کو چین بھی
میں چاہتا ہوں آپ کو اپنے انداز سے
لوگ کہتے ہیں کہ مجھ کو پیار بھی آتا نہیں

❄ نوشین گل......حیدر آباد
دل تو خدا کا گھر ہوتا ہے اس کو مت توڑو
گیت یہی گاتا پھرتا تھا اک پاگل دیوانہ

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
خاموشی کی گود میں سوئی آنکھیں شاید جاگ اٹھیں
آؤ مل کر پتھر پھینکیں شیشے کی دیواروں پر

❄ ناصر علی صدیقی......رحیم یار خان
ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

❄ یاسر علی راجپوت......گوجرہ، نواں لاہور
خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

❄ محمد تقی عباس......سینٹرل جیل میانوالی
جب اعلانِ مرگ ہوا تو اس نے بھی کہا وہی
چلو اچھا ہوا مر گیا اکثر اداس رہتا تھا

❄ محمد اعجاز، عبدالغفور خان خٹک......اٹک
غلطیاں شامل فطرت ہیں ازل سے میر
تم فرشتوں کی نظر سے مجھے دیکھا نہ کرو

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
بہت اندر تک تباہی مچا دیتا ہے
وہ اشک جو آنکھوں سے بہہ نہیں جاتا

❄ طاہرہ گلزار......پشاور
باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

❄ رانا عامر شاد......میاں چنوں
ہم غریبوں سے دوستی کر لے
ڈھنگ سکھا دیں گے بادشاہی کے

❄ قاضی عرفان احمد عاجز......آڑہ چکوال
احساس محبت کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے
تیرے بغیر بھی ہم تیرے ہی رہتے ہیں

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
وقت تیزی سے بدل گیا اور تم
وقت سے بھی تیز نکلے ہو صاحب

❄ مدحت......کراچی
میں اس کی دسترس میں ہوں پھر بھی
وہ مجھ کو میری رضا سے مانگتا ہے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
فخر یہ ہے کہ تم میرے ہو
فکر یہ کہ پتا نہیں کب تک؟

❄ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
بے وجہ جب تم، ہم سے لڑتے تھے نا!
بس وہیں سے ہوئی تھی ابتدا محبت کی

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
انا بضد ہے کہ جانے دو روٹھنے والے کو
اندر سے آتی ہے آواز منا لیتے تو اچھا تھا

❄ احمر علی......گوجرانوالہ
بڑھ گیا اور بھی تنہائی کا میری احساس
اپنی تنہائی میں اِک شخص کو شامل کر کے

❄ عرفان علی......لاہور
اندھیرے کالے کنویں سے جسے رہائی دی
وہ شخص میرے ہی گھر کا بجھا رہا ہے دیا

❄ جمشید احمد......اسلام آباد
آنکھوں میں خیمے ڈال دیے رت جگوں نے پھر
دیکھا تھا میں نے خواب میں بستر لہو میں تر

❄ اشفاق احمد......کوئٹہ
دیکھنا ہے کب تلک رکھتی ہے اپنی قید میں
یہ تری ویراں سرائے رنگ خوشبو روشنی

❄ زیڈ۔ اے نیازی......ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا مگر
تھا وہ بھی اتنا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

کوپن
برائے
شمارہ
اگست
2013

محفلِ شعروسخن

نام : --

پتا : --

موسم خشک اور گرم تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل نظر آ رہے تھے لیکن ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور لگتا تھا کہ یہ بادل بن برسے ہی گزر جائیں گے۔ مارتھا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ دن آن پہنچا تھا جس سے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہی تھی لیکن جس طرح موسموں کی تبدیلی ناگزیر ہے، اسی طرح اس دن کی آمد کو بھی نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اس دنیا میں ہر چیز کو ختم ہونا ہے اور وہ جانتی تھی کہ اس شخص کی جزیرے پر آمد کے

انصاف

تنویر ریاض

کہنے کو تو اس دنیا کی اساس میں توازن شامل ہے مگر دنیا والے جانے کیوں اس خوبی کو اپنانے سے کتراتے ہیں۔ اسے بھی اعتدال سے کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ لہٰذا حالات کی سرکش موجوں نے اس کے توازن کو اپنی لپیٹ میں کچھ ایسا لیا کہ زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا... ویسے بھی سرکشی کسی بھی روپ میں ہو بغاوت پر اکساتی ہے اور بغاوت میں بہت کم انصاف سے کام لیا جاتا ہے مگر جب قدرت منصف ہو تو تمام تقاضے باسانی نبھا لیے جاتے ہیں۔

من مانی کرنے والے ایک نادان کی خوش فہمیاں

ساتھ ہی اس کا سکون بھی رخصت ہوجائے گا۔

ساحل پر بندھی موٹر بوٹ کو دیکھ کر مارتھا سمجھ گئی تھی کہ رچرڈ واپس آ گیا ہے۔ اسے پچیس سال قید کی سزا ہوئی تھی گو کہ اس بات کو طویل عرصہ بیت گیا لیکن اس جرم کی کسک آج بھی مارتھا کے دل میں موجود تھی اور اب اس چھوٹے سے جزیرے پر ایک بار پھر ان دونوں کا آمنا سامنا ہونے والا تھا۔ قانون کی نظر میں وہ اپنے کیے کی سزا بھگت چکا تھا لیکن مارتھا نے اسے معاف نہیں کیا تھا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی جزیرے پر اس کا وجود برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اسی لیے وہ مارو یا مرجاؤ کا تصور لے کر گھر سے نکلی تھی کہ شام ہونے سے پہلے دونوں میں سے کسی ایک کو زندہ رہنا ہے۔ اب صرف یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ دونوں میں سے کون موت کو گلے لگائے گا۔

مارتھا کا خاندان اٹھارویں صدی سے اس جزیرے کا مالک تھا۔ یہ مئی کے ساحل سے بیس میل دور پچاس ایکڑ کا ٹکڑا تھا۔ اس کے شمالی کنارے پر ساحل تھا جہاں ہنس اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے اور تیرتے تھے۔ جزیرے کے جنوبی حصے میں سرسبز وشاداب چراگاہ تھی جہاں وہ رچرڈ سے ملا کرتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک خطرناک گہری دلدل تھی جسے چاروں طرف سے جنگلی درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد مارتھا اس جزیرے کی مالک بن گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی اکلوتی وارث تھی۔ ایک بہن لورین پندرہ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھی۔ مارتھا کو اس کی موت کا بے حد غم تھا اور وہ رچرڈ کو ہی اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ دونوں بہنیں اسی جزیرے پر پلی بڑھی تھیں اور انہیں یہاں کے ایک ایک انچ سے واقفیت تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ جزیرے کے کس حصے کی زمین ہموار اور سخت ہے اور کہاں کہاں پانی کے جوہڑ ہیں۔ اسی طرح انہیں اس خطرناک دلدل کے بارے میں بھی بہ خوبی علم تھا۔ اسی لیے جب جزیرے کے لوگوں نے کہا کہ شاید لورین دلدلی گیس کے دھماکے کی آواز سن کر خوفزدہ ہوگئی اور اس کا پیر پھسل گیا تو مارتھا نے اس پر بالکل بھی یقین نہیں کیا۔ لورین اس راستے پر ہزاروں مرتبہ جا چکی تھی لہٰذا اس کے پھسلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مارتھا گھر واپس چلی آئی۔ وہ رچرڈ کا سامنا کرنے سے پہلے کچھ تیاری کرنا چاہ رہی تھی۔ کھیل شروع ہوچکا تھا اور وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اس دوڑ میں تیز رفتاری، جیت کی ضامن نہیں ہوسکتی کیونکہ دونوں ہی بوڑھے ہوچکے تھے اور اب انہیں اس کھیل میں جیتنے کے لیے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا تھا۔ وہ جوڑوں کے مرض میں مبتلا تھی اور کون جانے کہ اتنے برسوں میں رچرڈ کن بیماریوں کو گلے لگا چکا ہوگا۔ کیا وہ اپنے آپ کو صحت مند رکھنے میں کامیاب رہا ہوگا۔ شاید کسی تیز شخص کے لیے ایسا کرنا ممکن ہو لیکن وہ رچرڈ کو اتنا اسمارٹ نہیں سمجھتی تھی۔

گھر آنے کے بعد اس نے مقابلے کے لیے تیاری شروع کردی۔ اس نے جیکٹ اور واٹر پروف پینٹ پہنی اور اپنے باپ کے پرانے جوتے چڑھا لیے جو وہ مچھلیاں پکڑنے کے دوران پہنا کرتا تھا۔ گیلی زمین پر چلنے کے لیے یہ جوتے بہترین تھے لیکن انہیں پہن کر دوڑنا مشکل تھا پھر وہ جوتے اس کے پیروں میں کچھ بڑے بھی تھے تاہم اسے امید تھی کہ زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔ رچرڈ اپنے گھر اور کشتی کے قریب جنگل کے شمالی حصے میں اس کا انتظار کرتا گو کہ جنوبی حصے میں واقع چراگاہ سے اس کی کئی خوش گوار یادیں وابستہ تھیں لیکن وہ دلدل پار کرنے کی ہمت کبھی نہیں کرتا اور اسے دوسرا راستہ معلوم بھی نہیں تھا۔

مارتھا تیار ہوکر گھر سے باہر نکلی۔ اس نے بیرونی دروازہ بند کیا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ بڑے جوتوں کی وجہ سے اس سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ رچرڈ نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ چھڑی کے سہارے جنگل سے گزرتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کے بھاری جوتوں کی دھمک سے پتوں کے چرچرانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی اور اس شور کی وجہ سے وہ رچرڈ کی زبان سے ادا ہونے والا جملہ نہ سن سکی۔ البتہ جب اس نے نام لے کر پکارا تو مارتھا کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا لیکن مارتھا اسے واضح طور پر نہیں دیکھ پا رہی تھی البتہ یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ بوڑھا ہوچکا ہے۔ وقت نے اس کے چہرے اور جسم پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کس طرح کرے۔ اس نے خاموش رہ کر رچرڈ کو پہل کرنے کا موقع دے دیا، اس امید پر کہ شاید اس کے پاس بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ ہوں۔

’’ہم کافی عرصہ بعد مل رہے ہیں۔‘‘ رچرڈ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’یقیناً۔‘‘ مارتھا نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد رچرڈ بولا۔ ’’تم بہت بدل گئی ہو۔‘‘

’’لیکن تم بالکل بھی نہیں بدلے۔‘‘

وہ مسکرایا اور بھدے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ’’تم جھوٹ بول رہی ہو، میں بھی بدل گیا ہوں۔ جیل میں جا کر سبھی بدل جاتے ہیں۔ ویسے بھی پچیس سال بہت ہوتے ہیں۔‘‘

مارتھا نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور رچرڈ کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگی۔ چونکہ رچرڈ نے بات شروع کی تھی لہٰذا وہ اسے ہی بولنے کا موقع دے رہی تھی۔

’’اس دوران تم کیا کرتی رہیں؟‘‘ رچرڈ نے پوچھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر ہی کھڑا ہوا تھا۔ ’’تم اب بھی صحت مند نظر آرہی ہو۔ یقیناً تمہاری شادی ہوگئی ہوگی۔ بچے بھی ہوں گے۔ شوہر کیا کرتا ہے؟‘‘

’’میری شادی نہیں ہوئی۔‘‘ مارتھا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’اس لیے شوہر اور بچوں کے جھنجٹ سے آزاد ہوں۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ’’شادی نہ ہونے کی وجہ؟‘‘

’’بس میں نے یہ سارا عرصہ اسی جزیرے پر گزار دیا۔‘‘ مارتھا نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ اس کے لیے کوئی وجہ بیان کرنا بہت مشکل تھا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھی جو صرف ایک بار محبت کرتے ہیں۔

رچرڈ اپنی جگہ پر بے حس وحرکت کھڑا رہا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ’’تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’تم نے جھوٹ بولا مارتھا۔‘‘ وہ غصے سے دہاڑا۔ ’’تم نے جج کے سامنے جھوٹا بیان دیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ میں تو اس رات جزیرے پر بھی نہیں تھا۔‘‘

’’تم رات کے آخری پہر یہیں تھے۔‘‘

’’تمہاری بہن نے وہ خط نہیں لکھا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے کبھی اس سے ملنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔‘‘

مارتھا نے بہ مشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے وہ خط اس کے بستر کے نیچے سے ملا تھا۔ جب مقدمہ شروع ہوا تو مجھے اس خط کے بارے میں علم نہ تھا لیکن بعد میں وہ میرے ہاتھ لگ گیا۔‘‘

’’تم جھوٹ بول رہی ہو۔‘‘ رچرڈ تیز آواز میں بولا۔ ’’تم جانتی تھیں کہ میں بے گناہ ہوں اور جج مجھے بری کردے گا لہٰذا تم نے خط والا ڈراما رچایا۔ تم میری دشمن ہوگئی تھیں اور تمہاری آنکھوں پر حسد کی پٹی بندھ گئی تھی لہٰذا تم نے مجھے جیل بھجوانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔‘‘

مارتھا کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ’’مجھے انصاف چاہیے تھا۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتی تھی۔‘‘

’’تم اپنی بہن سے حسد کرتی تھیں کیونکہ وہ تمہارے مقابلے میں زیادہ پرکشش تھی۔ تم ایک سوکھی ہوئی مچھلی کے مانند ہو جبکہ اس کی رگوں میں گرم خون دوڑ رہا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی۔‘‘

مارتھا جواب دیتے دیتے رک گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ رچرڈ کیا چاہ رہا ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ مارتھا غصے میں آکر مشتعل ہوجائے لیکن وہ اس کے جال میں آنے والی نہیں تھی چنانچہ اس نے اسی کے ہتھیار سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار رچرڈ غصے میں آگیا تو اس کے لیے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہوجائے گا۔

’’لورین نے تمہارے پاس جانے سے پہلے وہ خط سنگار میز پر رکھا تھا۔‘‘ مارتھا نے پرسکون انداز میں کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ہوا سے اڑ کر وہ خط بستر کے نیچے چلا گیا۔ دوسری صبح میں کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ میری اس پر نظر پڑگئی۔ لورین کا کہنا تھا کہ تم اسے لینے کے لیے آرہے تھے۔‘‘

مارتھا کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ اس نے رچرڈ کی ٹانگوں میں ہلکا سا ارتعاش دیکھا پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ’’میں اسے لینے نہیں آرہا تھا۔ بتا چکا ہوں کہ اس رات میں جزیرے پر نہیں تھا۔ میرے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو یہ تصدیق کرسکتے ہیں کہ وہ رات میں نے مین لینڈ میں گرو ور کے پب میں گزاری۔‘‘

’’تم وہاں ضرور گئے تھے تاکہ لوگ تمہارے حق میں گواہی دے سکیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تم نے پوری رات وہاں نہیں گزاری تھی بلکہ کچھ دیر بعد وہاں سے آگئے تھے۔‘‘ مارتھا کا انداز جارحانہ ہوگیا تھا اور وہ پوری طرح حملہ کرنے کے موڈ میں تھی۔ ’’تم نے لورین سے آنے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن تمہاری نیت اسے ساتھ رکھنے کی نہیں تھی۔ تم اس سے کھیل رہے تھے اور یہ تم ہی جانتے ہو کہ تمہارے دل میں کیا تھا۔‘‘

’’جھوٹی!‘‘ رچرڈ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ غصے کے عالم میں اس کی جانب لپکا اور اس تک پہنچنے کے لیے

بلیک بیری کی جھاڑیوں میں راستہ بنانے لگا۔ مارتھا نے اس کی پہنچ سے دور ہونے کی کوشش کی اور اندھادھند بھاگنا شروع کر دیا گو کہ جوتوں کی وجہ سے اسے مشکل پیش آ رہی تھی لیکن اس کے لیے اس نے چھڑی کا سہارا لیا، اس کی چال کامیاب رہی اور رچرڈ اس کے تعاقب میں آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسے بہ آسانی درختوں کے جھنڈ تک لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ گرے ہوئے درختوں اور عشق پیچاں کی جھکی ہوئی بیلوں کے درمیان سے کس طرح راستہ بنایا جاتا ہے۔ رچرڈ اس سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے پاس ایک کلہاڑی تھی اور وہ جھاڑیاں کاٹ کر ان میں سے گزرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مارتھا کے پاس صرف ایک چھڑی اور ٹارچ تھی۔ اگر انہیں اندھیرا ہونے تک جنگل میں رکنا پڑ جاتا تو وہ اسے ایک ہی دائرے میں چکر دے کر تھکا دیتی۔ جوتوں کی وجہ سے اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ اب دلدل کا رخ کرنا چاہیے۔ وہ آنے والے وقت کے لیے اپنی توانائیاں بچا کر رکھنا چاہ رہی تھی۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ کھلی جگہ میں آئی اور رچرڈ کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور ماضی کی یادوں میں گم ہو گئی۔ پچیس سال پہلے کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ یاد آ گیا کہ اس نے بھی کبھی کسی سے محبت کی تھی۔

رچرڈ سے مارتھا کی ملاقات موسم گرما کے اوائل میں ہوئی جب وہ اپنے باپ کے ساتھ کچھ سامان کی خریداری کے سلسلے میں قریبی قصبہ گئی تھی۔ اس کے بعد یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ رچرڈ کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنی کشتی پر سوار ہو کر جنوبی چراگاہ کی طرف چلا آتا۔ درمیان میں دلدل پڑتی تھی اور مارتھا کے باپ نے راستے سے واقف ہونے کے باوجود اسے پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مارتھا کا باپ کسی ایسے شخص پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا جو اس کی بیٹی پر نظر رکھتا ہو۔ اس کی کڑی نگرانی سے تنگ آ کر مارتھا نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی اور کوئی اسے نہیں پوچھے گا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ثابت ہوئی اور وہ واقعی کنواری رہ گئی لیکن اس میں باپ کا کوئی قصور نہ تھا۔

چراگاہ کی گھاس انہیں بہ آسانی چھپا لیتی اور وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر روزانہ ایک ہی کھیل کھیلتے۔ شروع میں بات سرگوشیوں اور محبت بھرے مکالموں تک محدود رہی پھر رچرڈ کی دست درازی بڑھنے لگی لیکن مارتھا نے کبھی اسے ایک حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو باپ اسے جان سے ڈالے گا۔ وہ رچرڈ کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا لہٰذا وہ مشکل سے ہی اس کے ساتھ مارتھا کی شادی پر رضامند ہوتا۔ مارتھا کو اس وقت تک اس کھیل کو خفیہ رکھنا تھا، جب وہ اسے راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتی یا اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کر لیتی کہ رچرڈ کی خاطر اس کی ناراضی مول لے سکے لیکن رچرڈ میں انتظار کی تاب نہیں تھی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

"تم کوئی نابالغ لڑکی نہیں ہو۔" وہ اکثر اس سے کہتا، رچرڈ کے لہجے میں چھپی ہوئی مایوسی اسے بے چین کر دیتی تھی۔ "تم چوبیس سال کی ہو چکی ہو۔ آخر وہ تمہیں کب تک اس جزیرے پر ایک راہبہ کی طرح قید کر کے رکھ سکتا ہے۔"

اکتوبر کے آخری دنوں میں رچرڈ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ بھی سال کی ان چند گرم راتوں میں سے ایک تھی جب درخت بالکل ننگے ہو جاتے ہیں اور سرد ہوائیں فضا میں بسیرا کر لیتی ہیں۔ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں اگلے موسم بہار تک اس جگہ سے محروم ہونا پڑتا اور یہی بات رچرڈ کی ناراضی کا سبب بنی۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ تھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگا دی لیکن مارتھا پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور رچرڈ غصے میں اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ آج بھی وہ اسے غصہ دلا کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔

کلہاڑی سے لکڑی چیرنے کی آواز آئی تو مارتھا فوراً ہی حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئی۔ رچرڈ درختوں کے جھنڈ سے نکل آیا تھا اور اب کھلی جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مارتھا نے پچیس سال بعد پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ پتوں، ڈالیوں اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کی کھال ایک ایسے مرغ کی طرح زرد اور سکڑی ہوئی تھی جسے چولہے میں رکھا جانے والا ہو۔ مارتھا کے ذہن میں ایک خوب صورت اور مضبوط جسم والے رچرڈ کی تصویر تھی لیکن وہ اس کا ماضی تھا۔ اس نے اپنے گالوں پر نمی محسوس کی لیکن یہ اس کی آنکھ سے بہنے والے آنسو نہیں بلکہ بادلوں سے ٹپکنے والے وہ قطرے تھے جو بارش کی آمد کا پتا دیتے ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کیا۔ پلکیں جھپکائیں تاکہ رچرڈ اور اس کی کلہاڑی پر نظر رکھ سکے۔ دلدل اس کے عقب میں کچھ

فاصلے پر تھی لہٰذا وہ اپنے آپ کو اس جگہ پر محفوظ سمجھ رہی تھی۔

"رچرڈ۔ اس طرف......" وہ راستہ بتاتے ہوئے بولی۔ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی کہانی میں جان پیدا کرنے کے لیے مزید کچھ حقائق کا انکشاف کرتی۔ "یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ غائب ہوئی تھی اور ہم اس سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں، کیا تمہیں یہ جگہ جانی پہچانی نہیں لگ رہی؟"

یہ کہہ کر اس نے رچرڈ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"جھوٹی!" وہ اپنی کلہاڑی فضا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "تم نے خود ہی اسے راستہ چلتے ہوئے دھکا دیا تھا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں اور پھر جھوٹی گواہی دے کر مجھے اس کے قتل کے الزام میں جیل بھجوا دیا۔"

یہ کہہ کر اس نے حملہ کرنے کے انداز میں کلہاڑی گھمائی۔ مارتھا پھرتی سے پیچھے ہٹی اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دی، اس نے ایسے راستے کا انتخاب کیا جس پر چل کر اس کے تعاقب میں آنے والا رچرڈ گمراہ ہوسکتا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے اپنے قدموں تلے زمین کی حالت میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اسے وہ جگہ ٹھوس ہونے کے بجائے نرم اور گیلی لگ رہی تھی اور اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ چند منٹ چلنے کے بعد اس کے پاؤں نم ہونے لگے اور اسے یوں لگا کہ اس کے قدم زمین میں دھنستے جارہے ہیں۔ وہاں سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر وہ درخت تھا جس کے عقب میں وہ تنگ راستہ گزرتا تھا جس پر چل کر دلدل سے محفوظ رہا جاسکتا تھا۔

کیچڑ سے اٹے ہوئے اس راستے پر صرف اندازے سے ہی چلنا ممکن تھا۔ اس کی چوڑائی بہ مشکل دو فٹ تھی اور اس پر وہی لوگ بہ آسانی چل سکتے تھے جو اس کی پیچیدگیوں سے واقف ہوں۔ مارتھا اور اس کی بہن لورین اس راستے کے چپّے چپّے سے اچھی طرح واقف تھیں اور انہیں معلوم تھا کہ دلدل سے بچ کر وہاں سے کس طرح گزرا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ سوچنا ہی غلط تھا کہ لورین اس راستے سے پھسل کر دلدل میں جا گری ہو۔ وہ دونوں اس راستے سے رات میں، بارش کے دوران...... یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے بھی گزر چکی تھیں اور اگر بہت زیادہ بارش ہوجانے کی وجہ سے دلدل کی گہرائی میں اضافہ ہوجاتا تو بانس کی مدد سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

مارتھا نے اس راستے کی جانب قدم بڑھائے اور پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی آگے بڑھی لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ اس نے پیروں میں ربر کے لانگ بو رکھے تھے لیکن رچرڈ اس کے پیچھے آتے ہوئے ہچکچار

"تم مجھے کہاں لے جارہی ہو؟" اس نے غصے پوچھا۔ اس کے پیر کیچڑ میں دھنس رہے تھے اور ا لیے بھاری بوٹوں کی وجہ سے قدم بڑھانا دشوار ہو

"اس بار تم مجھ سے دور نہیں جاسکو گی اور میں تمہیں میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر تم اس راستے پر چل تو مجھے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"لورین کے لیے بھی یہ راستہ اجنبی نہیں تھا۔" ما نے اس کا غصہ بھڑکانے کے لیے کہا۔ "اسی لیے مجھے غصہ آتا ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ غلطی سے پھسل گئی جبکہ یہ حادثہ اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا اور تم بھی بات اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں نے لورین کو نہیں مارا۔" وہ دہاڑتے ہو بولا۔ "لیکن تم اس طرح شور مچا رہی ہو جیسے میں نے اسے اس دلدل میں دھکا دیا ہو لیکن میں بے گناہ ہوں۔ م نے اس سے اس جگہ ملنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں تو یہاں بھی نہیں۔ وہ خط جعلی ہے اور یقیناً تم نے مجھے پھنسانے لیے خود ہی لکھا ہوگا۔ مارتھا، میں نے پچیس سال ایک ب جرم کی سزا کے طور پر جیل میں گزارے جو مجھ سے سرز نہیں ہوا تھا۔ یہ بات تمہارے لاشعور میں ہے اور تم سے انکار نہیں کرسکتیں۔"

"اس کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ چاہے اس لیے تم نے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا ہو۔" مارتھا نے کڑک آواز میں کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رچرڈ کو دلدل تک لانے کے لیے اسے کیا کرنا ہوگا۔ "میں نے وہ خط نہیں تھا لیکن مجھے اس کا ایک ایک لفظ آج بھی یاد ہے۔ لورین نے لکھا تھا۔ 'پیارے ڈیڈی اور میری بہن! میں کل یہاں نہیں ہوں گی لیکن میرے بارے میں فکرمند ہو ضرورت نہیں۔ میں اور رچرڈ شادی کرنے کے لیے مین جارہے ہیں۔ میں اس سے جنوبی چراگاہ میں ملوں گی وہاں سے ہم رچرڈ کی کشتی میں بیٹھ کر گاؤں جائیں گے چرچ میں شادی کرسکیں۔ میں ایک یا دو دن میں آجاؤں گی لیکن تم لوگوں کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ اس کی مخالفت نہیں کروگے اور نہ ہی مجھ پر غصہ ہوگے۔ میں تم سے ملوں گی، لورین۔'"

خط ختم ہوتے ہی مارتھا نے بڑی پھرتی سے اپنے آ کو اس پتھر سے بچایا جو رچرڈ نے اس کی جانب پھینکا تھ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ تقریباً لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن برقرار رکھ سکتی، رچرڈ نے اس کی جانب ایک اور پتھر پھینکا۔ اس بار اس کا توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ تقریباً اس گڑھے کے کنارے پہنچ گئی جس نے اس کی بہن کو نگل لیا تھا۔ اس جگہ پر وہ راستہ گھٹنوں تک گہرا ہوگیا تھا اور آگے چل کر اس کی گہرائی مزید بڑھ جاتی تھی۔ تین قدم آگے چل کر وہاں سے واپس گھوم کر آنا پڑتا تھا کیونکہ آگے بڑھنے کی صورت میں دلدل سے نکلنا مشکل ہوجاتا۔

اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ مارتھا کی زندگی میں یہ واقعہ پیش آیا تھا جب وہ اس جگہ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ اسے اکتوبر کی وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب وہ خوف زدہ اور پریشان ہوکر رچرڈ کی گرفت سے آزاد ہوکر بھاگی تھی۔ رچرڈ اس کے حیلے بہانوں سے تنگ آچکا تھا۔ اس رات دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ رچرڈ نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر زمین پر لٹا دیا لیکن مارتھا کی بھرپور مدافعت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ مارتھا کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹھی میں ریت بھری اور رچرڈ کی آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ مارتھا کو اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ رچرڈ نے ایک بار پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس بار مارتھا کے ہاتھ میں درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ آگئی۔ اس نے وہ شاخ اس کے چہرے پر دے ماری اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک سیدھی اور مضبوط شاخ مل گئی جس سے اس نے چھڑی کا کام لیا اور اس کے سہارے وہ دلدلی حصے سے نکلنے میں کامیاب ہوسکی۔

گھر پہنچ کر بھی وہ کافی دیر تک خوف کے مارے کانپتی رہی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ لورین کا بستر بھی اسی کمرے میں تھا لیکن اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ورنہ اس کے لیے لورین کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہوجاتا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ لورین تجسس سے مجبور ہوکر اس کے تعاقب میں چراگاہ تک گئی تھی۔ اس کی واپسی کافی دیر میں ہوئی۔ اس وقت تک سورج کی کرنوں نے رات کی سیاہی کو مٹا دیا تھا۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا اور دماغی کیفیت بھی ٹھیک نہ تھی۔ لورین نے کئی مہینوں تک اس بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن ایک وقت ایسا آیا جب اس کے لیے کچھ بھی چھپانا ممکن نہ رہا۔

مارتھا اس راستے پر آگے بڑھتی گئی۔ جہاں تک کہ دلدل چوڑی ہونا شروع ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ دلدل آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے سخت زمین کو نگلتا جا رہا ہے اور اس کی سرحدیں پھیلتی جارہی ہیں۔ ان میں سے کچھ درخت ابھی تک اپنی جگہ قائم تھے جبکہ کچھ جھک گئے تھے لیکن ان کی جڑوں نے ابھی تک زمین کو پکڑ رکھا تھا۔ ان کی جھکی ہوئی شاخیں دلدل پر اس طرح پھیل گئی تھیں کہ دور سے دیکھنے پر وہ جگہ ایک جزیرہ معلوم ہوتی تھی جہاں گھاس اور پھولوں کا ڈھیر جمع ہوگیا تھا گو کہ اسے صحیح معنوں میں جزیرہ نہیں کہا جاسکتا تھا بلکہ ٹوٹ کر گر جانے والے درختوں پر مٹی کی تہ جم جانے کے سبب وہ جگہ خشکی کا ٹکڑا دکھائی دیتی تھی۔ اوپر سے اس کی سطح سخت اور ٹھوس نظر آتی تھی لیکن اس کی تہ کھوکھلی تھی اور اس پر قدم رکھنے والا زیادہ دیر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا اور جلد یا بدیر اسے بھی دلدل کی گہرائی میں دفن ہونا پڑ جاتا۔

مارتھا اس جگہ سے ایک انچ کے فاصلے پر رک گئی جہاں سے اس راستے میں ایک موڑ آجاتا تھا۔ جو لوگ اس راستے سے واقف تھے، وہ آگے بڑھنے کے بجائے اس موڑ سے واپس ہوجاتے تھے۔ مارتھا نے وہاں رک کر اپنا چہرہ اس نقلی جزیرے کی طرف کرلیا اور فاصلے کا اندازہ کرنے لگی۔ وہ جگہ وہاں سے سات فٹ دور تھی۔ اس نے رچرڈ کے آنے کا انتظار کیا جو بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لورین یہاں آکر بہت تیزی سے مڑ گئی تھی کیونکہ اسے راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔" اس نے رچرڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے دلدل عبور کرنے کے لیے چھلانگ لگائی تھی لیکن اسے اس کی چوڑائی کا اندازہ نہیں تھا۔"

"ممکن ہے کہ اس نے چھلانگ لگائی ہو۔" رچرڈ بولا۔ وہ اب اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ "اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے اسے دھکا دیا ہو۔"

مارتھا نے اس کے آخری جملے کو نظرانداز کردیا اور بولی۔ "اب میں تمہیں چھلانگ لگا کر دکھاؤں گی۔" پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی چھڑی زمین پر مضبوطی سے جمائی اور پول والٹ کے کھلاڑیوں کے انداز میں دلدل پار کرگئی۔ اب وہ اس ٹیلے پر پہنچ گئی تھی جو نقلی جزیرے پر ابھرا ہوا تھا۔ اس نے رچرڈ کی جانب دیکھا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"کتیا!" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ اسے غصہ آرہا

تھا کہ مارتھا اس کی دسترس سے دور ہو گئی تھی، جانتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کھیل رہی ہے لیکن اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ دلدل کے اوپر سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دے گی۔ وہ جزیرہ دیکھنے میں محفوظ نظر آرہا تھا لیکن وہ اس انداز میں اس کا پیچھا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے چلّاتے ہوئے کہا۔

”تم مینڈک کی طرح چھلانگ لگا سکتی ہو لیکن میں تمہارا پیچھا کرتا رہوں گا۔ میں نے یہاں آنے کے لیے پچیس سال انتظار کیا ہے۔ اب تھوڑا سا انتظار اور کرلوں گا۔ شاید اس وقت تک یہاں کھڑا رہوں جب تک تم واپس نہ آجاؤ۔“

وہ اس جگہ پر کھڑے ہونے میں بے آرامی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے اس راستے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس راستے پر آگے جانا ہے یا کہیں سے مڑنا ہے۔ وہ اسی الجھن میں گرفتار تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے پھر اس نے وہی کیا جو کوئی بھی شخص بے چینی کے عالم میں کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ چھوٹا سا قدم آگے بڑھایا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دلدل گہری ہونا شروع ہو جاتی تھی۔

اچانک ہی اس نے چلّانا شروع کر دیا۔ مارتھا نے اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار دیکھے۔ وہ قہقہے لگانے لگی گو کہ اس کے اپنے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ٹیلا زیادہ دیر اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس نے دوسرے ٹیلے پر چھلانگ لگا دی جو پہلے کے مقابلے میں چھوٹا تھا اور وہ زیادہ دیر تک وہاں بھی نہیں کھڑی رہ سکتی تھی۔ وہ رچرڈ کو دیکھ رہی تھی جو دوبارہ اس راستے تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ کیچڑ سے آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ نظر آرہا تھا اور اس سے بہ آسانی نمٹا جا سکتا تھا لیکن مارتھا کے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا۔ وہ چھوٹا سا ٹیلا بھی اس کے قدموں تلے کھسکتا جا رہا تھا لہٰذا اس نے ایک بار پھر وہاں سے چھلانگ لگا دی۔

”تم پہلے بھی بزدل تھے اور آج بھی ویسے ہی ہو۔“ مارتھا نے اگلے ٹیلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ”تم نے جو کچھ کیا۔ اس کی ذمے داری قبول نہیں کی۔ لورین اس وقت پانچ ماہ کی حاملہ ہو چکی تھی۔ چند دنوں کی بات تھی جب سب لوگ اس بارے میں جان جاتے۔ وہ اپنے وجود میں تمہارا بچہ لیے پھر رہی تھی اور تم نے اسے مار ڈالا۔ تم نے لورین کو ہی نہیں بلکہ اپنے بچے کو بھی قتل کر دیا۔“

”میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“ وہ چلّاتے ہو بولا۔ وہ اب بھی محفوظ راستے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا وہ یہ جان کر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ دلدل کی گہرائی میں دھ جا رہا ہے۔ وہاں سے اسے مارتھا کا ٹیلا محفوظ نظر آرہا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔

”تم نے تو اسے اسی وقت مار دیا تھا جب اکتوبر رات کو اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔“ وہ چلّاتے ہو بولی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کیونکہ وہ ٹیلا بھی اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ وہ تقریباً گھٹنوں کے بل جھک گئی تھی اسے معلوم تھا کہ زیادہ دیر اس ٹیلے پر نہیں ٹھہر سکے گی۔ چنانچہ اس نے ایک درخت کی شاخ کا سہارا لیا اور دوبا رچرڈ سے باتیں کرنے لگی۔

”وہ بہ مشکل چودہ سال کی تھی اور تم اس سے عمر میں دوگنا بڑے تھے لیکن تم نے اس کی زندگی تباہ کر دی او تمہیں اس پر کبھی ندامت بھی نہیں ہوئی۔ شاید تمہیں کبھی اس کا دوبارہ خیال بھی نہ آیا ہو۔ تم نے تو اس کی لاش برآمد ہونے سے پانچ مہینے پہلے ہی اسے مار ڈالا تھا اس کے پاس اس دلدل میں ڈوبنے کے علاوہ کیا چار باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ بات ڈیڈی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ خوفزدہ تھی کہ جب لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ اس کے کردار کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس نے مجھے بھی اس وقت بتایا جب بہت دیر ہو چکی تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے یہ خط لکھ ورنہ تم سزا پائے بغیر ہی آزادانہ گھوم رہے ہوتے تم اسی سزا کے مستحق تھے۔ اگر میں جج ہوتی تو تمہیں پچیس سال قید کے بجائے موت کی سزا دیتی۔“

رچرڈ نے وہاں سے چھلانگ لگائی۔ اس کی وجہ خو اور غصہ دونوں ہی تھے۔ اسے یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ اب بھی سخت زمین پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ پہلے ٹیلے تک بھی نہ پہنچ سکا اور درمیان میں ہی دلدلی زمین پر گر گیا۔ اس کا پورا جسم کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اس نے چند قدم چلنے کی کوشش لیکن زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ وہ چلایا اور جسم کو جھٹکے دے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دلدل کی گرفت بہت سخت تھی، ادھر مارتھا بھی درخت کی شاخ سے لٹکی ہوئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اسے کب تک اس حالت میں رہنا ہوگا۔ وہ شاخ بھی اس کے وزن کی وجہ سے جھک گئی تھی اور رچرڈ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرح مارتھا بھی مشکل میں ہے۔

”کتیا!“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”تم بھی میرے ساتھ ہی اس دلدل میں دفن ہو جاؤ گی۔ تم نے اپنی طرف سے یہ انتظام کر لیا تھا کہ زندگی میں ہم اکٹھے نہ ہو سکے لیکن ہماری موت ایک ساتھ واقع ہو گی۔ میری بھی کیا زندگی تھی اور میں کس بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ امید ہے کہ مجھ سے پہلے تم اس کیچڑ میں دفن ہو جاؤ گی اور یہ منظر میرے لیے بڑا دل خوش کن ہوگا۔“

مارتھا کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا اور وہ پوری قوت کے ساتھ درخت کو پکڑے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دلدل کی پکڑ سے نہیں بچ سکتی لیکن اس کے لیے اس نے پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کی نظر جوتوں پر گئی اور اس نے ان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر اس نے اپنے بدن کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اس کے پیر لمبے بوٹوں کے اندر حرکت کرنے لگے۔ اس نے آہستہ آہستہ پیروں کو اوپر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا جبکہ ربر کا تلا کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ مارتھا اپنے آپ کو آہستہ آہستہ جوتوں کی قید سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے لیے وہ اپنے جسم کو اوپر کی طرف کھینچتی رہی۔ بالآخر اس کی ٹانگیں لمبے جوتوں سے باہر آگئیں اور اب وہ درخت کی شاخ پر چڑھ سکتی تھی۔ اس کے وزن سے شاخ میں چرچراہٹ پیدا ہوئی اور ایک لمحے کے لیے مارتھا کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں شاخ ٹوٹ نہ گئی ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سیاہ کیچڑ نے اس کے باپ کے جوتوں کو نگل لیا تھا۔ وہ درخت کے جھکے ہوئے تنے پر رینگتی ہوئی دوسری جانب زمین پر اتر گئی۔ اس کے ننگے پاؤں گندے ہو گئے تھے لیکن وہ بازی جیت چکی تھی۔

”خدا کرے تم جہنم میں جاؤ۔“ رچرڈ نے اسے عقب سے بددعا دی۔ اب وہ کمر تک کیچڑ میں دھنس گیا تھا۔ دلدل نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور پھیپھڑوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا...... ٹھکانا...... جہنم میں ہوگا۔“

”تم مجھے مارنے کے لیے آئے تھے رچرڈ جبکہ میں بھی تمہیں مارنا چاہ رہی تھی۔“ وہ درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ابھی تک اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پونچھ رہی تھی لیکن پسینا خشک نہیں ہو رہا تھا۔ ”میں تم سے محبت کرتی تھی، اتنی زیادہ کہ ساری زندگی تمہارے علاوہ کسی مرد کی طرف نہیں دیکھا لیکن تم نے میری چھوٹی بہن کو مار ڈالا اور میں انصاف چاہتی تھی اور تمہیں سزا کے بغیر آزادانہ گھومتا پھرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔“

وہ اسے چیختا اور روتا پیٹتا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ دلدل نے اسے پوری طرح نگل لیا۔ اس کا منہ سیاہ کیچڑ سے بھر گیا تھا پھر اس نے رچرڈ کی آخری چیخ سنی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چل دی۔ گیلی زمین پر اس کے ننگے پیروں کے نشانات بنتے جا رہے تھے۔ اسے سردی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور اب اسے رچرڈ کے بارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اسے رات میں اجنبی آوازیں نہیں سننا پڑیں گی اور نہ ہی وہ ہر کشتی کو جزیرے پر آتے دیکھ کر حیران ہوتی رہے گی۔ رچرڈ اب اس جگہ سے چند انچ کے فاصلے پر دلدل میں دفن ہو چکا تھا جہاں لورین نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ باپ کے قہر کا نشانہ بننے کے بجائے اپنے آپ کو دلدل کے حوالے کر دیا۔

مارتھا پرسکون ہو گئی۔ وہ گھر جا کر اپنے لیے چائے بنا سکتی تھی اور اس خط کو شعلوں کی نذر کر سکتی تھی جس کی وجہ سے رچرڈ کو پچیس سال پہلے جیل جانا پڑ گیا تھا۔ جب وہ اس خط کو آگ دکھا رہی تھی تو اس نے سوچا کہ رچرڈ کی روح ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح جہنم کی آگ میں جلتی رہے گی اور ایک دن اس کی روح بھی وہیں پہنچ جائے گی کیونکہ وہ بھی گناہ گار تھی۔ وہ خط اس نے خود لکھا تھا لیکن جج کے سامنے حلفیہ بیان دیا کہ یہ تحریر اس کی بہن کی ہے۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ لورین کی موت کا انتقام لینے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو رچرڈ بری ہو جاتا کیونکہ اس نے لورین کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے لورین کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، اس کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا اس لیے قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا لیکن مارتھا کی نظر میں لورین اسی رات مر گئی تھی جب رچرڈ نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ لہٰذا اس کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اس نے رچرڈ کو جیل کی دیواروں کے پیچھے بھیج کر انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ رچرڈ نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ زندگی میں اسے حاصل نہ کر سکی لیکن مرنے کے بعد شاید وہ ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جہنم کی آگ میں جلتے رہیں۔

* * *

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 17

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

یہ ایک، حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سردرویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنالیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں میں پھوپی کبریٰ بھی رہتی تھی جنھوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کردیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کررہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہوگیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن دریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ دریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت

خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا دریام خان چونکہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ مجھے کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرنا سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہارِ الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا، غلط فہمی میں اس نے مجھے چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دو کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میر ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فا ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگا ۔ میڈم کی راہنمائی میں، میں نے دل جیت سے بازپرس کی۔ ایک خون ریز لڑائی میں اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اسی دوران اس کے اڈے پر ہوا۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجب تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افر ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ البتہ موجو کو لے آیا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حد میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت خان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم نے مجھے اسما کو اس کے خریدار، حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں ہونچکا رہ گیا۔ وہی تو میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو ق کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا۔ وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا زور آور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہدہ نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکر کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی میں نے کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس پر بہ مشکل پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہماری دسترس سے دور نکل گیا تھا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انوروز بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی

ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آ چکا تھا اور ملاح دینا کے کیبن میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جا کر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہو گیا۔ وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کر کے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت مسیح سے مڈبھیڑ ہوئی اس سے سخت تگ ودو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خان زادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کر کے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوا لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کر کے اس ہوٹل میں ملاقات طے کر لی حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوا لینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم میری منتظر تھی۔ پھر سنگین ورنگین لمحات کے دوران میڈم شکیلہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیرزادی کی ناجائز اولاد تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی مچھیرے گامن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیرزادی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گامن نے اسے اسکول میں داخل کرایا اور اس کو چندو ماہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہوتے پر میر ظفر حیات کے بیٹے عمر حیات نے اس سے چھیڑ خانی کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا عمر حیات اس کا قصوروار گامن اور چندو کو ٹھہراتا تھا اور انتقام پر بضد تھا اسی کوشش میں اس نے گامن کو فائر کر کے زخمی کر دیا۔ مجبوراً چندو اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی جہاں اس نے اسے مارا پیٹا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن گامن اور اس کا گھرانا چندو سے سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے اپنانے کا عہد کیا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے تھے کہ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی انہوں نے دروازے پر دیکھا تو بھونچکا رہ گئے۔ عمر حیات کی ماں اس کی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہاں کچھ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس کی ماں ان دونوں کی شادی پر راضی ہو گئی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے چندو اپنی تعلیم مکمل کر لے گی حویلی میں رہ کر۔ حویلی میں آ کر اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور میٹرک میں بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران عمر حیات کا ماموں رضوان کے ہاں آیا جو گوشہ نشین اور دین دار شخص تھا۔ اس نے چندو کے مستقبل کے بارے میں تشویش ناک اور حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ پھر ایک غلط فہمی کے نتیجے میں عمر حیات نے چندو پر تشدد کیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اسے لینے آیا لیکن چندو نے انکار کر دیا اسی دوران ملک افراسیاب کی گاڑی وہاں سے گزری جو کہ ایک بدمعاش اور عیاش آدمی تھا اس نے عمر حیات کو گولی مار دی اور چندو کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے آیا جہاں اس کے گرگوں نے چندو کو یارن خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا پلان بنا لیا اور رات کی تاریکی میں شراب کے نشے میں اس کے پاس پہنچ گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ دہشت سے تھم گئی۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ ایسے میں جانو نے عقب میں آ کر اُسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا اور کھینچ کر چارپائی پر لے گیا۔ وہ حلق کے بل چیخی، زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر پھڑپھڑائی اور پھر ہار کر منت سماجت پر اُتر آئی۔ اس کی ہر کوشش ہوس کے بے لگام گھوڑے کے آگے دم توڑ گئی۔ ایک گھوڑا دم لینے کو ہٹ گیا، تازہ دم گھوڑا اُسے سموں تلے لتاڑنے کے لیے آگے بڑھ آیا۔ نایاب جوانی مالِ غنیمت بن کر ہاتھ لگی تھی۔ چوری کا تھان تھا جسے رات بھر ڈانگوں کے گز سے ماپا گیا۔ ان کے سفلی ہیجان نے اُسے بہت جلد بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ہوشی میں آنکھیں بند ہو جاتی ہیں مگر اس کی آنکھیں مُردوں کی طرح کھلی تھیں۔ چھت کی کڑیوں پر ساکت تھیں۔ اُسے بری طرح پامال کرنے کا گھناؤنا کھیل شب بھر جاری رہا۔ اس جہنم کدے جیسے صحرائی مکان تک صبح کی اذان شاید آج تک نہیں پہنچی تھی۔ دور افتادگی کے سبب فلاح اور نیکی کی پکار اندھوں بہروں تک اُس رات بھی نہیں پہنچ پائی۔

ہر رات کی طرح وہ رات بھی سورج تلے ماضی کا قصہ ہو گئی۔ دو بجے کے قریب چندو کی ساکت پتلیوں میں زندگی سرسرائی۔ کافی دیر تک خالی الذہنی کی کیفیت میں پڑی آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر اس کے لبوں سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ چند لمبی لمبی سانسیں لے کر چارپائی کی بانہوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اپنے بے لباس بدن کو سرد نظروں سے دیکھا پھر ادھ کھلے دروازے کے باہر چمکتی ہوئی دھوپ پر نظر ٹھہرا دی۔ عضو عضو دکھ رہا تھا۔ کسی احساس کے بغیر اس نے

رانوں پر ہاتھ مارے اور سر نیہوڑا کر رونے لگی۔ زندگی اتنی بدصورت بھی ہوتی ہے؟ اس نے زندگی بھر یہ نہیں سوچا تھا۔

جانو دروازے میں آ کر زور سے ہنسا۔ چندو نے سر اُٹھا کر دھندلائی نظروں سے اُسے دیکھا۔ بکھرے بالوں میں اس کا روتا ہوا چہرہ کسی پتھر کی طرح بے جان تھا۔

جانو نے اُسے سرتاپا گھورا۔ ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔ ''اُٹھو! نہا کر کپڑے پہن لو۔ کھانا تیار ہے۔''

وہ خاموشی سے اُسے گھورتی رہی۔ بدن کے کسی ننگے عضو پر اپنی ہی نگاہ پڑا کرتی تھی تو پورا بدن گدگدانے لگتا تھا۔ آج بھیانک چہرے والا جانو دیدے پھاڑ پھاڑ کر پورے بدن کی برہنگی کو اپنی شیطانی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر چندو کے ذہن میں شرم کا رَتی بھر احساس پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ بہ دقت تمام اپنے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹ کر اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ قریب آئی تو جانو نے بانہوں میں بھر لیا۔ جھک کر زلفیں ہٹائیں اور چہرہ چوما، عامیانہ انداز میں چھیڑا، مگر وہ بے حس کھڑی رہی۔ آنکھوں میں مزاحمت کا کوئی تاثر پیدا نہ ہوا۔ جانو کی کمینگی کچھ دیر تک اُسے روکے رہی، پھر راستہ دے گئی۔ وہ روبوٹ کی سی مشینی چال چلتی ہوئی صحن سے گزر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ بے جان ہاتھوں سے گھنٹا بھر اپنے وجود پر پانی ڈالتی رہی مگر بدن تھا کہ زندگی کی لہروں کو پہچان ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ران پر بندھی ہوئی پٹی بری طرح بھیگ گئی مگر اس نے پروا نہ کی۔ جانو نے دروازے پر دستک دی۔ وہ گیلے بدن ہی باہر آ گئی۔ جانو بولا۔ ''ایک ہی رات میں بڑی بے شرم ہو گئی ہو۔''

دیکھا جائے تو ایک رات کا قصہ کئی سالوں پر محیط تھا۔ ایسی رات گزرتی نہیں، گزاری جاتی ہے۔ چندو بے شرمی کے بارے سوچتے ہوئے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں رُکی، وہاں چند ہی لمحوں میں فرش پر پانی کھڑا ہو گیا۔ بالوں سے ننھے ننھے دھارے گر رہے تھے۔ جانو نے ایک بڑے تولیے میں اُسے لپیٹ دیا اور چمکتے ہوئے آفتابی بدن پر نگاہیں سینکتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ جب وہ کھانا اُٹھائے کمرے میں آیا، چندو کپڑے پہن چکی تھی۔ اس نے بال سنوارنے کے بجائے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی جبکہ جانو اس سے فحش چھیڑ چھاڑ اور اخلاق باختہ باتیں کرتا رہا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی گیلی پٹی کھولی۔ نئی باندھی۔ زخم پر کھرنڈ آنے لگا تھا۔ شام تک کرسی پر بے جان انداز میں بیٹھی رہی۔ شام کو کھانے کے بعد جانو کی ہوس پھر بھڑک اُٹھی اور وہ تختۂ مشق بنی اپنے نصیبوں کو کوستی رہی۔ جانو کا ہاتھ بٹانے والا لاٹو کہیں گیا ہوا تھا، شاید یارن خان کے پاس۔ کیونکہ وہ بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھونے نہیں آیا تھا۔

جانو جلد ہی اکتا گیا۔ جواں بدن جتنا بھی خوب صورت ہو، اگر گرم اور زندہ نہ ہو تو مردانگی کو شہہ نہیں دیتا اور بیزار کر دیتا ہے۔ جانو نے اُسے سیخ پا ہو کر مارا پیٹا، گولی مارنے کی متعدد بار دھمکی دی اور غصے میں بے قابو ہو کر دو تین مرتبہ اُٹھا کر پٹخ بھی دیا... مگر چندو کا جسم برف کی طرح خاموش اور یخ بستہ رہا۔ آنکھیں مُردوں کی طرح ساکت رہیں جن میں جھانکنے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ رات کے گہرا ہونے تک جانو اس پر لعنت بھیج کر کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ گھنٹا بھر کے بعد چندو کو دروازے کے کھلا رہ جانے کا احساس ہوا۔ اُٹھی، جلدی جلدی لباس پہن کر برہنہ پا باہر نکل آئی۔ جانو برابر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ حویلی کا بڑا دروازہ بند تھا۔ شاید مقفل بھی تھا۔ وہ تنور پر چڑھ کر دیوار کے پار ریت پر کود گئی۔ تاحدِ نگاہ چاندنی میں چمکتے ہوئے ٹیلوں پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکار اور درختوں پر جانوروں اور دشمنوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سر جھکائے ریت پر ناک کی سیدھ میں چلتی گئی۔

اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں تھی اور اسے کس طرف جانا چاہیے تھا۔ گامن کے دھتکارنے کے بعد عمر حیات کی زندگی کا دروازہ اُس پر وَا ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند ہوا تو دنیا بھر کے دروازے بند ہو گئے۔ ان دروازوں کو قسمت کھول سکتی تھی جو ابھی اس پر مہربان نہیں ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر چلتی گئی۔ ریت میں پیر دھنس رہے تھے اور چلنا بتدریج دوبھر ہوا جاتا تھا۔ شاید ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر پائی تھی کہ اچانک سر میں زوردار دھماکا ہوا... پھر اوپر تلے کئی نسبتاً کم شدت والے کئی دھماکے ہوئے۔ یہ مسلسل بے آرامی اور نہ ختم ہونے والے اضطراب کا شاخسانہ تھا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ پائی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر گھٹنوں کے بل ریت پر گر گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی بہتیری کوشش کی مگر ناکام رہی اور بے سدھ ہو گئی۔ بے جان اعضا کی طرح بال ریت پر بکھر گئے اور وہ زندگی اور وقت کی خودکار چال سے بے خبر ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُسے ہوش آیا اور اس نے خود کو قفس میں پایا تو یہ طے نہ کر پائی کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ بے ہوشی میں اُس پر کیا بیتا؟ خبر نہ تھی۔

جانو نے احسان جتا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا ''میں چاہتا تو تمہیں گولی مار کر ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیتا مگر مجھے تم پر ترس آ گیا۔ دوسری مرتبہ ترس نہیں آئے گا اس لیے تمہیں اپنے آپ پر رحم کرنا ہوگا۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ زندگی بے معانی ہو کر رہ گئی۔ ایسے میں جانو کی دھمکی دل پر کیا اثر کرتی۔ شام کو لاٹو کامیاب سودے بازی کی خوشی چہرے پر سجائے نظر آیا۔ اس نے چندو کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جانو کو بتایا کہ وہ یارن خان سے چار لاکھ میں سودا طے کر کے آدھی رقم پیشگی وصول کر لایا تھا۔ یارن خان سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنا کر بولا۔ ''تم یارن خان کے آدمیوں کے ساتھ جاؤ گے کیونکہ یارن خان نے یہ شرط عائد کی ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی اس کے کارندوں کے ساتھ نورپور تک جائے گا۔ دیکھونا!! ابھی اس سے تعلقات کی شروعات ہیں۔ وہ ہم پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے اس نے یہ شرط عائد کی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا کیونکہ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ تم حملہ آوروں کے تعاقب میں گئے ہو یا وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ٹھیک ہے؟''

جانو نے کچھ سوچا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ دونوں نے رقم بانٹ لی۔ بقیہ رقم آج رات کو مال کی ڈلیوری پر ملنی تھی۔ ان کو پانچ لاکھ کی توقع تھی۔ ایک لاکھ کم ہو گیا تھا مگر چوری کا مال بیچتے ہوئے دل کھلا کرنا پڑتا ہے۔ جھوم کر بولا۔ ''آؤ! اس کامیابی کا جشن مناتے ہیں، پھر اس چھوکری کو ذرا اوپنچا لگا دیتے ہیں۔ چار لاکھ کا مال دس لاکھ کا نظر آئے تو خریدار کا دل خوش ہو جاتا ہے۔''

لاٹو دوسرے کمرے سے سستی شراب کی بوتل اُٹھا لایا۔ دونوں نے چندو کے قید خانے میں بیٹھ کر جشن کا اہتمام کیا۔ جام سے جام ٹکرائے اور چندو کے غیر معمولی سرد جسم سے اپنی بپھری ہوئی جوانی کو تقویت دینے کی نامراد کوشش کی۔

لاٹو نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''اگر رات کو اس کی رخصتی نہ ہوتی تو اس کے بدن میں بھی شراب کی آگ اُتار دیتا۔ مردے کو چومنے چاٹنے کا خاک مزہ ہے۔''

جانو نے چندو کے سینے پر اُلٹے ہاتھ کا چانٹا رسید کیا۔ نفرت سے تھوک دیا۔ دس بج گئے۔ دونوں چندو کو غلیظ گالیاں دیتے ہوئے ہٹ گئے۔ لاٹو نے کمرے میں کونے میں خالی بوتل اچھالی اور برہمی سے کہا۔ ''جانو! اِسے نہلاؤ اور تھوڑی بہت لیپا پوتی کر دو اس کتیا کے چہرے پر۔ یارن خان کے بیڈروم میں ایسے ٹھنڈی ٹھار پڑی رہی تو وہ گولی مار کر کتوں کے آگے ڈال دے گا حرامزادی کو۔''

جانو نے اُسے گالی دی اور بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باتھ روم میں لے گیا۔ صحرا کی رات سرد تھی مگر نہ تو نہلانے والے کو پروا تھی، نہ نہانے والی ہی کو احساس تھا۔ پھر دونوں نے مل کر اُسے خوبصورت بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ تنقیدی نظر ڈال کر مطمئن ہو گئے تو جانو کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں جا گھسا۔

چولھے میں جنگلی کیکر کی خشک لکڑیاں جل رہی تھیں۔ شعلے باہر کو لپک رہے تھے۔ دونوں نے ملک افراسیاب کو دھوکا دیتے ہوئے چار لاکھ کما لیے تھے۔ جانو دو لاکھ کا حصہ دار تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی بڑی رقم تک زندگی میں پہلی بار ہاتھ پہنچا تھا۔ پھر کبھی ایسی مایا ہاتھ لگے، نہ لگے، مقدر کی بات تھی۔ لالچ جادو کی طرح سر چڑھ کر بولنے لگا تو اس کی ذہنی رو پٹڑی بدل گئی۔ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ لاٹو کی موت کا سامان اپنے لباس میں چھپا لایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اُس نے پستول نکال کر لاٹو کے سر کا نشانہ لیا اور کہا۔ ''بشیر علی! تم میرے پرانے یار ہو۔ ہم نے ہر مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے مگر اَب جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔''

لاٹو ہنسا۔ ''مذاق مت کرو، اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اتنی مت پیا کرو۔''

اس کی انگلی ٹرائیگر پر لرزنے لگی۔ لاٹو کو یکبارگی جانو کے چہرے پر چھا جانے والی سنگینی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولا۔ ''ناں کرو یار! اِسے پرے ہٹا لو، یہ چل بھی سکتا ہے۔''

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی پستول چل گیا۔ گولی کی خوفناک آواز نے چندو کو ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ خالی خالی آنکھوں سے کرسی سے گر کر فرش پر تڑپتے ہوئے لاٹو کو دیکھنے لگی۔ گولی اس کی پیشانی پر عین آنکھوں کے درمیان لگی تھی۔ سرخ تر خون تیز فوارے کی طرح نکل رہا تھا اور اسے چیخنے کی مہلت تک نہیں ملی تھی۔

چندو نے کسی تاثر کے بغیر پوچھا۔ ''اسے کیوں مار دیا تم نے؟''

''یہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔ میرے حصے کا کام باقی تھا! سو میں نے کر دیا مگر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں، تمہیں نہیں ماروں گا۔'' جانو کا چہرہ موت کی طرح پتھریلا تھا جبکہ لہجے سے خون کی بُو مترشح ہو رہی تھی۔ چندو نے ایک نظر لاٹو کے آخری جھٹکوں پر تڑپتے ہوئے لاشے کو دیکھا اور رُخ پھیر لیا۔ اُس کا عمر حیات بھی ایسے ہی تڑپ کر چند لمحوں میں سڑک پر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

جانو نے چندو کو چارپائی سمیت ملحقہ کمرے میں منتقل کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یارن خان کے کارندے جب چندو کو لینے کے لیے مکان میں آئیں تو انہیں لاٹو کی لاش نظر آئے۔ چندو اُس کی حرکات وسکنات کو بے حس نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اس درندہ صفت انسان نے لاٹو کے حصے کے دو لاکھ روپے ڈکارنے کے لیے اُسے گولی ماری تھی۔

اس لالچی روپے پر اُسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ عشق کا دعوی کرنے والے ایک دیوانے کو دیکھ چکی تھی۔ عمر حیات کا دل اگر جانو کی طرح سیاہ نہ ہوتا تو وہ اُسے بُرا سمجھنے کے باوجود بھیانک شیطان نہ بنتا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو کر اُسے حویلی سے نکال دیتا، مار مار کر اَدھ موا کر دیتا یا حد کرتا تو گولی مار دیتا مگر بھیڑیے کی طرح بے رحمی اور سفاکی سے اُسے پامال کرتے ہوئے اپنی نامراد مردانگی کو سیراب نہ کرتا۔

جانو اُس کے لیے چائے کا پیالہ بھر لایا۔ وہ سر جھکائے پیتی رہی اور دانستہ طور پر اپنے بدن سے نظریں چراتی رہی۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اُس ظالم شخص پر دل دُکھا جو اُسے اپنی گناہ آلود محبت کی نشانی بنا کر کسی کوکھ میں ڈال کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اُس جوانی کے منہ زور جذبوں کی بھینٹ چڑھنے والی عورت پر گلہ ہوا جو اُسے پیدا کرنے کے بعد مارنے کے بجائے زندہ دریا میں پھینک گئی تھی۔ اُسے گامن بھی اُس گھڑی برا لگا۔ وہ اگر اُسے پانی کی منہ زور لہروں سے چھین نہ لیتا، بے نام وجود کو 'چندو ماہی' نہ بنا دیتا تو وہ ڈوب گئی ہوتی، مر کھپ گئی ہوتی اور زندگی کو آغاز میں موت کا ذائقہ کچھ زیادہ برا بھی نہ لگتا۔ اب وہ نہ تو مر سکتی تھی اور نہ ہی دنیا کی کمینگی نے اُسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑا تھا۔

اس کے برابر چارپائی پر بیٹھا ہوا جانو دیکھ تو اُسے رہا تھا مگر اُس کی چشمِ تصور میں چار لاکھ روپے کے نوٹ چمک رہے تھے۔ نوٹوں کی مخصوص خوشبو اُس کے چہار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ اِس خوشبو میں اُس کے یار بشیر علی عرف لاٹو کی دیرینہ دوستی کی لاش سے اُٹھنے والا تعفن دَب گیا تھا اور قسمت اُسے دھوبی کا کتا بنا کر گھر اور گھاٹ میں چکرانے پر مجبور کرنے والی تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ لاٹو نے اُس سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اُسے جگری یار سمجھ کر اپنی یاری کی لج پالتا چلا آیا تھا مگر کسی وجہ کے بغیر اُس نے یہ بات چھپالی تھی کہ یارن خان کے دستِ راست استاد رنگو سے اُس کا رسمی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ اُس کا لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں کا بچپن ایک ہی گلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔

وہی استاد رنگو اپنے باس یارن خان کا پہلو گرمانے کے لیے دو لاکھ کے گرم گرم نوٹ اُٹھائے صحرا کے دل میں پہنچنے والا تھا۔ رات نصف سفر طے کر چکی تھی جب خوفناک سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ اُبھری۔ جانو جلدی سے اُٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گیا۔ چندو جاگ رہی تھی مگر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ آنے والا جانو اور لاٹو کا صاحب ملک افراسیاب تھا یا نور پور کے یارن خان کا کوئی پالتو غنڈہ۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتی بھی تو اُسے دروازہ بند ملتا۔ قفس سے نکل کر دیکھ چکی تھی کہ صحرا کے دامن میں اس کے لیے سائبانی نہیں تھی۔

آنے والے تعداد میں تین تھے جو جانو کے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں جانو نے چندو کو قید کر رکھا تھا۔ چندو نے آنکھیں کھولیں۔ سراسیمگی کے ساتھ تشویش کے ڈورے آنکھوں میں تیرنے لگے۔ آنے والوں میں سے ایک نے سفید رنگ کا اوور آل پہن رکھا تھا۔ گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکا رکھی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں کسی ڈاکٹر کی آمد کا جواز نہیں تھا اور نہ ہی اس کا چہرہ کسی مسیحا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اگر اُس نے سفید بے داغ لباس نہ پہن رکھا ہوتا تو جانو اور لاٹو کے قبیل کا ہی فرد نظر آتا۔ دوسرے دونوں اپنی وضع قطع سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ اوور آل والے نے چندو کو ایکسرے کرتی نظروں سے گھورا اور جانو سے مخاطب ہوا۔ ''کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا؟ ہاں...... رمضان علی...... لاٹو کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آ رہا۔''

جانو نے کن انکھیوں سے چندو کو دیکھا، کہا۔ ''اُسے ملک صاحب نے ہنگامی طور پر لاہور بلایا تھا۔ چلا گیا۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے اُس نے تمہارے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ میں تیار ہوں۔''

''رمضان علی! ہمارے دھندے میں جھوٹ نہیں چلتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ سچ بتاؤ! کیا تم دونوں نے اس لڑکی کو ہاتھ لگایا ہے؟''

اس کے لہجے سے برہمی مترشح تھی۔

جانو اُس کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولا۔ ''نہیں استاد رنگو! ہم نے تو کیا، کسی نے بھی اِسے نہیں چھوا۔''

''پھر یہ میلی کیوں ہے؟'' اس نے اپنے گلے میں جھولتی ہوئی اسٹیتھو اسکوپ کو آہستگی سے گھماتے ہوئے درشتی سے کہا۔ جانو کے بولنے سے قبل ہی اس نے اوور آل کے نیچے سے لمبی نال والا پستول نکال کر تان لیا، غرایا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھ زیادہ ہی بگڑے ہوئے ہو۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اوئے جیدیا! پورے مکان کی تلاشی لو۔ میرا خیال ہے کہ اِس خبیث نے میرے یار کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔''

جانو گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا۔ ''کیا مطلب؟ میں اپنے جگری یار کو کیوں ٹھکانے لگاؤں گا؟ کہا تو ہے کہ وہ لاہور گیا ہے۔ تم یہ تلاشی ولاشی کا چکر نہ چلاؤ، باقی رقم ادا کرو اور اپنا مال وصول کر کے چلتے بنو۔''

جیدا چوکس انداز میں پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جانو نے اُسے روکنے کے لیے سرعت سے پیچھے جانا چاہا مگر توانا جسم والے استاد رنگو نے اس کے سینے پر پستول کی نال ٹکا دی۔ پھنکارا۔ ''یہیں کھڑے رہو۔ زیادہ چالاک نہ بنو ورنہ گولی مار دوں گا۔ ہمارے خان نے زیرو میٹر مال کا دام چکایا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ مال کا نہیں۔ اگر لاٹو بتا دیتا کہ تمہارا مال دو نمبر ہے تو خان کبھی ہڈی نہ پھینکتا۔ تم میری آنکھوں میں دھول جھونک کر پیتل کو سونا بنا کر دکھا رہے ہو۔ واہ بھئی واہ! کیا تمہیں بشیر علی نے میرے بارے کچھ نہیں بتایا؟''

جانو کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کھلے دروازے کو خوف بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کافی دیر سے اِس کمرے میں قید ہے جس کی وجہ سے بیمار پڑ گئی ہے۔ کھلی ہوا میں جائے گی تو دو چار دن میں ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہیں اگر مجھ پر یقین نہیں تو اِسی سے پوچھ لو۔''

استاد رنگو کے اشارے پر اس کا نوکیلی مونچھوں والا ساتھی چندو کے قریب آیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''اے چھوری! کیا اس بے غیرت نے تیرے ساتھ منہ کالا کیا ہے؟''

چندو دہل کر رہ گئی۔ سوال شرمناک تھا۔ جواب اِس سے بھی زیادہ ذلت آمیز تھا۔ جھوٹ بول کر مقدس نہیں ہو سکتی تھی۔ سچ بولنے پر زیادہ سے زیادہ گولی ماردی جاتی۔ یہ بڑی بات نہیں تھی کیونکہ زندگی اُس کے نزدیک بے وقعت ہو گئی تھی۔ سوچا۔ اسی لمحے جانو اور لاٹو کی بربریت یاد آ گئی۔ جسم جھرجھرا گیا۔ دانت پیس کر بولی۔ ''ہاں! یہ دونوں بہت غلیظ ہیں! درندے ہیں۔''

جانو نے بھڑک کر گالی دی۔ استاد رنگو نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''نہیں چن! غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چھوری نہ بولے تب بھی اس کے منہ ماتھے سے ہی تمہارے کیے دھرے کا پتا چلتا ہے۔ لاٹو ایڈوانس میں دو لاکھ روپے لایا تھا، وہ کہاں ہیں؟''

جانو سمجھ گیا کہ کھیل کا پانسا پلٹ چکا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ آنے والا اتنی جلدی معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ جیدے نے کمرے میں آ کر سنسنی آمیز انداز میں کہا۔ ''استاد! تمہارا یار ساتھ والے کمرے میں مردہ پڑا ہے۔ ادھر گولی لگی ہے اُسے!'' جیدے نے پیشانی پر انگلی رکھی اور جانو کو خونخوار نظروں سے گھورا۔ ''دو لاکھ روپے بھی مل گئے ہیں جنہیں گاڑی میں رکھ آیا ہوں۔ اور کوئی خاص چیز نہیں ملی۔''

''اچھی طرح دیکھ لینا تھا۔ کوئی اور خبیث چھپا ہوا نہ ہو۔''

''نہیں اُستاد! میدان صاف ہے۔''

استاد رنگو نے سر ہلایا۔ جانو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں اوئے بے غیرت آدمی! تم نے اپنے ساتھی کو مار دیا۔ میرے سنگی لاٹو کو مار دیا۔ ہیں؟ صرف دو لاکھ روپے کی خاطر...... لاٹو کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ جس آدمی کو یار دشمن کی پہچان نہ ہو، اُسے اسی طرح کتے کی موت ہی مرنا چاہیے تھا۔ مر گیا۔ اور تم؟...... تمہیں نوٹوں کی پہچان ہے۔ یار کی نہیں۔ تمہیں بھی اس کے پیچھے پہنچ جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟''

''لاٹو کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ لالچ میں......''

''نہیں چن! اَب تم توے پر بیٹھ کر سچ کہو تب بھی نہیں مانوں گا۔ اگر وہ لالچی ہوتا تو اس کی جگہ پر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ تم رحم کے لائق نہیں ہو۔'' استاد رنگو کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

جانو نے تھوک نگلا۔ ''مگر یہ ہمارا مسئلہ ہے اُستاد! تم اپنے کام سے کام رکھو اور تانگا پکی پر چڑھاؤ۔''

استاد رنگو نے قہقہہ لگایا، سفاکی سے بولا۔ ''تانگا پکی پر چڑھاؤ۔ واہ بھئی واہ! کیا ڈائیلاگ مارا ہے تم نے...... مگر میں نہیں، یہ کام تم کرو گے۔ گھوڑے کو شانٹا مارو اور تانگا اسی پکی پر چڑھا دو جس پر لاٹو گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے لبلبی دبا دی۔ گولی خوفناک آواز کے ساتھ نکلی اور جانو کے سینے میں دھنس گئی۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ ڈگمگایا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر ایک ذرا سنبھلا۔ پستول نکالنے کے لیے ہاتھ مارنے لگا۔ استاد رنگو نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور نشانہ لے کر دوسرا فائر داغ دیا۔ گولی سیدھی جانو کی نرخرے میں لگی۔ خون کا فوارا پھوٹا اور وہ پھڑ پھڑا کر دیوار کی جڑ میں ڈھے گیا۔ تیسری گولی

کھوپڑی میں سوراخ کر گئی۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ استاد رنگو اُس پر نفرت سے تھوکتا ہوا دوسرے کمرے میں پڑے ہوئے بشیر علی عرف لاٹو کا آخری دیدار کرنے کے لیے چلا گیا جبکہ جیدا تیزی سے چندو کی طرف بڑھا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے لہو میں نہانے والے جانو کو دیکھ رہی تھی۔ جیدے نے اُسے بے دردی سے کھینچ لیا اور حویلی کے دروازے تک گھسیٹتا گیا۔ دروازے کے باہر تھڑے پر سفید رنگ کی ہائی رُوف ایمبولینس کھڑی تھی۔ جیدے نے اُسے ایمبولینس کے بیڈ پر پھینکا۔ اس وقت استاد رنگو بھی حویلی سے نکل کر گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا جبکہ تیسرے شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

جیدے نے میڈیکل باکس سے دو بھری ہوئی سرنجیں نکالیں۔ ایک چندو کے بازو کی ورید میں لگائی۔ دوسرے کندھے کے ماس میں۔ ابھی نیڈل گوشت میں ہی تھی کہ چندو کی اَدھ کھلی آنکھیں ٹھہرنے لگیں۔ زود اَثر دوا نے چند لمحوں میں ہی اُسے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

رنگو نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ گردن موڑ کر چندو پر نظر ڈالی، بولا۔ ’’ڈرپ لگا کر اِس پر چادر ڈال دو۔ یہ مریض نظر آئے گی تو ہمیں نور پور تک کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔‘‘

اُسے خبر نہیں تھی کہ ایمبولینس نے کتنا سفر کیا، کتنی دیر چلتی رہی مگر جب آنکھ کھلی، تب اپنے قفس کے بدلنے کا فوراً احساس ہو گیا۔ یہ کمرا ملک افراسیاب کے صحرائی مکان والے کمرے سے بہت مختلف تھا۔ چارپائی کے بجائے یہاں وہ نہایت آرام دہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ اُسے بے ہوش رکھنے کے لیے دوا انجیکٹ کی گئی تھی جس کا تھوڑا بہت اَثر ابھی سر درد کی صورت میں باقی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے وال کلاک لگا ہوا تھا۔ ناگاہ نظر پڑی۔ چار بج چکے تھے۔ چونکہ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا، دروازے میں کوئی درز بھی نہیں تھی، اس لیے کوشش کے باوجود وہ اندازہ نہ کر سکی کہ صبح کے چار بجے ہیں یا سہ پہر کے۔ یہ بھی طے نہیں تھا کہ وال کلاک درست تھا یا نہیں۔

کم و بیش نصف گھنٹے بعد اُس نے پہلو کے بل کروٹ لی۔ مشکل سے اُٹھی۔ ننگے پیروں کو دبیز قالین کا لمس عجیب سا لگا۔ کمرا وال ٹو وال کارپیٹڈ تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفل تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں باتھ روم دکھائی دیا۔ وہ باتھ روم میں گئی۔ لوٹی، ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں طرف پاگلوں کی طرح دیکھنے لگی۔ جانتی تھی کہ وہ اِس وقت یارن خان کی تحویل میں تھی۔ یارن خان کون تھا؟ یہ نہیں جانتی تھی مگر جاننے والی تھی۔

اپنی بے بسی پر دُکھ ہوا۔ رونا چاہا مگر آنسو روٹھ گئے۔ سوچا ’’کب تک روتی رہوں گی؟‘‘ ...... اتنی سمجھ بوجھ رکھتی تھی کہ رونے سے اُس پر آئی ہوئی مصیبت ٹلنے والی نہیں تھی۔ ایسے میں ماموں رضوان یاد آیا۔ اس کا خوب صورت چہرہ آنکھوں میں نور کی طرح سج گیا۔ اس کی ہر بات ذہن کی غلام گردشوں میں اپنی بازگشت پھیلانے لگی۔ اُس نے بتایا تھا کہ چندو کی محبت کی بساط پر اُسے عمر حیات نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہ ظاہر خاموش رہی تھی مگر دل سے نہیں مان رہی تھی۔ عمر حیات کی محبت پر یقین تھا مگر قسمت نے سمجھا دیا تھا کہ محبت کی آسودگی اس کی مرہونِ کرم ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو ملا دے۔ چاہے تو تنکوں کی طرح بکھیر کر زندگی بھر کے لیے دور کر دے۔ وہ دور کر دی گئی تھی۔ ایسے، کہ نہ تو اب وہ سماں لوٹ سکتا تھا، نہ عمر حیات کی قبر میں جان پڑ سکتی تھی۔ ماموں رضوان نے کہا تھا کہ بڑی مصیبتیں بانہیں کھولے چندو کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ بے زمین و آسمان ہو کر مصیبتوں کے رحم و کرم پر چکرا رہی تھی۔ کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی نہ بھاگنے کی کوئی راہ۔ نجانے یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔

انسان ہر طرف سے مایوس ہو کر اُوپر دیکھتا ہے۔ اوپر والا دکھائی نہیں دیتا مگر اوپر دیکھنے والے کو یقین ہوتا ہے کہ وہ سن رہا ہے تبھی دل کی زبان سے پکارتا ہے۔ اس کے دل سے بھی ہوک اُٹھی۔ عرش تک پہنچی یا نہیں، اُس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا جو اُس کے پیچھے آتا۔ اُسے شیطانوں کی دسترس سے نکالتا۔ الف لیلوی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں مگر سمجھ میں آتا تھا کہ شہزادوں کا عہد اپنی پوٹلی باندھ کر رخصت ہو چکا تھا۔ اس کا شہزادہ پہلے ہی وار میں چاروں شانے چت ہو چکا تھا۔ اور کون تھا؟ ...... اور کوئی نہ تھا جو اُس کے لیے بھیانک چہرے والے بھوتوں اور جنوں سے آن ٹکراتا۔

دل گرفتہ سی باتھ روم میں گئی۔ وضو کر کے کمرے کی نکڑ میں کھڑی ہو گئی۔ کعبے کا رُخ معلوم نہیں تھا۔ ناچار دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ نماز کی نیت کی، ہاتھ اُٹھا کر کانوں کی طرف لے جانے چاہے مگر اچانک دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خدا کے دربار میں کھڑی تھی جبکہ اُس کا بدن کتنا گندا تھا۔ وہ خود کتنی گندی تھی۔ کیا تعفن چھوڑتے ہوئے شخص کو اذنِ باریابی ملتا ہے؟ ...... از خود نفی میں سر ہل گیا۔ ہاتھ بے جان انداز میں رانوں پر گر گئے۔ سر جھکائے کھڑی سوچتی رہی پھر دوسرے گوشے میں ایستادہ چوبی وارڈ روب تک گئی۔ دونوں پٹ کھول کر ہینگروں میں لگے ہوئے قیمتی ملبوسات کو دیکھنے لگی۔ وہ شاید اُسی کے لیے رکھے گئے تھے۔ پھر باتھ روم میں گھس گئی۔

اس کے جسم کا کوئی حصہ کنوارا نہیں رہا تھا۔ عضو عضو پر ہوس آلود ہاتھوں کا میل چپکا ہوا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے اپنا عضو عضو دھو رہی تھی۔ دو تین مرتبہ صابن لگانے پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو شاور کے گرتے ہوئے پانی تلے آنکھوں کے شاور چلانے لگی۔ تب خیال آیا کہ من اپنا آپ بھی دھونا چاہتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ خود کو اچھی طرح پونچھ کر کپڑے پہننے لگی تو ان کپڑوں سے کراہت آنے لگی۔ انہیں کئی گندے ہاتھوں نے چھوا تھا۔ اس نے تولیا لپیٹا اور باتھ روم سے نکل کر وارڈ روب تک جانا چاہا مگر شرم سے اَدھ کھلے دروازے میں رُک گئی۔ وہ صحن چیر کر چمکتے دن کی شوخ دھوپ میں باتھ روم سے نکل کر لاٹو اور جانو کی حرام کار آنکھوں کے سامنے اپنے کمرے میں آ سکتی تھی مگر خالی کمرے میں پیر نہ رکھ سکی۔ تب سمجھ میں آیا کہ اُس کا من دھل چکا تھا۔ اس نے اپنا اُترا ہوا لباس پہنا اور وارڈ روب تک گئی۔ ایک سوٹ نکال کر پھر باتھ روم میں گھس گئی۔

اَب بارگاہِ ایزدی میں کھڑی ہوئی تو دل اندیشوں سے پاک تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے، ’اللہ اکبر‘ کہا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنکھیں کھلی رکھنے کا حکم ہے، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے لبوں پر مقدس الفاظ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں تھیں۔ گیلا چہرہ نمکین ہو گیا۔ رکوع کرنے لگی تو ہمت جواب دے گئی۔ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جھک گئی۔ دل سے ہوک نکلی۔ ’’ربا! میکوں چا گھن ...... ایں جہی حیاتی تاں نہی منگدی تیکوں!‘‘

(ربا! مجھے اُٹھا لے۔ ایسی زندگی تو نہیں مانگتی تجھ سے)

ایسے میں ماموں رضوان کا ہر دم مسکراتا ہوا چہرا دھند میں اُبھرا، اس کی کہی ہوئی باتوں نے لاشعور سے نکل کر اُس کے تخیل کو گویائی دے دی، ’انسان کو کبھی خدا سے شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی زندگی جیسی عظیم نعمت کو پست اور گھٹیا قرار نہیں دینا چاہیے۔ زندگی کے خالق کو بُرا لگتا ہے اگر اس کی دی ہوئی عطا کو جھٹلایا جائے ...... زندگی میں ہر آن اُس سے مدد اور فلاح کی دعا مانگنی چاہیے۔‘

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹ لیا۔ روتے روتے اونچی آواز میں بولی۔ ’’نہیں ربا! تو مجھے جس حال میں بھی رکھے، میں خوش ہوں۔‘

دل دُکھا ہوا تھا۔ بے اختیار لبوں پر آ کر بین کرنے لگا۔ ’’مگر یہ کوئی حال بھی تو نہیں سوہنیا رَبا! کیا تو نے مجھے اتنا خوب صورت بدن اس لیے دیا تھا کہ اِسے کتے بھنبھوڑتے رہیں؟ ...... اگر میرا بدن تیرے کسی نیک بندے کی امانت ہے تو اُسے فوراً بھیج دے تا کہ وہ آ کر سنبھال لے اور اگر میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا ہے تو میرے بدن میں کیڑے ڈال دے، اس میں بدبو بھر دے تا کہ ہر کوئی مجھ سے دور رہنے پر مجبور ہو۔‘‘

وہ کافی دیر عبادت اور خود کلامیوں میں مصروف رہی پھر بے دم سی ہو کر بیڈ کے پائنتی کے تختے سے کندھا ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کے لیے کھانا لانے پر ایک غیر معمولی دبلا پتلا اور مدقوق بدن والا نوکر تعینات تھا۔ وہ اس کا ہر سوال خاموشی سے سنتا اور کھانے کی ٹرے رکھ کر واپس چلا جاتا۔ چندو نے اُسے گونگا بہرا سمجھ لیا اور دو تین دن سوتے، نہاتے دھوتے اور عبادت کرتے گزار دیے۔ اس نے اس کمرے سے بھاگ نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ مسلسل خوف اور تکلیف رسانی کے باعث اُس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے ہونے والی قتل و غارت نے اُس کی نفسیات پر بدترین اثرات مرتب کیے تھے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یارن خان کا انتظار کرنے لگی تھی۔

تین چار دنوں بعد جب اچانک یارن خان اپنے کارندے استاد رنگو کی معیت میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ چونک سی گئی۔ استاد رنگو اور ملک افراسیاب کے غنڈوں کے برعکس وہ بہت وجیہ اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ جب تک رنگو کمرے میں موجود رہا، وہ دلچسپی آمیز نظروں سے چندو کو دیکھتا رہا اور رنگو کی خوشامدانہ باتوں کا جواب ’ہوں‘ اور ’ہاں‘ میں دیتا رہا۔ رنگو کے جانے کے بعد وہ شرافت کے لبادے سے باہر آنے لگا۔ چندو نے اپنی خوش فہمی کا دامن تھام کر دھڑکتے دل سے کہا۔ ’’تمہارا ملازم کہتا تھا کہ تم سیکنڈ ہینڈ مال کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے ہو۔ میں ایک نہیں، کئی ہاتھوں سے میلی ہو کر یہاں پہنچی ہوں۔‘‘

یارن خان کے بدن کو جھٹکا لگا۔ آنکھیں پھیلا کر اُسے بہ غور دیکھنے لگا۔ معصوم نظر آنے والی لڑکی اس کی توقع کے برعکس زہر بھری تھی۔ اُس کا چہرہ آہستگی سے اوپر اُٹھا کر بولا۔ ’’تمہارا چہرہ بولتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔‘‘

اس کے چہرے پر ننھے زخموں اور خراشوں کے نشان باقی تھے مگر یارن خان کی بہکی ہوئی آنکھوں کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر پھر بولا۔ ”رنگو نے تمہارا نام چندو بتایا ہے۔ کیا یہی تمہارا اصل نام ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس پر پھیلی ہوئی آنکھیں مرتکز کر کے بولی۔ ”تم دیکھنے میں انسان ہو مگر تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم ان سے بڑے کتے ہو جنہوں نے مجھے اَب تک نوچا گھسیٹا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں تمام عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

یارن خان چند لمحوں تک اُسے سپاٹ چہرہ لیے دیکھتا رہا پھر ہنس کر بولا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں سب سے بڑا کتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اُس نے چندو کی کلائی تھامی اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس نے درست کہا تھا کہ وہ اجلے لباس اور خوش رو شخصیت کے لبادے میں چھپا ہوا سب سے بڑا کتا تھا جس نے ایک ماہ تک چندو کو اپنی حویلی کے تہ خانے میں اپنے نوکیلے پنجوں اور خونیں جبڑے سے نوچا پھر اُس باسی ڈبل روٹی کو اُٹھا کر اپنے دیرینہ رفیق ملک عتیق کے ڈیرے پر پھینک دیا جو پندرہ بیس دن بعد اُسے سردار حیدر خان کی جھولی میں ڈال آیا۔ اس کا دل بھی ہفتہ بھر میں بھر گیا تو چندو ماہی کو میاں دلبر حسین کی تحویل میں دے کر مونچھوں کو بل دینے لگا۔

بھرے ہوئے پیٹ والوں نے اس کا پچکا ہوا پیٹ بھر دیا تھا جو دیکھنے والوں پر آشکار ہونے لگا تھا۔ میاں دلبر حسین نے اُسے پہلی نظر میں تاڑ لیا تھا مگر دو تین راتیں دادِ عیش وصول کرنے کے بعد اپنے کارندے پر پل پڑا۔ خوب بُرا بھلا کہنے کے بعد تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”اس حرام زادی کو اُٹھا کر باہر پھینک دو۔ کہیں دور لے جا کر۔ بلکہ یوں کرو کہ اِسے لنک کینال میں ڈال دو۔ نہ رہے بانس، نہ بجے گی بانسری۔“

میاں دلبر کے اس درندہ صفت کارندے کا نام مظہر علی تھا جو چندو کو یہاں لایا تھا۔ چونکہ وہ چالیس کے سن میں پہنچنے کے باوجود ابھی تک کنوارا تھا، اس لیے چندو کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”صاحب جی! اگر اجازت ہو تو میں اِسے اپنے گھر لے جاؤں؟“

”اوئے گدھے کے بچے! تم اس کا کیا کرو گے؟“ میاں دلبر حسین چونک گیا۔

مظہر کے درشت اور بھیانک چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ عجیب انداز میں شرما کر، سر جھکا کر بولا۔ صاحب جی! میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی ناں۔ اسے گ لے جا کر دو بول پڑھوالوں گا۔ اور نہیں تو میری بڈھڑی کی روٹی ٹک پکا دیا کرے گی۔“

دلبر حسین نے اُسے دلچسپی آمیز نظروں سے گھو مسکرا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جو جی میں آئے مگر اس کی زبان بند رہنی چاہیے۔“

مظہر نے سینے پر ہاتھ رکھا اور یقین سے کہا۔ ”آپ ف نہ کریں صاحب جی۔ اس کی بولتی اِیسے بند کروں گا کہ سا عمر دانتوں تلے زبان دبائے برتن مانجھتی رہے گی۔“

یہ ساری گفتگو چندو کی موجودگی میں ہو رہی تھی۔ میا دلبر حسین نے پلٹ کر کمرے سے جاتے ہوئے ایک رُک کر پوچھا۔ ”مگر اِس کا کیا کرو گے؟“

اس نے چندو کی طرف دیکھ کر اپنا پیٹ تھپتھپایا۔

”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے صاحب جی! اِدھر ا سرکاری اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔ وہ اِس قصے کو سر سے پاک کر دے گی۔“

”جو ڈاکٹر زندگی دینے کے بجائے زندگی لیتا ہے اس کی بھاری قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ کیا تمہارے پا اتنی رقم ہے؟“

”آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا فکر ہو سکتی صاحب جی!“ مظہر علی نے چاپلوسی سے کہا۔

”بہت کمینے ہو۔ پر خیر! لے جاؤ اِسے اور اپنی جورو لو۔ دلہن کے ساتھ تمہیں ایک مہینے کی چھٹی بھی ہوں۔ جاؤ، جا کر عیش کرو۔“

”میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔“ حاتم کی لات کھا کر مظہر علی نے سر جھکا کر مسرت بھرے میں کہا۔

چندو پھٹی پھٹی نظروں سے دونوں کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ میاں دلبر حسین نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ اور مظہر علی کی طرف اُچھال دیے۔ وہ نوٹ جھپٹنے کے ادھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔ میاں دلبر حسین اُس کی با حرکات کو دیکھ کر ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔ مظہر علی نے فرش گر جانے والے نوٹ اُٹھائے، ہونٹوں سے لگا کر جیب ڈالے اور خوشی سے جھوما۔ ”میاں صاحب! زندہ باد۔“

وفورِ مسرت سے اس نے بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی چند بانہوں میں بھر کر اُٹھا لیا۔ ایڑیوں پر گھوما اور بولا۔ ”

خوب صورت چھوکری کو مارنے کا کیا فائدہ۔ میاں صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔“

چندو کے لیے زندہ بچ جانا اور مظہر علی جیسے سانڈ کے ہاتھوں میں پھسل جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے حسی کے عالم میں مظہر علی کی بانہوں میں گٹھڑی بنی اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھتی رہی جس میں نہ جانے کس اوباش کا گناہ نمو پا کر اُس کی تمام تر زندگی کو نجس کر گیا تھا۔ نصف شب کا عمل تھا جب مظہر علی نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اُسے میاں دلبر حسین کے فارم ہاؤس سے نکالا اور کار میں سوار کر کے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ایک ویران ڈیرے پر منتقل کر دیا۔ یہ ڈیرا بھی میاں دلبر حسین کی وسیع و عریض زمینوں کے بیچ میں تعمیر کیا گیا تھا اور مظہر علی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ یہاں مقیم تھا۔ مظہر علی کا ساتھی ان دونوں کو ڈیرے پر اُتار کر کار میں واپس چلا گیا تو مظہر علی اُسے کلائی سے تھام کر کھینچتا ہوا اپنی ماں کے پاس لے آیا۔

وہ بہت ضعیف تھی۔ دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ اس کے بدن کی آخری کیاری میں زندگی کا پانی دوڑ رہا تھا۔ چندو کو خشمگیں نظروں دیکھ کر اپنے بیٹے سے کہنے لگی۔ ”اوئے موئے مردار! یہ تو کس گناہ کی پوٹ کو اُٹھا لایا ہے؟“

چندو نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ تلخی سے بولی۔ ”میں گناہ کی پوٹ ہوں تو تیرا پتر کیا مسجد میں جھاڑو دینے پر لگا ہوا ہے؟“

مظہر نے اُسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا، پھر اَزخود رُک گیا، بولا۔ ”یہ میری ماں ہے، اس کے ساتھ اَدب سے بات کرو ورنہ چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔“

وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تیرے جیسے کتے کو جنم دینے والی کے ساتھ اتنے ہی ادب سے بات کر سکتی ہوں۔“

مظہر نے بہ دقت تمام اپنا غصہ دبایا اور ماں کو پھوکٹ میں ہاتھ آنے والی چندو کے بارے میں بتانے لگا۔ ماں سننے لگی۔ بیٹے کے خاموش ہونے پر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بین کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ ”تو کیا اب تو میاں صاحب کی چکھی ہوئی روٹی کھائے گا؟“

اس نے کندھے اُچکائے۔ ”تیری عقل میں کچھ نہیں آتا اماں! ساری عمر بھوکا رہنے سے چکھی ہوئی کھانی بہتر ہے یا نہیں؟ تجھ سے تو آج تک میرے لیے کوئی لنگڑی لولی لڑکی بھی ڈھونڈی نہ جا سکی۔ میں لے آیا ہوں تو نخرے دکھانے لگی ہے۔“

ماں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بوڑھے بدن میں منہ اُٹھا کر تھوکنے کی سکت نہیں تھی وگرنہ وہ چندو کے پیٹ پر تھوک دیتی۔ رات کے دو پہر باقی تھے جو بڑھیا نے کھانستے، مظہر علی نے ہانپتے اور چندو نے حسبِ معمول کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزارے۔ صبح دیر سے جاگی۔ کافی دنوں سے نہیں نہائی تھی۔ جن ہاتھوں میں کھلونا بن رہی تھی، ان کا میل صاف کرتے کرتے اُس کے ہاتھ تھک گئے تھے۔ پے درپے کی پامالی نے اُس کی رگوں سے خون نچوڑ ڈالا تھا۔ وہ تیز چلتی تو سانسیں اکھڑنے لگتی تھیں۔ کئی مہینوں سے وہ بس موت کی دعا مانگتی چلی آ رہی تھی کیونکہ اُسے گناہ کی دلدل سے نکلنے کی ہر راہ مسدود دکھائی دے رہی تھی اور تجربات سے ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر بوڑھی کے قریب چولھے پر آ بیٹھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تجسس ہلکورے لیتا دکھائی دیتا تھا۔ پوچھنے لگی کہ مظہر علی اُسے کہاں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ وہ بولی۔ ”تیرا پتر بے غیرت ہی نہیں، بے حیا بھی ہے۔ کیا تو اتنی سی بات بھی نہیں جانتی؟“

اسے بیٹے کی بدخوئی بُری لگی، بولی۔ ”میرا پتر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہے۔ ضرور تم نے ہی کوئی جادو ٹونا کیا ہو گا شودھے پر۔“

وہ زہریلے انداز میں ہنسی، بولی۔ ”میرے پیٹ میں کسی کی غلاظت بھری ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں مجھے ایک گندگی کے ڈھیر سے اُٹھا کر اپنے باپ میاں دلبر حسین کی غلیظ گود میں ڈالا۔ وہاں سے بیوی بنانے کی نیت سے مجھے اُٹھا کر یہاں لے آیا۔ نکاح سے پہلے ہی مجھے ناہر (بھیڑیے) کی طرح رات بھر نوچتا گھسیٹتا رہا۔ آج یا کل مجھے اسپتال میں لے کر جائے گا۔ میرا پیٹ چھوٹا کروانے کے بعد نہلا دھلا کر دلہن بنا لے گا۔ تو پھر بھی کہتی ہے کہ تیرا پتر ایسا گیا گزرا نہیں ہے؟ تجھ پر اور تیرے مردار خور پتر پر خدا کی مار ہو۔“

مظہر کی ماں برداشت کرنے والی عورت نہیں تھی مگر بیٹے نے جاتے ہوئے اُسے درشت لہجے میں سمجھایا تھا کہ اس کے آنے تک کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اس لیے خاموش تھی وگرنہ منہ توڑ جواب دیتی۔ چندو نے مہینوں بعد کھلا آسمان دیکھا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لینے کے درمیان اُس کے دل میں بھاگ نکلنے کی ایک مرتبہ پھر خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے چہار سو دیکھا۔ گھر چھوٹا اور خستہ حالت میں تھا۔ چونکہ یہاں مظہر علی کی ماں اکیلی رہتی تھی اس

لیے گھریلو سامان برائے نام تھا۔ چار دیواری کے باہر کی دنیا کیسی تھی، اُسے معلوم نہیں تھا۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی کہ بوڑھی نے چائے کا پیالہ بڑی حقارت سے اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی توجہ بٹ گئی۔ چائے پیتے ہوئے پھر ڈیرے کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے کی کچی دیوار کے ساتھ پانچ دس بکریاں بندھی ہوئی تھیں جو رات سے اَب تک مسلسل منمنا رہی تھیں۔ ساخت اور نوعیت کے اعتبار سے یہ گھر بابا گامن کے گھر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ چندو کے دل سے دعا نکلی کہ یہ آسیب زدہ ڈیرا کسی آبادی کے قریب ہوتا کہ اُسے یہاں سے نکلتے ہی کوئی جائے پناہ مل جائے۔ چونکہ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی، دل کمزور ہو چکا تھا! اِس لیے وہ زیادہ دور اور دیر تک بھاگ نہیں سکتی تھی۔

مظہر علی نظر نہیں آرہا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے چائے کا اَدھ پیا پیالہ زمین پر رکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بوڑھی نے کریدتی نظروں سے گھورا۔

''اے! تو کہاں جارہی ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور صحن سے گزر کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی توقع کے برعکس بڈھی کا ہڈیوں بھرا ڈھانچا بجلی کی سی مستعدی سے اُس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں چیخی۔ ''نامرادے! رُک جا، میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گی۔''

اس نے بوڑھی کی ناتواں گرفت کو جھٹکا دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے زمیں بوس ہوگئی۔ بلند آواز میں چیخنے چلانے لگی۔ یوں لگا کہ اُس میں اُٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چندو دھڑکتے دل کو سنبھالتی ہوئی حویلی سے نکلی۔ یہ دیکھ کر اُس کی جان ہوا ہوگئی کہ مظہر علی کے اِس بدشکل ڈیرے کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ دور دور تک کوئی گھر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

دروازے کے سامنے فصلوں کے بیچ ایک پگڈنڈی تھی جو گھوم کر پچھواڑے میں غائب ہورہی تھی۔ وہ دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی مکان کے پچھواڑے میں آئی۔ بوڑھی کی چیخ و پکار مسلسل اُس کا تعاقب کررہی تھی مگر وہ پروا کیے بغیر بڑھتی گئی۔ چھوٹے قد کی فصلوں کے تاحدِ نگاہ سلسلے کے آخر میں اُسے سرخ اور سفید بلاکس والی چار دیواری اور سرکاری طرز کی سرخ ٹیپ شدہ عمارت دکھائی دی تو اس کے دل کو ایک ذرا تقویت ملی۔ فاصلہ زیادہ تھا مگر اُسے وہاں پہنچ کر پناہ مل سکتی تھی۔ اس کے دوڑنے کی رفتار تیز ہوگئی مگر ابھی اُس کی قسمت میں رہائی نہیں تھی۔ اس کے عقب میں دوڑتے قدموں کی چاپ اُبھری۔ وہ دہشت سے رُک کر پلٹی۔ اپنے عقب میں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے مظہر علی کو دیکھ کر پگڈنڈی پر ڈھے گئی۔ وہ کسی اور رستے سے گھر پہنچا تھا اور اُسے نہ پاکر تلاش میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس غیر معمولی ویرانی میں اُسے دیکھ لینا اور تعاقب کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

وہ چند لمحوں میں ہی چندو کے سر پر پہنچ گیا۔ اُسے درشتی سے گالیاں دیتے ہوئے گھسیٹ کر مکان کی طرف لے جانے لگا۔ وہ مدد کے لیے چیخی۔ مظہر علی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ہونٹوں کے گوشوں سے خون رِسنے لگا۔ رہی سہی سکت بھی دم توڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈراؤنی شکل والی بڑھیا کے سامنے لے جاکر پھینکی گئی تو اس کی سانس بری طرح اکھڑ رہی تھی۔ مظہر علی نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ ''تو تم بھاگ رہی تھیں؟ ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔''

اس نے چندو کو بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور چند ہی لمحوں میں اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ مظہر علی جسیم اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی ضربوں کے مقابلے میں چندو زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بے ہوش ہوگئی۔ مظہر نے پانی چھڑکا۔ وہ ہوش میں آگئی مگر بے دم پڑی رہی، آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر ایک طرف گردن ڈال گئی۔ وہ اُسے گھسیٹ کر چارپائی تک لایا اور پٹخ کر ماں کے پاس چلا گیا۔

ماں ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ ''پتر! اِس کم ذات کو جہاں سے اُٹھا کر لایا ہے، وہیں پھینک آ۔ یہ گھر میں ٹکنے والی نہیں ہے۔''

وہ پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ''تو دیکھتی جا ماں! میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ یہ زندگی بھر یہاں سے نکلنے کا سوچے گی بھی نہیں۔''

''تو کیا کرے گا؟ ہاں؟''

''میں اس کی ایک ٹانگ کاٹ پھینکوں گا۔ پھر دیکھوں گا، کیسے بھاگتی ہے۔''

''اوئے جھلیا! میں اپنے ٹک پانی سے عاجز ہوں۔ یہ چارپائی پر پڑ گئی تو میں اس موئی مردار کو کیسے کھلاؤں پلاؤں گی؟ میری مان تو اِس گندی پوٹ کو دور پھینک آ۔'' بوڑھی کے سلوٹ زدہ ماتھے پر شکنوں میں اضافہ ہوگیا۔

دن چڑھے چندو کی سرت جاگی۔ اس نے سر اِدھر اُدھر پٹخا۔ چارپائی پر اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر بدن کا عضو عضو دُکھ رہا تھا۔ منہ سے مسلسل کراہیں خارج ہورہی تھیں۔ مظہر جلدی سے قریب پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چمکدار پھل والی کلہاڑی تھی، غرایا۔ ''میں تمہیں ترس کھا کر یہاں لایا تھا مگر تم

اس قابل نہیں ہو۔ میاں صاحب نے تمہیں بڑی نہر میں پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ اچھا کرتا جو میاں صاحب کا حکم مانتا۔ میں تمہیں بیوی بنا کر عزت کی زندگی دینا چاہتا تھا مگر تمہیں عزت راس نہیں ہے۔ بھاگ رہی تھیں ناں؟''

اس کی آنکھوں میں خوف بھر گیا۔ تھوک نگل کر بولی۔ ''ماردو...... میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

مظہر نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی تھامی اور سر سے بلند کر کے بولا۔ ''نہیں۔ تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ اس طرح زندہ رکھوں گا کہ تمام عمر سسکتی تڑپتی رہو مگر یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرسکو۔ آج ایک ٹانگ کاٹ رہا ہوں۔ اگر تم ایک ٹانگ سے بھاگنے کی کوشش کرو گی تو دوسری بھی کاٹ دوں گا۔''

چندو کا چہرہ مارے دہشت کے سفید ہوگیا اور آنکھیں پوری وسعت میں پھیل گئیں۔ اس نے تمام تر قوت سے چیخنا چاہا مگر آواز سینے میں ہی پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ مظہر نے جبڑا بھینچا، ایک زوردار گالی دی اور کلہاڑی کو پشت کی طرف لہرایا۔ کسی دَم بھی کلہاڑی کا تیز دھار پھل چندو کے گھٹنے کے جوڑ کو دولخت کرسکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں چندو کی قسمت بیدار ہوگئی۔ مظہر کی بوڑھی ماں چیخ کر اُٹھی اور بیٹے کو اُس کے مکروہ ارادے سے باز رکھنے کے لیے دوڑی۔ چارپائی کی پائنتی کے قریب پہنچی تو پتھر کی بنی ہوئی دَوری سے ٹھوکر کھا کر چارپائی پر آن گری۔ عین اِسی لمحے مظہر کے ہاتھ پوری قوت سے نیچے آئے اور چندو کے گھٹنوں پر اوندھے منہ گری بوڑھی کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں کلہاڑی کا پھل نصف تک دھنس گیا۔ بوڑھی کے حلق سے خرخراہٹ نکلی اور اس کا نچلا دھڑ تڑپنے لگا۔ بالائی دھڑ بالکل ساکت ہوکر رہ گیا۔ مظہر کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس نے کلہاڑی کو کھینچ کر نکالنا چاہا مگر آہنی پھل کھوپڑی کی ہڈی میں پھنس گیا تھا۔ اُس نے دو تین جھٹکے دیے مگر ناکام ہوکر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کے سر سے نکلتے، بھل بھل کرتے خون کو دیکھنے لگا۔

چندو نے جونہی کلہاڑی کے پھل کو اپنی ٹانگوں کی طرف آتے دیکھا تھا، اس نے آنکھیں غیر معمولی سختی سے بند کرلی تھیں۔ بوڑھی کی خرخراہٹ سننے کے بعد اُسے صورتِ حال کو سمجھنے اور خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر ٹانگیں کھینچ کر بوڑھی کے استخوانی وجود تلے سے نکلی اور برق مستعدی سے چارپائی سے اُتر کر دیوار تک چلی گئی۔ وہ کمرے سے نکل نہیں سکتی تھی کیونکہ بوڑھی کا آدھا وجود چارپائی پر تھا جبکہ اس کی ٹانگیں دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ مظہر ابھی ہوش میں نہیں تھا مگر وہ جونہی دروازے کا رُخ کرتی، وہ اُسے دبوچ لیتا۔ ماں کے غیر متوقع اور غیر ارادی قتل کے بعد اس کی ذہنی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اُس سے کوئی بھی رحم آمیز عمل کی توقع عبث تھی۔

اچانک مظہر ہوش میں آگیا۔ 'ہائے' کی پھٹی پھٹی آواز حلق سے برآمد کرتے ہوئے چارپائی پر اوندھی پڑی ماں پر گر گیا۔ اس نے نبض ٹٹولنے اور سانسیں محسوس کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یا تو اُسے دھیان نہیں رہا تھا یا اُس نے ازخود ماں کی موت کا یقین کرلیا تھا۔

چندو نے خوفزدہ نظروں سے اِردگرد دیکھا۔ وہ غیر اختیاری طور پر کسی ایسی چیز کو کھوج رہی تھی جسے اپنے بچاؤ کے لیے ہتھیار بنا سکے۔ اس کی کوشش اکارت نہیں گئی اور اسے اپنے داہنے ہاتھ پر دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑا ہوا چوبی ڈنڈا نظر آگیا۔ اس ڈنڈے کو مقامی زبان میں 'ملنا' کہا جاتا ہے اور کم و بیش ہر دیہاتی گھر میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے چٹنی کوٹی جاتی ہے یا ہنڈیا میں ڈالنے کے لیے گرم مسالا اور سرخ مرچیں پیسی جاتی ہیں۔

اس نے چوبی ملنا اُٹھایا، دونوں ہاتھوں میں سختی سے پکڑ کر سر سے بلند کیا اور بغیر سوچے بجلی کی سی مستعدی سے قدم بڑھا کر مظہر کے سر پر دے مارا۔ دھماکے کی آواز کمرے میں گونجی۔ مظہر نے سر اُٹھایا۔ اُسے دہشت ناک نظروں سے دیکھا اور کھڑا ہونا چاہا مگر تب تک چندو مظہر کے تالو پر دوسرا کارگر وار کرچکی تھی۔ دوسرا دھماکا پہلے سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ خون کا فوارا اُبلا اور مظہر چارپائی کی بانہہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں لہراتا ہوا دیوار کی جڑ میں ڈھے گیا۔ چندو کے پیروں اور بانہوں میں بجلی بھر گئی۔ چارپائی کا چکر کاٹ کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ چوبی ملنا ہوا میں بلند کیا تو مظہر نے مدافعانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ فوری طور پر سر پر رکھ لیے۔ ملنا ایک ہاتھ پر لگا۔ ہاتھ کی کئی ہڈیاں چٹخ گئیں۔ چندو نے پے در پے بیسیوں وار کرکے اُس کی زندگی کا چراغ گُل کردیا۔ اس پر وحشت سوار تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک جبڑے بھینچے وحشیانہ انداز میں اس کی کھوپڑی کوٹتی رہی پھر ڈنڈا ایک طرف پھینک کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہانپتے ہانپتے سسکنے لگی۔ اس سے پہلے انسان کو قتل کرتے اور قتل ہوتے دیکھا تھا۔ آج اپنے ہاتھوں قتل کرکے رو رہی تھی۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اگر اُسے ایک لمحے کو بھی خیال آجاتا

کہ وہ کیا کرنے لگی ہے تو شاید زندگی کا پہلا قتل سرانجام نہ دے پاتی۔

خوف اور ڈر انتہائی حد پر پہنچ کر انسان کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے دونوں لاشوں کو باری باری دیکھتی رہی۔ روتی رہی۔ پھر ڈرنے لگی۔ گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ اُٹھ کر کمرے سے یا ڈیرے سے نکل جاتی۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا مگر قسمت اپنا کام کر رہی تھی۔ اُسے پژمردہ اور نڈھال بیٹھے ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تو ڈیرے کی مہیب سکوت والی فضا میں موٹر سائیکل کے انجن کی پھٹ پھٹ گونجی۔ وہ بے حس بیٹھی سنتی رہی۔ موٹر سائیکل دروازے پر آن رکی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ کمرے کے دروازے تک آئی۔ چندو نے آنسوؤں سے تر چہرہ اُٹھایا۔ ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ دروازے تک آن پہنچنے والا اپنی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا ملا جلا تاثر لیے مظہر علی اور بوڑھی کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چندو کو نہیں دیکھا تھا یا دیکھ کر نظرانداز کر دیا تھا۔

وہ حلیے سے کسی بھی طور مظہر علی کے قبیل کا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے سادہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ گلے میں سیاہ نالی والی اسٹیتھواسکوپ لٹکا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں بلڈ پریشر چیک کرنے والا آپریٹس جبکہ دوسرے میں ننھا سا ہینڈ بیگ تھاما ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ چندو سراسیمگی سے اُسے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس جگہ پر کسی ڈاکٹر کی آمد نہایت غیر متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے محتاط نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُسے دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر باری باری دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر کھڑا ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اے لڑکی! تم کون ہو اور ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے؟“

چندو نے کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ دیوار کا سہارا بھی لیا مگر ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ بے بسی سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تب بھی خاموش رہی تو وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا اُس کے قریب آ کر پیروں کے بل کچے فرش پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”میں یہاں کبھی کبھی آیا کرتا ہوں۔ اِس بوڑھی کو، جو اِس وقت مردہ حالت میں چارپائی پر پڑی ہے، نیوروبیان (طاقت کا ٹیکہ) لگانے کے لیے...... تمہیں آج سے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔ جلدی بولو۔ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“

اس نے منہ کھولا۔ ”مم...... میں چندو ماہی......“

ڈاکٹر بھانپ گیا کہ خوف اور دہشت کی شدت سے اس کے حواس بحال نہیں تھے۔ پانی بھر لایا۔ پلانے کے بعد بولا۔ ”انہیں کس نے قتل کیا ہے؟“

”یہ کلہاڑی سے میری ٹانگ کاٹنا چاہتا تھا۔ بوڑھی مجھے بچانے کے لیے آئی تو اس کے سر میں کلہاڑی لگ گئی۔ پھر...... پھر میں نے اسے......“ اس کی آواز پھر رُندھ گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

”تم مظہر کی کیا لگتی ہو؟“

”کک...... کچھ نہیں...... وہ مجھے اغوا کر کے لایا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”مم...... مجھے بیٹ خیر پور سے......“ وہ گڑبڑا گئی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا مگر اس کی کہانی ایک جملے میں سمیٹی جانے والی نہیں تھی۔ ڈاکٹر چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”تم شادی شدہ ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر یہ کیا چکر ہے؟“ ڈاکٹر نے اُس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کٹ کر رہ گئی۔ ایک بار خشمگیں آنکھیں پھیلائے مرے پڑے مظہر علی کو دیکھا۔ ہونٹوں کو غیر معمولی سختی سے دانتوں میں کچلا، بولی۔ ”مجھے یہاں سے نکال لیں۔ میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گی مگر...... خدا کے لیے مجھے بچا لیں۔ یہ بہت ظالم ناہر (بھیڑیے) ہیں۔“

وہ جہاندیدہ آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ وہ ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اُٹھا، اُسے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے باہر جانے کا حکم دیا، کہا۔ ”خود کو سنبھال کر اُٹھو اور پورے گھر کی تلاشی لو۔ تمہاری کوئی نشانی یا سامان گھر میں نہیں ہونا چاہیے ورنہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔“

”جب یہ مجھے اُٹھا کر یہاں لایا، میں خالی ہاتھ تھی۔“ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ پولیس کا خیال آتے ہی اس کی حالت خاصی دگرگوں ہونے لگی تھی۔ بہ وقت تمام کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر اس دوران گہری سوچ میں مستغرق رہا۔ جونہی وہ خود کو رگیدتی ہوئی چارپائی کے پاس پہنچی، ڈاکٹر نے شانوں سے پکڑ کر بوڑھی کی لاش کے قریب چارپائی پر بٹھا دیا۔ جلدی سے اُس کے پیروں سے چپل کھینچ لی۔ چندو نہ سمجھتے ہوئے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے برق رفتاری سے چندو کی چپل بوڑھی کے پیروں میں ڈال دی اور اُس کی چپل اُٹھا کر چارپائی کے نیچے رکھ دی۔ اُس نے کمرے کے سامان میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ مطمئن ہو کر بولا۔ ”اے لڑکی! میں تمہیں اُٹھا کر باہر لے جاؤں گا۔ تم یہ خیال رکھو گی کہ تمہارے پیر کہیں بھی زمین سے نہیں لگنے چاہئیں۔ او کے؟“

وہ ڈاکٹر کی بات سمجھ گئی مگر یہ نہ سمجھ پائی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا مضبوط اور گٹھے بدن کا مالک تنومند شخص تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اور آپریٹس چندو کو تھمایا اور اُسے ایسے اُٹھا لیا جیسے وہ سات آٹھ سال کی بچی رہی ہو۔ مکان سے باہر لا کر اُسے موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر بولا۔ ”زمین کو چھوئے بغیر اپنے پاؤں فٹ ریسٹ پر رکھ لو۔“

وہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے موٹر سائیکل پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ اس دوران ڈاکٹر نے ایک ہاتھ سے موٹر سائیکل کو سنبھالے رکھا پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ کک مارتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں چاہتا تمہارے پیروں کے نشان پولیس کو مجھ تک پہنچا دیں۔ ٹھیک سے بیٹھ گئی ہو ناں؟“

اس نے ’جی‘ کہا۔ موٹر سائیکل اُسی پگڈنڈی پر چل پڑی جس پر وہ صبح بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل سرخ اور سفید بلاکوں والی چار دیواری کے متوازی کچے راستے پر پہنچ گئی۔ چار دیواری کے تقریباً وسط میں پہنچ کر ڈاکٹر نے دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل روکی۔ اپنا پاؤں دیوار سے باہر کو نکلی ہوئی بنیاد پر جمایا، تھوڑا پہلو بدلا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ”دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاؤ اور وہیں رُک کر میرا انتظار کرو۔ میں مین گیٹ کی طرف سے آتا ہوں۔“

چندو کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا مگر پولیس کے خوف سے اُس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو یکجا کیا اور ڈاکٹر کی مدد سے دیوار پھاند لی جبکہ ڈاکٹر نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

چندو کم بلند دیوار اور سرخ اینٹوں والی بلند عمارت کے درمیان اینٹوں کی روش پر گری تھی۔ ننگے پیروں میں اینٹوں کے کنکر چبھے اور وہ پروا نہ کرتے ہوئے سہمے سہمے انداز میں اردگرد دیکھنے لگی۔ اطراف میں سوائے جنگلی گھاس، کنیر کے اُڑی رنگت والے پودوں اور بجری کے بلند ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ بے اوقات اور بے سہارا تھی۔ دور دور تک عافیت کا کوئی گوشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تبھی اس سرکاری عمارت کو دیکھ کر مزید سہم گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر سرکاری آدمی تھا اور مبادا اُسے پولیس کی تحویل میں دینے کے لیے یہاں لایا ہو...... دل دھک سے رہ گیا۔ چاہا کہ دیوار پھاند کر نکل بھاگے۔ سوچ آئی کہ اُسے تو یہ تک علم نہیں کہ وہ اس وقت کس علاقے میں تھی، یہاں سے کس طرف جا سکتی تھی اور اُسے کدھر کا رُخ کرنا چاہیے تھا۔

ایسے میں اُسے قتل گاہ سے نکال کر لانے والا ڈاکٹر بلند عمارت کی بائیں نکڑ سے نکلا اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی جانب بلانے لگا۔ وہ میکانیکی انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ اس نے ہاتھ تھاما اور کھینچتا ہوا عمارت کے اندر لے گیا۔ راہداری کے آخری کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”تم اس کمرے سے تب تک باہر نہیں نکلو گی جب تک میں واپس نہیں آ جاتا۔ کمرا اٹیچڈ باتھ ہے اور فریج میں کھانے پینے کا سامان پڑا ہے۔“

وہ خاموش رہی مگر اُس کی آنکھوں میں کئی اندیشے سرسرا گئے۔ وہ اس کے چہرے پر رقصاں پرچھائیوں کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ درشت لہجے میں بولا۔ ”دہرے قتل کا معاملہ ہے۔ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے مجھے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ایسے میں اگر کوئی تمہیں یہاں دیکھ لے گا تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ اگر تم مجھ پر اعتماد نہ کرو تو بھلے باہر نکل جاؤ؛ مجھے پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہوگا۔“

وہ سہم گئی۔ جھٹ سے بولی۔ ”نن...... نہیں...... مجھ پر رحم کریں۔“

”میں رحم کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ وقت ضائع نہ کرو، جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ اگر تم رحم کے کونسیپٹ کو سمجھتی ہو تو جاؤ، وضو کرو، ضرورت سمجھو تو غسل کرو اور رحم کرنے والے سے رحم کی اپیل کرو۔“ ڈاکٹر کے لہجے کی خنکی اپنی تمام تر سنگینی سمیت چندو کی سماعت میں اُتر گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی اور سختی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ اپنی ہوس کی آبیاری کرنے والے لوگ ہمیشہ انسان کو راہ سے گمراہ کرتے ہیں مگر وہ چندو کو بھٹکا نہیں رہا تھا۔ اُسے خدا کی طرف راغب کر رہا تھا۔

وہ سہمی سہمی نظروں سے اس بڑے سے کمرے اور بے ترتیب پڑے ہوئے سامانِ روزمرہ کو دیکھنے لگی۔ بڑی سی ونڈو، جس کے کئی شیشے ٹوٹ گئے تھے اور وہاں گتے چپکائے گئے تھے، کے قریب چوبی میز پڑی تھی جس پر مختلف ادویات بکھری ہوئی تھیں۔ ایک سالخوردہ کرسی بھی قریب پڑی تھی۔ مریضوں کا اسپرنگوں والا بیڈ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ برق کوندے کی طرح ماموں رضوان کی بات یاد آئی۔

”مطالعہ کرنے والا بے ایمان اور ظالم نہیں ہوتا۔“

دل کو ایک ذرا ڈھارس ملی کہ اُسے یہاں لانے والا

بے ایمان اور ظالم نہیں تھا بلکہ خدا کو یاد کرنے والا شخص ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں فریج پڑا تھا جو نیا معلوم ہو رہا تھا۔ ٹی وی بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر کی بھاری آواز دور کہیں سنائی دی۔ پتا چل گیا کہ نہ صرف وہ اِس کوٹھی نما عمارت سے نکل گیا تھا بلکہ اس کے ارد گرد اور لوگ بھی موجود تھے۔ فرار ہونے کا موزوں موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔ تبھی لپک کر دروازے میں آئی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ غیر مقفل تھا۔ وہ کھلے طاق کو تھام کر ایک ذرا رُکی۔ سوچا، میں کیوں بھاگ رہی ہوں؟...... قید خانہ مقفل ہوتا ہے۔ جائے امان غیر مقفل ہوتی ہے۔ اُسے یہاں لانے والے نے اُسے قید نہیں کیا تھا بلکہ پناہ دی تھی اور پناہ دینے والے سے بھاگنا دانش مندی نہیں ہوتی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر گیلری میں دائیں ہاتھ چلتی گئی۔ بڑے دروازے میں رُک گئی۔ وہ بھی غیر مقفل تھا۔ اس نے طاق کو تھوڑا سا کھولا اور درز بنا کر باہر جھانکا۔ تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر بڑا سا برآمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ برآمدے میں ڈاکٹر ایک عورت اور مرد کے ساتھ کھڑا محوِ گفتگو تھا۔ وہ ان دونوں کو کچھ سمجھا یا بتا رہا تھا۔ چندو کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسپتال کے احاطے میں بنی ہوئی رہائشی کوٹھی میں کھڑی تھی جبکہ اُس کے سامنے اسپتال کی مرکزی عمارت ایستادہ تھی۔ اس نے درز بڑی کی۔ برآمدے میں پڑی ہوئی چوبی بنچوں پر کئی عورتیں اور مرد بیٹھے دکھائی دیے جو دوا دارُو لینے کے لیے آئے تھے۔

وہ بے جان انداز میں دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گئی۔ لوہے کے پائپ والی اکلوتی چارپائی پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کا سراپا نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ دیکھنے میں اچھا لگا تھا۔ دیکھنے میں تو یارن خان، میاں دلبر حسین اور حیدر خان بھی اچھے لگتے تھے۔ عمر حیات بھی بہت سوہنا تھا۔ ان سب کی وضع قطع اجلی تھی مگر اصلیت بہت ڈراؤنی اور قبیح تھی۔ سر جھٹک کر بڑبڑائی۔ ’’اچھا! اس کی اصلیت بھی سامنے آ ہی جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہی کچھ ہو گا جو اب تک ہوتا آ رہا ہے۔‘‘

ماحول میں مختلف آوازیں چکرا رہی تھیں۔ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا۔ چہار دیواری کے منسلکہ کچے راستے پر موٹر سائیکل اور گاڑی کے دو تین مرتبہ گزرنے کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ مظہر علی اور بوڑھی عورت کا مردہ خوف ناک چہرہ آنکھوں میں لہرا گیا۔ اُسے ایک جھرجھری آ گئی۔ اپنی کیفیت سے ایک ذرا استغنا ہوا تو اُسے بھوک اور نقاہت کا احساس ہوا۔ بہ دقت تمام تک پہنچی۔ فریج میں انڈے، دودھ اور دواؤں کے کچھ نہیں تھا۔ اس نے ٹھنڈے دودھ کے دو چار گھ بھرے۔ فریج کے اوپر اسٹیبلائزر رکھا ہوا تھا جس قریب خاصی تعداد میں بسکٹوں کے ٹکی پیک پڑے ایک پیک اور پانی کی بوتل اُٹھا کر چارپائی پر آ گئی۔ کی نسبت پانی کم ٹھنڈا تھا۔ بسکٹوں کو پانی کے ساتھ حلق اُتارا اور کراہتی ہوئی چارپائی پر دراز ہو گئی۔ بے سے اپنے اجنبی محسوس ہونے والے پیٹ پر ہاتھ پھیر ہوئے کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ نیند کانٹوں پر جاتی ہے؛ آ گئی اور وہ بے خبری کے گہرے استغراق چلی گئی۔

بیدار ہوئی تو کمرا تاریک تھا۔ اپنی اتنی طویل نیند حیرانی ہوئی۔ وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے ہوئے بدن کو گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ گیلری بائیں دہانے پر بلب کی پیلی روشنی دیکھ کر اس طرف آ گئی۔ کھلے صحن میں چارپائی پر ڈاکٹر کو نیم دراز حالت میں مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر رُک گئی۔ وہ بغیر بازوؤں والی سف بنیان اور کمر سے بندھے ہوئے خانوں والے تہ بند میں با دیہاتی لگ رہا تھا۔ سفید و سیاہ ملے جلے بال بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی قریب آئی۔ اس سے پہلے اُس کا سایہ مطالعے میں مستغرق ڈاکٹر تک پہنچ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور کتاب بند کر کے سپاٹ لہجے میں بولا۔ ’’جاگ گئی ہو۔‘‘

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہاتھ سے اشا کرتے ہوئے بولا۔ ’’اگر تم چاہو تو اس کمرے سے ک نکال کر یہاں بیٹھ سکتی ہو۔‘‘

وہ روبوٹ کی طرح پلٹی، کمرے میں گئی اور ایک دفتری کرسی نکال لائی۔ کچھ فاصلے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس چہرہ بلب کی روشنی میں نہا گیا۔

وہ کچھ دیر تک کریدتی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر مستفسر ہوا۔ ’’تمہیں بھوک لگی ہو گی؟‘‘

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ’’فریج سے انڈا نکال کر آملیٹ بنا لو یا فر کر لو۔ کچن میں روٹیاں پڑی ہیں۔ اگر چاہو تو چائے بنا بھی پی سکتی ہو۔‘‘

چندو کو اُس کا بے تاثر لہجہ غیر فطری سا معلوم ہوا۔ کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ چندو ماہی کی کوٹھی میں

موجودگی اُس کے نزدیک کسی خاص واقعے کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسی چھوڑ دی۔ کچن تلاش کیا۔ کچن میں مٹی کے تیل والا چولھا اور ضرورت کے برتن دیکھ کر مشینی انداز میں اپنی بھوک کا سامان کرنے لگی۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا تو ذہن پر چھائی ہوئی بے حسی کی چادر چھٹنے لگی۔ عدم احتیاط کی بدولت چائے ایک پیالے سے زیادہ بن گئی تھی۔ اس نے کیتلی میں بچ جانے والی چائے دوسرے کپ میں ڈالی اور دونوں پیالے اُٹھائے صحن میں آ گئی۔ بغیر کچھ کہے ایک کپ ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چارپائی پر اُٹھ بیٹھا اور پیالہ تھام کر بولا۔ ’’عورت کے ہاتھ کی چائے زہریلی ہوتی ہے مگر تم چونکہ بنا لائی ہو، اس لیے پی لیتا ہوں۔‘‘

اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چائے زہریلی تھی یا نہیں مگر ڈاکٹر کا لہجہ بڑا زہر بار تھا۔ سکوت بھرے ماحول میں چائے کے گھونٹوں کی مخصوص آواز اُبھرنے لگی۔

وہ اچانک بولا۔ ’’چندو ماہی! تم نے یہی نام بتایا تھا ناں اپنا...... واہ! دور فلک میں تنہا کھڑا چاند...... پاکیزہ سا...... اور کبھی ہاتھ نہ آنے والی مچھلی، ماہی...... نام رکھنے والے پر قربان جاؤں۔ مگر انسان کتنا منافق ہوتا ہے۔ اپنے نام کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا۔ یقیناً تم نے بھی اپنی اَداؤں سے کئی گھرانے تباہ کیے ہوں گے۔ اپنے جسم کی چقماق سے کئی خرمن خاکستر کیے ہوں گے۔ مگر میرے سامنے معصوم اور مظلوم بن کر کوئی دردناک کہانی سناؤ گی۔ مجھے باور کراؤ گی کہ تم پر مردوں کے معاشرے نے بڑے ظلم توڑے ہیں اور تمہیں کسی جرم کے بغیر سزا دی گئی ہے۔‘‘

وہ چائے پینا بھول گئی۔ ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی جو اپنی ہی رو میں بہک کر بڑے اپسرائی انداز میں بول رہا تھا۔ باوجود کہ اس کا لہجہ درشت اور جملے تکلیف دہ تھے، اس کا بولنے کا انداز اتنا دل نشیں تھا کہ وہ جملوں کی معنویت پر اپنا دھیان مرتکز نہ کر پائی۔

وہ اُس کی محویت کو دیکھ کر بولا۔ ’’چائے پی لو، ٹھنڈی ہو جائے گی۔‘‘

اس نے چونک کر پیالہ لبوں سے لگایا۔ وہ کہنے لگا۔ ’’زن، زر اور زمین...... تینوں قتل کے سب سے بڑے محرک ہیں۔ زر اور زمین کے حصول کا محرک درحقیقت زَن تک رسائی ہوتا ہے۔ یعنی ہر رنگ میں عورت ہی قتل کا موجب بنتی ہے۔ تم نے آج ایک قتل کیا تھا مگر قانون کی نظر میں تم پر دو قتل ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے نائب قاصد کو بھیج کر پولیس کو بلوایا تھا۔ پولیس والے بڑے بے ایمان اور ہڈ حرام ہوتے ہیں۔ انہوں نے موقع ملاحظہ کیا، نقشے اور تصویریں بنائیں مگر اپنی رپورٹ میں لکھا وہی، جو میں نے گیس کیا۔ انہیں یہ اندازہ تک نہیں ہوا کہ ان دونوں کے قتل کے پیچھے ایک جواں سال لڑکی کا ہاتھ تھا جسے میں مکھن سے بال کی طرح نکال کر اپنے گھر لے آیا ہوں۔ ہونہہ! مذرا (مظہر علی) پکا واردتیا تھا۔ پولیس کو مطلوب تھا۔ انہوں نے ایک فرضی کہانی گھڑ لی کہ اس کے ساتھیوں نے لوٹی ہوئی دولت کی تقسیم پر برانگیختہ ہو کر اُسے بوڑھی ماں سمیت قتل کر دیا۔ اور ٹائیں ٹائیں فش!‘‘‘

اس نے بولنے کے دوران چائے پی لی تھی۔ پیالہ پھیلے ہوئے چارسوتی کھیس پر رکھا اور منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ’’میرا نام منور علی ہے۔ منور علی شاہ۔ اس اسپتال میں میڈیکل آفیسر ہوں یعنی ڈاکٹر ہوں۔ میں نے ساری عمر بھاڑ ہی جھونکا ہے۔ اکیلا رہتا ہوں کیونکہ دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں۔ خود پکاتا ہوں اور مزے سے بیٹھ کر کھا لیتا ہوں۔ شادی نہیں ہوئی کیونکہ مجھے عورت کے وجود سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ کیوں؟ یہ بتانا ضروری نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، مذرے کی ماں کو نیوروبیان کا ٹیکہ لگانے جاتا ہوں۔ اس کا پتر واردتیا اور جاگیرداروں کا منہ زور کارندہ ہے مگر میں اس بوڑھی عورت کو یہاں آنے کی تکلیف سے بچانے کے لیے تیسرے چوتھے دن چلا جاتا ہوں۔ اسپتال کے اسٹاف میں سے کوئی آدمی مذرے کے گھر جانا پسند نہیں کرتا، اس لیے مجھے ہی ثواب کمانے کے لیے وہاں جانا پڑتا ہے۔ بائی داوے! مجھے ثواب کمانے کا بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ یہ تھا میرا اکمل تعارف اور مذرے کے گھر میں عین وقت پر پہنچنے کا سبب...... اَب تم اپنی دکھ بھری داستان جس میں مرد کو ظالم اور عورت کو مظلوم ثابت کیا گیا ہو، الف سے یے تک سنا ڈالو۔ جی چاہا تو تمہاری مدد کر دوں گا۔ جی چاہا تو تمہیں رات یہاں گزارنے اور صبح رخصت ہونے کا حکم صادر کر دوں گا۔‘‘

وہ آنکھیں جھپکے بغیر اُسے دیکھ رہی تھی اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والا ہر لفظ دل میں اُتار رہی تھی۔ ایسے میں اُسے اپنا مقام بھولنے لگا تھا۔ اس کے خاموش رہنے پر ڈاکٹر منور علی نے درشت لہجے میں اپنا حکم دہرایا۔ وہ کچھ دیر تک الفاظ مجتمع کرتی رہی، سوچتی رہی کہ کیا بتائے اور کیا چھپائے؟ تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ نہ چھپانے کا فیصلہ کر کے سر اُٹھایا اور پس منظر اور سیاق و سباق سمیت اپنی

زندگی کی کہانی دریائے چناب کی لہروں سے چھیڑ کر ڈاکٹر منور علی سے حادثاتی ملاقات تک بیان کردی۔ ڈاکٹر منور شاہ کا حوصلۂ سماع دیدنی تھا۔ وہ جب تک بولتی رہی، وہ گود میں رکھی ہوئی کتاب سے کھیلتا رہا اور لب بستگی کے عالم میں پورے انہماک سے سنتا رہا۔

رات وقت کے بدن پر تاریخ کی چولی بدل رہی تھی جب وہ دونوں چاندنی کا غسل کرتے ہوئے لب بستہ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں سے نبرد آزما تھے۔ خاموشی کا طویل دورانیہ ڈاکٹر منور کی بھاری اور قدرے بے تاثر آواز کے طلسم سے ٹوٹا۔ ’’ہوں! تو تم واقعی دکھی ہو۔ عورت زمانے کو اور زمانہ مرد کو ڈستا ہے جبکہ تمہیں سانپ جیسے مردوں نے ڈس لیا۔ مگر خیر! یہ کوئی ایسی نئی کہانی بھی نہیں کہ اس پر ماتم کیا جائے۔ تم نے جو غلطیاں کیں، وہ اس عمر کی لڑکیاں عمومی طور پر کرتی رہتی ہیں اور خمیازے بھگتتی رہتی ہیں۔‘‘

چندو نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی پونچھی۔ امید بھرے انداز میں پوچھا۔ ’’سر! کیا آپ میری مدد کریں گے؟‘‘

وہ چونکا۔ ’’آں...... ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ مگر مدد کا تعین تمہیں کرنا ہوگا۔‘‘

’’میں سمجھی نہیں سر!‘‘

’’یہی کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔‘‘

’’مم...... مجھے بچالیں سر......‘‘ وہ گھگیائی۔

’’کس سے؟‘‘ ڈاکٹر کی کڑی نظریں اُس پر جم گئیں۔

وہ گڑبڑا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

’’مردوں سے۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں؟‘‘ ڈاکٹر نے تائید طلب کی۔

اس نے سر ہلایا تو وہ بولا۔ ’’سنبھلتے ہی مرد مرد کرنے لگو گی، پھر؟‘‘

وہ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے منہ بنایا، کہا۔ ’’مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر عورتیں اور مرد موجود ہیں۔ سانپوں، کتوں اور بھیڑیوں سے بچا جاسکتا ہے مگر انسانوں سے نہیں۔‘‘

وہ مایوس سی ہوگئی، بولی۔ ’’مگر جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، ایسا دوسری سب عورتوں کے ساتھ نہیں ہو رہا سر!‘‘

’’تم کیا یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے ساتھ لوگ اس لیے کھیلتے رہے کہ تم لاوارث تھیں؟‘‘

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

’’یعنی تم کسی مرد کی پناہ چاہتی ہو؟‘‘

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے لبوں سفاک سی مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ ’’جس سے ڈرتی ہو، اُ سے تحفظ مانگتی ہو؟‘‘

وہ روہانسی ہوگئی۔ ’’سر! میں مرنا نہیں چاہتی ہوں مگر ج زندگی گزشتہ چند مہینوں سے گزار رہی ہوں، اس سے موت بدرجہا بہتر ہے۔ میں بابا گامن کے پاس جانا چاہتی ہوں مگر جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایک پل کے لیے گھر میں ٹکنے نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے جتنی محبت کرتا تھا، اس سے کہیں زیادہ نفرت کرنے لگا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے جہاں مجھے پناہ مل سکتی ہو۔ میرا کوئی اپنا نہیں؛ کوئی بھی نہیں۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں مگر میں پڑھ بھی نہیں سکتی۔ میں گندی نہیں اچھی لڑکی بنتا چاہتی ہوں مگر لگتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟‘‘

ڈاکٹر منور علی کی سفاک مسکراہٹ اُسے بدن چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سر جھکا کر رونے لگی۔

ڈاکٹر نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ’’اے لڑکی! رونا بزدلی ہے۔ بزدل اپنی زندگی بھی گزارنے کے قابل نہیں ہوتے، کسی کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ ابھی بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اِس کے بارے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟‘‘

اس نے چندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ کمزور سی آواز میں بولی۔ ’’جس طرح میرا غلیظ وجود کسی عورت کے پیٹ میں ڈالا گیا تھا، ایسے ہی میرا پیٹ بھی کسی حرام زادے کے بدن سے بھر دیا گیا ہے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں، چاہتی ہوں کہ ایسی زندگی کوئی اور نہ گزارے اور سانس لینے سے پہلے ہی مرجائے۔‘‘

’’یعنی اَبارشن کرانا چاہتی ہو؟‘‘ ڈاکٹر کا لہجہ زہرخند ہوگیا۔

اس نے سر ہلایا۔ ’’جی سر!‘‘

’’یہ تو قتل ہوگا۔‘‘ ڈاکٹر نے ’قتل‘ لفظ پر خصوصاً زور دیا۔

’’جی سر! مگر میں سوچتی ہوں کہ میرے جیسی زندگی سے موت بہتر ہے۔‘‘

ڈاکٹر نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ ’’میرا اندازہ ہے کہ تمہاری پریگننسی کی عمر بہ مشکل چار پانچ ماہ ہے۔ اس موقع پر کیے جانے والے ڈی این سی سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہی پیچیدگیاں ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیتی ہیں۔ نہیں لڑکی! میں کسی بھی معروضی حالات میں اس قبیح عمل کے حق میں نہیں ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قتل ہے اور ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنے والا بچہ خطاکار نہیں ہے۔ خطاکار تم ہو یا تمہاری لاش پر موج اُڑانے والے گدھ ہیں جن کے جرم کی سزا بچے کو نہیں دی جاسکتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ طے نہیں کہ جو زندگی تم نے گزاری، وہ اس بچے کا مقدر بھی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟‘‘

’’جی سر! میں سمجھ رہی ہوں مگر لوگ نہیں سمجھتے۔ لوگوں نے قدم قدم پر مجھے ’حرام کی پھوئی‘ کہہ کر مذاق اور تضحیک اڑائی ہے۔ زمانہ اس پر بھی قہقہے لگائے گا۔ لفظ بدل بدل کر چرکے لگائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی۔‘‘

’’تم جو کرنا چاہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر میں ظلم کو ظلم سے روکنے کا روادار نہیں ہوں۔‘‘ اس کے لہجے کی خنکی میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ ’’اور تم جہاں جانا چاہوگی، میں بندوبست کردوں گا۔‘‘

وہ سہم گئی۔ چند ثانیوں میں وہ سبھی چہرے نظروں میں گھوم گئے جن سے پیچھا چھوٹ گیا تھا مگر ان کا خوف ابھی تک ذہن پر مسلط تھا۔

’’اگر تم میری مدد چاہتی ہو تو تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا، جو میں چاہوں گا۔‘‘

اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ ’’آپ کیا چاہتے ہیں سر؟‘‘

ڈاکٹر منور علی کے لبوں پر پھر سفاک مسکراہٹ دکھائی دی۔ بولا۔ ’’میں چاہتا ہوں کہ تم اس۔ بچے کو جنم دو۔‘‘

چندو کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ ’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟ میرا وجود مجھ پر بوجھ ہے۔ کوئی ٹھور ٹھکانا بھی نہیں۔ میں کیسے......‘‘

’’میری بات پوری ہونے دو۔ اگر تم میری مرضی پر چلنا چاہو تو میں مدد کروں گا وگرنہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو جنم دو۔ رہی بات کہ اسے معاشرہ حرام زادہ نہ کہے؛ تو میں اس کا بندوبست بھی کرسکتا ہوں۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لیے میں تم سے عقد کر لیتا ہوں۔ گواہوں اور نکاح خواں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ تم حاملہ ہو۔ اس بچے کو اپنا نام دے دیتا ہوں۔ نہیں نہیں...... ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم عملی یا شرعی طور پر میری بیوی نہیں ہو گی۔ اپنوں اور غیروں کے طعنوں سے بچنے کے لیے یہ جعلی شادی ہوگی۔ جب تک بچہ پیدا نہیں ہو جاتا، ہم خود کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ ڈلیوری کے بعد میں تمہیں بہ ظاہر طلاق دے کر آزاد کردوں گا۔ اس طرح بچے کو میرا نام مل جائے گا اور یہ راز میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ جانتا ہوں کہ تم اس اَن دیکھے بچے سے نفرت کرتی ہو اور ایسا ہونا غیر فطری بھی نہیں ہے مگر قتل غیر فطری اور غیر انسانی عمل ہے۔ میری باتیں سمجھ رہی ہو ناں؟‘‘

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اُسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ’’اگر تمہاری نفرت قائم رہے گی تو میں بچہ کسی بانجھ گود میں ڈال کر تمہیں اس کے تردد سے نجات دلا دوں گا۔ میرا ایک دوست کئی سالوں سے بچہ اَیڈاپٹ کرنے کے چکر میں ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی۔ تم سے علیحدگی کے بعد کسی نرسنگ اسکول میں داخلہ دلا دوں گا۔ نرسنگ کے کورس کے دوران سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس سے زندگی کی گاڑی بہ آسانی چلتی رہتی ہے۔ محفوظ رہائش اور چار سالہ کورس کی تکمیل کے بعد بہ آسانی نوکری بھی مل جاتی ہے۔ تب تم کوئی مناسب سا لڑکا دیکھ کر شادی کر لینا۔ چونکہ تم اچھی زندگی کی خواہاں ہو، محفوظ رہنا چاہتی ہو اس لیے میں اس طریقے سے تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ چاہو تو ٹھیک، نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔‘‘

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اُسے ڈاکٹر منور علی کی معاملہ فہمی اور منصوبہ بندی پر حیرت آمیز خوشی ہوئی، بولی۔ ’’سر! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔‘‘

ڈاکٹر نے جواباً آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں چندو کی نگاہ اُس کی بند آنکھوں پر پڑی۔ بائیں آنکھ نے چونکا دیا۔ جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ جو دیکھا تھا؛ وہی سچ تھا۔ سچ کیا تھا؟ وہی، جو اُسے عمر حیات کی حویلی میں ماموں رضوان نے بند آنکھ پر انگلی رکھ کر بتایا تھا۔ یکبارگی چندو کا دل وفورِ اطمینان سے منور ہو گیا۔ لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور دل میں سر اُٹھانے والی تشکیک کے ننھے ننھے کانٹوں نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر منور علی شاہ نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ ’’تم میرے احسان کو یقیناً بھول جاؤ گی کیونکہ میری زندگی میں تم سے پہلے کئی لوگوں نے احسان فراموشی کی روایت قائم کر رکھی ہے۔ مگر مجھے یہ طلب نہیں ہے کہ تم تمام عمر مجھے جھک جھک کر ملتی رہو یا احسان مندی کے کھوکھلے اظہار میرے منہ پر مارتی رہو۔ میں تمہیں نرسنگ اسکول جوائن کرنے تک اپنے گھر میں برداشت کروں گا اور پھر کبھی تمہاری شکل تک دیکھنا نہیں چاہوں گا۔ اگر تم نے اپنا آپ سنبھال لیا تو ٹھیک ورنہ پلٹ کر یہاں آنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ تمہارے

ڈاکومنٹس کہاں ہیں؟‘‘

وہ چونکی۔ ’’وہ......وہ......رزلٹ کارڈ......‘‘

سوچ میں پڑ گئی۔ عمر حیات کی حویلی سے نکلتے ہوئے اس کا ہینڈ بیگ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ رزلٹ کارڈ اُسی ہینڈ بیگ میں تھا جو نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ بے چارگی سے بولی۔ ’’میٹرک کا رزلٹ کارڈ تھا۔ وہ بھی کھو گیا۔‘‘

وہ بولا۔ ’’رول نمبر یاد ہے؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’جی سر! بائیس سو اکیانوے......‘‘

’’میں کل ڈسپنسر کو بھیج کر بورڈ سے ڈپلیکیٹ کارڈ نکلوا لوں گا۔ اب کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ چھوٹے کمرے میں بستر پڑا ہے، نکال لو۔ رات کے پچھلے پہر میں خاصی سردی ہو جاتی ہے یہاں۔ جب تک نیند نہ آئے، تب تک میری پیشکش کے بارے میں سوچتی رہنا۔ اور ہاں! تم پڑھی لکھی ہو۔ اپنے فائدے اور نقصان کے بارے میں سوچ سکتی ہو اس لیے فیصلہ کر لوگی۔ اس خوف میں مبتلا نہ رہنا کہ میں ان مردوں جیسا ہوں جن سے اب تک تمہارا واسطہ پڑا ہے۔ آئی ایم ڈیفرنٹ کیس......‘‘

وہ اُٹھی۔ چند قدم چل کر رُکی۔ مستفسر ہوئی۔ ’’سر! میں چائے بنا لوں؟‘‘

’’ہاں! مگر صرف اپنے لیے۔‘‘ اس نے کہا اور پائنتی پر تہ کر کے رکھا ہوا کھیس کھینچ کر تان لیا۔

وہ کچن میں آ کر چائے تیار کرنے لگی۔ اس کا ذہن گنبدِ بے روزن بنا ہوا تھا جس میں ڈاکٹر منور علی کی بھاری مگر دل میں اُترنے کا وصف رکھنے والی آواز چکرا رہی تھی۔ چونکہ اُس کے پاس اس پیشکش کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا، اِس لیے اس نے صحن میں بیٹھے بیٹھے ہی دل میں اُس کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ بچہ جننے کے حق میں قطعی طور پر نہیں تھی مگر ڈاکٹر منور علی کا اٹل رویہ دیکھ کر ناچار آمادہ ہو گئی تھی۔

اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں تشکیک سنپولیے کی طرح کلبلا رہی تھی کہ مبادا ڈاکٹر منور علی اُس سے شادی کا خواہش مند تو نہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسا تھا بھی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ وہ وجیہہ، پُرکشش اور امیر شخص تھا۔ بدبودار لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر چکرانے سے اس کا قرب بہتر اور محفوظ تھا۔ وہ بستر میں گر کر جب تک جاگتی رہی، آنے والے دنوں کی پیش بندی کرنے کے بجائے گزرے ہوئے ایام کی تلخیوں پر کڑھتی رہی۔

اس کو جلد ہی اپنی تشکیک پر شرم آنے لگی۔ آ والے چند ہی دنوں میں ڈاکٹر منور علی کی تہ در تہ چھپی شخصی اُس پر آشکار ہونے لگی۔ وہ انتہائی روکھا، تلخ اور بے انسان تھا۔ اس کے باوجود کہ چندو ماہی نے اُس ویران کوارٹر کا نقشہ بدل دیا، کچن سنبھال لیا اور زند نسوانی ترتیب سے آراستہ کر دیا، اس نے ایک بار بھی چہر کو بہ نظرِ غور دیکھا اور نہ ہی اس کے اندازِ آرائش پر دا دینے کی زحمت کی۔ وہ اسپتال سے آ کر سو جاتا؛ بیدار ہو مطالعے میں مگن ہو جاتا پھر کھانا کھا کر لگے بندھے معمو کے مطابق سو جاتا۔

چندو جسمانی اور ذہنی طور پر زخمی تھی۔ ڈاکٹر نے اس مخدوش حالت کے پیشِ نظر چند قوت آور ٹیکے لگائے۔ نیز وقت کھانے کی گولیاں دیں۔ ڈاکٹر منور علی اتوار کو چندو سے ذاتی استعمال کی اشیا کی فہرست لے کر بورے والا گیا۔ واپسی پر اس کی موٹر سائیکل ریڈی میڈ ملبوسات سمیت مختلف انواع کے سامان سے لدی تھی۔ صحن میں موٹر سائیکل اسٹینڈ کرنے کی مخصوص جگہ پر رُک کر اس نے چندو کو دیکھے بغیر کہا۔ ’’میں جعلی نکاح کا بندوبست کر آیا ہوں۔ صبح، ذ جلد ہی یعنی پانچ بجے کے لگ بھگ، شہر جانے کے لیے تیا ہو جانا تاکہ ہمیں اسپتال سے نکلتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔ اور ہاں! الٹے ہاتھ والا دوسرا کمرا اپنے لیے مخصوص کر لو۔‘‘

اس نے ’جی اچھا‘ کہہ کر موٹر سائیکل سے سامان اُتار شروع کر دیا۔ پھر گھنٹا بھر حکم کی تعمیل میں جتی رہی۔ کمرے کی صفائی ستھرائی میں کچھ زیادہ دیر لگ گئی۔ فارغ ہو کر سامان چیک کرنے لگی۔ بالکل اسی انداز میں عمر حیات اُس کے لیے سامان خرید کر شہر کے مکان میں لایا تھا۔ ایسے ہی وہ کورٹ میرج کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ وہ صدقِ نیت رکھتا تھا مگر اس کی ماں نے عین موقع پر پہنچ کر اس کی پلاننگ تہس نہس کر دی تھی۔ عمر حیات نے اُسے بڑے ظالمانہ اند میں پامال کیا تھا مگر آنکھوں کی نمی نے آشکار کر دیا کہ وہ ابھی تک اُس کے دل میں جاگزیں تھا۔ اس کی ادائیں یاد آ دل میں حبس پیدا کرنے لگیں تو وہ سفید جھالر والے سر سوٹ کو سینے سے بھینچ کر سسک پڑی۔ عمر حیات کو اپ آنکھوں سے گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کے زندہ جانے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اُس وقت اس کی آنکھوں بے حسی طاری تھی مگر آج اس کی آنکھیں کوئی اور نوحہ خو کرنے لگی تھیں۔ اس نے بہ دقت تمام سر جھٹک کر عمر حیات

کی یادوں سے پیچھا چھڑا کر سامان کو الماریوں میں رکھنا شروع کیا۔

اگلے دن وہ ڈاکٹر منور علی کی ہدایت پر علی الصباح غسل کر کے، نیا لباس زیب تن کر کے شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ابھی اندھیرا اچھٹ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اُسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسپتال سے نکل کھڑا ہوا۔ دس پندرہ منٹ کے سفر کا اختتام ایک جدید وضع کے مکان پر ہوا۔ مکان کے باہر ڈاکٹر نورالامین کی سنہری نیم پلیٹ نصب تھی۔ کال بیل پر ایک پستہ قامت مگر فربہی مائل گنجے سر والے شخص نے مین گیٹ کا بغلی دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر اور چندو کو دیکھ کر بغیر کچھ کہے پلٹ گیا۔ چند لمحوں بعد اُس نے مین گیٹ کا ایک طاق کھول کر موٹر سائیکل اندر لانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر منور علی اور چندو ماہی اُس کے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

میزبان دس پندرہ منٹ بعد چائے کی ٹرے اُٹھائے ڈرائنگ روم میں آیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''ڈاکٹر شاہ! تمہیں ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔ حاضری لگاؤں گا اور واپسی پر تمہارے مطلوبہ افراد کو اُٹھا لاؤں گا۔''

ڈاکٹر منور علی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، کہا۔ ''اس بات کا دھیان رکھنا کہ یہ شادی آج ہی ہوگی۔ مگر سرکاری ریکارڈ میں اندراج پانچ ماہ پہلے کی کسی تاریخ میں ہونا چاہیے۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے ڈاکٹر! تم فکر نہ کرو۔'' وہ اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

''کام ہونا چاہیے بس! اور ہاں! اس وقت میرے پاس رقم کم ہے کیونکہ تنخواہ ابھی نہیں ملی۔ یہ خیال رکھنا۔'' ڈاکٹر منور علی کی آواز میں ہلکی سی تشویش کا عنصر شامل تھا۔

وہ سر ہلاتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ ڈاکٹر منور علی نے چائے کا کپ اُٹھایا، کہا۔ ''یہ میرا کلاس فیلو ہے۔ ڈاکٹر نورالامین...... ہمارا اکلوتا واقفِ حال۔ اسپتال سے واپسی پر نکاح رجسٹرار اور سیکریٹری کو اُٹھا لائے گا اور ہمیں میاں بیوی کے رشتے میں پرو دے گا۔''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر منور علی محض بچے کو دنیا میں جائز مقام دینے کے لیے شادی کا سوانگ رچا رہا تھا، اس کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ جذبۂ تشکر سے معمور نظروں سے انسانی شکل میں بیٹھے ہوئے دیوتا کو دیکھنے لگی۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے کہا تھا ناں کہ یہ محض ڈراما ہو گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی حمل کے دوران نکاح نہیں ہو سکتا۔''

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ دل میں کہا۔ ''سر! آپ بہت عجیب انسان ہیں۔ نبض دیکھ کر جسم کے سات پردوں میں چھپی ہوئی بیماری کو دیکھ لیتے ہیں مگر آنکھوں میں جھانک کر دل میں ہلکورے لینے والے جذبے کو پہچان نہیں سکتے۔''

نصف گھنٹے بعد مین گیٹ کھلنے اور گاڑی نکلنے کی آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر نورالامین جا رہا تھا۔

ڈاکٹر منور علی نے بارہا واضح کیا تھا کہ یہ شادی محض کاغذی ہوگی، پھر بھی چندو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کن اَنکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ سامنے والی دیوار پر آویزاں لینڈ اسکیپ کی اُڑے اُڑے رنگوں والی پینٹنگ پر نظریں جمائے کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر! ایک بات پوچھوں؟''

اس نے چندو کو دیکھا اور آنکھوں سے اجازت دی۔

وہ بولی۔ ''آپ کی شادی نہیں ہوئی؟''

اس نے عام سے انداز میں سر نفی میں ہلایا۔

''کیوں سر!'' اُسے حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر کی عمر خاصی تھی۔ چندو کے نقطۂ نظر سے اُس کی شادی کم و بیش پانچ دس سال پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔

''اس لیے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر منور کا لہجہ کسی لچک سے عاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چندو کے اگلے ممکنہ سوال کی راہ مسدود کر دی۔ ''نو اَینی مور آن دِس ٹاپک!''

چندو مجبوراً خاموش ہو گئی۔ وہ ڈاکٹر منور علی کی شخصیت میں مسلسل دلچسپی لے رہی تھی اور اس کے رویے میں جا بجا دکھائی دینے والا تغیر اُسے حیران کر رہا تھا۔ وہ بیک وقت مہربان اور نہایت خشک طبع انسان تھا۔ چند لمحوں میں اُسے مدد کے لائق سمجھ کر پولیس سے بچانے کا فیصلہ کرنا اور فوراً عمل پیرا ہو جانا، بچے کی پیدائش پر مصر ہونا، دنیا میں آنے والے بچے کو اپنی شناخت دینے کا تہیہ کر لینا اور بے داغ منصوبہ تیار کر کے عمل پیرا ہو جانا...... یہ سارے فیصلے اُس کی مضبوط قوتِ ارادی کو ظاہر کرتے تھے جبکہ اس کا بے اعتنا رویہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے نزدیک چندو ماہی کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ تمام واقعات خواب کی طرح چندو کو اپنی تحویل میں لیے آگے کی طرف سرک رہے تھے اور وہ بے اختیارانہ چلتی جا رہی تھی۔ جن حالات سے دوچار ہو کر وہ ڈاکٹر منور علی تک پہنچی تھی، اُن حالات کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر منور اُس پر بھروسا نہ کرتا مگر وہ اعتماد کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی

کہ ڈاکٹر منور کی باوقار اور سنجیدہ شخصیت کے حصار سے نکلنا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نورالامین کا انتظار خاصا اعصاب شکن واقع ہوا تھا جس کا اختتام مین گیٹ پر رُکنے والی گاڑی کی آواز پر ہوا۔ وقت چندو کو نکاح کی لڑی میں پرونے پر کمربستہ تھا اور وہ دھڑکتے دل اور خالی ذہن سے ڈاکٹر منور علی کو دیکھ رہی تھی جو آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور اس کے جبڑوں کے اعصاب جلد میں تھرک رہے تھے۔

❋❋❋

بہت مصروف دن شہر میں گزارنے کے بعد جب وہ اپنے ہینڈ بیگ میں نکاح نامہ سنبھالے ڈاکٹر منور علی کے ہمراہ کوارٹر میں داخل ہوئی تو اس کے ذہن میں ڈاکٹر نورالامین کے چند جملے مسلسل ضربیں لگا رہے تھے۔ اس نے ڈاکٹر منور علی کی عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں ڈاکٹر شاہ کا ہم راز ہونے کے ناتے جانتا ہوں کہ نکاح کے باوجود اُس کا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ استوار نہیں ہوا۔ وہ عجیب شخص ہے۔ جونہی تم کرائسس سے نکلو گی، وہ تمہیں اپنی زندگی سے نکال دے گا۔ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہیں ڈاکٹر منور سے اچھا انسان اور باوقار ساتھی دنیا میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ بھلے وہ ٹوٹا پھوٹا انسان ہے، انسانوں کا ڈسا ہوا ہے مگر وہ پانی بھی پینا نہیں چاہتا۔ اگر تم سے ممکن ہو تو اُسے پانی پلا دینا۔ اُسے انسانوں کی دنیا میں لوٹنے پر مجبور کر دینا۔ نہ صرف تمہاری زندگی خوب صورت ہو جائے گی بلکہ دنیا کے اس عظیم مسیحا کو بھی قرار آ جائے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

اس نے نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مزید قریب ہو گیا، بولا۔ ''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم اس کاغذی شادی کو حقیقی شادی میں بدلنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ تمہیں اپنی بیوی کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو سمجھو، تم دنیا کی خوش قسمت لڑکی ہو۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا مگر ڈاکٹر منور علی لوٹ آیا۔ ہنس کر بولا۔ ''تمہاری شکل چغلی کرتی ہے کہ تم میرے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہو؟''

ڈاکٹر نورالامین جھینپ کر مسکرایا اور کھانا لگانے کا کہہ کر صوفے سے اُٹھ گیا۔

فوری طور پر چندو ماہی نے اُس کی باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا مگر راستے بھر میں وہ مسلسل یہی سوچتی آئی تھی۔ اُسے ڈاکٹر نورالامین کا مشورہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر منور علی جیسے خوش رو اور صاحبِ مقام شخص کے پاس تاعمر محفوظ اور مطمئن رہ سکتی تھی۔ اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار عمر حیات اور ڈاکٹر منور کی شخصیات میں موازنہ کیا۔ سوائے جوانی کی شوخیوں کے ڈاکٹر کی شخصیت کا پلڑا بھاری تھا۔ جنسی تشدد کے بحران سے نکلنے اور ڈاکٹر منور علی کے سنجیدہ رویے کی بدولت اُس کا اعتماد لوٹ رہا تھا اور وہ صحت مند انداز میں سوچنے لگی تھی۔ چونکہ وہ دنیا میں تنہا تھی، کوئی سہارا نہیں تھا، اس لیے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ ڈاکٹر منور علی کی زندگی سے طلاق لے کر نہیں نکلے گی۔ مجبوراً کی گئی شادی کو ازدواجی خوشیوں میں تبدیل کرے گی۔ چونکہ وہ ڈاکٹر منور علی کے پس منظر اور عادات کی پختگی سے ناواقف تھی، اِس لیے اُسے یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر کو شوہر بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

چونکہ وہ شام کا کھانا ڈاکٹر نورالامین کے ہاں کھا کر آئے تھے، اِس لیے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر لگاتے ہی ڈاکٹر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چندو نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ پھر چائے تیار کرنے کے لیے کچن میں آ گئی۔ ٹرے میں دو کپ رکھ کر دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس آئی۔ وہ اس کے چائے تیار کرنے تک اپنی چارپائی اور بستر صحن میں نکال چکا تھا اور اب بلب کی پیلی روشنی تلے اپنے مخصوص انداز میں تہ بند اور بنیان پہنے چارپائی پر نیم دراز میٹریا میڈیکا کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ پر متوجہ ہو کر بولا۔ ''گڈ گرل! میں تمہیں چائے کا کہنے ہی والا تھا۔''

چندو کو اس کے رویے میں نرمی کا احساس ہوا۔ اس نے تپائی کھینچی، ٹرے رکھی اور ایک کپ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع تھی کہ وہ اُسے بیٹھنے کے لیے کہے گا مگر جب وہ اس پر توجہ دیے بغیر چائے پینے لگا تو مایوس ہو کر بولی۔ ''سر! بیٹھ جاؤں؟''

''اوہ ہاں! کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر نے پائنتی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی، بولی۔ ''سر! آپ بہت اچھے ہیں۔''

''ہوں!'' اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا۔ نظریں بہ دستور میٹریا میڈیکا پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ''انسان اپنے لباس میں رہے تو ہر دیکھنے والے کو اچھا لگتا ہے۔ جانور بن جائے تو غلیظ اور بدصورت دکھائی دیتا ہے۔''

''سر! آپ اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں؟'' وہ پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ ''آپ ہر وقت اتنے جلے بھنے کیوں رہتے

ہیں؟'' مگر جرأت نہ کر پائی۔

وہ چونکا۔ خشک نظروں سے اُسے دیکھ کر بولا۔ ''کیا میں اس عمر میں بچوں کی طرح اچھل کود کروں؟ بات بے بات قہقہے لگاؤں؟''

وہ قدرے سہم گئی۔ اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی جانب راغب کرنا چاہتی تھی مگر شرم سے اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ باوجود کہ یارن خان اور حیدر خان کی فحش گفتگو نے اُسے خاصا منہ پھٹ بنا دیا تھا اور اس کے جو جی میں آتا، بغیر جھجکے بولتی رہی تھی مگر ڈاکٹر منور علی کے سامنے اُس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ''سر! اگر مجھے وقت نے آپ کی بیوی بنا ہی دیا ہے تو آپ مجھ پر احسان کریں اور قبول کر لیں۔ میں تمام عمر آپ کی خدمت کروں گی۔''

اس نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر لفظ ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئے اور وہ رُخ پھیر کر اپنے چہرے کی غیر معمولی سرخی کو چھپا گئی۔ ڈاکٹر چائے کی ننھے ننھے گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے اُس کی پل پل بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ گیا۔ قدرے ترشی سے بولا۔ ''چندو! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔ ''وہ دراصل ...... میں جب سے یہاں آئی ہوں، آپ کو ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا اس لیے ......''

ڈاکٹر منور کا لہجہ بہ دستور ترش تھا۔ ''یہ بات تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں نے بھی اَب تک تمہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔''

وہ گڑبڑائی۔ ''مم ...... میں ایسی نہیں تھی؛ جیسی اَب ہوں۔ مقدر نے مجھے بے گھر کر دیا ہے۔ بے گھر انسان بے وزن ہو جاتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا ہر انسان پیدائشی طور پر بے گھر ہوتا ہے۔''

''مگر آپ تو بے گھر نہیں ہیں۔'' چندو نے جتانے کے سے انداز میں کوٹھی پر طائرانہ نظر ڈالی۔

''یہ گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔ جب میں گورنمنٹ کے کام کا نہیں رہوں گا، مجھے نکال باہر کر دیا جائے گا۔ جس طرح تمہیں ناکارہ ہو جانے پر پہلے تمہارے باپ گامن نے پھر دل پھینک میرزادے نے اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔'' ڈاکٹر منور کا لہجہ بتدریج بے رحم ہو گیا۔ ''مجھے چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ تم جب تک یہاں رہنا چاہو، بے شک رہو۔ اینٹوں کے اس ڈھیر کو اپنا گھر سمجھو۔ ہنسو، کھیلو اور موج کرو۔ بوجھ کم ہونے اور اگلا سفر آسان دکھائی دینے تک خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو۔ ریس میں وہی گھوڑا حصہ لے سکتا جو تازہ دم اور صحت مند ہو۔ مطالعہ کا شوق رکھتی ہو تو نا پڑھا کرو، شاعری پڑھ لیا کرو۔ ڈاکٹری کی خشک کتاب کے علاوہ بھی یہاں بہت کچھ موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہاں سے نکلتے ہی تمہیں وہی ماحول ملے گا جس سے م تمہیں کچھ دنوں کے لیے نکال کر لایا تھا اور ایسے کبیدہ خاط ماحول میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے تمہیں انسان بالخصوص مرد کی فلاسفی اور سائیکی کو سمجھنا ہوگا۔ یہ بات اپ ذہن میں رکھو کہ اکیلا آدمی دنیا کو فتح کر سکتا ہے جبکہ سہاروں کے چکر میں پڑنے والا ہر موڑ پر اَٹک جاتا ہے۔''

وہ بہ ظاہر بڑے انہماک سے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی مگر درحقیقت وہ نہ تو سن سمجھ رہی تھی اور نہ ہی ذہن نشین کر رہی تھی کیونکہ یہ مربیانہ گفتگو اس کے سوال کا جواب نہیں تھی۔ وہ اندر ہی اندر ڈاکٹر نورالامین کے مشوروں کو دہ رہی تھی اور ڈاکٹر منور کے سامنے اپنا آپ پیش کرنے کے لیے مناسب الفاظ اور ہمتیں یک جا کر رہی تھی۔ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر بولی۔ ''سر! کیا اِس گھر میں مجھے ہمیشہ کے لیے پناہ مل سکتی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

وہ ڈر کر اُٹھی اور چند قدم دور رُک کر رُخ پھیرتے ہوئے کانپتی آواز میں بولی۔ ''مم ...... میں تھک گئی ہوں سر! میرا جی چاہتا ہے کہ ...... کہ ...... میں آپ کے پاس رہوں۔ ہمیشہ کے لیے ...... مم ...... میں جانتی ہوں کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں مگر ...... آپ مجھے اپنے قابل کر سکتے ہیں۔''

''تم احسان کا بدلہ اس طرح چکانا چاہتی ہو؟''

''نہیں سر!'' ڈاکٹر کی غیر معمولی سرد آواز سن کر وہ بوکھلا گئی۔

''تو پھر اپنی اوقات سے نکل کیوں رہی ہو؟''

''مجھ پر رحم کریں سر!'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

''رحم ہی تو کر رہا ہوں جو تمہیں سنبھلنے کا موقع دے رہا ہوں ورنہ اس وقت تم دہرے قتل کے جرم میں قانون کے رکھوالو کا پہلو گرما رہی ہوتیں۔ رحم کرتے ہوئے ہی تمہیں اپنے بچے کے قتل جیسے قبیح گناہ سے بچا رہا ہوں اور تمہارے بچے کو دنیا میں اپنا نام دے کر معتبر کر رہا ہوں۔ تمہیں محفوظ مستقبل دینے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر شاید تم جس کلاس سے تعلق رکھتی ہو، اس کلاس کی عورتوں کا بدن زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔ وقت ناوقت بولنے لگتا ہے۔ عزت کی رات شاید تمہاری آنکھوں میں بھی چبھنے لگی ہے اس لیے مجھ سے وہ کچھ مانگنے چلی آئی ہو جو میں دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ جاؤ! جا کر سو جاؤ۔'' ڈاکٹر منور علی کے لفظ لفظ سے آگ کی لپٹیں برآمد ہو رہی تھیں اور وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ رہی تھی۔

تڑپ کر بولی۔ ''سر! میں ایسی نہیں ہوں ...... مم ...... میں تو ......''

''تم جیسی بھی ہو، مجھے اس سے غرض نہیں۔ ہاں! اگر تم اچھی عورت بننا چاہتی ہو، عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو اُس معاہدے پر عمل کرو جو میرے اور تمہارے درمیان طے پایا تھا۔ تم بہ ظاہر میری بیوی ہو مگر حقیقت میں تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے سر پر لٹکتی ہوئی ننگی تلوار کے ہٹتے ہی تمہیں طلاق دے کر نرسنگ کلاس میں داخل کرا دوں گا اور پھر زندگی بھر میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہوں گا۔'' ڈاکٹر نے نہایت زہر بار مگر فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

چندو نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی پھر احساسِ تضحیک میں ڈوب کر نڈھال قدموں سے صحن عبور کر کے برآمدے میں آ گئی۔ چند لمحے ستون کے ساتھ کندھا ٹکائے کھڑی ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھتی رہی پھر آہ بھر کر کمرے میں چلی گئی۔ جب تک جاگتی رہی، روتی رہی۔ اس دوران ڈاکٹر منور علی کی غیر معمولی سرد اور نفرت بھری آواز اُس کے ذہن میں چکراتی رہی اور اُسے شدید نوع کی ندامت سے دوچار کرتی رہی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اُس کی پیشکش کو بخوشی نہ سہی، مجبوراً ہی سہی، قبول کر لے گا مگر اُس کی توقع شیشے کی طرح ٹوٹ کر آنکھیں زخمی کر گئی۔ اس ناتوانی میں ایک کمزور سی ڈھارس اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی کیونکہ ڈاکٹر نورالامین نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آسانی سے ماننے والا شخص نہیں۔ پتھر دل ہے۔ اس لیے چندو کو بوند نہیں، پانی کی دھار بننا تھا جو رفتہ رفتہ پتھر کی سل میں سوراخ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

زندگی 'رات گئی بات گئی' کے فارمولے پر چلتی ہے مگر اس کی زندگی اُس شام میں بے دردی سے ٹھکرائے جانے کے واقعے پر ٹھہر سی گئی۔ ڈاکٹر منور علی کی ادھیڑ عمری اور سنگ دلانہ گفتگو جذبات کی بہکی رو کے سامنے مزاحم تھی مگر وہ اپنی پیش قدمی روکنے کے حق میں بھی نہیں تھی۔ کاغذی دلہن بنتے ہی اُسے کوٹھی سے نکلنے اور اسپتال کے احاطے میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ ڈاکٹر منور نے اُس کا تعارف اپنے اسٹاف سے کروا دیا تھا اور پانچ چھ آدمیوں پر مشتمل اسپتال کے عملے نے اُسے اپنے آفیسر کی بیوی کے طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اس نے بڑے نپے تلے انداز میں عمر رسیدہ ایل ایچ وی اور اس کے شوہر، جو اسپتال کے مضافاتی حلقے میں ویکسی نیٹر کے فرائض سرانجام دیتا تھا، کو اپنے بارے میں بتا کر مطمئن کر دیا۔ وہ بدترین جنسی اور جسمانی تشدد سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی مگر ہفتہ بھر میں جسمانی طور پر فٹ ہو گئی مگر روح پر لگے چرکوں سے جان چھڑانے میں کچھ زیادہ وقت درکار تھا۔ ماہ بھر میں معروضی حالات کا تغیر اُس کی گم گشتہ قدرتی آب و تاب کو لوٹانے لگا اور آئینہ اُسے پھر سے خوبصورتی کی بھول بھلیوں میں ڈالنے لگا۔

اُس نے از خود ڈاکٹر کے تمام گھریلو معاملات کو سنبھال لیا اور اس کی لگن نے کوٹھی کو گھر بنا کر ایسا ماحول تخلیق کر دکھایا کہ کوئی بھی دیکھنے والا بغیر بتائے انہیں میاں بیوی قرار دے سکتا تھا۔ آدھا دن اسپتال میں اسٹاف کے ساتھ گزارنے کے نتیجے میں ماتحتوں کے دلوں میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے بارے پیدا ہونے والی بدگمانیاں بھی آپوں آپ رفع ہو گئیں مگر چندو کو ہر آنے والے دن میں اپنی ریاضت کے اکارت جانے کا احساس ستانے لگا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا تمام تر احساسِ ذمے داری، محبت آمیز رویہ اور اپنی پرانی روش پر لوٹتا ہوا حسنِ دل کشا ڈاکٹر منور علی کی بے پروائی اور درشتی کے محاذ پر نہ صرف پسپا ہو رہا تھا بلکہ اُس کا حوصلہ رفتہ رفتہ مارے تضحیک کے دم توڑنے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اُس پر نہ تو چندو کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا اثر ہوا اور نہ ہی اُس کے نہ رُکنے والے آنسوؤں نے اُسے نرم کیا۔ چندو نے اَن گنت مرتبہ پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کی مگر کئی ذلت آمیز ناکامیوں پر دل برداشتہ ہو کر اُس نے ہتھیار ڈال دیے اور خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

موسم بدلتے ہی ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیشِ نظر اُسے اسپتال کی عمر رسیدہ اور تجربہ کار ایل ایچ وی صفیہ پروین کی نگہداشت میں دے دیا۔ صفیہ پروین کی معاونت سے وہ اپنی ذات کے نئے داخلی تجربے سے بہ آسانی گزرتی چلی گئی۔ انہی دنوں شہر سے ڈاکٹر نورالامین وقت نکال کر ڈاکٹر منور علی سے ملنے آیا۔ چونکہ ڈاکٹر منور ڈیوٹی پر تھا، اِس لیے اس کو چندو سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔ ناکامی

چہرے پر رقم ہوگئی۔

وہ بولا۔ ’’تمہارا رونا بتا رہا ہے کہ تم ڈاکٹر شاہ کو رام کرنے میں ناکام رہی ہو۔ میں درست کہہ رہا ہوں ناں؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ’’ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر رکھا ہوا ہے۔‘‘

ڈاکٹر نور الامین نے اپنے بے بال سر پر ہاتھ پھیرا۔ ’’خیر! ایسی بھی بات نہیں مگر...... مگر مجھے حیرت ہے کہ اس پر تمہاری معصوم صورت کا جادو بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ بتاؤ؛ تم نے کیا کچھ کیا؟‘‘

چندو نے اپنی کوششوں سے آگاہ کیا، وہ بولا۔ ’’تم نے بہت محنت کی مگر یہی کافی نہیں۔ ابھی تم دو چار ماہ اِدھر ہی ہو۔ ڈاکٹر شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا دورانیہ بتیسویں ہفتے میں جا رہا ہے۔ ایک ماہ بعد تم زچگی کے مراحل طے کر چکی ہوگی۔ یعنی تم پھر لڑکی بن جاؤ گی۔ تب شاید تم زیادہ بہتر طور پر ڈاکٹر شاہ کو سنبھال سکو گی۔‘‘

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں سر! مجھے اُن سے کوئی توقع نہیں ہے۔‘‘

’’مگر میری اُمید ابھی زندہ ہے۔ تم اگر ہمت سے کام لو گی تو مجھے یقین ہے کہ آخر کار کامیاب ہو جاؤ گی۔‘‘ ڈاکٹر نور الامین نے اُسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر شاہ پر زیادہ توجہ دینے کی ہدایت دی۔ اس کے جانے کے بعد چندو خواہش کے باوجود ڈاکٹر منور علی سے کچھ نہ کہہ پائی۔

ایک ماہ بعد اُسے قدرت نے ایک صحت مند اور خوب صورت بیٹی کی ماں بنا دیا۔ تخلیق کے کرب سے نکل کر ایک ذرا سنبھلی تو پہلو میں لیٹی ہوئی گلابیں بیٹی کو دیکھ کر رونے لگی۔ صفیہ پروین اور ساتھ کے گاؤں سے بلائی گئی دائی (دایہ) نے اُسے خاموش کرانے کی کوشش کی، بولی۔ ’’بیٹی تو اللہ میاں کی رحمت ہوتی ہے۔ اسے مسکرا کر خوش آمدید کہو ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جائے گا۔‘‘

وہ آبدیدہ رہی۔ دایہ نے گال سہلائے، سمجھایا۔ ’’ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اس بار اللہ نے رحمت کی ہے۔ اگلی بار بیٹے کی صورت میں انعام دے کر جوڑی بنا دے گا۔ دیکھو تو سہی! چاند کا ٹکڑا تمہارے پہلو میں پڑا ہے۔‘‘

تب بھی اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت نہ جاگی تو صفیہ پروین نے ہاتھ دھوتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ’’چندو بی بی! ڈاکٹر صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کو دیکھ کر ہرگز ناراض نہیں ہوں گے بلکہ دیکھنا، وہ اتنے خوش ہوں گے کہ پھولے نہیں سمائیں گے۔ ویسے بھی مردوں کو بیٹی اچھی لگتی ہے۔ بے وقوف عورتیں جرم سمجھ کر بیٹیاں پیدا کرتی ہیں۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں چاند سی بیٹی؛ وہ بھی بے عیب، عطا کر دی ہے اور ڈلیوری کے دوران کوئی بھی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔‘‘

اس نے نم آنکھوں سے پہلو میں لیٹی ہوئی بیٹی کو دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈاکٹر منور علی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نوزائیدہ بچی کو شہد چٹایا۔ کن اَنکھیوں سے دایہ اور ایل ایچ وی کو دیکھا، بولا۔ ’’مبارک ہو چندو ماہی! ہماری بیٹی بہت پیاری ہے۔ اللہ اس کا نصیب بھی اِس کی صورت کی طرح روشن کرے۔‘‘

وہ خالی خالی آنکھوں سے سفید و سیاہ بالوں والے اس وجیہہ انسان کو دیکھنے لگی جو اُس کا محسن تھا۔ بغیر تقاضے کے نئی زندگی دلانے والا شخص تھا۔ اس نے چندو کے لیے جو کچھ کر دکھایا تھا، شاید دنیا کا کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنی ساکھ، اعتبار اور شخصیت تک کو داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کے بدلے میں اُس نے قدرت رکھنے کے باوجود کچھ بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ چندو اُسے اپنا آپ سونپنا چاہتی تھی۔ وہ بڑی محویت سے بچی کو چھو رہا تھا۔ چندو کے ہونٹ لرزے مگر دل کی بات دل میں ہی چکرا کر رہ گئی۔ ’’سر! آپ کے سینے میں دل کی جگہ کالا پتھر رکھا ہوا ہے۔‘‘

چندو تب تک ڈاکٹر شاہ کے پروقار اور دل کش چہرے کو پھیلی پھیلی نظروں سے دیکھتی رہی جب تک وہ دایہ اور صفیہ پروین کو دو چار دن تک چندو کا خصوصی خیال رکھنے کا حکم دے کر کمرے سے چلا نہیں گیا۔ دایہ نے اُسے تین دنوں تک سیدھا لیٹے رہنے کا مشورہ دے کر کہا۔ ’’بی بی! تین دن اَوکھے سَوکھے نکال لو اور ایسے ہی لیٹی رہو۔ اگر اُٹھو گی، چلو پھرو گی تو پیٹ بڑھ جائے گا۔‘‘

دونوں اپنے کام میں بہت تجربہ کار تھیں۔ ڈاکٹر منور علی کا دل سے احترام کرتی تھیں اِس لیے انہوں نے تین چار روز تک نہ صرف چندو کی خوراک، دوا اور آرام کا خیال رکھا بلکہ بچی کو بھی سنبھالا۔ چوتھے دن شام کو جب اپنے معمول کے مطابق ڈاکٹر شاہ چندو کے کمرے میں آیا۔ دایہ کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا اور خود چندو کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ’’چندو ماہی! مجھے صفیہ نے بتایا ہے کہ تم بچی سے پیار نہیں کرتی ہو۔ شکر ہے کہ وہ اندازہ نہیں کر سکی کہ تم اپنی بیٹی سے شدید نفرت کرتی ہو ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔ پیٹھ پیچھے باتیں بنائی جاتیں اور

ہمارے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ تمہارا یہ رویہ اَن نیچرل ہے۔‘‘

اس نے سر جھکا لیا۔ دل میں ایک کسک اُٹھی۔ ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر بیٹی کو دیکھا جو برابر میں لیٹی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ بولی۔ ’’سر! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے، اِس سے کیا پیار کروں گی۔‘‘

’’یعنی تم اپنی کمزوری کی سزا اِسے دے رہی ہو؟‘‘

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا، بولا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ تم بُری نہیں ہو؛ میں سمجھتا ہوں مگر مجھے تمہارا یہ رویہ بُرا لگ رہا ہے۔ اِسے اُٹھاؤ اور پیار کرو۔ یہی سوچ لو کہ یہ تمہارے پاس چند دِنوں کی مہمان ہے۔ آج نہیں تو کل چلی جائے گی۔‘‘

وہ چند لمحوں تک بیٹھی ڈاکٹر کو دیکھتی رہی پھر ہاتھ چھڑا کر بچی کو اُٹھانے لگی۔ جھولی میں رکھ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ اس کی وارفتگی دیوانگی میں بدلنے لگی تو ڈاکٹر نے دکھ بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور کہا۔ ’’چندو! ہوش میں آؤ۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔‘‘

وہ ہوش میں آ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنی بیٹی اور کبھی ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ’’سر! میری طرح اِس کی تمام عمر بھی روتے ہی گزرنی ہے۔ آج ہی رونا سیکھ لے تو اچھا ہے۔‘‘

ڈاکٹر نے بلکتی ہوئی بچی کو اُس سے چھیننے کے انداز میں لیا اور پیار کرتے ہوئے بولا۔ ’’یہ ضروری نہیں کہ تمہیں جن حالات سے گزرنا پڑا، وہی حالات اِس گڑیا کو بھی درپیش ہوں۔ بہرحال! میں نے تخلیہ اِس لیے حاصل کیا ہے کہ ہم دونوں آئندہ کے بارے میں کچھ بات چیت کر لیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک بے اولاد جوڑا ایک بچے کو گود لینا چاہتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ میڈیکل کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ اللہ نے اُس کی شدید خواہش کے باوجود اولاد کی دولت سے محروم رکھا۔ چونکہ وہ خود ہی باپ بننے کے قابل نہیں تھا، اِس لیے دوسری شادی بھی اُس کے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دو ماہ پہلے اُس نے اپنا تبادلہ ملتان سے لاہور کروا لیا مگر میرے ساتھ اُس نے رابطہ بحال رکھا۔‘‘

ڈاکٹر سانس لینے کے لیے رُکا۔ چندو کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھے اور اپنی بات بڑھائی۔ ’’چندو! تم اس بچی کی ماں ہو۔ وارث ہو۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہو۔ اس لیے میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں۔ تم میرے دوست کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر نہیں بلکہ اپنے آپ کو سامنے رکھ کر آزادانہ فیصلہ کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ ہاں! یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں مزید دو تین ماہ تک تمہاری یہاں موجودگی کو برداشت کروں گا۔ تب تک نہ صرف تمہیں پوری طرح سنبھلنا ہے بلکہ نرسنگ اسکول میں ایڈمشن بھی لینا ہے۔ چونکہ نرسنگ کلاس کے داخلے کے لیے شادی شدہ عورتیں یا مائیں کوالیفائی نہیں کرتیں، نہ ہی وہاں دودھ پیتی بچی کی گنجائش ہے، اس لیے اگر تم اچھی اور خودمختار زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اس ماتا کی قربانی دینا پڑے گی جو ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی۔‘‘

وہ ملتجیانہ انداز سے مخاطب ہوئی۔ ’’سر! میں آپ پر بوجھ تو ہوں مگر......‘‘

ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔ ’’ہاں چندو! تم مجھ پر بوجھ ہو، یہی سچ ہے کیونکہ مجھے تمہاری موجودگی میں اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ میں اپنی محدود دنیا میں کسی دجود کو برداشت نہیں کرتا۔ پہلے کی طرح اکیلا رہنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں سے جلد یا بدیر جانا ہی ہوگا مگر میں چاہتا ہوں کہ میرا تعاون رائگاں نہ جائے اور تم ایک اچھی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ۔ تم چاہو تو کسی کالج میں بھی پڑھ سکتی ہو مگر کالج میں پڑھنے کے لیے معقول ماہانہ رقم درکار ہوتی ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔ ویسے بھی کالج کے ہاسٹل میں رہائش کا مسئلہ حل تو ہو جائے گا مگر لمبی تعطیلات کے دنوں میں ہاسٹل بند ہوتے ہی تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لے دے کے ہمارے پاس صرف نرسنگ کا شعبہ ہی بچتا ہے۔ ایک تو چار سالہ کورس کے دوران معقول ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، ہاسٹل کی سہولت حاصل ہے اور کورس کی تکمیل پر سرکاری نوکری بغیر کسی تردد کے مل جاتی ہے۔ مریضوں کے درمیان زندگی کے چلن کو قریب سے دیکھو گی تو بڑا اعتماد اور مضبوط ہو جاؤ گی۔ پھر اپنے لیے کوئی مخلص ساتھی تلاش کر لینا۔‘‘

چندو آنکھوں میں مایوسی کی دبیز چادر سمیٹے ڈاکٹر منور علی کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اُٹھا۔ کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلتا گیا۔ پھر پشت پر ہاتھ باندھ کر رُکا اور بھاری آواز میں بولا۔ ’’مجھے ایسے مت دیکھو۔ تم نے مجھے جتنا سخت مزاج پایا ہے، یقین کرو میں اس سے کہیں زیادہ بدمزاج اور تلخ واقع ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کاغذی رشتے میں حقیقی رنگ بھرنا چاہتی ہو۔ تم یہ بھی سوچتی ہو کہ میں تمہیں تمہاری گناہ

گار زندگی اور اس معصوم بچی کی وجہ سے بیوی بنانے پر تیار نہیں ہوں مگر یہ سچ نہیں ہے۔ تمہاری جگہ پر کوئی بھی ہوتی تو مجھے ایسا ہی پاتی۔ چونکہ میرے نزدیک تمہارا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے، اس لیے مجھے ان بھیانک حالات سے بھی سروکار نہیں ہے جنہوں نے اس ننھی سی گڑیا کو جنم دیا۔ ہاں! یہی سچ ہے کہ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ بس!''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''اگر میں آپ سے کچھ نہ مانگوں اور آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں تو؟''

''کہا ناں! یہ ممکن نہیں ہے۔ تم خاموش رہو گی تو تمہاری آنکھیں بولنے لگیں گی۔ تمہاری جوانی اپنی پذیرائی کا تقاضا کرنے لگے گی۔ نہیں چندو! میں سب کچھ افورڈ نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر منور علی کا لہجہ بے تاثر مگر قدرے اُکتایا ہوا تھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اُسے کچھ کہنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑ لیا۔ ''اس موضوع پر ہم بہت ساری باتیں کر چکے ہیں، اِس لیے اب تم صرف یہ فیصلہ کرو کہ بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو یا گود دینے پر تیار ہو؟''

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، دُھندلائی ہوئی نظر سے اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکی۔ ''میرے ساتھ کیا ہوگا، میں کن حالات سے گزروں گی، علم نہیں۔ ایسے میں اس ننھی سی جان کی خاک پرورش اور تربیت کروں گی۔ ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اسے کوئی معقول انسان ایڈاپٹ کر لے تاکہ کم سے کم یہ تو میرے جیسی زندگی گزارنے سے بچ جائے۔ میرا اللہ وارث ہے۔''

ڈاکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پلٹ کر چندو پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ غم واندوہ کی تصویر بنی ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے قریب آ کر چندو کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں جھانک کر پیار سے سمجھایا۔ ''چندو ماہی! زندگی کسی خوب صورت تخیل کا نہیں بلکہ تکلیف دہ عمل کا نام ہے۔ لمبا پریکٹیکل پیریڈ ہے جسے حوصلے سے گزارنا ہوتا ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو اور اپنے مستقبل کے لیے بہترین لائحہ عمل تیار کرو۔ دیکھو! میں تمام عمر کا ساتھی ہوں نہ اتنا امیر کہ تمہیں ہر غم سے آزاد کرنے کے لیے نوٹوں میں چھپا کر کہیں رکھ دوں۔ میں مدد تو کر سکتا ہوں مگر میدان میں تمہیں ہی نکلنا ہو گا، مجھے نہیں۔ کیا سمجھیں؟''

اس کی آنکھیں بولیں۔ ''آپ بہت ظالم اور پتھر دل ہیں۔''

لبوں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''سر! مجھے آپ کی آدھی باتوں کی سمجھ آتی ہے، آدھی کی نہیں اور میں کبھی آپ کو عظیم انسان سمجھنے لگتی ہوں تو کبھی آپ بہت اور خشک مزاج لگنے لگتے ہیں۔''

ڈاکٹر کے لبوں پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ ایک دیر کو اُبھری پھر معدوم ہو گئی اور وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ چندو نے سنا کہ وہ گیلری میں رُک کر دایہ سے کہہ رہا تھا۔ ''تم کل تک یہیں رہو گی۔ کل عائشہ کی پھوپی لینے کے لیے آ جائے گی اور تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔''

دایہ کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ''یہ عائشہ کون ہے؟''

''یہ میری بیٹی کا نام ہے۔ عائشہ...... چونکہ چندو ناتجربہ کاری کی وجہ سے عائشہ کو سنبھال نہیں سکتی اِس لیے میں اپنی بڑی بہن کو بلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تاکہ وہ اسے اپنے ہاں لے جائے۔ پانچ سات ماہ بعد میں واپس آؤں گا۔''

دایہ کی تفکر بھری آواز چندو کے کانوں میں پڑی۔ ''آپ کیا کر رہے ہیں صاحب جی؟...... پہلے بچے کی پیدائش پر ہر عورت ناتجربہ کار ہوتی ہے۔ اگر آج وہ بچی کو نہیں سنبھالے گی تو اگلے بچے کی باری پر پھر ناتجربہ کاری کے عذاب سے گزرے گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو مگر میں وہی کچھ کروں گا جو مجھے بہتر محسوس ہوگا۔'' ڈاکٹر کی آواز میں اس کی مخصوص درشتی عود کر آئی۔

''تو کیا بچی ڈبے والا دودھ پیے گی؟''

''ہاں! اور میرے خیال میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا پھر اُس کے قدموں کی چاپ نے چغلی کی کہ وہ گیلری سے نکل گیا تھا۔ انسان اپنے کہے سے پھرے تو عجیب لگتا ہے۔ وہ تمام دن عورتوں کو درس دیتا تھا کہ ماں کا دودھ پینا بچے کا بنیادی حق ہے۔ محروم کیا جائے تو خدا سخت ناراض ہوتا ہے۔ دایہ حیران تھی کہ اتنا سمجھدار ہونے کے باوجود ڈاکٹر منور علی خدا کو ناراض کیوں کر رہا تھا؟ تھوڑا سوچا، سمجھ میں کچھ نہ آیا تو سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ بڑے لوگوں کی اکثر باتیں غریبوں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی عائشہ کے لیے دودھ گرم کرنے لگی۔

کمرے میں لیٹی ہوئی چندو ماہی نے چور نظروں سے اپنے لختِ وجود کو دیکھا۔ دل میں پیار کی توانا لہر بیدار ہوئی۔ لبوں سے بے ساختہ سرگوشی برآمد ہوئی۔ ''عائشہ...... غلام عائشہ...... کتنا پیارا نام ہے۔''

اس کی تخلیق کو یہ نام دینے والا خود بھی کتنا پیارا تھا مگر

ایک چھت تلے رہتے ہوئے اُس سے کوسوں دور تھا۔ وہ اسے قریب کرتے کرتے تھک کر دور ہو رہی تھی۔ یکبارگی جی چاہا کہ ڈاکٹر منور علی کو روک دے کہ وہ اس کی عائشہ کو کسی کی گود میں نہ ڈالے...... کوئی اپنے لختِ جگر کو یوں پھینکتا ہے؟...... پھر خیال آیا کہ اس کے لبوں سے نکلنے والا ایک جملہ ڈاکٹر منور علی کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دے گا اور وہ بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے گی۔

ڈاکٹر منور علی اپنی موٹر سائیکل پر بورے والا گیا۔ ڈاکٹر نور الامین سے ملنے کے بعد اُس نے فون پر اپنے دوست سے رابطہ کیا اور اُسے خوش خبری سنائی۔ اس نے اگلے ہی دن پہنچنے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر منور علی نے مطمئن ہو کر غلام عائشہ کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی اور لدا پھندا چندو ماہی کے کمرے میں داخل ہوا۔

اُس دن چندو نے عائشہ کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا اور بہت سی باتیں کیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند دن کی بچی اُس کی باتیں کیا سنے سمجھے گی، اس نے اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور اپنی سیاہ بختی پر آخری اشک بہائے۔ عائشہ کو اوپر تلے کئی لباس پہنائے، کئی اُتارے اور اپنی آنکھوں میں اُس کی شبیہ کو تصویر کی صورت ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

جدائی فیصلہ نہیں، مرحلہ ہوتی ہے جس سے چندو ماہی دو مرتبہ گزر چکی تھی۔ گامن اور عمر حیات سے جدا ہونا اُس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا مگر وقت کی گرد نے اُن دونوں زخموں پر کھرنڈ سجا دیے تھے۔ وہ دونوں یاد تو آتے تھے مگر اس کسک میں پہلی سی جان نہیں رہی تھی۔ عائشہ کی جدائی اُس کی زندگی کا تیسرا مرحلہ بن کر ڈاکٹر نفیس بخاری اور بیگم شگفتہ بخاری کی شکل میں دہلیز پر آ گیا۔ وہ عائشہ کو گود لینے کے لیے آئے تھے۔ ڈاکٹر منور اس معصوم شکل جوڑے کو لے کر چندو کے کمرے میں آ گیا۔ تعارف کے دوران ہی بیگم شگفتہ بخاری نے تجسس اور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر عائشہ کو اُٹھا لیا۔ اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔

ڈاکٹر منور علی نے کہا۔ ''شگفتہ! یہ میری بیٹی ہے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ کس حوصلے سے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ یاد رکھنا کہ میری چوکھٹ پر تم اِسے ماں بن کر لینے آئی ہو۔ عائشہ کی حقیقی ماں بن کر دکھاؤ گی تو مجھے زندگی میں کبھی گلہ نہیں ہوگا۔ اگر رتی بھر بے پروائی کا مظاہرہ کرو گی تو معاف نہیں کروں گا۔''

بیگم شگفتہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر نفیس بخاری نے نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ یقین دلایا کہ وہ دونوں ڈاکٹر منور علی کو زندگی بھر شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ چندو سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ باری باری سبھی چہروں کو دیکھ رہی تھی، ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

عائشہ کے نئے والدین اُسے بہت اچھے لگے تھے مگر اپنے حلیے سے خاصے امیر اور شگفتہ مزاج دکھائی دینے والے مہمانوں سے ڈاکٹر منور علی کا رویہ واضح طور پر کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیگم شگفتہ بخاری کو مخاطب کیا۔ ''شگفتہ! میں نے اِس کا نام غلام عائشہ رکھا ہے۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ٹھیک ورنہ بدل لینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''یہ نام بہت پیارا ہے مگر میں نے اِس کا نام بہت پہلے سے ہی شائستہ رکھ دیا تھا...... شائستہ بخاری۔''

چندو کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آنکھیں خشک رہیں۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''عائشہ ہو یا شائستہ...... اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر بیگم صاحبہ! میری بیٹی محفوظ تو رہے گی ناں؟''

بیگم شگفتہ بخاری عائشہ کو ہاتھوں میں اُٹھائے اس کے پہلو میں آن بیٹھی۔ عائشہ کو گود میں رکھ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ گال چوم کر بولی۔ ''لوگ تو دعا دینے سے کتراتے ہیں جبکہ تم نے مجھے وہ دوا دی ہے، جسے دینے کا حوصلہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ میں اِسے زمین پر نہیں، اپنی ہتھیلیوں پر چلاؤں گی۔ اِسے پنگھوڑے میں نہیں، اپنی چھاتی پر سلاؤں گی اور تم دیکھنا، میں اپنی ذات کے روم روم سے پیاسی ممتا نکال کر ان پیارے پیارے لبوں پر نچھاور کر دوں گی۔''

وہ احسان مندی کے جذبات سے مغلوب آواز میں بول رہی تھی۔ ڈاکٹر منور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''منور! تم بڑے انسان ہو۔ ہمیشہ کی طرح تم نے پھر مجھے مقروض کر دیا مگر اَب کے وہ قرض دیا جسے میں تو کیا، میری سات پشتیں بھی اتارنے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ کیا اَب میں جاؤں؟''

چندو نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ملتجیانہ انداز میں عائشہ کو اُٹھا کر اپنی گود میں ڈالا۔ جی بھر کر پیار کیا۔ پیدا ہونے سے پہلے عائشہ کا وجود اُس کے لیے نہایت تکلیف دہ اور قابلِ نفرت تھا۔ اس نے پورا ایک دن اُسے دیکھنے سے گریز کیا تھا مگر چند دِنوں میں ہی عائشہ نے اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ ذات بانٹ لی تھی۔ چندو نے بڑی سختی سے اپنی آنکھیں بند کیں اور بولی۔ ''آپ اپنی بیٹی کو اُٹھا لیں۔ قسمت ہوئی تو زندگی میں اس کی ایک آدھ جھلک دیکھ لوں گی، وگرنہ

اِسے یاد کر کے اپنی ماما کو بے چین کیے رکھوں گی۔''

چاروں کچھ دیر تک عائشہ کے موضوع پر باتیں کرتے رہے، پھر عائشہ کو لینے کے لیے اتنا طویل سفر کرنے والے چندو کو تنہا کر کے لوٹ گئے۔

چندو ماہی کو ڈاکٹر منور علی کا رویہ بڑا عجیب لگا۔ اس نے نہ تو انہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا تھا اور نہ ہی جھوٹے منہ رات رہنے یا کچھ وقت مزید بیٹھنے کا کہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اُس نے مہمانوں سے چائے پانی تک کا نہیں پوچھا تھا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر منور چندو کے کمرے میں آیا۔ اُس پر کریدتی ہوئی نگاہ ڈال کر بولا۔ ''چندو! میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا؟''

اس نے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے دایہ کو اُس کے کمرے میں چھوڑا اور چلا گیا۔

چندو کو بیگم شگفتہ بخاری سے روا رکھے جانے والا ڈاکٹر کا رویہ اچنبھے سے دوچار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر نفیس بخاری اُس کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ اگر یہ درست تھا تو پھر اُس کی بیوی ڈاکٹر منور سے کیوں بے تکلف تھی؟...... ڈاکٹر دونوں سے خفا خفا کیوں تھا؟...... اگر ڈاکٹر کے دل میں کوئی رنجش تھی یا ان سے کسی معاملے میں اختلاف تھا تو اُس نے عائشہ کو ان کی تحویل میں کیوں دیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب اُسے ڈاکٹر منور ہی دے سکتا تھا جس سے بعید نہ تھا کہ وہ جواب دینے کے بجائے درشتی سے جھٹک دیتا۔ عائشہ کی معصوم سی شکل اور رونے کی باریک آواز اسے بے چین کرتی رہی۔ رات کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزری مگر جب پچھلے پہر سونے کے بعد دن چڑھے جاگی تو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور پرسکون تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے دلی طور پر عائشہ کی جدائی کے دکھ سے مفاہمت کر لی تھی۔ آنے والے چند دنوں میں اس کے رویے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ اپنی بیٹی کی حادثاتی جدائی کو ذہن سے محو کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

چاق و چوبند ہوتے ہی اُس نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر منور علی کو اُس کی خود ساختہ تنہائی سے نکالنے اور اپنی جانب راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ صدقِ دل سے ڈاکٹر منور کے پاس رہنا چاہتی تھی کیونکہ گزشتہ دورانیہ میں ڈاکٹر کی پروقار شخصیت نے اُس کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب کر دیے تھے۔ وہ سوتے جاگتے اُسے ہی سوچتی رہتی تھی۔ اُس کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ ڈاکٹر اُسے اپنی حقیقی بیوی کی حیثیت دے کر عدم تحفظ کی سلگتی ہوئی آگ سے نکال لے مگر وہ اُسے کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ دو تین میں چندو کا پہلا مسحور کن روپ لوٹ آیا اور سر چڑھ کر بولتا ہو حسن ڈاکٹر کو سخنے درے مضطرب کرنے لگا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کی فصیلِ جاں میں دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں اور وہ چندو سے نظریں چرانے اور دور رہنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ کھینچا تانی کا یہ اعصاب شکن سلسلہ تین ماہ چلا مگر اچانک ڈاکٹر کی سنگدلی جیت گئی اور چندو احساسِ کم مائیگی میں مبتلا ہو کر ٹوٹ گئی۔

ڈاکٹر منور علی نے اپنے پلان کے تحت اخبار میں اشتہارات شائع ہوتے ہی تین مختلف نرسنگ اسکولوں میں چندو ماہی کی درخواستیں جمع کرا دیں۔ چونکہ اُس نے میٹرک میں پوزیشن لی تھی؛ اِس لیے اُسے تینوں اسکولوں میں ہی داخلہ بہ آسانی مل سکتا تھا۔ بغیر کسی تگ و دو کے ملتان کے نرسنگ اسکول میں ایڈمشن مل گیا اور ڈاکٹر منور علی اُسے لے کر ملتان پہنچ گیا۔ چندو کو ہاسٹل چھوڑ کر اُس کے لیے ضروری سامان خریدنے شہر چلا گیا۔ دو تین دن شہر میں رہتے ہوئے اُس نے چندو کا مکمل اقامتی بندوبست کیا اور ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد آخری ملاقات کے لیے ہاسٹل پہنچ گیا۔

ڈھلتی ہوئی شام میں دونوں نرسنگ اسکول کے ملحقہ اسپتال کے بڑے سے لان میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ چندو کا چہرہ حزن و ملال سے رقم تھا جبکہ ڈاکٹر مطمئن اور سرخرو دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے اُس کے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو، بولا۔ ''چندو ماہی! میں تمہارے لیے یہی کر سکتا تھا، کر گزرا۔ کاش! میرے پاس دینے کے لیے اور بھی کچھ ہوتا تو دریغ نہ کرتا۔ تمہاری طلب پوری کرنے کے لائق ہوتا تو تمہیں مایوس نہ کرتا۔ بس! اب تم دل کو ہر قسم کے شکووں اور میل سے پاک کر کے مجھے الوداع کہو۔ مجھے اپنی ڈگر کو دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔ اگر قسمت نے کہیں ملایا بھی تو دنیا ہمیں بس واقف کار ہی سمجھے گی۔ ٹھیک ہے ناں؟''

چندو کا گلا رُندھ گیا، بولی۔ ''سر! مجھے پتا ہے کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں مگر ایسا بھی کیا ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑنے لگے ہیں۔ میں آپ سے ملتے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اتنی سی اجازت تو آپ دے ہی سکتے ہیں ناں کہ کبھی کبھی آ کر ایک نظر دیکھ لیا کروں؟''

ڈاکٹر کا چہرہ پتھرا گیا۔ آنکھیں بے تاثر ہو گئیں، بولا۔ ''نہیں لڑکی! تم نے میرے ساتھ لگ بھگ ایک سال کا عرصہ گزارا ہے۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم مجھے سمجھتی ہو مگر حقیقت میں تم مجھے بالکل سمجھ نہیں پائی ہو۔ تم اچھی لڑکی ہو مگر میں اچھا آدمی نہیں ہوں، شاید انسان بھی نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ نہ ہی چل سکتی ہو اور نہ کبھی خوش رہ سکتی ہو۔ تم بہت خوب صورت اور ذہین ہو۔ ایک تابناک مستقبل جس میں پھول، خوشبو، لہریں اور صبا شامل ہیں، تمہارا منتظر ہے جبکہ میرے پاس سوائے خشک مٹی اور تند ہوا کے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں اگر یہ کہوں کہ مجھے تابناک مستقبل کی نہیں، آپ کی ضرورت ہے تو؟'' اُس نے ہمت کی اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں براہِ راست جھانک کر پوچھا۔

ڈاکٹر نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چندو! میں تمہارا نہیں بن سکتا، کسی کا بھی نہیں...... شاید اپنا بھی نہیں...... کوئی اور بات کرو۔''

''سر! میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی مگر التجا کرتی ہوں کہ آپ بھلے مجھے قبول نہ کریں مگر مجھ سے مل لیا کریں۔''

ڈاکٹر نے پھر نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''نہیں...... کہاں ناں کہ چھوڑو اِس تذکرے کو۔ یہ ایک لاکھ روپے کا چیک پکڑو۔ قرب و جوار میں کوئی بینک دیکھ کر اپنا اکاؤنٹ کھلوا لینا اور یہ چیک اُس میں جمع کروا دینا۔''

ہاتھ بڑھائے بغیر چندو نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ کیا سر! میں اتنی بڑی رقم کا کیا کروں گی؟''

ڈاکٹر نے چیک اُس کی جھولی میں رکھ دیا، کہا۔ ''رکھ لو؛ تمہارے کام آئے گی۔''

چندو کی آنکھیں ایک لحظہ کے لیے ویران ہوئیں پھر بول پڑیں۔ ''کیا یہ عائشہ کی قیمت ہے؟''

ڈاکٹر اُس کی آنکھوں سے پھوٹتا ہوا مدعا بھانپ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ سمجھانے لگا۔ ''چھوٹی باتوں سے صرفِ نظر کر کے بڑی باتوں پر توجہ دینا دانش مندی کہلاتی ہے۔ چونکہ میرا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے میری ہر تنخواہ سے اچھی خاصی رقم بچ جایا کرتی ہے۔ یہ شاید میرے کسی کام نہیں آئے گی۔ اس میں سے میں نے ایک لاکھ روپے تمہیں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''نہیں سر! میں جو مانگ رہی ہوں، وہ دے سکتے ہیں تو دیں ورنہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''کہا ناں! بے وقوف مت بنو اور وہی کچھ کرو، جو میں کہہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کاغذی بیوی کاغذی حقوق بھی رکھتی ہے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ اپنا حق سمجھ کر سنبھال لو۔ میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی ہدایات نہیں دینا چاہتا۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یہاں تمہارا قدم قدم پر مردوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ سبھی میرے یا ڈاکٹر نور الامین جیسے لوگ نہیں ہیں بلکہ ان میں اکثریت اُن کی ہے جن کے چنگل سے نکل کر تم میرے پاس پہنچی تھیں۔ وہ ڈاکٹروں کے بہروپ میں بھی ہیں، اسکول انتظامیہ اور مریضوں کے روپ میں بھی ہو سکتے ہیں...... ان سے محتاط رہنا۔ تمہیں چند دن نئے سیٹ اَپ میں ایڈجسٹ ہونے میں لگیں گے پھر تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو کر ماضی کو بھول جاؤ گی۔ یہ دنیا تمہیں پھر سے اچھی لگنے لگے گی کیونکہ یہ خوبصورت ہے۔ انسان کو لبھا کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے۔ اَب مجھے ہنستی آنکھوں سے گڈ بائے کہو......''

ڈاکٹر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ سمجھ گئی کہ ڈاکٹر اُسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکالنے جا رہا تھا۔ لپک کر قریب آئی اور بے ساختہ ڈاکٹر کے چٹانی وجود سے چمٹ کر سسکنے لگی۔ وہ اتنا ٹوٹ کر روئی کہ اگر ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر کوئی پہاڑ ایستادہ ہوتا تو پگھل جاتا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے خود سے علیحدہ کر کے، آنسو پونچھ کے 'بائے' کہتا ہوا تیزی سے لان سے نکلتا چلا گیا۔

وہ بہ دقت تمام اپنے کمرے میں آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی روم میٹ زرینہ سے باتیں کرنے لگی۔ دل کو سنبھالنے لگی جو ڈاکٹر منور کی جدائی پر ٹوٹنے لگا تھا۔ ڈاکٹر منور علی نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ میں اُس ماحول میں رچ بس گئی۔ اُسے دنیا اچھی لگنے لگی اور اپنا آپ بھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد اُس نے اپنے اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکالی اور ڈاکٹر منور علی سے ملنے کے لیے بورے والا عازمِ سفر ہوئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب چک ستاسی کے سرکاری اسپتال میں پہنچی تو یہ روح فرسا خبر اُس کی منتظر تھی کہ ڈاکٹر منور علی شاہ اس اسپتال سے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر کسی اور اسپتال سدھار چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے نئے ڈیوٹی اسٹیشن کا پتا چلانے کی کوشش کی مگر عملے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ صفیہ پروین نے صرف اتنا بتایا کہ ڈاکٹر نے چھ ماہ کی چھٹی بھی لی ہے۔ ان چھ ماہ میں وہ کہاں ہو گا؟ یہ اُس سمیت کسی بھی شخص کو معلوم نہیں تھا۔

ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر آنے والے میڈیکل آفیسر کی رہائش بورے والا شہر میں تھی اور وہ ڈیوٹی آف ہوتے ہی اپنی کار پر گھر لوٹ جاتا تھا، اِس لیے وہ کوٹھی جس میں چندو نے ڈاکٹر کے ساتھ کم و بیش ایک سال کا عرصہ گزارا تھا، مقفل رہتی تھی۔ سرخ اینٹوں والی کوٹھی کے سامنے روش پر کھڑے ہو کر اُس نے حسرت بھری نظروں سے در و دیوار کو دیکھا اور آہ بھر کر اسپتال سے نکل آئی۔ یہ صورتِ حال

چندو کے لیے بڑی حوصلہ شکن اور مایوس کن تھی کیونکہ ڈاکٹر منور علی نے اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اُس سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیا تھا۔

اس نے چندو سے ناتا جوڑا بھی کیا تھا؟

محض ایک جھوٹے کاغذ کا رشتہ...... دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی ایک فرضی دستاویز اور بس......

اُسے دوسرا دھچکا لگا جب ڈاک کے ذریعے طلاق کا پہلا نوٹس ملا۔ ایک ایک ماہ کے وقفوں سے بقیہ نوٹس بھی مل گئے۔ ڈاکٹر منور علی نے اپنا نام اُس کی ذات کی سلیٹ سے مٹا کر سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی ڈاکٹر منور کو یاد نہ کیا کرے۔ یاد کرنے کا حق بھی کھو بیٹھی تھی۔ ڈاک کے لفافوں پر واپسی کا پتا درج نہیں تھا۔ یونین کونسل وہی تھی جس کے دائرہ کار میں چک ستاسی آتا تھا۔ چندو جانتی تھی کہ ڈاکٹر چک ستاسی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اِس لیے دہاں ڈاکٹر منور علی کے پیچھے اس یونین کونسل یا اسپتال میں جانا ثمر آور نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اگر کسی طرح کھوج نکال کر ڈاکٹر تک پہنچ بھی جاتی تو کیا کرتی؟ وہ ڈاکٹر کو ایک نظر دیکھنے، چند روکھی باتیں سننے اور ناکام لوٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ بھی بابا گامن اور عمر حیات کی طرح خاص موقعوں پر یاد آنے والا کردار بن گیا اور چندو کا سفر نرسنگ کے مخصوص ماحول میں بغیر کسی رُکاوٹ کے چلنے لگا۔ اُس کی روم میٹ زرینہ اختر کی ترغیب پر اُس نے نرسنگ کے ساتھ ساتھ انٹرمیڈیٹ کی تیاری کی۔ میڈم جوزفین نے دونوں لڑکیوں کی مدد کی۔ پھر انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دیا اور اچھے نمبروں میں پاس ہو گئیں۔ زرینہ ملتان کی ایک مضافاتی بستی سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت سادہ مزاج مگر پر اعتماد لڑکی تھی۔ وہ حق دوستی نبھاتے ہوئے اُسے چھٹیوں میں اپنے گھر لے جایا کرتی تھی جہاں اُس کا وقت کھلی فضاؤں اور سرسبز کھیتوں میں بہت اچھا گزرتا تھا۔

* * *

چالیس سالہ اسٹاف نرس مس جوزفین اپنی غیر معمولی سیاہ رنگت اور بے ڈیل ڈول جسامت کی وجہ سے ابھی تک کنواری تھی۔ اس کے بقول اُس کی ہتھیلیوں پر شادی کی ریکھا سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ بہ ظاہر خاصی اکھڑ مزاج تھی مگر فطرتاً انسان دوست واقع ہوئی تھی۔ چندو پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے دورانِ تربیت انٹرمیڈیٹ کی تیاری کرنے میں چندو اور زرینہ کی مدد کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دونوں لڑکیاں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے نرسنگ کورس مکمل ہونے تک گریجویشن ڈگری بھی حاصل کر لیں۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے سمجھانے والا پوری توانائیاں خرچ کر کے برسوں میں کوئی ایک نکتہ سمجھا پاتا ہے جبکہ بے وقوف بنانے والا چند لمحوں میں اُس نکتے کو مٹا کر اُلو سیدھا کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر منور علی نے چندو کی ذہنی تربیت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اُسے معاشرے میں پنپنے کی کئی باتیں سمجھائی تھیں مگر مس جوزفین کی چند میٹھی باتوں نے چندو کو آپے سے باہر کر دیا۔ اُس نے فاش غلطی کرتے ہوئے جوزفین پر اپنا ماضی آشکار کر دیا۔ ہمدردی سمیٹنے کی احمقانہ خواہش سے مغلوب ہو کر وہ سب کچھ بتا دیا جسے اپنے سائے تک سے چھپانے کا حکم ڈاکٹر منور علی نے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جوزفین نے اُسے اپنے بہت قریب کر لیا۔ گاہے بہ گاہے اپنی مہربانیاں دکھانے لگی۔ جوزفین نے کہا کہ گریجویشن کی تیاری کرو۔ نصاب کی کتب خرید لاؤ۔ چندو نے بلا چوں چرا اس حکم کی تعمیل کی اور کتابیں دکھانے کے لیے شام کو اس کے روم میں پہنچ گئی۔ حسب معمول جوزفین کمرے میں اکیلی نیم دراز تھی۔ اپنے پہلو میں بٹھا کر سرسری انداز میں کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ پھر سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں! یہی ہماری یونیورسٹی کا نصاب ہے۔ بی اے کی بیس انگریزی کے سبجیکٹ پر ہے۔ اگر تم اس مضمون پر قابو پا لو تو سمجھو ڈگری ہاتھ لگ گئی۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس اسی مضمون میں فیل ہو جاتے ہیں۔ باقی تمام کورس اتنا آسان ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے۔''

''مگر یہ آپشنل سبجیکٹ؟'' چندو نے ایک کتاب نکال کر دکھاتے ہوئے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

''عربی؟''

''جی میڈم! میں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں ہے۔''

''تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مشکل مضمون نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی امیدوار فیل ہوتا ہے جو کمرائے امتحان میں غیر حاضر ہوتا ہے۔ سو میں سے پچانوے نمبر بہ آسانی مل جاتے ہیں۔'' جوزفین نے دلاسا دیا۔ کچھ دیر اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتی رہی، پھر قدرے آہستہ آواز میں بولی۔ ''شکر ہے کہ آج تمہارے ساتھ زرینہ نہیں آئی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بنا کچھ چھپائے بتایا تھا۔ تب سے میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھنے لگی ہوں۔ بہت سی باتیں تم سے کرنا چاہتی تھی مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج مل گیا ہے۔ ادھر قریب آجاؤ۔''

وہ بیڈ پر تھوڑا اور قریب کھسک آئی۔ جوزفین سہلانے کے سے انداز میں اس کی پشت پر اپنا بھاری ہاتھ پھیرنے لگی۔ پیار بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ کچھ بولے بنا اپنی بے لوث محبت کا یقین دلانے لگی۔ چندو یقین کر رہی تھی تبھی اُس کے بھدے ہاتھ کے لمس کو پسند کر رہی تھی۔

جوزفین نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''چندو! تمہیں خداوند نے راج کرنے کے لیے بنایا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تمہیں اتنا خوبصورت نہ بناتا۔ یقین مانو؛ جب میں سوچتی ہوں کہ تمہاری ساری عمر دواؤں کی بُو میں نتھنے سکیڑتے، لاشیں دیکھتے، غلیظ اور خون سے لتھڑے ہوئے مریضوں کو سنبھالتے اور ڈاکٹر کی ہوس بھری نظروں کی سولی پر لٹکتے ہوئے گزرے گی تو میرے دل سے ہوک نکلتی ہے۔ یہی زندگی میں گزار کر آئی ہوں۔ تھک گئی ہوں مگر پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے ہر روز اس سلاٹر ہاؤس میں چلی آتی ہوں۔ یہاں کوئی رومانس نہیں ہے۔ بائیس سالوں میں لاکھوں خواب اجڑتے دیکھ چکی ہوں۔ یہاں آنے والا بوڑھا مریض بھی، جو ٹھیک سے سانس تک نہیں لے سکتا، معصوم آنکھوں کو سپنے دکھا کر بدن کی سیج پر سونے کی خواہش رکھتا ہے۔ لڑکیاں بھٹک جاتی ہیں۔ ٹوٹ کر مر بھی جاتی ہیں مگر ہاتھ خالی رہتے ہیں۔''

جوزفین نے نیا موضوع چھیڑا تھا۔ چندو دیدے پھاڑے اُسے دیکھ رہی تھی جو کل تک نرس اور نن کے کردار کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ آج تصویر کا بھیانک رُخ بڑی بے دردی سے دکھا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کی زبان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چندو نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔ ''میڈم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں نرسنگ کا شعبہ چھوڑ دوں تو میرے لیے یہ ممکن ہی کس طرح ہو گا؟''

جوزفین کچھ دیر سوچتی رہی۔ کہے، نہ کہے، فیصلہ کرتی رہی پھر بولی۔ ''چندو ماہی! ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا اور جو دوست ہوتا ہے اُسے ہاتھ ملانے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایک دوست مجھے بھی قسمت نے دے رکھا ہے، اجمل گیلانی۔ مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹا ہے پر حیثیت میں بہت بڑا ہے۔ پارس ہے۔ جانتی ہو کہ پارس کیا ہوتا ہے؟ نہیں...... بتاتی ہوں۔ پارس اُس پتھر کو کہتے ہیں جسے چھونے والا ہر وجود سونا بن جاتا ہے۔ اجمل جس کو چھوتا ہے، وہ سونا بن جاتا ہے۔ میں کافی دنوں سے تمہیں اُس سے ملانا چاہتی ہوں۔''

چندو نے حیرت اور تشکیک بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور خاموش رہ کر مزید بولنے کا موقع دیا۔

وہ بولی۔ ''قسمت انسان کو ایک ایسا سنہرا موقع ضرور دیتی ہے جو اُس کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر انسان دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قسمت کا ہاتھ تھام لے تو ایک ہی جست میں وہ آکاش کو چھو لیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اس جست سے لطف اندوز ہو کر راج محل پہنچ جاؤ۔'' جوزفین کے لہجے میں پیار بھرا ہوا تھا۔ ''چندو! تم غریب اور لاوارث لڑکی ہو۔ خوبصورت بھی ہو مگر جس ماحول میں رہ رہی ہو، یہاں زندگی کو محض پریکٹیکل سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جذبات، احساسات اور عورت پن نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ تم ہزاروں روپے کما کر بھی تشنہ رہو گی۔ بہ ظاہر صاف کپڑے پہنو گی مگر بدن تھکن اور میل سے اَٹا رہے گا۔ تمہارے شوہر، کیا نام تھا اُس کا؟...... ہاں! ڈاکٹر منور علی شاہ...... اُس نے جس وقت تمہیں نرسنگ جوائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اُس وقت اس سے بہتر کوئی اور فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اَب تم ان حالات سے نکل آئی ہو اور اپنے لیے بہتر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں ہو۔''

وہ جوزفین کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر چکی تھی کہ وہ اُسے نرسنگ چھوڑ کر کوئی اور شعبہ جوائن کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ چونکہ اُس پر اعتماد کرتی تھی، اِس لیے پوری توجہ سے سن رہی تھی اور اُسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ میڈم جوزفین دل کی بات آشکار کرنے میں ہچکچا رہی تھی۔ کھل کر بتا نہیں رہی تھی۔ تبھی حوصلہ افزا لہجے میں گویا ہوئی۔

''میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔ میں آپ کے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کرتی مگر آپ مجھے کھل کر کچھ بتا نہیں رہیں۔''

وہ مسکرائی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ گرم لوہا چوٹ طلب کرنے لگا تھا، بولی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ اس سے پہلے سمجھانا چاہتی ہوں کہ سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ورنہ اسی کمرے میں دفن کر کے چلی جانا۔ قطعاً ضروری نہیں کہ میں جو کچھ کہوں، تم اُسی پر عمل کرو۔ نہیں...... بلکہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ ابھی پوری بات خاموشی سے سن لو، رات کو بستر میں لیٹ کر سمجھنے کی کوشش کرنا اور صبح مجھے اپنا فیصلہ سنا دینا۔ نفع ہو گا تو تمہیں ہو گا۔ نقصان ہو گا تو تمہارے مستقبل کا ہو گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں کوئی ناراضی نہیں ہو گی۔''

جوزفین نے چندو کا ہاتھ تھاما۔ کھینچ کر پہلو سے لگا لیا۔

اپنی بات دیواروں سے بھی چھپانا چاہتی تھی تبھی رازداری سے بولنے لگی۔ چندو ماہی ایک ایک لفظ سنبھال کر ذہن میں محفوظ کرنے لگی۔ چند منٹوں کے لیے آئی تھی۔ سوا گھنٹا گزار چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر اور بیٹھنا تھا۔ جب مس جوزفین کی اجازت پا کر کمرے سے نکلی تو اُس کے پاؤں گیلری کے پھسلویں فرش پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ اپنے روم میں پہنچی تو زرینہ کو برانگیختہ پایا۔ وہ برہمی سے پوچھنے لگی۔ ''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ آج پھر ہم میس میں دیر سے پہنچیں گے اور ٹھنڈا کھانا زہر مار کریں گے۔''

وہ کتابیں الماری میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں میڈم کے کمرے میں گئی تھی، کتابیں چیک کروانے۔''

''پھر کیا کہا اُس نے؟''

''سوائے ٹیسٹ پیپر کے، سب 'او کے' ہیں۔ ٹیسٹ پیپر بدلوانے کے لیے ہمیں پھر گھنٹا گھر بازار کا چکر لگانا پڑے گا۔'' چندو نے منہ بنا کر کہا۔

''نہیں...... ادھر قریب میں ایک بک سینٹر ہے۔ وہاں سے بدلوا لیں گے۔'' زرینہ نے کہا۔ ''فی الحال مزید وقت ضائع کیے بغیر کمرے سے نکلو۔ برا حال ہے کیونکہ آج دوپہر کا کھانا بھی گول ہو گیا تھا۔ یقین کرو، بھوک کے مارے میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔''

دونوں کمرا لاک کر کے میس کی طرف چل پڑیں۔ کھانے کے دوران چندو عدم توجہی سے زرینہ کی باتیں سن رہی تھی اور 'ہوں' اور 'ہاں' میں جواب دینے پر اکتفا کر رہی تھی۔

اس کے ذہن میں جوزفین کی باتوں نے جو طوفان بپا کیا تھا، وہ اُسے پوری طرح اپنی تندی کے حصار میں جکڑ چکا تھا۔ اُسے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک رات کی مہلت ملی تھی جو یقیناً بہت مختصر تھی۔ جوزفین نے سختی سے کہا تھا کہ اگر وہ علی الصباح اُسے کوئی جواب نہیں دے گی تو وہ انکار سمجھتے ہوئے اِس موضوع کو ہمیشہ کے لیے بغیر رشوت کی فائل کی طرح داخل دفتر کر دے گی۔ انسان کی سرشت میں لالچ اور آگے بڑھنے کی طلب کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے۔ باوجود کہ چندو ماہی کو کوئی مالی پریشانی لاحق نہیں تھی، مستقبل بھی محفوظ دکھائی دے رہا تھا مگر جوزفین کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر وہ راج کماری بننے کے لیے پوری سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ وہ عدم تحفظ اور احساسِ کم تری کے حصار سے تو کب کی نکل چکی تھی مگر لالچ زندگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے اُسے سختی سے سمجھایا تھا کہ ناک کی سیدھ میں چلتی رہے اور کبھی امیر ہونے کے لیے شارٹ کٹ راستہ اختیار نہ کرے مگر جوزفین کی پیشکش نے ڈاکٹر کی تمام پند و نصائح پر پانی پھیر دیا تھا۔

روم میں پہنچ کر اُس نے سر درد کا بہانہ کیا اور منہ سر لپیٹ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ دل ہی دل میں میڈم جوزفین کی سنائی ہوئی کہانی کو دہرانے لگی۔ کہانی کی جزئیات کو ذہن میں رکھ کر وہ اِس اوکھلی میں سر دینا چاہتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ اُسے ایسے پل پر سے گزرنا تھا جو اُس کے پار اُترتے ہی دریا برد ہو جائے گا اور واپسی کا راستہ مسدود ہو جائے گا۔

گیلانی فلور مل کا مالک اکمل گیلانی سیلف میڈ انسان تھا۔ اندرونِ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے اپنی محنت اور دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نکلا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا شہر کے کاروباری حلقے میں اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز غلہ منڈی کے قریب اجناس کی پھڑی لگا کر کیا۔ تول اور قیمت میں ڈنڈی مارتے ہوئے تھڑے سے اُٹھ کر ایک چھوٹی سی دکان میں جا بیٹھا اور بروکر بن گیا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود خاصا چرب زبان واقع ہوا اور اس کا کاروبار زبانی جمع خرچ کی بنیاد پر روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ دولت کی برکھا برسنے لگی۔ چند ہی سالوں میں وہ نہ صرف غلہ منڈی کا معروف آڑھتی بن گیا بلکہ اُس نے ملتان کے ایک مضافاتی علاقے میں اپنی فلور مل بھی لگا لی اور آنے والے چند برسوں میں اس نے خاصی شہری جائداد بھی بنا لی اور پچاس ایکڑ زرعی اراضی کا مالک بھی بن گیا۔

اکمل گیلانی کی شادی اُس کی چچازاد سے ہوئی تھی۔ دو سگے بھائیوں سمیت اُس کا پورا خاندان ابھی تک اندرونِ شہر کی عسرت زدہ گلیوں کی کوٹھڑیوں میں مقیم تھا اور محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے پیٹ پال رہا تھا۔ اپنی تمام تر بدقسمتی اور محرومی کو اکمل گیلانی سے نفرت اور انتقامی سوچ کی مالا میں پروتا رہتا تھا۔ اکمل کے سسرال کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اس نفرت کو مہمیز کرنے میں گیلانی کے کوتاہیوں بھرے مزاج کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ دولت کی ریل پیل میں وہ آگے بڑھتا گیا اور اس نے پلٹ کر اپنے خاندان اور بہن بھائیوں کی خبر تک نہ لی۔ اگر کوئی اُس سے ملنے کے لیے اُس کی تین کنال کی جہازی سائز کی کوٹھی میں پہنچا بھی تو اُس کے اہانت آمیز رویے کی بدولت اس کا دشمن بن کر نکلا۔ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف اپنے خاندان سے کٹ گیا بلکہ اُس کا نام سنتے ہی رشتہ داروں کا خون یکبارگی کھول اُٹھتا اور وہ منہ بھر کر اُسے مغلظات سے نوازتے۔

اجمل اُس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ کی عدیم الفرصتی اور ماں کی بیماری نے اُسے بچپن میں ہی تنہائی پسند، مغرور اور منتقم مزاج بنا دیا تھا۔ جیب خرچ کے نام پر اُس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔ نوٹوں کا نشہ سر پر سوار رہتا جس کی وجہ سے وہ دن بہ دن بگڑتا چلا گیا۔ میٹرک کے دوران ہی اُس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور اوباش دوستوں کی صحبت میں شراب نوشی کا عادی ہو گیا۔ باپ نے چاہا کہ فلور ملز کے معاملات میں بیٹے کی معاونت حاصل کرے اور اُسے کاروباری رموز و قواعد سے روشناس کرے مگر اجمل نے چند دنوں میں ہی اُکتا کر ٹھینگا دکھا دیا اور اپنے من چاہے معمول میں چلا گیا۔

دولت اور جائداد کی ہوس شر کا باعث بنتی ہے۔ شر کا سودا اکمل گیلانی کے بھائیوں اور پیداگیر قسم کے سالوں کے سروں میں سما کر پروان چڑھ چکا تھا۔ اکمل گیلانی اور اس کی بیوی اور بیٹے کی موت سے وہ تینوں خاندان کروڑپتی ہو سکتے تھے۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے مگر آنکھوں پر ہوس کی پٹی باندھ لینے والے فطرت کے قوانین سے ٹکرانے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان تینوں نے اکمل گیلانی، جواں سال بیٹے اجمل گیلانی اور بستر نشین بیوی کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا لیا۔

وہ اپنے خونیں منصوبے پر عمل پیرا ہوئے اور چاند رات کو مسلح ہو کر گیلانی ہاؤس پر حملہ آور ہو گئے۔ چونکہ چاند رات کو گھر کے سبھی ملازمین اور چوکیدار چھٹی پر تھے، اِس لیے ان کے پیاسے ہتھیاروں کو خون مل گیا۔ اکمل گیلانی اور اس کی اہلیہ کو بے بسی کی موت مارنے کے بعد انہوں نے اجمل کی تلاش میں پوری کوٹھی چھان ماری مگر وہ نہ ملا۔ وہ اپنے اوباش دوستوں کے ہمراہ شاپنگ سینٹروں کی آوارہ گردی پر نکلا ہوا تھا۔ چاند رات میں اکمل جیسے بھونروں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہ چاندی اُس کی جان بچانے کا سبب بن گئی۔

اجمل زندہ تو بچ گیا مگر اپنے مشن میں جزوی طور پر ناکام ہونے والوں نے مدعی بن کر اُسے اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کے الزام میں حوالات بھجوا دیا۔ پولیس کا پیٹ بھرا تو انہوں نے اجمل کی پولیس فائل پر تے کر دی۔ چونکہ دُہرے قتل کی اس بھیانک واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا، اِس لیے اجمل کو ہی اپنے والدین کا قاتل قرار دیا گیا۔ دونوں چچاؤں اور ماموؤں نے محرک پیش کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اجمل کا باپ اُسے ہر وقت برے کاموں سے روکتا ٹوکتا تھا اور ان دِنوں اُس نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تھا جس پر اجمل نے مشتعل ہو کر دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

اس کے جیل جاتے ہی تینوں حصہ داروں نے تمام جائداد اور کاروبار کے حصے بانٹ لیے۔ دو رکاوٹیں دور ہو گئی تھیں۔ ایک رکاوٹ باقی تھی۔ اگر اجمل باہر ہوتا تو اُسے بھی ٹھکانے لگا دیا جاتا مگر وہ قانون کی تحویل میں تھا اور اُسے قانون کے ہاتھوں مروانا ضروری تھا کیونکہ اجمل کی زندگی میں وہ لوٹی ہوئی دولت کے مالک نہیں بن سکتے تھے۔ اجمل کو سزائے موت دلوانے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پیسا پانی کی طرح بہایا اور قانون کو مٹھی میں لے کر اُسے تختۂ دار کا مستحق ثابت کر دیا۔ اجمل کے پاس نہ تو پیسا تھا، نہ جائداد اور نہ ہی اس کے کیس کی پیروی کرنے والا کوئی غم خوار تھا، اِس لیے وہ مقدمہ ہار گیا۔

وہ بچپن سے ہی منتقم مزاج تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں ملنے والی بدنامی اور موت کی سزا نے اُس کا خون کھولا دیا اور اس کے روم روم میں انتقام کی آگ بھر دی جو نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ جیل سے نکل کر اپنے ماں باپ کے قاتلوں کے گردنیں ماپنا چاہتا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ اُن تک پہنچنا ناممکن کی حد تک مشکل تھا۔ جانتا تھا کہ اُسے عنقریب تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ اچھے وقتوں کے دوست آڑے وقت میں کنارہ کر گئے تھے۔ سارا پیسا مقتول باپ کے اکاؤنٹس میں جمع تھا۔ اس کسمپرسی کے سبب وہ ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر نہ کر سکا۔

ہر جانب سے مایوس ہو کر وہ سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا تھا، چیخنے چلانے لگا اور بعید نہ تھا کہ بلیک وارنٹ آنے سے قبل ہی پاگل ہو جاتا یا مر جاتا مگر انہی دنوں اس کی ملاقات جیل میں عمر قید کاٹنے والے ایک نامی گرامی ڈکیت سے ہوئی۔ وہ ہر قسمی زنگ آلود قفل کھولنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے اجمل کی ملاقات جیلر سے کروا دی۔ جیلر اُس گاؤں کا رہنے والا تھا جس گاؤں میں اجمل گیلانی کی پچاس ایکڑ اراضی واقع تھی۔ وہ بہت زرخیز اور مہنگی زمین تھی۔ ڈکیت سے ملنے والی معلومات نے جیلر کی آنکھیں چندھیا دیں۔ اسے اجمل کے معروضی حالات سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ اُس کی ہوس بھری نگاہیں اُس کی زرعی اراضی پر جم گئیں۔

ڈکیت نے تھرڈ مین کا کردار ادا کیا اور ان کے درمیان رقبے کے عوض اجمل کو آزادی دلانے کا معاہدہ طے

پا گیا۔ قانونی موشگافیوں کا دھیان رکھتے ہوئے پہلے تو اجمل کی سزائے موت کے خلاف اپیل ہائی کورٹ میں دائر کرائی گئی، جیلر کے کسی رشتہ دار کے نام اجمل نے زمین منتقل کرائی پھر اُسے بیمار ظاہر کر کے ڈی ایچ کیو اسپتال میں ریفر کر دیا گیا۔ یہیں معاہدے کی دوسری شرط پوری کرتے ہوئے اجمل کو اسپتال سے زندگی اور دشمنوں کے پیچھے بھاگنے کا موقع دے دیا گیا۔

وہ خطرناک اشتہاری مجرم تھا۔ موت کے منہ سے نکل کر کھلی فضا میں سانسیں لے رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے رشتہ داروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”ایک ذرا انتظار...... پھر ایک الو کا پٹھا بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

اُسے پہلے شک تھا کہ اس کے ماں باپ کے قتل کے پیچھے اس کے چچاؤں اور ماموؤں کا ہاتھ تھا کیونکہ اس کے مقدمے میں وہی تینوں مدعی بنے تھے۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ اس کے باپ کے ترکے پر انہی لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے تو اس کا شک پختہ یقین میں بدل گیا۔

چونکہ وہ مفرور مجرم تھا؛ قانون کو مطلوب تھا اِس لیے چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اپنے دشمنوں پر شب خون مارنے کے لیے جرائم کی دلدل میں اُتر گیا۔ وہ غیر معمولی ذہین اور دلیر تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں اپنے اردگرد جرائم پیشہ لوگوں کا ایک گروہ مجتمع کرلیا جو کئی نوع کی وارداتیں کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ان مختلف ہنر میں یکتا لوگوں کو ایک تنظیم کی شکل دے کر جدید طرز کا کریمنل گینگ بنایا پھر ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ہی اُس نے تینوں رشتہ داروں کو ایسی منصوبہ بندی کے تحت زمین میں اُتارا کہ وہ قانون کے شکنجے میں آنے سے بچ گیا۔

اپنے خاندان کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُس نے در پردہ رہتے ہوئے اپنا کاروبار، فلور مل اور تمام جائداد کو اپنے منیجر کی تحویل میں دیتے ہوئے ایک طرف وارداتوں کا سلسلہ جاری رکھا جبکہ دوسری طرف اپنے کیس کی قانونی پیروی شروع کر دی۔ اَب وہ نہتا نہیں تھا، اس لیے جب دونوں ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں اُٹھائے انصاف کے بازار میں نکلا تو اُسے ہر کوئی پرسانِ حال اور معاون ملا۔ ہر دفتر کا دروازہ اُس پر کھلتا گیا، ہر ماتھے کی تیوریاں کھلتی گئیں اور وہ چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد مکمل بریت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اجمل نے اپنے جن چچاؤں اور ماموؤں کو قتل کیا تھا، ان کی اولادیں شک کی بنا پر اُس کے خون کی پیاسی تھیں۔ وہ ڈرتا نہیں تھا مگر احتیاطاً ان سے بچ کر چلتا تھا کیونکہ ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کے نام کی دھاک شہر میں بیٹھ گئی مگر تب تک مسلسل شراب نوشی کی عادت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اُسے گردوں کا ضعف لاحق ہو گیا تھا جس نے سال بھر میں ہی اُسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ابتدا میں اِس بیماری کو اہمیت نہیں دی مگر جب گردوں کا جان لیوا درد اس کی برداشت سے باہر ہو گیا، کمزوری نے اعصاب میں شدید شکست و ریخت بھر دی تو وہ شہر کے جدید نجی اسپتال منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔

وہ دیکھنے میں تندرست، مضبوط قد کاٹھ کا مالک پرکشش مرد تھا مگر شراب نوشی نے اُسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ دو تین مرتبہ ڈائیلاسز کے مرحلے سے گزرنے کے بعد مزید نحیف ہو گیا۔ اس کے متوالوں نے گردوں کے حصول کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر دال نہ گلی جس پر اجمل کا علاج کرنے والے ڈاکٹرز نے اس کی زندگی کے سوال پر نفی میں سر ہلا کر دعا کا مشورہ دے دیا۔ اِن دنوں وہ بسترِ مرگ پر اپنی آخری سانسیں شمار کرنے پر مامور تھا اور ڈاکٹرز کی رائے کے مطابق وہ ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ نکالنے والا نہیں تھا۔

جوزفین نے اجمل گیلانی کی رام کہانی تمام تر جزئیات سمیت سنانے کے بعد اُس کی طرف دیکھا اور کہا تھا۔ ”چندو ماہی! میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ شہزادوں کی طرح زندہ رہا۔ بہادروں کی طرح قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا رہا پھر جیل سے نکلنے کے بعد بجلی کی طرح اپنے دشمنوں پر ٹوٹا۔ وہ مر رہا ہے۔ اُسے بچایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا ہے تبھی شان سے مرنا چاہتا ہے۔ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے مگر تم جیسی کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ مرتا ہوا شخص ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر جائداد، جو بلاشبہ اِس وقت کروڑوں میں ہے، دے کر زندگی سے بھرپور ایک رات خریدنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے خاندان کا کوئی شخص اس کی جائداد سے ایک دھیلا بھی حاصل نہ کر سکے...... میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ بہت منتقم مزاج اور ٹھوس بنیاد پر دشمنی یا دوستی رکھنے والا انسان ہے۔“

چندو نے جوزفین سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اس کا جوزفین سے کیا تعلق تھا؟...... جوزفین نے بتایا کہ وہ اُس کے باپ اکمل گیلانی کی دوست تھی۔ چونکہ اس کی بیوی

مستقل بیمار تھی، اِس لیے اُسے اپنی زندگی کو سیراب کرنے کے لیے جوزفین جیسے تھرڈ کریکٹر کی احتیاج تھی۔ وہ بھاری معاوضے پر بڑی رازداری سے محبت کے چند لمحات خرید کر گیلانی کی گود میں ڈال دیتی تھی۔ اجمل گیلانی سے تعلق کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی تھی۔

چندو کو اُس کے کردار پر گھن آ رہی تھی مگر اس کی پیشکش اور منصوبے کی طرف دل کھنچ رہا تھا۔ جوزفین نے اُسے کہا تھا۔ ”چندو! تم کتنے مردوں کی خواب گاہ میں جا چکی ہو؟ یاد کرو...... مگر تمہارا کیا بگڑ گیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اور تو اور...... تم بیوی اور ایک بچی کی ماں بھی بن چکی ہو مگر تمہاری معصوم شکل دیکھ کر کوئی بھی یہ بات سچ ماننے کو تیار نہیں ہو گا۔ پہلے کی طرح یہ شادی بھی محض کاغذی کارروائی ہے۔ وہ مرنے والا ہے اور تمہیں اپنی مرضی سے چھونے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ فرض کیا؛ وہ تمہاری ایک رات حاصل کر بھی لیتا ہے تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کوئی گناہ تو نہیں کرے گا، نہ تم۔ اور یوں یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہو گا۔ بنا ہاتھ پیر ہلائے کروڑوں کی جائداد تمہاری جھولی میں آن گرے گی...... ہے ناں؟“

جب اُس نے یہ باتیں سنی تھیں، تب اُسے بُری لگی تھیں مگر رات کے اِس پہر میں اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جوزفین نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی قسمت ایسے سنہرے مواقع بار بار نہیں دیتی۔ اُسے بھی اپنا ماضی جھوٹ لگنے لگا۔ عمر حیات کی حویلی خواب تھی۔ حویلی میں چند دن کا مہمان بن کر آنے والا ماموں رضوان خواب تھا، خواب گر تھا، چلا گیا۔ اس نے چندو کی دنیا میں تبدیلی لانے والے جس راج گر کا تذکرہ کیا تھا، وہ ڈاکٹر منور علی تھا۔ آیا اور آ کر چلا بھی گیا۔ جاتے ہوئے زندگی گزارنے کا ہنر دے گیا۔ وہ ہنر آزما تھی مگر اب سبز باغ دیکھتے ہوئے بھٹکنے لگی تھی اور جوزفین کے صاف و شفاف تعلق کو مدنظر رکھ کر مرتے ہوئے شخص کی انتقامی سوچ سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ ماموں رضوان نے جس شخص کا تذکرہ کیا تھا، شاید وہ اجمل گیلانی ہی تھا۔ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ خوابوں کا دل افزاء سلسلہ جاری تھا اور پھر اُس نے دولت کے حصول کے لیے شارٹ کٹ اختیار کرنے کا آدھا فیصلہ کرلیا۔ بقیہ آدھے فیصلے کا انحصار اجمل گیلانی سے ہونے والی ملاقات پر تھا۔

وہ دیر سے سوئی تھی۔ دیر سے جاگی۔ زرینہ یونیفارم پہن کر جا چکی تھی۔ اُس پر کسلمندی سوار تھی۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی اسٹڈی چیئر پر آ بیٹھی۔ وارڈ میں جانے کو جی نہ چاہا۔

کہیں آپ
زندگی
کی حقیقی خوشیوں سے
دور تو نہیں، انسان کے پاس سب کچھ ہو اور ساتھ ہی خاص پوشیدہ پیچیدہ اعصابی کمزوری میں مبتلا ہو۔ ایسی زندگی صرف بے رونق، بے لطف، نامکمل ہی ہو سکتی ہے۔ زندگی کا اصل مزہ اور لطف حاصل کرنے کے لیے خاص پوشیدہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ، آج ہی ہم سے فون پر بات کر کے بذریعہ وی پی پارسل
خاص اعصابی کورس
منگوالیں یا خود تشریف لائیں
الرحمٰن غوثیہ دواخانہ
68A، اے بلاک، گلی نمبر 1، شہباز ٹاؤن، فیصل آباد
فون: 0322-6506989
اوقات فون وملاقات: 10 بجے تا رات 8 بجے

ایسے میں سوچ کی سوئی اجمل گیلانی پر جا اَٹکی۔ وہ کیسا تھا؟ کیا وہ واقعی مرنے جا رہا تھا؟ ان سوالوں کا جواب اجمل سے ملنے پر مل سکتا تھا۔ جوزفین نے اُسے بتایا تھا کہ وہ آنے والے دو تین دن ڈیوٹی پر نہیں جائے گی بلکہ اجمل کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرے گی۔ چندو نے اپنا کمرا مقفل کیا اور جوزفین کی طرف چل دی۔

جوزفین نے دیکھا کہ سوجی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ چندو کی تفکرات بھری شب کی کتھا سنا رہا تھا۔ اس کے استفسار پر چندو نے اجمل گیلانی سے شادی کی نیم رضامندی ظاہر کی تو اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وفورِ مسرت سے چندو کو بانہوں میں بھر کر چومنے لگی۔ اس کی معاملہ فہمی اور قوتِ فیصلہ کو سراہتے ہوئے حوصلہ افزائی کرنے لگی، بولی۔ "چندو جان! تم مقدر کی سکندر ہو۔ یقین کرو! اجمل دل کا بہت اچھا ہے۔ ہائے کاش! اس کی موت ٹل جائے، کسی دشمن کو آجائے اور اُسے تمہارے حسن کی پذیرائی کی مہلت مل جائے۔ وہ زندہ رہے گا تو تمہیں دل کے سنگھاسن پر بٹھائے گا۔ مر جائے گا تو تمہیں ملکہ بنا کر اپنی راج دھانی سونپ جائے گا۔"

چندو ماہی سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جوزفین کی شرارت بھری باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "مگر میں اُسے دیکھنے کے بعد حتمی فیصلہ کروں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا نکاح عدالت میں ہوگا اور اس سے پہلے اجمل کی جائداد میرے نام منتقل ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے رشتہ دار اور وراثت کے حقدار مجھ سے سب کچھ چھین لیں۔ میں کوئی بھی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

جوزفین نے اُسے گہری نظروں دیکھا پھر پرجوش انداز میں یقین دلایا کہ وہ جیسا چاہے گی، ویسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد جب چندو کمرے سے نکلنے لگی تو جوزفین نے پیار سے روکا، مسکرا کر کہا۔ "ہم سہ پہر کو اجمل سے ملنے کے لیے جائیں گے۔ ویسے تو تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں مگر ہلکا پھلکا میک اَپ کر لینا۔ اور ہاں! تمہاری روم میٹ کو اس معاملے کی بھنک نہیں ملنی چاہیے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے کمرے میں آ کر بغیر ناشتا کیے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے زندگی میں معمولی نوعیت کی غلطیاں کی تھیں جن کی بھیانک سزا پائی تھی۔ دودھ کی جلی تھی اور چھاچھ کو پھونک مارنے پر مجبور تھی۔ ایسے میں اس کے خوبصورت ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ بڑبڑانے لگی۔ "میری ہر غلطی کی زیادہ سے زیادہ سزا وہی ہے جو مجھے پہلی مرتبہ عمرِ حیات نے دی تھی۔ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وہی ہو گا جو یارن، افراسیاب اور جانو جیسے بھیڑیوں نے کیا تھا۔ تب کیا ہوا تھا؟ اَب کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں...... پہلے میں کمزور تھی۔ جس کا بس چلا، اس نے توڑ موڑ کر رکھ دیا۔ اَب میں نادان ہوں نہ ہی کمزور۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی تو اجمل اور میڈم جوزفین پر لعنت بھیج کر واپس آ جاؤں گی۔"

پہلی اُڑان بھرنے والا ہر بوٹ یہی سوچ کر چھلانگ لگاتا ہے مگر پھر زندگی بھر گھونسلے میں لوٹنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس نے بھی آنکھیں بند کیں اور گھونسلے سے چھلانگ لگا دی۔

پانچ بجے جوزفین کے ساتھ شہر کی مصروف شاہراہ پر آسمان کو چھوتی ہوئی نجی اسپتال کی عمارت کے پارکنگ ایریا میں رکشا سے اُتری تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے زندگی میں دو سرکاری اسپتال دیکھ رکھے تھے۔ سوچا کرتی تھی کہ دنیا کے سبھی اسپتال ایسے ہی ہوتے ہیں مگر اس اسپتال کے آؤٹ ڈور کاؤنٹر پر رک کر ارد گرد دیکھتے ہی اُسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ یہ اسپتال ٹی وی اور فلموں میں دکھائے جانے والے فائیو اسٹار ہوٹلوں سے کسی طور پر کم نہیں تھا۔ یہاں صفائی اور آرائش کا معیار بہت اچھا تھا۔

اجمل گیلانی کا وی آئی پی کمرا چوتھی منزل پر تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعے فورتھ فلور پر پہنچیں۔ گیلری کے آخری کمرے میں آئیں۔ مردے کی طرح بیڈ پر لیٹے ہوئے پیلے چہرے والے مریض کے دونوں اطراف دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر کھڑے تھے۔

وہ جوزفین سے جڑ کر چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آ گئی۔ متذبذب انداز میں مریض کو دیکھنے لگی۔ وہ یقینی طور پر اجمل گیلانی ہی تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ ایک نظر دیکھتے ہی چندو کو جھرجھری آ گئی اور اس نے غیر ارادی طور پر رُخ پھیر لیا۔ ایسے میں جوزفین کی متفکر آواز کانوں میں پڑی۔ "ڈاکٹر صاحب! کیا یہ ہوش میں ہے؟"

"یس! مگر اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی ہے۔" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ بے تاثر لہجے میں کہا۔

زندگی اور موت کا کھیل چندو ماہی کے لیے نیا نہیں تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے

دیکھا تھا۔ نرسنگ کے شعبے میں آتے ہی اسی کھیل سے اُس کا مستقل واسطہ پڑا تھا۔ اس کے سامنے جیتا جاگتا انسان زندگی زندگی پکارتا ہوا موت کی اتھاہ گپھا میں چلا جاتا تھا۔ مرتا ہوا شخص اچانک سنبھل کر موت کے خونیں پنجوں سے آزاد ہو جاتا تھا۔ مسیحائی کا پیشہ انسان کو غیر معمولی طور پر مضبوط اور سخت دل کر دیتا ہے۔ وہ بھی مضبوط بن کر آئی تھی مگر اس کمرے کے در و دیوار سے آسیب کی طرح چمٹی ہوئی موت نے اس کے اعصاب کو جھنجنا کر رکھ دیا تھا۔

بہ دقت تمام اس نے اپنی ہمتیں یکجا کیں۔ کیمل کلر کے کمبل میں گردن تک چھپے ہوئے اجمل کو دیکھا۔ اس کی اَدھ کھلی آنکھیں جوزفین پر جمی ہوئی تھیں اور لبوں پر شکست خوردہ سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے نرسوں کی معاونت سے اپنا کام مکمل کیا اور جوزفین کو ہمدردی بھری نظر سے دیکھ کر چلا گیا۔ جوزفین نے نرسوں کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیجا۔ پھر اجمل پر جھکی اور پیشانی پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے پیار سے بولی۔ "کیسے ہو میری جان؟"

"تم آ گئی ہو تو دو چار گھڑیاں اچھی گزر جائیں گی۔"

"ہوں...... آج میں تمہارے لیے بہت بڑی خوشخبری لائی ہوں۔ تمہاری دلہن ڈھونڈ لائی ہوں۔ دیکھ لو۔ اسے چندے آفتاب کہو یا چندے ماہتاب...... دیکھنے سے میلی ہونے لگتی ہے۔ اس شہر میں تو کیا، پورے ملک میں اتنی خوبصورت لڑکی نہیں ہوگی۔"

یہ کہہ کر جوزفین نے چندو کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اجمل کے سامنے کر دیا۔ اس کا دعویٰ بجا ثابت ہوا۔ اجمل کی آنکھیں یکبارگی کھل گئیں۔ یک ٹک دیکھتے ہوئے اپنی دہلیزِ جاں تک آنے والی موت کی صدا کو بھول گیا۔ کمزور سی آواز میں بولا۔ "آں ہاں! تت...... تم ٹھیک کہتی ہو جوزی ڈیئر۔ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی۔ دودھ کی طرح پاکیزہ...... پھول کی طرح تازہ...... مگر کیا یہ مجھ سے شادی پر تیار ہے؟"

"تو کیا ایسے ہی اُٹھا لائی ہوں اِسے؟" جوزفین نے سینہ پھلایا۔ "یہ بہت مغرور ہے۔ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ ڈاکٹر تو رہے ایک طرف، نرسیں بھی اس سے بات کرنے کو ترستی ہیں اور بڑی مشکل سے تمہارے لیے رام کر لائی ہوں۔"

چندو اور اجمل ایک دوسرے کو پلکیں جھپکے بغیر دیکھ رہے تھے۔ چندو اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے تھوڑا اور قریب ہوئی۔ بائیں آنکھ کو دیکھا۔ اجمل کی نیم باز آنکھیں ایک لحظے کو بند ہوئیں۔ اپنی آنکھ پر ماموں رضوان کی انگلی کا لمس جاگا اور دل اچانک تیزی سے پہلو میں دھڑکنے لگا۔ موت کی بانہوں میں جھولنے والے کی بائیں آنکھ پر ایک ننھا سا سیاہ تل جگمگا رہا تھا۔

ماموں رضوان نے کہا تھا کہ ایک بادشاہ اُس کی زندگی میں گھڑی دو گھڑی کے لیے آئے گا اور اُسے سہارا دے کر چلا جائے گا۔ مرنا اور جانا ایک برابر ہوتا ہے۔ یعنی ماموں رضوان کا کہا پورا ہونے والا تھا۔ اُس نے جو نشانی بتائی تھی، وہ موجود تھی۔ اس نے اپنی آنکھ پر انگلی رکھ کر سرگوشی کی طرح ایک لفظ 'تل' ادا کیا تھا۔ اُس لفظ کی بازگشت ذہن میں ہتھوڑے مارنے لگی۔ دل یقین کے ساتھ اُسے سمجھانے لگا کہ وہ جسے دیکھ رہی تھی، وہ اُس کو ہر فکر سے آزاد کرنے والا ہی تھا۔ اچانک اُس کی سوچ کی تابانی فرو ہو گئی۔ دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ڈاکٹر منور علی کا چہرہ چشمِ تصور میں سج گیا۔ اس کی بند آنکھ پر ایسا ہی تل تھا۔ ماموں رضوان نے ایک شخص کا کہا تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر منور تھا تو وہ اپنے حصے کا کام کر کے منظر سے ہٹ گیا تھا۔ اگر وہ مطلوبہ شخص نہیں تھا تو اس نے کیوں سہارا دیا تھا؟...... اگر وہی تھا تو پھر اجمل کی آنکھ پر تل کا نشان کیوں تھا؟...... شش و پنج میں بڑھتے ہوئے قدم بے جان ہونے لگے۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر بہ غور اجمل کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا غیر معمولی پیلا پن دیکھ کر اُس پر ترس آیا۔ جواں عمری میں موت کو گلے لگانا دیکھنے والوں کے لیے تکلیف رساں ہوتا ہے۔

ایسے میں اجمل نے آنکھیں کھول دیں اور بے چارگی سے معمور لہجے میں چندو سے مخاطب ہوا۔ "میں...... اجمل گیلانی ہوں۔"

"جی! میں جانتی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں دو چار دنوں یا دو چار لمحوں کا مہمان ہوں؟"

"مجھے میڈم نے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ اجمل کے پیلے چہرے پر زیادہ دیر نظریں ثبت رکھنا دل گردے کا کام تھا۔ "اخبار میں آئے روز گردوں کی غیر قانونی منتقلی اور چوری کی خبریں چھپتی ہیں۔ کئی گروہ یہ کام باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ آپ اتنے امیر ہوتے ہوئے بھی ایک گردہ خرید نہیں پائے۔ حیرت کی بات ہے۔"

اجمل کے بجائے جوزفین نے جواب دیا۔ "ہاں! اس معاملے میں میرا دوست بدقسمت ثابت ہوا ہے۔ اس

کے ساتھی اور میں تمام تر کوشش کے باوجود کسی گروہ چور گروہ تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ عطیے والی فہرست میں ابھی اس کا نام بہت نیچے ہے اور باری آتے آتے چھ ماہ گزر جائیں گے۔''

کچھ دیر اجمل کے علاج اور کیفیت پر گفتگو ہوتی رہی پھر جوزفین دونوں کو تنہائی میں وقت دینے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔ اجمل کے ہونٹ بھنچ گئے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔ چندو نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا درد ہو رہا ہے؟''

اجمل نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر کھول کر آزردگی سے مسکرایا اور بولا۔ ''جوزی نے تمہیں بتا دیا ہے ناں کہ میں مرنے سے پہلے کیوں شادی کرنا چاہتا ہوں؟''

چندو نے اپنا وزن دوسری ٹانگ پر منتقل کیا۔ اثبات میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ''کیا تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟''

اس نے پھر اثبات میں سر کو جنبش دی، بولی۔ ''کیا آپ کے پاس اپنی دولت اور جائداد کو اپنے دشمنوں یا رشتہ داروں سے بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ شادی کے جھنجٹ میں پڑے بغیر یہ مقصد پورا کر سکتے ہیں۔''

''کیسے؟'' اجمل نے پوچھا۔

''آپ کسی فلاحی ادارے کو جائداد منتقل کر سکتے ہیں۔ کسی ٹرسٹ کو ڈونیٹ کر سکتے ہیں۔ پراپرٹی بیچ کر رقم غریبوں اور مستحق لوگوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ اپنے نام پر کوئی خیراتی اسپتال......''

اجمل کے چہرے پر اذیت کے آثار دیکھ کر وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ سہم کر سوالیہ انداز میں دیکھنے لگ گئی۔

وہ بولا تو اس کی آواز پہلے سے بھی نحیف تھی۔ ''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ میں شادی سے پہلے اپنی زیادہ تر جائداد تمہارے ہاتھ فروخت کروں گا۔ بقیہ حق مہر میں تفویض کر دوں گا تاکہ ہیرز لاء کے تحت کوئی بھی تم سے ایک اینٹ بھی نہ ہتھیا سکے۔ اپنی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گا۔ رہی بات ٹرسٹ یا کسی رفاحی تنظیم کو وقف کرنے کی تو سن لو۔ میں ان خدائی فوجداروں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ جیل میں رہتے ہوئے میں نے سبھی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ اپنی بے گناہی کا واویلا کیا تھا مگر کسی نے مجھ تک پہنچنے یا کچھ پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔'' اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ کچھ دیر سنبھلنے میں لگی۔ پھر بولا۔ ''لڑکی! اس بے حس معاشرے نے مجھ سے میرے ماں باپ چھین لیے۔ قانون نے مجھے ہی اپنے والدین کا قاتل قرار دیا اور دنیا کی سب سے بڑی سزا سنا دی، سزائے موت۔ آہ! میں مجرم نہیں تھا اور میں نے دُہری سزا کاٹی۔ اور ہاں! میری چیخوں پر، فریاد اور پکار پر کسی ٹرسٹ نے، کسی این جی او یا سوشل ورکر نے کان تک نہ دھرا۔ جب میں دولت کے بل بوتے پر اس مقتل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو سبھی مجھے خوش آمدید کہنے لگے مگر میں نے پورے معاشرے کو اپنا مجرم سمجھا...... بلاتخصیص!''

وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر پھر بھی تھک جاتا تھا۔ چند لمحے خود کو سنبھالتا، پھر بول پڑتا۔ ایسا ہی ایک وقفہ گزار کر گویا ہوا۔ ''اور میں نے سزا دینے کا ہنر بھی سیکھ لیا مگر لوگوں کی طرح زندگی بھی بے وفا نکلی۔ اب میں مرنے والا ہوں۔ میرے اردگرد گدھوں کی طرح میرے رشتہ دار آنکھیں پھاڑے جمع ہیں۔ صبح و شام یہاں مجمع لگتا ہے۔ ہر کوئی دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ میں کب آنکھیں بند کروں گا تاکہ انہیں موج اُڑانے کے لیے کروڑوں روپے ملیں۔ مگر نہیں...... میں ان کتوں کے منہ میں چچوڑی ہوئی ہڈی بھی نہیں ڈالوں گا۔ ایک دھیلا بھی نہیں......''

اس کے لہجے میں بے پناہ نفرت گھلی ہوئی تھی۔ سانسیں ہموار کرنے کے بعد شعلہ بار نظروں سے چھت کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''میں کیسے بھول جاؤں کہ میرے باپ کی میت پر کوئی رونے والا نہیں تھا اور میری ماں کی لاش کو غیر محرم ہاتھ لگے تھے۔ انہیں کس نے کیسے دفن کیا، علم نہیں مگر بھولنے والا بھی نہیں۔ میں اُس وقت حوالات کی سلاخوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ تھانیدار مجھ پر طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ مکر کرتا ہے، فراڈ کرتا ہے۔ اسے اگر ماں باپ کا دکھ ہوتا تو انہیں قتل ہی کیوں کرتا...... آہ! وہ وقت بھولے سے نہیں بھولتا۔ جن لوگوں نے مجھے وہ دن دکھایا تھا، ان کی اولادوں نے بھی وہ دن دیکھ لیا ہے مگر نہیں...... بڑا فرق ہے۔ ان کتوں کی لاشوں پر بین کرنے والے تو موجود تھے ناں۔ وہی اَب میرے خون کے پیاسے ہیں، میری جائداد کے طلب گار ہیں مگر میں ان کے ہاتھ پھوٹی کوڑی نہیں لگنے دوں گا...... کسی کو بھی نہیں......''

''تو مجھے ہی کیوں دے رہے ہیں؟'' چندو اس کی مدھم آواز سننے کے لیے کافی قریب آ گئی تھی۔ ''آپ اپنی دوست میڈم جوزفین کو بھی دے سکتے ہیں۔''

''اسے اس کا حصہ دوں گا مگر تمہیں سب کچھ دوں گا۔ کیوں؟ اس کا جواب اگر تمہیں جوزی نے نہیں دیا تو میں دیتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ تم مجھے تمام جائداد کے عوض میں اپنی زندگی کی ایک قیمتی رات دو گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رات میری جھولی میں وارث کی خیرات ڈال دے اور مرنے کے بعد باپ بنا دے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کوئی بات نہیں۔ میں کم سے کم مایوسی کے عالم میں تو موت کو گلے نہیں لگاؤں گا۔''

جوزفین نے یہ بات نہیں کی تھی۔ چندو کی پیشانی پر پسینا آ گیا۔ اس نے پھر تشکیک آمیز نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ہاتھ کیسے تھام سکتا تھا؟ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

اجمل کا چہرہ مزید بجھ گیا، بولا۔ ''تمہاری مرضی! میں سوائے خاموش ہونے کے کیا کر لوں گا۔''

چندو کٹ کر رہ گئی۔ اپنی یسیری اور بدبختی کو دیکھ کر خود کو دنیا کی غمزدہ لڑکی سمجھتی تھی مگر جب دنیا کا غم دیکھا تو اپنا غم بھول گئی۔ سر جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی پھر سر اُٹھا کر بولی۔ ''سچ پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ خواب لگ رہا ہے جو کسی بھی جھٹکے پر ٹوٹ جائے گا اور میں دھوکے میں ماری جاؤں گی۔''

''کیا میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے، نہیں بھی...... میں......'' وہ گڑبڑا کر تھم گئی۔

اجمل کے حلق سے آہ نکلی۔ تڑپ کر کچھ کہنا چاہ مگر کھانسی آ گئی۔ ایسے ہی وقت میں جوزفین کمرے میں داخل ہوئی۔ تیزی سے قریب آئی۔ کمبل میں ہاتھ ڈال کر اُس کی چھاتی سہلانے لگی۔

وہ سنبھل کر بولا۔ ''جوزی! یہ کہتی ہے کہ میں اسے دھوکا دوں گا۔ میں! اسے بتاؤ کہ میں نے شیر کی زندگی گزاری ہے۔ خون کیے ہیں، ڈنکے کی چوٹ پر لوگوں کو لوٹا ہے مگر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ اسے بتاؤ کہ میں نے ہمیشہ سینے میں گولی ماری ہے۔ کبھی پیٹھ پر وار نہیں کیا۔ مرتے ہوئے کیا دھوکا دوں گا۔ ہائے جوزی! درد...... جاؤ...... اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اسے سمجھاؤ۔ مطمئن کرو۔ دل سے مان جائے تو فوری طور پر حق نواز ایڈووکیٹ کے پاس لے جانا۔ وہ دستاویز تیار کیے بیٹھا ہے۔ تم نے اُس کا گھر تو دیکھ رکھا ہے ناں؟''

جوزفین نے اثبات میں سر ہلایا۔ بیڈ سائڈ میں نصب کال بیل کا بٹن پش کیا۔ نرس کی آمد پر اُسے اجمل کا خصوصی دھیان رکھنے کا حکم دے کر باہر نکل آئی۔ اسپتال سے نکل کر ملحقہ باربی کیو میں چندو کو لے کر جا بیٹھی۔ سوپ کا آرڈر دے کر چندو سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں چندو جان! بتاؤ، تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' چندو نے ہچکچاتے ہوئے دل کی بات کی۔

''میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہی ہوں۔ یقین دلاتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا فراڈ نہیں ہونے دوں گی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہارا مستقبل تاریک کر دوں؟...... میں نے اجمل گیلانی سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ دیکھ بھال لیا ہے۔ مزید ہم وکیل سے دستاویز کی کاپی حاصل کر کے اور کسی وکیل کو دکھا لیں گے تاکہ تمہیں بھی تسلی ہو جائے۔ کیا خیال ہے؟''

اس نے بھاپ اُڑاتے سوپ پر نظریں جمائیں اور سپر ڈال دی۔ ''اگر آپ میرے ساتھ رہنے اور رہنمائی کی ذمے داری قبول کریں تو میں یہ رِسک لینے پر تیار ہوں۔''

جوزفین نے مسکرا کر اس کے فیصلے کا خیر مقدم کیا اور حق نواز ایڈووکیٹ کے گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

چندو اپنی قوتِ پرواز سے کہیں بلند پرواز کرنے جا رہی تھی اس لیے کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تبھی اس نے میڈم جوزفین کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا اور حق نواز ایڈووکیٹ کو بھی۔ پھر اُس نے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیوں کو پہلے جوزفین کے منتخب کردہ وکیل کو دکھایا پھر جوزفین کی معیت میں ایک اجنبی وکیل سے ملی جس نے فیس طے کرنے کے بعد کاغذات کا اچھی طرح جائزہ لیا اور کہا۔ ''بیٹا! ان کاغذات کی رُو سے اجمل گیلانی نامی شخص نے گیلانی فلور ملز اور ایک تین کنال رقبے پر تعمیر شدہ کوٹھی فروخت کی ہے۔ ابھی یہ دستاویز ادھوری ہے کیونکہ اس میں خریدار کے نام کی جگہ خالی ہے۔ ریونیو آفیسر کی تصدیق اور ریکارڈ مال میں اندراج بھی باقی ہے۔ بالکل ان پیپرز کی طرح یہ بھی اُدھورے پیپرز ہیں جن کی رُو سے اجمل گیلانی کسی سے عقد کرنے جا رہا ہے اور حق مہر میں اپنی تمام جائداد تفویض کر رہا ہے۔ یہاں بھی دلہن کے نام اور کوائف والا خانہ خالی ہے۔''

چندو نے اُس سے کرید کرید کر بہت کچھ پوچھا۔ تسلی ہونے پر اُس نے فیس ادا کی اور جائداد کی اس منتقلی کے عمل میں معاونت چاہی۔ وکیل نے عدیم الفرصتی کی بنا پر معذرت چاہی اور دیوانی مقدمات کے ایک وکیل کا وزٹنگ کارڈ تھما دیا۔ ''یہ بہت قابل وکیل ہیں۔ فیس معمول سے تھوڑی زیادہ لیتے ہیں مگر اپنے کلائنٹ کا نقصان نہیں ہونے دیتے۔ آپ ان سے ابھی جا کر مل لیں۔''

چیمبر سے نکل کر چندو نے جوزفین کے استفسار پر کہا۔ ''میڈم! میں چاہتی ہوں کہ اجمل صاحب کے وکیل کے

ساتھ ساتھ اس معاملے میں میری طرف سے بھی ایک وکیل شامل ہو۔''

''مگر تم فیس کی مد میں اتنی رقم کیوں ضائع کرنا چاہتی ہو؟'' جوزفین کو اس کی احتیاط پسندی کچھ بری لگی تھی جو اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔

وہ جوزفین کی ناراضی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سر جھٹک کر بولی۔ ''رقم کی کوئی بات نہیں میڈم! مجھے تسلی تو ہو جائے گی ناں!''

چندو کے پاس ابھی تک ڈاکٹر منور علی کی دی ہوئی رقم موجود تھی جس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔

* * *

'پیسا پھینک تماشا دیکھ' کے مصداق حق نواز ایڈووکیٹ اور چندو ماہی کے وکیل ملک امیر محمد ایڈووکیٹ نے مل کر ہفتوں کا کام ایک ہی دن میں مکمل کر دکھایا۔ اسپتال کے کمرے میں آکر ریونیو آفیسر اور متعلقہ عملہ نے دستاویزات کو حتمی شکل دی اور ملک امیر محمد ایڈووکیٹ نے چندو ماہی کو علیحدگی میں خوش خبری سنا کر اپنی بقیہ فیس وصول کرلی کہ فلور ملز اور کوٹھی کی قانونی طور پر منتقلی کا عمل مکمل ہوگیا ہے۔

وہ فائل اُٹھائے چلا گیا تو چندو ماہی جوزفین کے پاس آگئی۔ اسپتال کے خصوصی کمرے میں ایک محفل برخاست ہو رہی تھی۔ دوسری بساط سجنے والی تھی۔ حق نواز ایڈووکیٹ کا منشی فیملی کورٹ کا نمائندہ لے کر پہنچ چکا تھا۔ فلور ملز اور وسیع وعریض کوٹھی پر مشتمل قیمتی جائداد جسے ابھی تک چندو ماہی نے دیکھا ہی نہیں تھا، اس کی ملکیت بن چکی تھی اور اب وہ اجمل گیلانی کی ملکیت بننے والی تھی۔ ڈھائی بجے تک وہ کروڑ پتی بن کر اجمل کی ہوگئی۔ وہ دوسری مرتبہ دلہن بنی تھی مگر واقعات کا مزاج بتا رہا تھا کہ وہ پہلے کی طرح تشنہ اور ازدواجی آسودگی سے محروم سیج پر براجمان ہوئی تھی۔

جوزفین نے اُسے بیڈ پر پائنتی کی جانب بٹھا دیا۔ کمرا خالی ہونے پر چندو کو پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاسٹل کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارا سامان محفوظ کرلوں گی اور ایک ماہ کی چھٹی بھی منظور کروا لوں گی۔ تم شام کو اپنے مریض سمیت کوٹھی میں شفٹ ہو جاؤ گی۔ میں بھی گاہے بہ گاہے چکر لگا لیا کروں گی۔ اگر آنے والے دنوں میں کبھی تمہیں نرسنگ کا شوق چرایا تو کلاس جوائن کر لینا۔ ویسے تو اَب تمہیں کورس یا ملازمت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کل تک تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی رقم منتقل ہو جائے گی کہ ساری زندگی بیٹھ کر کھاؤ تو ختم نہیں ہوگی۔ کوٹھی میں اجمل کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر اور نرس کی خدمات میں نے حاصل کرلی ہیں۔ خداوند اس کے حال پر رحم کرے اور یہ تمہیں دو چار دن مزید دیکھنے کے لیے زندہ رہے۔ اب میں چلتی ہوں۔''

وہ چندو کو حیران و سراسیمہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اجمل تھک کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی تیز سانسوں کی آواز کمرے میں چکرا رہی تھی جبکہ چندو کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ زندگی کے عجیب و غریب اور نہ سمجھ میں آنے والے مرحلے سے خالی الذہنی کے عالم میں گزر گئی تھی۔ آگے کیا ہونے والا تھا؛ یہ اس کی دانست سے ماورا تھا۔ وقت ایسی ہی چال چلتا ہے۔ ایک خانماں خراب لڑکی کو اس نے غربت کی کوکھ سے نکال کر نرسنگ کورس کے لیے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے اُٹھا کر ایک دن میں کروڑ پتی بنا دکھایا تھا۔ وقت کے نادیدہ اوراق پر لکھی ہوئی تحریر سے زندگی کے واقعات کھوجنے والا ماموں رضوان نہ جانے کہاں تھا مگر اُس کا کہا لفظ لفظ چندو ماہی کے ذہن میں تھا۔ اس نے غلطی کی تھی، درست راستہ اختیار کیا تھا...... یہ تعین بھی وقت نے ہی کرنا تھا اور وقت ابھی خاموش تھا۔

وہ دانستہ طور پر اجمل کے کھنڈر چہرے سے نظریں چرائے گامن، ناراض تاجاں اور بچھڑی ہوئی بہن کو یاد کر رہی تھی۔ عمر حیات اور ڈاکٹر منور علی سے تصور میں باتیں کر رہی تھی..... ان لوگوں کی یاد کے علاوہ اس کے پاس کل تک کچھ نہیں تھا۔ آج بہت کچھ تھا اور بہت کچھ سونپ دینے والا بھیانک موت سے نبرد آزما تھا۔ یہ جنگ کب تک چلنے والی تھی؟ علم نہیں تھا۔

گھنٹا گزر گیا۔ نرسیں اور ڈاکٹرز اپنے معمول کے مطابق آتے جاتے رہے۔ اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے رسمی انداز میں چندو کو شادی کی مبارک باد بھی دی۔ کرید کر کچھ پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ لب بستہ رہی۔ ابھی اپنی سمجھ نہیں آ رہی تھی، لوگوں کو کیا سمجھاتی... ایسے میں خاموشی ہر مسئلے کا بہترین حل تھا۔

شام ڈھلنے لگی۔ بھوک کا احساس ہوا۔ اُٹھ کر کینٹین تلاش کرنا چاہتی تھی مگر اچانک زوردار آواز سے دروازہ کھلا۔ اُس نے دروازہ کھولنے والے کو دیکھا تو ایک دم ٹھٹک گئی۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، ہکلائی۔ ''آ...... آپ......!''

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

''مکے، گھونسے، تھپڑ، ٹھوکر، لاتیں کھانے اور طعنے گالیاں ہی سن لیتیں، تم ڈاکٹر کیوں بنیں۔ پڑھی لکھی ہو کر بھی شوہر کی فرماں برداری نہیں غلامی کرنا تھی تو پھر کالج جانے کی کیا ضرورت تھی۔ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اگر اس ظالم سے ٹکر نہیں لے سکتی ہو تو تمہاری قسمت میں کچھ اور نہیں ہوگا۔''

وہ ہماری کلاس کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی نہ صرف یہ کہ خوب صورت بلکہ خوب سیرت بھی تھی۔ غضب کی کشش تھی اس میں اس کی عادتوں کی وجہ سے۔ پڑھنے والی، بروقت مدد کرنے کو تیار، ہنسنے بولنے والی سب میں سب سے نمایاں۔

ایک اور بات جس کا پتا بعد میں چلا وہ یہ کہ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ غریب خاندانوں میں ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ خوب صورت بھی ہوں، ان میں اعتماد بھی ہو اور اتنی بولڈ ہوں جتنی وہ تھی۔ غریب خوب صورت لڑکیوں کی شادی تو شاید سولہ، سترہ سال کی ہونے سے پہلے ہی کسی سے کر دی جاتی ہے کیونکہ خاندان اور عزیز واقارب

واپسی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

سفر تو نام ہے آگے بڑھتے رہنے کا... انسان واپس آکر اپنے پہلے سفر کا آغاز نہیں کرسکتا بالکل ایسے جیسے بہتے پانی کو پلٹانا نہممکن نہیں... جو گزر گیا سو گزر گیا۔ اسی کو جیون کہتے ہیں۔ وہ بھی ماضی کے دیپ جلائے کب سے آتی جاتی پرچھائیوں میں گم شدہ لمحات تلاش کر رہا تھا مگر اب اس کا ایسا سوچنا لاحاصل تھا جو زندگی کے ہر رستے پر واپس پلٹنا چاہتا تھا۔

پرجوش تقاریر کرنے والی لڑکی اور
ایک ستم زدہ عورت کی
پتا

کے لڑکوں کے ماں باپ کی نظر ایسی لڑکیوں پر ہوتی ہے، ایسی لڑکیاں پھر تمام عمر اپنے سے بہت زیادہ عمر کے شوہروں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے گزارہ کرتی رہتی ہیں۔

شازیہ میرے گروپ میں تھی اور میرا خیال تھا کہ فائنل ایر کا امتحان ہونے کے فوراً بعد اس کی شادی کا چکر شروع ہوگا۔ ہم دونوں کی اچھی دوستی تھی، خلوص بھرا تعلق تھا ہم دونوں کے درمیان۔ ایک طرح سے عزت بھی کرتے تھے، لڑتے بھی تھے ایک دوسرے کے کام بھی آتے تھے۔ وہ ذہین تھی اور ہمارے گروپ کی لیڈر بھی۔ جیسا کہ لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے وہ خیال بھی رکھتی تھی ہم لوگوں کا۔

عملی زندگی میں چیزیں اتنی مختلف ہوں گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جو میرے خیال وگمان میں بھی نہیں تھا وہ ہوگیا، فائنل ایر کے آخری امتحان کے دوسرے دن ہی میں نے امی سے کہا تھا کہ مجھے ناہید سے شادی کرنی ہے اور انہیں اس کے گھر رشتے کے لیے جانا ہوگا۔

میں نے سوچا تھا کہ انہیں خوشی ہوگی لیکن جب میں نے بتایا کہ ناہید سعود آباد میں رہتی ہے، کالج کی بس میں آتی ہے، غریب متوسط درجے کے خاندان سے تعلق ہے اس کا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے جوش وخروش پہ کسی نے برف کا پانی ڈال دیا ہے۔

دوسرے روز ہی ابو اور امی نے رات کو مجھے بٹھا کر اچھا خاصا لیکچر دے دیا تھا۔ ہم لوگ ڈیفنس فیز فور میں رہتے ہیں وہ لوگ سعود آباد کی کچی گلی میں اسی گز کے مکان میں رہتے ہیں، یہ بڑا فاصلہ ہے بہت بڑا، اسے طے کرنا ناممکن ہے بیٹے۔ شادیاں ہم پلہ لوگوں میں ہی ہوتی ہیں اور ہم پلوں میں ہی ہوسکے گی۔ تم کبھی بھی ملنے جلنے والوں کو اپنے سسرال کا پتا نہیں بتا سکو گے۔ یہ خیال دل سے نکال دو۔ ابو نے حتمی انداز سے کہہ دیا تھا۔

میں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بتایا تھا کہ وہ کتنی ذہین ہے، کتنا دوستانہ رویہ ہے اس کا، غریب ہونے کے باوجود کتنی پُراعتماد ہے وہ، سعود آباد میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جو ڈیفنس سوسائٹی، کارساز اور نارتھ ناظم آباد میں رہنے والی بہت ساری ہماری رشتہ دار لڑکیاں نہیں کرسکی ہیں۔ وہ بہت الگ سی ہے ابو، بہت الگ سی آپ ملیں گے تو فوراً ہی پسند کرلیں گے میری بات کو اہمیت تو دیں۔

مگر وہ لوگ میری بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ”ذہانت، خوش اخلاقی، محنتی یہ ساری باتیں زندگی کے عملی مرحلے میں ثانوی ہیں بیٹے، ہم نے تمہارے لیے بہت بڑے خواب دیکھے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں، کھاتے پیتے گھرانوں کے جو تمہیں داماد بنا کر سر پہ بٹھائیں گے تمہیں کیا ضرورت ہے کیچڑ میں پھنسو۔“ ابو نے سنجیدگی سے بڑے گہرے لہجے میں کہا تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ امی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

نہ وہ مجھے سمجھا سکے اور نہ میں انہیں راضی کرسکا۔ ناہید سے کہنا بے کار تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے ایسے ہی جیسے میں اسے پسند کرتا ہوں مگر وہ میرے ساتھ بھاگنے پر راضی نہیں ہوگی، بغاوت وہ نہیں کرسکتی ہے۔ میں کرسکتا تھا، میں تیار بھی تھا مگر وہ کبھی تیار نہیں ہوتی۔ میں سوچتا رہا اور وقت بڑی تیزی سے گزر گیا۔

ہمارا نتیجہ نکل آیا۔ معمول کے مطابق اس کی پوزیشن تھی اور ہم لوگوں نے مختلف وارڈوں میں ہاؤس جاب شروع کردی۔ نئے نئے کاموں میں الجھے ہونے کے باوجود میں دو دفعہ امی ابو کو سمجھانے کی کوشش کرچکا تھا جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا سوائے اس کے کہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ پاکستان چھوڑ کر ہی چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ انہی خیالات اور اسی اُمید اور ناامیدی کی کشمکش میں ہاؤس جاب کے ڈیڑھ ماہ گزر گئے تھے اور پتا چلا کہ ناہید کی شادی طے پاگئی ہے اور ہفتے دس دن میں وہ بیاہ کے امریکا چلی جائے گی۔

مجھ پر جو گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے محبت کی ہے۔ کسی کو آہستہ آہستہ ایک رازداری کے ساتھ چاہا ہے، اسے خوابوں میں، آنکھوں میں نظروں میں بسا رکھا ہے، یہ خبر بس بجلی بن کر ہی گری تھی۔

میں اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ اس نے خود فون کرکے مجھے آنے کو کہا مگر میں تو اس سے صحیح طریقے سے بات بھی نہیں کرسکا۔ اس کی آواز میں بھی کوئی کمی تھی۔ ناہید کی وہ آواز نہیں تھی۔ اس وقت تو میں نے محسوس نہیں کیا مگر سالوں بعد وہ تھکی تھکی پژمردہ آواز میرے کانوں میں گونج گئی تھی۔ ڈاکٹر نادر ہم سے بارہ سال پہلے ڈاکٹر بنا تھا۔ امریکا میں دل کے امراض کا ماہر تھا۔ اس کی بہن نے کراچی میں ناہید کو اپنے بھائی کے لیے پسند کرلیا تھا اور ناہید کے ماں باپ نے ہامی بھرلی تھی۔

ابتدا میں مجھے نفرت سی ہوگئی، ناہید کے خاندان سے۔ بالکل دو پیسے والی حرکت کی تھی ان لوگوں نے۔ ایک پیسے والے بڑے عمر کے بندے سے شادی کردی اپنی بیٹی کی، تھوڑا انتظار بھی نہیں کیا۔ اسے موقع تک نہیں دیا کہ وہ ہاؤس جاب کرتی، امتحان دیتی مگر میرا غصہ بجا نہیں تھا۔ اور کیا کرتے وہ لوگ۔ ان کی لڑکی کی شادی ایک پڑھے لکھے ڈاکٹر

سے ہورہی تھی جو امریکا میں سیٹ تھا۔ وہ بھی جا کر امتحان دے کر پاس ہوجائے گی اور پھر اس کا اپنا مقام ہوگا، یہی کہا تھا نادر کی بہن نے۔

ماں باپ اور کیا سوچتے ہیں متوسط اور نچلے گھرانوں میں بیٹیوں کی شادی دیر سے ہو تو کہنے والے نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ وہ لوگ کیا کرتے۔ نادر سے اچھا آدمی کہاں ملتا۔ ناہید کے پاس اور کیا مواقع تھے۔ اس نے ہمیشہ ماں باپ کے فیصلوں پر عمل کیا تھا۔ اب بھی ان کا کہا اس کو ماننا تھا، وہی اس نے کیا۔

میں نے ہاؤس جاب چھوڑ دی اور لائبریری میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ نہ ہاؤس جاب نہ پاکستان میں رہنا تھا اور نہ شادی کرنی تھی۔ امریکا کا امتحان میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ میں نے پاس کیا اور امریکا چلا گیا۔ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ میں دس سال کے بعد واپس آکر ان کی مرضی سے شادی کرلوں گا مگر میں نے ایسا نہیں سوچا تھا میری زندگی سے ناہید نکل ضرور گئی تھی مگر کوئی دوسرا میری زندگی میں نہیں تھا۔

کئی سال گزر گئے، مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے، میں اس کے بارے میں اچھا ہی سوچتا تھا کہ اس نے سارے امریکن امتحان پاس کرلیے ہوں گے۔ اسے فزیشن بننے کا شوق تھا وہ فزیشن بن گئی ہوگی۔ خوب صورت سے بچے ہوں گے اس کے۔ نادر کے ساتھ خوش ہوگی وہ۔ اور کیا سوچ سکتا تھا میں اس کے بارے میں۔

مگر ایسا نہیں تھا۔ سات سال گزر گئے تھے میں نے اپنے آپ کو اپنے کام میں مصروف کرلیا تھا، صبح وشام زندگی گزر رہی تھی۔ یونیورسٹی کے ساتھ کام کرنے میں یہ ہوتا ہے کہ آپ جتنا چاہیں اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتے ہیں۔

شکاگو کی کانفرنس میں میری ملاقات شازیہ سے ہوگئی تھی کئی سالوں کے بعد۔ وہ ہمارے ہی گروپ میں تھی، وہ بھی فزیشن تھی اور اس کا شوہر سرجن تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کانفرنس میں آئی تھی اور میرے لیکچر کے بعد سیدھی مجھ سے ملنے چلی آئی تھی۔

ہم دونوں ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ سالوں کے بعد جب ملاقات ہوتی ہے تو دنیا بھر کی بات ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں اس نے بتایا کہ ناہید کنساس میں رہتی ہے اپنے شوہر کے ساتھ۔ تین بچے ہیں اس کے اور اس نے کوئی امتحان نہیں دیا ہے صرف گھر اور شوہر کی ہوکر رہ گئی ہے۔ اس کی آواز میں ہلکا سا درد محسوس کرلیا تھا میں نے، کچھ تھا جو وہ مجھے نہیں بتا رہی تھی۔

”وہ تو بہت ذہین تھی۔ شازیہ ایسا کیسے ہوگیا۔ وہ تو سب کچھ کرسکتی تھی۔ کیوں نہیں کیا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں کرسکتی تھی۔ ضرور کرتی۔ اگر شوہر نے چاہا ہوتا۔ مگر نادر کا تو کھیل ہی کچھ اور تھا۔ یہ سب بات بتانا مت کسی کو۔ اس کا صرف مجھ سے رابطہ ہے اور یہ سب کچھ مجھے پتا ہے تمہیں صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ ہم تم سب دوست تھے۔ بہت معصوم سا رشتہ تھا ہمارا اور وہ رشتہ ابھی تک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تھی۔

”بتاؤ مجھے اس کے بارے میں۔ میرے دل میں ابھی بھی صرف اس کے لیے ہی درد اٹھتا ہے۔ کئی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی ہے امریکن اور پاکستانی لیکن وہ آئیں آکر چلی گئیں میں ناہید کو تلاش کرتا رہا ان میں۔ کہاں ملتی مجھے، ناہید تو ایک ہی بنائی گئی تھی۔“

اصل بات تو مجھے پتا نہیں ہے۔ وہ کچھ بتاتی بھی نہیں ہے۔ یہ مجھے ضرور پتا ہے کہ اس نے پڑھا نہیں۔ امریکن امتحان میں بیٹھی تک نہیں۔ ہاں تین بچوں کی ماں ضرور بن گئی ہے اور شاید اس نے اپنی زندگی ان ہی کے لیے وقف کردی ہے۔ فون پر دنیا جہاں کی باتیں کرتی ہے مگر اپنے بارے میں اپنے شوہر کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی۔ شازیہ نے بات کرتے ہوئے ناہید کو فون کیا۔

ناہید نے ہی فون اٹھایا۔ میں نے بھی بات کی تھی۔

”کیسی ہو ناہید، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے اس طرح سے بات ہوجائے گی میں بول رہا ہوں خرم، پہچان لیا۔“ میں نے بڑے جوش وخروش سے کہا۔

”کیوں نہیں پہچانوں گی۔ ٹھیک تو ہو۔“ اس نے آہستہ آہستہ رک رک کر کہا تھا۔ اس کی آواز کی قدرتی شوخی کہیں کھوگئی تھی۔ اس نے کوئی زیادہ بات نہیں کی۔ ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ میرا دل جیسے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی مگر یہ وہ نہیں تھی۔ وہی تھی مگر وہ نہیں تھی۔

میں نے شازیہ سے فون نمبر لے لیا۔ شازیہ نے کہا تھا کہ اگر بہت ضروری ہو تو فون کرنا اور صبح کو کرنا۔ اس کے شوہر کو اس کا فون پر بات کرنا پسند نہیں ہے اور وہ بھی کسی مرد سے۔ اسے تو میرے بھی فون پر اعتراض ہے۔

”تم اس سے کبھی ملی ہو۔“ میں نے سوال کیا۔

ہاں ملی ہوں پچھلے سال ”اپنا“ کے جلسے میں۔ اس کا شوہر مذہبی آدمی ہے۔ چھوٹی سی ڈاڑھی کے ساتھ۔ میں نے اسے نماز کے وقت نماز کے لیے دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا، بات بھی ہوئی ناہید کے سامنے مگر مجھے لگا جیسے اس کے اندر کوئی

اور بھی چھپا ہوا ہے۔ کچھ عجیب قسم کی بے سکونی سی ہوئی اس سے بات کرنے میں۔ مجھے مصنوعی سا لگا تھا وہ۔'' شازیہ نے جواب دیا۔

''ناہید سے بات ہوئی تھی۔ وہ کیسی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کافی وقت گزرا اس کے ساتھ۔ وہ بالکل بدل گئی ہے، اسکارف پہنتی ہے اس میں جو غضب کا اعتماد تھا۔ وہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ وہ کالج میں پروفیسروں سے بھڑ جاتی تھی اچھے خاصے لمبے چوڑے لڑکے اس سے گھبراتے تھے اور اب تو مجھے لگا جیسے اسے اپنے اوپر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ ایسا کیسے ہوگیا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے لڑکیاں دیکھی ہیں جو شادی کے بعد شوہر کے دباؤ میں سب کچھ کرتی ہیں مگر وہ لڑکیاں ناہید نہیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے تو صرف شوہر کے ہی خواب دیکھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں نہیں سوچا ہوتا۔ وہ بیوی، دوست، ساتھی نہیں ہوتیں، خادمائیں ہوتی ہیں، شوہر کو مجازی خدا سمجھنے والی۔ ناہید تو ایسی نہیں تھی۔ اس نے تفصیل سے بتایا۔

مجھے یاد تھا کالج میں اس سے گرما گرم بحث ہوتی۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں، سماج میں ان کی حیثیت سے متعلق، عورتوں کو باندی سمجھنے والوں کے خلاف اس کے خیالات سے میں آگاہ تھا۔ کاروکاری اور عورتوں کی مالکانہ حیثیت سے وہ نفرت کرتی تھی وہی ناہید ڈاکٹر بننے کے بعد امریکا جیسے ملک میں باندی بن گئی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے دکھ ہوا اور میں سوچتا رہا کاش میرے گھر والے راضی ہو جاتے، کاش میں اسے بغاوت پر آمادہ کرلیتا۔ کاش!

میں بڑے بوجھل دل کے ساتھ شکاگو سے واپس آیا۔ میں پہلے کون سا اسے بھولا تھا جو اب بھول جاتا۔ اس کی ایک الگ تصویر سی میرے ذہن میں بن گئی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہنے لگی۔ فون کرنے کے بارے میں، میں کشمکش کا شکار تھا کہ ایک دن شازیہ کا فون آگیا۔

بہت اداس تھی وہ اس نے بتایا کہ صبح اس کی فون پر ناہید سے بات ہوئی تھی۔ ناہید پہلی دفعہ ٹوٹ گئی تھی فون پر۔ اس نے بتایا کہ زندگی آسان نہیں رہی ہے۔ اس کا شوہر ایک عزت دار ڈاکٹر، مانا ہوا کارڈیولوجسٹ اور ایک معزز شہری ضرور ہے مگر ایک ظالم آدمی ہے جو بیوی کو کسی قابل نہیں سمجھتا، اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے، بے عزتی کرتا ہے، اس کی حیثیت ایک جنسی خادمہ کی ہے جو اس کے بچوں کی ماں ہے۔ اسے اگر ڈرائیونگ سکھائی ہے تو اس لیے کہ وہ بچوں کو اسکول اور اسلامک سینٹر سے لا جاسکے، باقی کچھ حیثیت نہیں ہے اس کی۔ پہلی دفعہ اس نے تفصیل سے بتایا کہ نادر اس کی تعلیم کے خلاف تھا اور اس کا یہ خیال ہے کہ یہاں کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کے دماغ خراب ہوجاتے ہیں۔ پاکستان کی بات اور تھی اور یہاں کی اور ہے، یہاں اس کی آمدنی اتنی ہے کہ وہ سب کو پال سکتا ہے، ناہید کو نہ پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کام کرنے کی یہی حکم تھا اس کا یہ حکم منوایا گیا۔

مگر شازیہ امریکا میں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ ڈاؤن سنڈروم تھوڑی ہے۔ اس کا دماغ ہے۔ وہ ذہین ہے کیوں ہونے دیا اس نے ایسا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نہیں پوچھ سکتی یہ بات۔ یہ تو نہ جانے کیسے بتادیا اس نے کچھ ہوا ہوگا۔ ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا اس سے پہلے کہ وہ خودکشی کرلے۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ شخص مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میں مطمئن نہیں تھی اس سے، تم فون نہ کرنا ابھی۔'' اس نے کہا۔

''مجھے فی الحال اس سے بات کرنے دو۔''

میرا دل چاہا کہ میں اس کے پاس چلا جاؤں، ملوں اس سے، سنوں اس کی، کہوں اپنی، کہ وہ اپنی زندگی کو جہنم نہ بنائے، بغاوت کرے حالات سے، ناہید بن کر بتائے بیگم نادر نہیں، زندگی ایسی نہیں گزرتی اور نہ گزارنی چاہیے مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھی نہ جانے اس کے کیا حالات تھے، اس لیے تو مل بھی نہیں سکوں گا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا مگر حالات بہت مختلف تھے۔ مجھے شازیہ کے فون کا انتظار کرنا تھا۔

دو دن بعد شازیہ نے بتایا کہ اس دن ناہید کے کھل جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس دن ہی اسے پتا لگا تھا کہ نادر نے پہلے بھی ایک شادی کسی گوری سے کی ہوئی تھی جس سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں اس کی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ ایک خط لگ گیا تھا جو شاید نادر کے کاغذات میں سے گر گیا تھا جس میں اس کی سابقہ بیوی کے وکیل کا خط تھا کہ وہ بچوں کے پیسے پابندی سے نہیں بھیج رہا ہے۔ نادر کو جب پتا چلا کہ اسے پتا چل گیا ہے تو بجائے شرمسار ہونے کے اور اپنے جھوٹ پر نادم ہوکر معافی مانگنے کے بلکہ اس نے ناہید کو ہی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ بچوں کے سامنے تھپڑوں اور گھونسوں سے پیٹا ہے اس نے۔ دنیا میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شازیہ نے مجھ سے سوال کیا۔

میرے پاس کیا جواب تھا کچھ بھی نہیں، مگر مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا جو میری کلاس کی سب سے زیادہ ذہین لڑکی تھی جو خوب صورتی میں یکتا تھی، جو بے باک تھی، نڈر تھی مگر ایک ایسے ملک میں جہاں سب کو حقوق حاصل تھے وہ اپنا حق گنوا بیٹھی تھی۔

میں نے شازیہ سے کہا کہ اس سے کہو کہ وہ 911 کو فون کرکے پولیس کو بلائے، نادر کتنا بھی بڑا آدمی ہے اس ملک میں قانون سے نہیں بچ سکتا۔ اسے فیصلہ کرنا ہوگا اس جہنم سے نکلنے کے لیے۔ میں اس کے ساتھ ہوں ہم سب اس کے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے۔

کئی دن گزر گئے۔ شازیہ کی ناہید سے کوئی خاص بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ ناہید نے کہا تھا کہ وہ سوچ رہی ہے، اسے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہے اس کے بچے ہیں، پاکستان میں خاندان کے کئی گھریلو معاملات ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہی ہے، ایک کشمکش کا عالم ہے مگر وہ اندر سے سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جل رہی تھی۔ اسے یہ غم کھائے جارہا تھا کہ نادر نے اس سے، اس کے خاندان سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے اسے پڑھنے نہیں دیا۔ اسلام کا حوالہ دے کر اسے تقریباً پردے میں بٹھادیا۔ اسے گھر کے معاملات میں الجھادیا۔ وہ علاقے کی مسجد کمیٹی کا بھی بہت کچھ تھا اور گھر میں ایک جھوٹا ظالم مرد، یہ سب باتیں شازیہ نے مجھے بتائی تھیں۔

''مگر شازیہ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے، امریکا میں تو بہت سے لوگ ہیں جن کی دو دنیائیں ہیں۔ ایک دنیا شادی سے پہلے کی اور ایک دنیا شادی کے بعد کی۔ شادی سے پہلے وہ سب کچھ کرتے ہیں، ان کی گرل فرینڈ بھی ہوتی ہیں، وہ شادی کے بغیر بھی ساتھ رہتے ہیں، امریکی سفید، اسپینش اور ہندوستانی لڑکیوں سے شادی بھی کرلیتے ہیں۔ ان کے بچے بھی ہوتے ہیں پھر طلاق بھی ہوتی ہے، پھر وہ پاکستان جاکر سچ جھوٹ بول کر نئی شادیاں کرلیتے ہیں، انہیں یکا یک اسلام اچھا لگنے لگتا ہے، بیویوں کو قید کردیتے ہیں ان کی مرضی کے خلاف ان سے پردہ کراتے ہیں، انہیں وہ قرآنی آیات ازبر ہوتی ہیں جس میں مرد کے حقوق اور شوہر کی برتری کے تذکرے ہوتے ہیں۔ وہ وقت بھول جاتے ہیں جب وہ شتر بے مہار کی طرح آزاد دنیا میں اتنی آزادی سے رہتے تھے کہ وہ آزادی امریکیوں کو بھی میسر نہیں ہوتی ہے۔''

''مگر اس قسم کے کام صرف اسلامی لوگ تو نہیں کرتے ہیں۔'' شازیہ نے مجھے روک دیا تھا۔ ''اور سارے پاکستانی بھی ایسے نہیں ہیں تمہاری باتوں سے مجھے تھوڑا اختلاف ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''میں نے کب کہا کہ یہ کام سارے اسلامی لوگ کرتے ہیں، دوسری مثالیں بھی ہیں۔ بہت سارے ایسے لوگ ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا انہوں نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ زیادہ تر ایسے لوگ آخر میں مذہبی ہی ہوجاتے ہیں، خیر چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ کہ ناہید کو اس جہنم سے کیسے نکالا جائے۔''

ایک ہفتے بعد شازیہ نے بتایا کہ اگلے مہینے نادر دو دن کے لیے کسی میٹنگ میں دوسرے شہر جارہا ہے۔ اس نے بکنگ کرائی ہے اور وہ کنساس جاکر ناہید سے ملے گی۔

میں نے کہا کہ میں بھی چلتا ہوں مگر اس نے مجھے منع کردیا کہ ایک دفعہ وہ مل لے تو صحیح حالات کا اندازہ ہوسکے گا، اس کی اپنی خواہش کیا ہے اور وہ خود کیا چاہتی ہے تب ہی ہم لوگ اس کی صحیح معنوں میں مدد کرسکیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ خود اس جہنم سے نہیں نکلنا چاہتی ہے تو ہم لوگ کیا کرسکیں گے۔

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس سے کہا ''اس سے کہہ دینا کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھے۔ مجھے اپنے ساتھ سمجھے۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ جب وہ کہے گی میں آسکتا ہوں۔ ڈالرز کی ضرورت ہے تو وہ بھی ہیں اور بڑے سے بڑا وکیل کرنا ہوگا تو وہ بھی کریں گے۔ اس سے کہنا کہ یہ صرف زبانی باتیں نہیں ہیں میں یہ سب کچھ کروں گا جب بھی ضرورت پڑے گی۔''

شازیہ کے واپس آنے کے دوسرے دن ہی حالات میں زبردست اور یکایک تبدیلی آگئی، میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس طرح سے صورت حال بدل جائے گی۔

شازیہ اس کے گھر کے قریب واقع میریٹ ہوٹل میں ٹھہری تھی، ناہید اس سے وہیں آکر ملی۔ چار پانچ گھنٹے میں ناہید نے اپنی زندگی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی مگر وہ اس زندگی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کرلیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے کی کوشش بہت تباہی لائے گی، میں نے حالات سے سمجھوتا نہیں کیا ہے بلکہ اسی حالات میں زندگی گزارنے کی عادت ڈالی ہے۔ ناہید نے شازیہ سے کہا تھا۔

''مگر ناہید یہ مار پیٹ، گالی گفتار تمہارے بچے کیسے بڑے ہوں گے، کیا کریں گے بڑے ہوکر۔'' شازیہ نے اس سے پوچھا تھا۔ ''یہ کوئی صحت مند حالات تو نہیں ہیں ایسے کیسے رہو گی تم۔''

''رہ لوں گی، سب رہتے ہیں پاکستان میں بھی تو رہتے ہیں نہ مجھے ہی صبر کرنا ہوگا، ہر بات ماننی ہوگی۔ کوئی سوال نہیں کرنا ہوگا پھر اب تو مار کی عادی ہوگئی ہوں۔'' ناہید نے کہا تھا۔ ''لاکھوں لوگوں کے خواب پورے نہیں ہوتے، ایک میں بھی سہی۔''

شازیہ نے یہی بتایا تھا مجھے فون پر اس کے جانے کے بعد، شام کے جہاز سے شازیہ واپس آگئی تھی۔ پیچھے جو ہوا اس کا

پتا ہم لوگوں کو دو دن کے بعد لگا جب میں اور شازیہ ہنگامی طور پر کنساس پہنچے۔ ہوا یہ تھا کہ اس دن ناہید اپنے تینوں بچوں کو اسلامک سینٹر کے مسجد کے امام کے گھر ان کی بیوی کے پاس چھوڑ کر آئی جس کے شوہر کو نادر اس کی جاسوسی کے لیے کہہ کر گیا تھا۔ امام صاحب نے اپنے بیٹے کے ساتھ ناہید کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ وہ تن تنہا میریٹ ہوٹل گئی جہاں سے چھ گھنٹے بعد واپس آئی تھی۔ ہوٹل میں چار گھنٹے گزرنے کے ساتھ ہی انہوں نے نادر کو فون پر یہ خبر دی کہ بچے ان کے گھر پر ہیں اور ناہید کئی گھنٹوں سے ہوٹل کے اندر ہے۔

نادر کے لیے یہ بڑی ہولناک خبر تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوری طور پر جہاز پکڑ کر واپس آیا اور رات دس بجے غیر متوقع طور پر گھر پہنچ گیا تھا۔ ناہید کے حیرت کے اظہار پر اس نے اس وقت ناہید کی پٹائی شروع کر دی، طرح طرح کے الزامات لگائے، خرافات بکی، گالیاں دیں۔ ’’عیاشی کرتی ہے حرامزادی۔ یہ صلہ دیا ہے میرے احسانوں کا‘‘ کہہ کر نہ جانے کیا مارا تھا کہ ناہید کا چہرہ خونم خون ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ناہید کے 9 سالہ بیٹے نے باورچی خانے سے 911 پر فون کر دیا اور پولیس پہنچ گئی۔ ناہید کو سر اور منہ پر ٹانکے لگانے کے لیے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ نادر کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔

مگر اچھا یہ ہوا کہ واپس آنے کے بعد ناہید نے جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے شازیہ کو فون کر کے بتایا تھا۔ میں اور شازیہ دوسرے دن ہی پہنچ گئے تھے۔

میرے سوال کا جواب مجھے اس دن نہیں دیا تھا اس نے کیونکہ اس دن وہ جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے شہر کے مشہور یہودی وکیل سے بات کی جس نے عدالت سے ابتدائی فیصلہ کرایا تھا کہ اس کا شوہر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ پولیس کی زیر نگرانی وہ اپنا کچھ سامان لے گیا تھا۔ عدالت کے حکم کے ہی مطابق اسے ناہید کو گھر اور بچوں کے لیے پیسے دینے تھے اور اسے ہفتے میں دو دن سوشل ورکر کے سامنے آ کر بچوں سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ میں نے 20 ہزار ڈالرز ناہید کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے تاکہ وہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ناہید کے دونوں بھائی جو دوسرے شہروں میں تھے وہ بھی آئے مگر انہوں نے ناہید پر زور دیا تھا کہ وہ نادر سے صلح کر لے، کراچی میں اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال تھا مگر میڈیکل کالج والی ناہید واپس زندہ ہو گئی تھی اس نے وہی کیا جس کا فیصلہ وہ کر چکی تھی۔

چھ مہینے کے اندر طلاق کی تمام شرائط طے ہو گئیں اور ناہید بچوں کو لے کر کنساس سے فلوریڈا شازیہ کے گھر کے پاس آ گئی جو میرے شہر سے بھی صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ وہیں ایک مکان میں رہ کر ناہید نے ڈیڑھ سال کے اندر امریکن امتحان پاس کر لیے اور ہم سب کی مدد سے اسے ریذیڈنسی بھی مل گئی جو وہ ہمیشہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا سارا اعتماد، وقار، خوب صورتی واپس آ گئی تھی، وہ وہی ناہید تھی جو کراچی میں ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔

ایک دن میں نے دوبارہ اس سے اپنا سوال کر لیا کہ آخر کیوں پڑھی لکھی ہو کر وہ گھونسے لاتیں، تھپڑ کھاتی رہی۔ آخر ڈاکٹر کیوں بنی تھی وہ اگر اس کو یہی سب کچھ کرنا تھا۔

’’بات یہ ہے کہ شادی کے شروع کے دنوں میں ہی اور پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے حمل سے ہوتی چلی گئی کیونکہ نادر کی یہی خواہش تھی۔ اسے بچوں کا شوق تھا۔ پھر اس نے پہلے سال ہی پتا نہیں کیا کیا، یکے بعد دیگرے میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو امریکا بلوا لیا اور ان کی پڑھائی کی ذمہ داری بھی لے لی۔ انہی دنوں میرے ابو بیمار پڑے تو ایک خطیر رقم ان کے علاج کے لیے اس نے پاکستان بھیج دی۔ یہ سارے احسان تھے ایک کے بعد ایک۔ ایک طریقہ تھا مجھے اس بات پر راضی کرنے کا کہ مجھے پڑھنے کی اور خود مختار ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس جال میں، میں پھنستی چلی گئی۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا زبردستی برقعہ، پردہ، مار پیٹ، پہلی شادی کا دھوکا، جاسوسی، سب کچھ محض اس لیے کہ اس کے احسانات تھے میرے بھائیوں پہ، میرے باپ پہ، میرے خاندان پہ اور شاید میں یہ قیمت دیتی ہی رہتی اگر اس دن میرے بیٹے نے 911 کو فون نہ کیا ہوتا۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شازیہ صحیح کہتی ہے کہ ہمیں اس جہنم سے نکلنا ہوگا۔ تم اب سمجھ گئے ہوگے۔‘‘ میری بات اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے قبل بڑی اداسی سی اس کے چہرے پر آ گئی اور وہ بولی کہ اس کے دونوں بھائی ابھی تک اس کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے خاندان کی عزت امریکا میں بیچ دی ہے۔ شکر ہے میں امریکا میں ہوں پاکستان میں نہیں۔ وہاں تو شاید یہ مجھے زندہ ہی جلا دیتے۔ اس کے چہرے پر اداسی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

’’خدا کرے میرے بھائیوں کی شادی پاکستان میں نہ ہو۔‘‘ اس نے پھر دھیرے سے کہا۔

مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں سوچتا رہا عورت آخر کب تک لڑے گی دوسروں کے لیے؟ کب کھڑی ہوگی اپنے لیے، اپنی ذات کے لیے؟

* * *

شمع فروزاں

ضیا تسنیم بلگرامی

ولیوں کی شان ہوتی ہے کہ وہ عہد ساز ہو کر بھی کسی دنیاوی عہدے کے متمنی نہیں ہوتے۔ محبت اور رواداری کا درس دیتے ہیں مگر کسی احسان کے روادار نہیں ہوتے... آپ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا... جب کم سنی میں ہی آپ کو حج کرنے کا شوق ہوا اور ایک لمبا سفر اختیار کیا... اس کے بعد پھر آپ کو کسی ایک جگہ بیٹھنا بہت کم نصیب ہوا۔

کٹھن آزمائشوں میں پورا اترنے والے ایک اور معتبر ولی کا قصہ

بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں آپ نے خاموشی اختیار کر لی تھی، حصول علم کا بے حد شوق تھا۔ اسی دوران آپ نے حاجیوں کا ایک قافلہ دیکھا جو مکہ معظمہ کی جانب چلا جا رہا تھا۔ آپ نے دوڑ کر قافلے والوں سے ملاقات کی اور کہا۔ ’’کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک دن رک جائیں اور آپ کے قافلے میں، میں بھی شامل ہو جاؤں؟‘‘

قافلے کے امیر نے لڑکے کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ ’’میاں صاحبزادے! آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ آپ کے والد کیا

کرتے ہیں؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”والد بقیدِ حیات نہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا نام ابوبکرؒ ہے اور کتان فروشی ان کا پیشہ تھا۔“

امیر قافلہ نے مشورہ دیا۔ ”تب پھر تم ابھی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔ وہ تمہیں اپنے پاس نہ پا کر بہت پریشان ہوں گی۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں اپنی ماں کی اجازت کے بغیر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اسی لیے تو آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک دن کے لیے ٹھہر جائیں تاکہ میں اپنی ماں سے اجازت حاصل کر لوں۔“

امیر قافلہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تمہاری ماں تمہیں سفر کی اجازت دے دیں گی؟“

”کیوں نہیں دیں گی، ضرور دیں گی کیونکہ میں جس متبرک سفر کی ان سے اجازت مانگوں گا، وہ ایسا نہیں ہے جس کی اجازت نہ دی جائے۔“

امیر قافلہ کو آپ کے شوق سے بڑی دلچسپی ہوئی اور رحم بھی آیا۔ اس نے قافلے کو روک دیا اور قافلہ پڑاؤ ڈال کر رک گیا۔

آپ سیدھے اپنی ماں کے پاس پہنچے اور درخواست کی۔ ”ماں! ایک قافلہ حج کو جا رہا ہے، میں نے ایک دن کے لیے اسے روک لیا ہے۔“

ماں نے پوچھا۔ ”تو نے اسے کیوں روک لیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ماں! میں بھی حج کرنا چاہتا ہوں۔“

ماں نے کہا۔ ”لیکن تیری ابھی عمر ہی کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”آپ میری عمر کے بجائے میرا شوق دیکھیے۔“

ماں نے بیٹے کو بڑی محبت اور شفقت سے دیکھا، بولیں۔ ”اتنی سی عمر میں تو باتیں کیسی کرنے لگا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ماں! میں باتیں کرتا نہیں ہوں بلکہ مجھ سے کوئی باتیں کرواتا ہے۔“

انہوں نے محسوس کیا، ماں اداس ہو گئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے ہیں، آپ نے اپنے دامن سے ماں کے آنسو خشک کرنے چاہے، بولے۔ ”ماں! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے ہیں؟ خوشی کے یا غم کے؟“

ماں نے مسکرانے کی کوشش کی **بولیں ”یہ خوشی کے** آنسو ہیں میرے بیٹے! میرا ننھا اس کم عمری میں حج کرنے جا رہا ہے بس اسی خوشی میں آنسو نکل آئے۔“

ماں نے بیٹے کو حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ کسی انتظام اور اہتمام کے بغیر حج کے قافلے میں پہنچے اور امیر قافلہ سے کہا۔ ”آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری خاطر یہاں پڑاؤ ڈالا اور میرا انتظار فرمایا۔“

امیر قافلہ نے شفقت سے کہا۔ ”نہیں بیٹے! شکریے کی کوئی بات نہیں، میں تمہارے شوق سے خوش ہوں۔“

قافلۂ حج روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر کئی دن بعد آپ کو اچانک یہ احساس ہوا کہ ماں نے سفر کی اجازت بہ خوشی نہیں دی ہے، بیٹے کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے کے لیے دے دی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سفر سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور راستے ہی سے واپس آ گئے۔ جب یہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑا کیونکہ ماں دروازے پر اس طرح کھڑی تھیں، گویا انہیں پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ بیٹے نے ماں کو سلام کیا اور ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور سر اور پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہیں۔

بیٹے نے ماں سے پوچھا۔ ”ماں! سچ بتائیے کیا آپ نے مجھے سفر کی اجازت نہیں دی تھی؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں سفر کی اجازت دے تو دی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تم چلے گئے تو تمہارے بغیر میرا گھر میں جی نہیں لگتا تھا اور میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے میں اپنا زیادہ وقت تمہارے انتظار میں دروازے پر ہی گزار دوں گی۔“

آپ نے فرطِ جوش میں ماں کو چمٹا لیا اور کہا۔ ”ماں! میں بھی آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک آپ موجود ہیں میں سفر نہیں کروں گا۔“

آپ نے کمسنی کے باوجود عبادت و ریاضت میں غیر معمولی محنت کی اور اپنا بیشتر وقت خدا کی یاد میں گزارنے لگے۔

آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا صدمہ تھا کہ ابوبکرؒ اس کا اثر ایک عرصے تک محسوس کرتے رہے۔ ان کا اپنے گھر سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ آپ نے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ آپ بزرگانِ دین کے مزاروں پر حاضریاں دیتے رہے۔ آپ قبرستانوں سے گزرتے تو قبر میں سونے والوں کی بے بسی اور بے چارگی سے عبرت حاصل کرتے۔

آپ کسی شکستہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ قبر کا کچھ حصہ کھلا ہوا ہے اور اس کھلے حصے سے ایک برہنہ لاش صاف دکھائی دے رہی ہے۔ آپ نے اکثر لاشیں دیکھی تھیں اور مُردوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان سب کے چہروں میں ایک مشترک کیفیت محسوس ہوتی تھی، اور یہ کیفیت تھی ان کی بے بسی، اداسیت اور نزع کے وقت کا کرب، جو مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کے چہروں پر باقی رہتا ہے لیکن اس شکستہ قبر کا مردہ گویا مسکرا رہا تھا۔ آپ فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد اس مُردے کو کچھ دیر بغور دیکھتے رہے، پھر اپنے آپ سے سوال کیا۔ ”حیرت ہے یہ کیا بات ہے کہ اس مردے کے چہرے پر کرب و اذیت کے بجائے مسکراہٹ پائی جاتی ہے؟“

آپ نے یہ سوال خود سے کیا تھا لیکن آپ کو جواب کسی اور نے دیا، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”سنو! تمہیں میرے چہرے کی مسکراہٹ پر حیرت کیوں ہے؟“

آپ نے ادھر ادھر دیکھا کہ یہ جواب کس نے دیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بہ آوازِ بلند سوال کیا۔ ”تم کون ہو جو میری بات کا جواب دے رہے ہو؟“

آپ کو جواب ملا۔ ”ذرا ادھر دیکھو میری طرف، میں جو شکستہ قبر میں پڑا ہوں، تمہاری بات کا میں ہی جواب دے رہا ہوں۔“

آپ نے ایک بار پھر حیرت سے شکستہ قبر کے مُردے کی طرف دیکھا۔ آپ کو جھرجھری سی آ گئی، بولے۔ ”اگر تم خود ہی میری بات کا جواب دے رہے ہو تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر موت کا کرب و اذیت کیوں نہیں؟ یہ خلافِ واقعہ مسکراہٹ کیوں پائی جاتی ہے؟“

مُردے نے جواب دیا۔ ”ارے! تعجب ہے کہ تم اللہ کی محبت کا دم تو بھرتے ہو لیکن اس رمز سے واقف نہیں ہو کہ جو لوگ ”عشقِ خداوندی“ میں مبتلا ہوتے ہیں وہ دنیا کی کسی بھی اذیت اور کرب سے لاعلم اور بے نیاز ہوتے ہیں۔ ”عشقِ خداوندی“ کی لذت انہیں حال میں بشاش اور خوش رکھتی ہے۔“

آپ چیخ مار کر رو دیے، آہ و زاری کرتے ہوئے بولے۔ ”اے اللہ العالمین! یعنی میں ابھی تک اس راز سے ناواقف تھا کہ عشقِ خداوندی انسان کے تمام دکھوں کو بے اثر بنا دیتا ہے۔ آہ، کتنا عبرت کا مقام ہے کہ میں راہِ عشق میں ہنوز مبتدی اور ناتجربہ کار ہی ہوں۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”یہ! تم کس کی شکایت کس سے کر رہے ہو؟ گلہ اور شکوہ سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں۔ جو عاشقِ صادق ہیں وہ راضی برضائے محبوب ہوتے ہیں اور گلہ و فریاد سے انہیں ذرا بھی سروکار نہیں ہوتا۔“

آپ نے فوراً سکوت اختیار کیا اور دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ خاموش ہی رہیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس میں توفیقِ ایزدی اس کے شاملِ حال ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ خدا سے یہ توفیق مانگ لی جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ”خدایا! میں تیرا عاجز و درماندہ بندہ تجھ سے اس توفیق کے سوا کچھ بھی نہیں مانگتا جس کا تعلق تجھ سے ہے، تیری ذات سے، تیری مہربانیوں اور نوازشوں سے ہے۔ میں تجھ سے تیری توفیق چاہتا ہوں۔“

آپ کو سوتے میں رویائے صادقہ ہوا اور کسی نے آپ کو مطلع کیا۔ ”سن! تیری دعا قبول ہوئی، تو بے فکر رہ۔“

آپ کی جیسے ہی آنکھ کھلی آپ نے فوراً ایک اور دعا مانگی، بولے۔ ”میرے مولا! میری ایک اور دعا قبول فرما لے۔“

آپ کو رگ گلو سے جواب ملا۔ ”بول، وہ کون سی دعا ہے؟“

آپ نے شوخی اختیار کی، بولے۔ ”میرے مولا! میں جانتا ہوں کہ تو رگ گلو سے زیادہ قریب ہے، جب تو مجھ سے خود ہی مخاطب ہے تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو عالم الغیب ہے اور دلوں کے حال سے واقف ہے۔ میں اپنی دعا کو کیا بیان کروں تو خود ہی سمجھ لے اور اگر مناسب سمجھ تو مجھے بھی یہ بتا دے کہ میں تجھ سے کون سی دعا مانگنے والا ہوں۔“

جواب ملا۔ ”ابھی ...! کیا تو مجھ سے یہ دعا نہیں مانگ رہا تھا کہ میں تیرا نقص دور کر دوں؟“

آپ کا دل بھر آیا، عاجزی سے جواب دیا۔ ”بیشک خداوندا بیشک، میں انسان ہوں اور انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے۔ میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ تو میرے عیوب اور نقائص کو دور فرما دے۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”میں نے تیری دعا قبول کی اور کچھ؟“

آپ نے فرطِ جوش میں کہا۔ ”بس خداوندا بس۔ تیرا کس طرح شکرادا کروں؟ میں نے جو مانگا مجھے اس زیادہ ہی ملا۔“

اس دعا کے بعد آپ پر بے خودی طاری رہنے لگی، بہت کم ہوش آتا اور جب ہوش آتا تو زبان سے اللہ اللہ کے سوا کچھ بھی نہ ا ہوتا۔ کافی عرصہ بعد کچھ ہوش آیا تو خیال آیا کہ ایسی بے خودی اور بے نیازی کس کام کی کہ میں نے اپنے رب سے کچھ مانگنا ہی چھوڑ دیا۔

آپ نے کہا۔ ”خدایا یہ مجھ کو کیا ہوگیا ہے کہ میں تجھ سے کچھ مانگ ہی نہیں رہا۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”ابوبکرؒ! تمہیں یاد ہے نا کہ تم نے مجھ سے دعا مانگی تھی کہ میں تیرا نقص دور کردوں اور تجھے یہ بات بھی معلوم ہے کہ میں نے تیری دعا قبول بھی کرلی تھی۔ چنانچہ بار بار دست طلب بڑھانا، یہ بھی ایک نقص ہے اور میں نے تیرے نقص تجھ سے دور کردیے ہیں۔ اس لیے تو مجھ سے اب کوئی دعا بھی نہیں مانگ رہا۔“

ابوبکرؒ بے اختیار سجدے میں گر گئے، بولے۔ ”خدایا! تو کتنا بندہ نواز ہے۔ شدت جذبات سے میرا کلیجا پھٹ جائے گا، میرا سینہ شق ہوجائے گا۔ تیری بندہ نوازیاں اور کرم فرمائیاں ایسی نہیں کہ انسان بہ آسانی چشم پوشی کرسکے۔“

آپ کو جواب ملا۔ ”ابوبکرؒ! ہم تیرے ہیں جب یہ بات طے پا گئی کہ ہم تیرے ہیں تو پھر تجھے طلب کی ضرورت ہی کیا رہ گئی؟“

آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ ابوالحسن مزین نے اللہ کے توکل پر اپنا سفر شروع کیا تو انہیں ایسے ایسے واقعات پیش آئے اور کچھ ایسی واردات قلبی گزریں کہ انہیں خود پر زعم سا ہوگیا اور انہیں یہ فخر محسوس ہوا کہ میں اس دور کا عظیم بزرگ ہوں کیونکہ میں نے اللہ کے بھروسے پر کسی زادِ سفر کے بغیر ہی سفر شروع کردیا ہے اور کسی کے سامنے دست طلب نہیں دراز کررہا ہوں۔ ابوالحسن مزین کے دل میں یہ خیال گزر رہا تھا کہ کسی نے انہیں ڈانٹ دیا اور کرخت لہجے میں کہا۔ ”ابوالحسن! تو اپنے نفس کے ساتھ دروغ گوئی کیوں کررہا ہے؟“

ابوالحسن مزین نے آواز کی طرف مڑ کر دیکھا تو اپنے پاس ابوبکرؒ کو کھڑے ہوئے دیکھا، شرمندگی سے کہا۔ ”حضرت! میں اپنے نفس کے تکبر پر شرمندہ ہوں۔ واقعی یہ دروغ گوئی ہے، مگر یہ دروغ گوئی میں نہیں، میرا نفس کررہا ہے۔“

آپ نے ابوالحسن کو نصیحت کی۔ ”ابوالحسن! یہ غلط فہمی ہے کہ تم خود کو اپنے نفس سے علیحدہ کررہے ہو۔ تم اور نفس لگ الگ نہیں ہو، دونوں ایک ہی ہو، یہ غلط فہمی بھی تمہیں گمراہ کرسکتی ہے۔ اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم خود کو اپنے نفس اور اعضا سے الگ مت تصور کرو۔“

آپ کی شہرت نے آپ کے اردگرد مریدوں اور ارادتمندوں کا مجمع لگادیا۔ یہ لوگ ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے، اس سے آپ کو بڑی زحمت پیش آتی اور پریشان ہوجاتے لیکن اس خیال سے لوگوں کو منع نہیں کرتے کہ کہیں کسی کی دل آزاری نہ ہوجائے۔ ن لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جس کی موجودگی آپ کو سب سے زیادہ گراں گزرتی لیکن اسے منع نہ کرپاتے۔ یہ شخص عبادت بڑے خشوع وخضوع سے کرتا اور اپنے زہد وتقویٰ سے دوسروں سے ممتاز نظر آتا تھا۔

آپ کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ شخص نام ونمود کا بندہ ہے اور اس طرح اپنی نمائش کرتا رہتا ہے۔ کچھ ارادت مند بھی اس کی عبادت کو نمود ونمائش تصور کرتے تھے۔ کسی مرید نے کہا۔ ”حضرت! یہ شخص عجیب وغریب ہے، کم بولتا ہے، کسی شخص کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ میرا خیال ہے اس شخص کو اپنے زہد وتقویٰ پر بڑا ناز ہے۔ آپ اس شخص کو کیوں گوارا کررہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! یہ سوءظنی ہے، کسی کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ آدمی کے ظاہر وباطن میں بہت کم مطابقت ہوتی ہے اور اس عدم مطابقت سے خدا خوب واقف ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کا حساب کتاب کیوں کریں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسرے مجھ سے زیادہ اچھے ہیں۔“

معترض چپ ہوگیا۔ لیکن ذرا سی دیر کے لیے آپ کو بھی یہ خیال آیا کہ یہ شخص نمائشی ضرور ہے اور ہم سب پر اپنی عبادت کا رعب ڈالتا رہتا ہے۔ آپ ان وسوسوں میں مبتلا تھے کہ اندر سے آواز آئی۔ ”اے ابوبکرؒ! تو یہ کیا سوچ رہا ہے؟ اگر دیکھنا ہی ہے تو اپنے عیوب دیکھ، دوسروں کے عیوب دیکھنے کی کیوں کوشش کررہا ہے؟“

آپ کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ ایک تازیانہ تھا جس نے آپ کو مضطرب وبے چین کردیا۔ آپ نے اس سوءظنی کی تلافی یوں کی کہ اپنی جائز کمائی کے دوسو درہم لے کر اس شخص کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت وہ مصروف عبادت تھا۔ آپ کچھ دیر اس کے پاس کھڑے رہے لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا کوئی بھروسا نہیں ہے کہ کب تک یونہی عبادت میں مصروف رہے، آپ نے وہ دوسو درہم اس کے مصلے کے نیچے رکھ دیے اور بہ آواز بلند کہا۔ ”اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں یہ دوسو درہم کی حقیر سی رقم ہی تیری خدمت میں پیش کرسکا ورنہ میں اس سے زیادہ تجھے دینا چاہتا تھا جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہوجائے تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے خرچ میں لے آنا۔ میں کوشش کروں گا کہ تیری اور زیادہ خدمت کرسکوں۔“

آپ یہ کہہ کر چلے آئے اور اپنی طبیعت میں ہلکا پن محسوس کیا۔

اس دن آپ کی خدمت میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوئے تھے اور آپ سے طرح طرح کے سوالات کرکے روحانی تسکین حاصل کررہے تھے۔ ان میں ایک خراسانی بھی شامل تھا۔ یہ آپ سے عجیب تھکا دینے والے سوالات کررہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے لیے سب سے زیادہ سودمند کیا شے ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”زہد وسخاوت اور نصیحت۔“

سوال کرنے والے نے اس کی وضاحت چاہی، پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”زہد اس لیے کہ اس کے انہماک میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور دنیا کی برائیوں کا موقع نہیں ملتا۔ سخاوت اس لیے مفید ہے کہ انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں ہوسکتی اور دوسروں کا اس سے کام نکلتا ہے، انسان، انسان کے کام آتا رہتا ہے اور جب کسی انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ ہی نہیں ہوگی تو انسان اس کے حرص وطمع میں بھی مبتلا نہ ہوگا جو بہت ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسروں کو نصیحتیں کرتے رہنا بھی بہت مفید ہے۔ جب یہ دوسروں کو کسی اچھی بات کی نصیحت کرے گا تو اس پر خود بھی عامل اور کاربند رہنے کی کوشش کرے گا۔ گویا کوئی انسان جب کسی کو نصیحت کرتا ہے تو اپنے آپ کو اس نصیحت پر کاربند ہونے کا پابند سمجھتا ہے اور اس طرح یہ شخص شب وروز کے بیشتر اوقات میں خود اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔“

اس شخص نے ایک اور سوال کردیا، پوچھا۔ ”زہد کیا شے ہے اور آپ زہد کسے کہتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”زہد کے بجائے میں زاہد کی بابت بتاؤں گا، اے شخص! زاہد وہ ہے جو نہ ملنے پر بھی خوش رہے۔ زندگی بھر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔ جب مصائب پڑیں تو صبر سے کام لے اور راضی بہ رضائے الٰہی رہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”تو گویا آپ اس طرح تصوف کی تعریف فرمارہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، صوفی انہی باتوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصوف سرتاپا اخلاق ہے اور جس شخص میں اخلاق کی حقیقی زیادتی ہوگی اس میں تصوف بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔“

آپ ابھی ان سوالات کے جوابات سے بھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ وہ شخص آگیا، جس کے مصلے کے نیچے آپ دوسو درہم رکھ کر آئے تھے۔ اس نے آتے ہی دوسو درہم آپ کے آگے پھینک دیے اور ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ میری عبادت کی لذت ہی چھین لی۔ میں کتنے خشوع وخضوع سے اللہ کے دربار میں کھڑا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ ”اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں دوسو درہم کی حقیر سی رقم ہی تیری خدمت میں پیش کرسکا ورنہ میں تجھے اس سے زیادہ دینا چاہتا تھا۔ جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہوجائے تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے صرفے میں لے آنا۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ تیری اور زیادہ خدمت کرسکوں۔ ابوبکرؒ! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری یہ آواز میرے حق میں کیا ثابت ہوئی؟ یہ ایک شعلہ تھا جس میں میری عبادت کی لذت جل گئی، پانی تھا جس میں میرے شوق کی آگ بجھ گئی۔ آہ، یہ تم نے کیا غضب کردیا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ پرسوز اور لذیذ لمحات میں نے کتنے میں خریدے تھے؟“

آپ نے پشیمان ہوکر دریافت کیا۔ ”تو نے وہ لمحات کتنے میں خریدے تھے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ستر ہزار درہم میں، میرے پاس میرے کاروبار سے جو کچھ آتا تھا، یہ ستر ہزار درہم اس کے علاوہ میرے پاس موجود تھے اور مجھ پر ان درہم کا جتنا نشہ رہتا تھا کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ اس نشے سے نشہ محبت الٰہی دور رہتا تھا۔ میں عبادت کرتا تھا لیکن عبادت کی لذت سے محروم رہتا تھا۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان ستر ہزار درہم کی لعنت سے نجات حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں خدا کی راہ میں اہل احتیاج میں تقسیم کردیا اور اس کے بعد یاد الٰہی میں مشغول ہوگیا اور خوش قسمتی سے وہ لذت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کی بہت دنوں سے آرزو کررہا تھا۔ لیکن جب تم نے دوسو درہم میرے مصلے کے نیچے رکھے اور اس کی مجھے بہ آواز بلند اطلاع دی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ میری آہ وزاری کے پرسکون تالاب میں دوسو درہم پھینک کر تم نے ارتعاش پیدا کردیا ہے۔ آہ، یہ تم نے کیا کیا۔ یہ اپنے دوسو درہم سنبھالو، اگر یہ صورت برقرار رہی تو میں تمہاری صحبت سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گا۔“

آپ نے وہ دوسو درہم تو واپس لے لیے لیکن اس وقت آپ جیسی شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہے تھے، کچھ وہی جانتے تھے ذرا دیر سر جھکائے رہنے کے بعد آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا اور وفور جذبات میں کہا۔ ’’اے شخص! میں نے واقعی غلطی کی ہے، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود کو بہت ہی ذلیل وخوار اور رسوائے زمانہ سمجھ رہا ہوں تو ایک عظیم انسان ہے۔ اے کاش! اس عظمت کا ذرا سا حصہ مجھے بھی مل گیا ہوتا۔‘‘

آپ باب شیبہ سے نکلے تو دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا ہوا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ جیسے ہی اس کے قریب پہنچے، اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ’’السلام علیکم!‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’وعلیکم السلام۔‘‘

اس شخص نے کہا۔ ’’جناب! آپ صورت شکل سے تو بڑے اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔‘‘

آپ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ’’اچھی اور بے عیب ذات خدا کی ہے۔ میں انسان، مجسمہ خطا ونسیان۔ آپ اپنی منشا بیان کریں۔‘‘

اس شخص نے متبسم ہو کر عرض کیا۔ ’’جناب والا! مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقام ابراہیم میں ایک بزرگ احادیث بیان فرما رہے ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔‘‘

آپ نے پوچھا۔ ’’کیا وہ بزرگ کوئی محدث ہیں؟‘‘

جواب ملا۔ ’’ہاں، وہ محدث ہیں۔‘‘

آپ نے پوچھا۔ ’’وہ بزرگ کس سند سے احادیث بیان کرتے ہیں؟‘‘

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ’’حضرت عبدالرحمنؒ، حضرت معمرؒ، حضرت زہریؒ اور حضرت ابوہریرہؓ کی اسناد سے۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’لیکن بھائی میرے! میں کسی اور سے حدیث سن کر کیا کروں گا کیونکہ خود میرا دل تو میرے رب کی سند سے احادیث بیان کرتا ہے۔‘‘

ان بزرگ نے آپ کو سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا۔ ’’یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس کی کوئی سند؟‘‘

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ’’آپ اس کی مجھ سے سند مانگ رہے ہیں واللہ! آپ یہ فرمائیں کہ کیا آپ حضرت خضر علیہ السلام نہیں ہیں؟ میں نے آپ کو کسی تعارف کے بغیر ہی پہچان لیا ہے۔‘‘

وہ بزرگ حیران اور ششدر رہ گئے، بولے۔ ’’ابوبکرؒ! بخدا میں آج تک اسی وہم میں تھا کہ اس دنیا میں ایک بھی ایسا ولی نہیں ہے جو مجھے پہچان سکے اور میں اسے نہ پہچان سکوں۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ یہاں ایسے بھی ولی موجود ہیں جن سے میں خود تو ناواقف ہوں لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’جناب خضرؑ، میں نے خود کو پہچان کر آپ کو پہچانا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے خود کو پہچانا اس نے مجھے پہچانا۔ میرے لیے آپ کی پہچان کوئی ایسا نازک مسئلہ نہیں ہے۔‘‘

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام آپ سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

آپ کاندھے پر چادر ڈالے کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ سنسان تھا۔ جب آپ ایک موڑ پر پہنچے تو ایک طرف سے ایک شخص اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے نمودار ہوا آپ کے کاندھے سے چادر اتار کر فرار ہو گیا۔ آپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا مگر اس کا تعاقب نہیں کیا اور بہ دستور چلتے رہے۔ ظہر کا وقت تھا، آپ مسجد میں داخل ہوئے، نماز ادا کی اور دعا سے فارغ ہو کر جیسے ہی مسجد سے باہر نکلے، آپ نے دیکھا ایک شخص آپ کی چادر لیے کھڑا ہے۔ آپ نے اس شخص پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنی راہ ہو لیے۔ وہ شخص چادر لیے ہوئے آپ کی طرف دوڑا، بولا۔ ’’حضرت! آپ اپنی چادر تو لے لیجیے۔‘‘

آپ نے پوچھا۔ ’’کیا تیری ضرورت نکل گئی؟‘‘

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ ’’میری ضرورت کیا معنی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’میرا مطلب صاف ہے۔ اگر تجھے چادر کی ضرورت نہ ہوتی تو، تو کبھی میرے کاندھے سے اتار کر فرار نہ ہوتا۔ میں نے اسی خیال سے تیرا پیچھا نہیں کیا کہ تو اس چادر کا مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔‘‘

اس شخص نے شرمندگی سے گردن جھکالی، روتے ہوئے کہا۔ ’’آپ خدا کے لیے اپنی چادر واپس لے لیجیے۔‘‘

آپ نے پھر سوال کیا۔ ’’آخر کیوں؟ کیا تم واقعی اس چادر کی ضرورت نہیں محسوس کر رہے ہو؟‘‘

اس شخص نے بہ دستور روتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے اس چادر کی نہ تو پہلے ضرورت تھی اور نہ ہی آج اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کی چادر عادتاً چرائی تھی، حضرت! میں عادی چور ہوں۔‘‘

آپ نے کہا۔ ’’چلو، میں نے مان لیا کہ تم عادی چور ہو اور ضرورتاً نہیں عادتاً چوری کرتے ہو مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میری چادر واپس کیوں کر رہے ہو؟‘‘

چور نے جواب دیا۔ ’’مجھے آپ کی چادر چرانے کی بدترین سزا مل چکی ہے۔‘‘

آپ نے کہا۔ ’’یعنی؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔‘‘

چور نے عاجزی سے جواب دیا۔ ’’حضرت! آپ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں ورنہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ اس سزا سے اچھی طرح واقف ہیں جو چادر چرانے کے سلسلے میں مجھے مل چکی ہے۔‘‘

آپ نے چور کے ایک ہاتھ کی طرف دیکھا جو بالکل خشک اور بیکار ہو چکا تھا۔ آپ نے اس ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’کیا تو نے اسی ہاتھ سے چادر چھینی تھی؟‘‘

چور نے جواب دیا۔ ’’جی جناب!‘‘

آپ نے اس کا خشک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’کیا یہ پہلے بالکل درست تھا؟‘‘

چور نے جواب دیا۔ ’’جی جناب والا۔‘‘

آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ’’اب تو کیا چاہتا ہے؟‘‘

چور نے جواب دیا۔ ’’میں نے آپ کی چادر واپس کر دی ہے اور اب یہ چاہتا ہوں کہ آپ دعا فرمائیے کہ میرا یہ خشک ہاتھ دوبارہ ٹھیک ہو جائے۔‘‘

آپ نے چور سے کہا۔ ’’عظمت الٰہی کی قسم کہ مجھے چادر کے جانے کا ذرا بھی ملال نہ تھا اور نہ اس کے دوبارہ پانے کی خوشی ہے اس لیے تیرے ہاتھ کے خشک ہو جانے کا مجھے ملال تو ہے لیکن خوشی ذرا بھی نہیں۔ اس لیے میں بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دعا ہوں کہ خدا تیرا ہاتھ درست فرما دے۔‘‘

اچانک چور کو یہ محسوس ہوا گویا اس کے ہاتھ میں خون دوڑنے لگا ہے اس نے اپنے ہاتھ کو ادھر ادھر حرکت دی اور جب یہ اچھی طرح یقین ہو گیا کہ بہ ظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں نظر آتی تو اس نے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور آپ کو دعا دیتا ہوا چلا گیا۔

آپ نے چادر دوبارہ اپنے کاندھے پر ڈال لی۔

آپ نے دوران وعظ فرمایا کہ۔ ’’لوگو! میں کئی مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ مجھے ان سے بچاؤ۔‘‘

اس وقت آپ کے آس پاس بہت سارے مرید جمع تھے۔ ایک مرید نے پوچھا۔ ’’خدا خیر کرے، کیا آپ بتائیں گے کہ ان دنوں آپ کس مصیبت یا کن مصیبتوں میں گرفتار ہیں؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’عذاب، مصیبت اور ذلت میں گھرا ہوا ہوں اور ان تینوں سے سردست نجات مشکل نظر آ رہی ہے۔‘‘

اس مرید نے عرض کیا۔ ’’حضرت! یہ رمزیہ باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ آپ وضاحت سے بیان فرمائیے تو شاید آپ کے کام آیا جا سکے۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’اے شخص! میں ان دنوں مخلوق کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور مخلوق کی محبت میں گرفتار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میں ایک عذاب جھیل رہا ہوں۔ تم لوگ دعا کرو کہ کسی طرح اس عذاب سے نجات پا جاؤں۔ اس کے بعد ذرا سکون کی سانس لے سکوں گا۔‘‘

مرید نے پوچھا۔ ’’اور جناب! وہ کون سی مصیبت ہے جس میں آپ آج کل گرفتار ہیں؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’جس طرح مخلوق کی محبت باعث عذاب ہے اسی طرح اس کی صحبت باعث مصیبت ہے اور میں آج کل مخلوق کی محبت کی وجہ سے اس کی صحبت میں بھی رہنے لگا ہوں اور اس کی صحبت باعث مصیبت ہے۔‘‘

مرید نے پوچھا۔ ’’اور حضرت! یہ ذلت کیا چیز ہے؟ اور آپ کس قسم کی ذلت میں گرفتار ہو چکے ہیں اور کس طرح؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’بھائی میرے! جس طرح مخلوق کی محبت باعث عذاب اور اس کی صحبت باعث مصیبت ہے اسی طرح

مخلوق سے ربط ضبط باعث ذلت ہے اور میں آج کل مخلوق سے ربط ضبط پیدا کیے ہوئے ہوں جو میرے حق میں ذلت کا سبب بنی ہو ہے۔"

مرید اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت حسین شخص آپ کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ "ارے بھائی! خدا تم سے راضی ہو، آخر تم ہو کون؟ مجھے تو تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

اس خوبرو شخص نے جواب دیا۔ "ابوبکرؒ! میں تقویٰ ہوں اور مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے پاس آجاؤں۔"

ابھی ان دونوں میں یہ گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ نے اپنے بائیں طرف دیکھا ایک نہایت بدصورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی صورت سے وحشی پن ٹپک رہا تھا۔ آپ نے اس عورت سے پوچھا۔ "ارے مائی! تم کون ہو اور یہاں میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ابوبکرؒ! میرا نام مصیبت ہے اور میں ہمیشہ سے ان کے دلوں میں رہتی ہوں جو اہلِ نشاط کہلاتے ہیں۔"

آپ نے خوبرو شخص سے پوچھا۔ "اور تم کہاں رہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب! میرا مسکن غمزدوں کے قلوب میں ہے۔"

جب آپ بیدار ہوئے تو آپ پر اس خواب کا گہرا اثر تھا اور آپ نے یہ عہد کر لیا کہ جب تک زندہ ہوں ہمیشہ غمگین زندگی بسر کروں گا۔ صبح جب آپ وعظ کے لیے کھڑے ہوئے آپ کا دل بڑا گداز ہو رہا تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا۔ "لوگو! تم مجھے اسیر سمجھتے ہو یا آزاد؟"

آپ کو جواب ملا۔ "آزاد بہ ظاہر اور گرفتارِ باطن۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں۔ اولیاء اللہ ظاہر میں اسیر اور باطن میں آزاد ہوتے ہیں۔" اس کے بعد فرمایا۔ "لوگو! صوفی وہ ہے جو عبادت کو مشقت نہ سمجھے کیونکہ جب عبادت پر مشقت کا احساس ہونے لگے تو گویا عبادت کی لذت اور حلاوت ختم ہو چکی ہے اور جب عبادت میں لذت اور حلاوت ہی باقی نہ رہے تو گویا اس کی طبیعت تصوف پر مائل نہیں رہتی۔"

کسی نے پوچھا۔ "ایسی صورت میں، استغفار کا سہارا تو لیا جا سکتا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "اے شخص! کیا تو استغفار کے معنی جانتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کیا استغفار۔ کے معنی اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں، جن سے ہم سب واقف ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔ "استغفار کے کئی معنی ہیں۔ معصیت کے بعد ندامت کے ساتھ توبہ کرنا، یہ استغفار ہے۔ بعد از توبہ گناہ کا کبھی قصد نہ کرنا، یہ بھی استغفار ہے۔ مرنے سے پہلے حقوق اللہ کی تکمیل کر دینا، یہ بھی استغفار ہے۔ توبہ کے بعد جسم کو ایسی مشقتوں میں لگائے رکھنا جن کا جسم سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو اور ایسا لگے گویا جسم بہت آرام اٹھا چکا ہے، یہ سب استغفار ہے۔ اگر کوئی شخص مذکورہ استغفار کا سہارا لے گا تو وہ ضرور عبادت کی لذت اور حلاوت کو دوبارہ حاصل کر لے گا۔ کیونکہ جب اس طرح توبہ کی جاتی ہے تو فوراً ہی درِ مغفرت کھل جاتا ہے۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "اور جناب! یہ توکل کیا چیز ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اتباعِ علم اور کامل یقین کا دوسرا نام توکل ہے۔"

کسی اور نے سوال کیا۔ "جناب! میں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے بے چین ہو جاتا ہوں، اس پر کس طرح قابو حاصل کروں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب تک نیند اچھی طرح غلبہ نہ حاصل کرے، مت سو۔ جب تک بھوک پوری شدت سے نہ لگے، مت کھاؤ۔ جب تک بات کرنے کی شدید ضرورت نہ محسوس ہو، مت بات کرو۔" آپ نے مزید فرمایا۔ "جب تم ان تینوں پر قابو پا لو گے تو دوسری چیزیں بھی قابو میں آجائیں گی۔"

کسی اور نے سوال کیا۔ "حضرت! دین کی اساس کون سی چیزیں ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تین چیزیں۔"

پوچھا گیا۔ "کون کون سی تین؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اول حق، دوم عدل، سوم صدق۔ حق کا تعلق اعضاء سے ہے یعنی اعضاء کے ذریعے ذکر الٰہی کرتے رہو۔ عدل کا تعلق قلب سے ہے یعنی بذریعہ قلب نیک اور بد میں تمیز کرو اور صدق کا تعلق عقل سے ہے یعنی عقل کے ذریعے خدا کو پہچانو۔" پھر فرمایا۔ "ہر روز نسیم سحری دنیا میں پھر کر خدا کے بندوں کی گریہ وزاری اور طلب مغفرت اپنے دوش پر خدا کے حضور لے جاتی ہے۔"

آپ نے رات کو رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس سے حرص و ہوس کا خاتمہ ہو جائے۔"

جواب ملا۔ "پھر سنو! ہر روز چالیس بار اس دعا کو پڑھ لیا کرو۔ "ویاحی یا قیوم لا الله انت اسئلک ان یحیئ قلبی بنور معرفتک ایدأ۔"

آپ نے بیداری کے بعد اس پر عمل کیا تو اس کے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہوئے۔

ایک دن آپ کے پاس ایک درویش آیا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ کر زاروقطار رونے لگا۔ آپ نے پوچھا۔ "اے شخص! تجھ پر کیا افتاد پڑی جو تو یوں زاروقطار رو رہا ہے؟"

درویش نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بابا! میں تو تباہ و برباد ہو گیا۔ اب میں کیا کروں؟"

آپ نے دریافت کیا۔ "کچھ بتاؤ سہی، بات کیا ہوئی؟"

درویش نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے صبر اور قناعت کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس میں اتنا ثابت قدم رہا تھا کہ بڑے بڑے کٹھن دور سے گزر گیا اور اپنے صبر اور قناعت میں کسی قسم کا ضعف نہیں آنے دیا۔"

آپ نے کہا۔ "تو فضول باتیں زیادہ کرتا ہے اور کام کی کم، ہوا کیا؟ بس یہ بتا؟"

درویش نے دم لیتے ہوئے کہا۔ "حضرت! وہی تو میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے صبر اور قناعت کی روش اختیار کی اور بڑے دشوار مراحل سے بخیر و خوبی گزر گیا۔ پھر میں فاقوں کی مصیبت میں گھر گیا۔ فاقوں کی اذیت میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا اب میں ناکام ہو جاؤں گا اور میں کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

آپ نے گھبرا کے پوچھا۔ "پھر تو نے کسی کے آگے دست طلب دراز تو نہیں کیا؟"

درویش نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ "بس یہی افتاد تو ہے جس میں، میں گرفتار ہو چکا ہوں۔"

آپ نے افسوس سے گردن جھکا لی، کہا۔ "اپنی بات پوری کر، پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "پھر یہ ہوا کہ مجھ پر پے در پے بیس فاقے گزر گئے اور ان فاقوں نے مجھے اتنا بدحواس اور پریشان کر دیا کہ میں کھانے کے لیے دست طلب دراز کر بیٹھا۔"

آپ نے بے چینی سے پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "اس کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ میں نے جس کے آگے دست طلب دراز کیا تھا اس نے بھی میرا ساتھ نہ دیا اور معذرت کر لی۔"

آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا آپ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "جب اللہ کے بندے کی طرف سے انکار ہو گیا تو میں شرمندہ اور نادم ہو کر ایک گوشے میں پڑا رہا اور اپنی بے صبری کا ماتم کرنے لگا۔ لیکن کسی پہلو چین ہی نہ آتا تھا۔ ناگہاں یہ محسوس ہوا، گویا کوئی کہہ رہا ہے، اے بے صبرے انسان! اٹھ اور بازار کی راہ لے، خدا نے تیرے دکھ کا مداوا کر دیا ہے۔ مجھے اس آواز پر یقین نہیں آیا اور میں یہ سمجھا کہ شاید یہ آواز ابلیس ملعون کی ہے جو مجھ جیسے انسانوں کو خوار و ذلیل کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اے شخص! بدگمانی اچھی بات نہیں، بازار کی راہ لے اور دیکھ کہ خدا تیرے لیے کیا کرتا ہے۔ چنانچہ میں بازار روانہ ہو گیا، راستے میں مجھے چند درہم ملے جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گویا وہ نئے نئے بنا کر راستے میں ڈال دیے گئے ہوں۔ میں بہت خوش ہوا کہ کسی انسان نے اگر میرے فاقوں کا خیال نہیں کیا تو کیا ہوا؟ میرے رب کو تو میرے فاقوں کا احساس ہے اور اب میں ان درہموں سے کھانا خریدوں گا اور بھوک کی اذیت سے پیچھا چھڑاؤں گا۔ میں درہموں کو لے کر جب بازار پہنچا اور روٹیاں خریدنا چاہیں تو دکاندار نے طنز کیا۔ "اے شخص! تو نے انسان سے روٹیاں مانگیں اور اس سے اپنے بیس فاقوں کا ذکر کیا۔ کیا تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ خدا تیرے حال سے واقف نہیں۔ کیا تو اس لاعلمی کا شکار تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حال سے واقف نہیں یا کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ خدا اپنے بندوں کی احتیاج اور ضرورت سے بے فکر اور بے نیاز ہوتا ہے۔ افسوس کہ تو نے اس کی عنایت اور مہربانی کا انتظار کیے بغیر اپنے بیس فاقوں کا ذکر ایک انسان کے سامنے کر دیا۔ تو نے یہ

بھی دیکھ لیا کہ اگر اللہ کسی کو کچھ نہ دینا چاہے تو انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے ارادے اور اپنی کوشش سے کسی کو کچھ دیدے۔"

اتنا کہہ کر درویش زار و قطار رونے لگا۔

آپ نے کہا۔ "تجھ پر یہ طنز دکاندار نے کیا یا اللہ نے؟"

درویش نے جواب دیا۔ "زبان تو دکاندار کی تھی لیکن بات خدا کی، آخر اس دکاندار کو میرے حال کا علم کیوں کر ہوا؟ کیا وہ دکاندار کوئی صاحب کشف نہیں تھا؟"

آپ نے درویش کو تسلی دی۔ "اے درویش! جو کچھ ہوا، اس پر رونے دھونے سے حاصل؟ جا، ایک بار پھر صبر و توکل کی روش اختیار کر اور اس سے زیادہ مشکل حالات کے مقابلے کے لیے تیار رہ۔ کیونکہ امتحان میں ایک بار ناکام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی ہمیشہ کے لیے امتحان میں ناکام ہو گیا ہے، دوسرے امتحان کی تیاری کرو، خدا اس میں تمہیں کامیاب کرے گا کیونکہ تمہارا عرق انفعال اس بات کی علامت ہے کہ تم میں پشیمانی کا جوہر موجود ہے اور جب تک کسی انسان میں یہ جوہر موجود ہے وہ خدا کا معتوب نہیں ہو سکتا۔"

درویش نے آپ کے پاس ہی اقامت اختیار کی اور آپ کی رہنمائی میں اپنی منزلیں طے کرنے لگا۔

آپ نے مستقلاً خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے قیام اختیار کیا۔ آپ کے مرید اور ارادت مند یہاں بھی پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بستی قائم ہو گئی۔ آپ نے ان لوگوں کو وہاں سے ہٹ جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ بہترین طریقۂ عبادت یہ ہے کہ آدمی کہیں بھی ہو، اس کے صدق و زہد میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خانۂ کعبہ کے پاس خود نہ آئے مگر خانۂ کعبہ اس کے پاس پہنچ جائے۔

آپ کے مریدوں نے اس پر عمل کیا اور مکے میں پھیل گئے۔ ان میں ایک مرید نے اتنا کمال حاصل کیا کہ وہ واقعی جب چاہتا جس چیز کو دیکھنا چاہتا آنکھیں بند کر کے اپنے سامنے بلا لیتا۔ اسی دوران اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور روز بہ روز حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ آپ نے اس کی بیماری کا حال سنا تو اس کی عیادت کو پہنچ گئے اور پوچھا۔ "تیرا کیا حال ہے؟"

اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "بس چل چلاؤ ہے، اور اللہ کے بلاوے کا انتظار کر رہا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تیری کوئی خواہش؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ہاں، میں کمزوری کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا۔ مگر خواہش یہ ہے کہ ایک بار خانۂ کعبہ کی زیارت کر لوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "کیا میں تجھے خانہ کعبہ تک پہنچا دوں؟"

مرید نے کہا۔ "میں خانۂ کعبہ کو یہیں بلوائے لیتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے لگا۔ اسی وقت ایک طرف سے ایک اونٹ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے ایک زوردار لات اس شخص کی آنکھ پر رسید کر دی جس سے اس کی آنکھ نکل کر باہر آ گئی۔

مرید نے روتے ہوئے کہا۔ "یا اللہ! یہ کس بات کی سزا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اے بدنصیب انسان! تو اگر ذرا سا صبر کرتا تو تجھے مکاشفۂ حق حاصل ہو جاتا۔ چونکہ تو نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی خواہش کر کے کم پر قناعت کر لی اس لیے خدا کو تیری یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے تیری آنکھ کا ڈھیلا نکلوا دیا۔"

آپ تیس سال تک خانۂ کعبہ کے پرنالے کے نیچے ہی اقامت گزیں رہے۔ آپ سے آخری وقت میں کسی نے پوچھا۔ "حضرتؒ! آپ کو اتنا بلند مقام کس طرح حاصل ہوا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے چالیس سال تک قلب کی یوں حفاظت کی ہے کہ اس میں کسی اور کو داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اس میں خدا کے سوا کوئی بھی نہ رہا اور اب یہ حال ہے میں نے خدا کے سوا ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے۔"

آپ نے ذرا سکوت اختیار فرمایا۔ پھر آخر ہچکی لینے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ "اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ یہ میرا آخری وقت ہے اور میں مزید زندہ نہیں رہوں گا تو میں یہ راز، راز ہی رکھتا اور اس طرح انکشاف نہ کرتا۔"

اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور خانۂ کعبہ کے قریب ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

ماخذات

سفینتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔
خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

محمد الیاس

عشق بھلائے نہ بھولے

اندھا انسان ہو یا اعتماد... بعض اوقات بہت مشکل صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اسے بھی کسی کے بڑے پن پر بہت ناز تھا مگر رفتہ رفتہ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ بڑا انسان عمر سے نہیں ظرف سے تسلیم کیا جاتا ہے... وہ جو خود کو بہت چھوٹا تصور کرتا تھا قدرت نے اسے ایسا اعلیٰ مقام عطا کیا کہ دنیا کے سارے رشتے اور جذبے اس کی عظمت کو سلام کر بیٹھے... بچپن میں کھیلے جانے والے کھیل تماشے کبھی کبھی سمجھداری کے زمانے میں بھی کھیلنے پڑتے ہیں... نامساعد حالات کے باوجود اسے بھی بچپن کے اس کھیل سے بہت پیار تھا جسے وہ تمام عمر کھیلنا چاہتا تھا۔

کسی کے عشق میں اپنی ذات کو مٹانے والے ایک
سچے عاشق کا قصہ

میری زندگی کی بند تاریک گلی کے پچھلے سرے پر وہ سارے منظر روشن ہیں۔ میں بیٹھا ہوا ایک ایک لمحہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں...... میرا بچپن، یہ میرا گھر، جس کے چوبارے کی چھت پر میں گھر گھر کھیلا کرتا تھا۔ چار پائیاں کھڑی کر کے چادروں سے ڈھانپ کر ہم گھر بنایا کرتے تھے۔ پینو میری گھر والی بنا کرتی تھی۔ پینو چاچے تمے کی بیٹی۔ تما اسے اسی لیے کہا کرتے تھے کہ وہ بڑا کڑوا اور غصیلا تھا۔ پینو اتنی خوب صورت تھی، گوری گلابی، سنہری

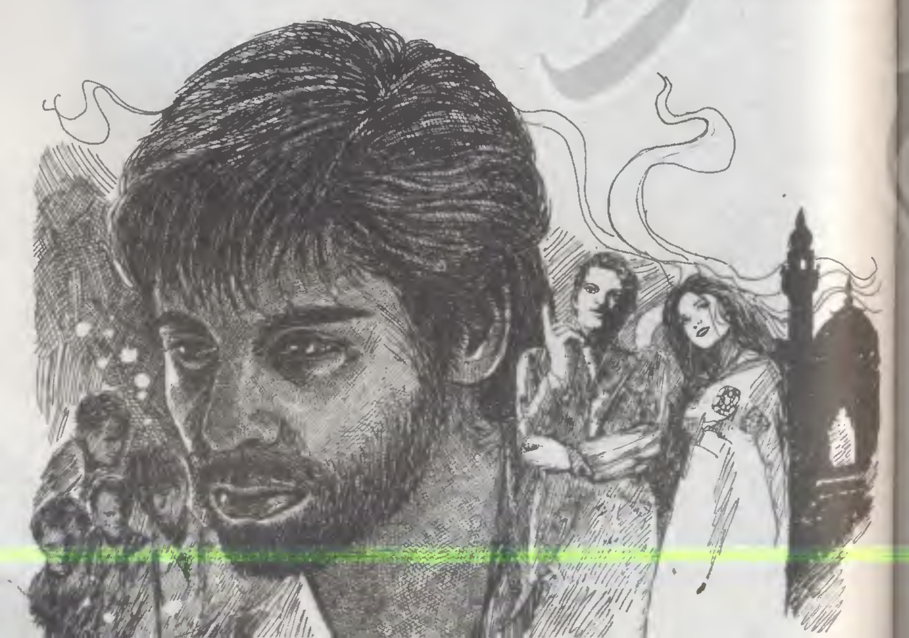

بالوں اور نیلی آنکھوں والی۔ سبھی اسے پینو مینی کہتے۔ اس کا گھر والا بننے کے لیے مجھے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ اماں سے چوری چوری، رسوئی سے دستیاب ہر وہ چیز جو کھانے پینے یا گھر گرہستی کے کام آسکتی تھی، بڑوں کی نظروں سے بچا کر اوپر لے جانا میرے اوّلین فرائض میں شامل تھا۔ دسترخوان سجانے کے لیے روٹی، سالن، گڑ، چنے، تل، سونف، کشمش، اجوائن کوئی چورن یا پھکی، جو کچھ بھی میسر ہوتا، مہیا کرنا مرد ہونے کے ناتے میرا دردِ سر تھا۔ اماں کا دوپٹا لا کر میں سر پر پگڑی باندھتا اور چارپائیوں سے بنے گھر کے دروازے پر لٹکی چادر کا پردہ اٹھا کر پینو سے کہتا۔

”ہاں بھئی کرماں والی! کچھ ہے گھر میں کھانے کو؟ آج بڑی بھوک لگی ہے۔“

کرماں والی کے گھونگٹ میں سے دو نیلے روشن ستارے چمکنے لگتے اور گلاب پر سجی پنکھڑیاں حرکت کرتیں۔

”بسم اللہ کروں، تو بیٹھ تو سہی کرماں والیا! سب کچھ ہے اللہ کے فضل سے۔“

ان دنوں واقعی بڑا اللہ کا فضل ہوا کرتا تھا، جس قدر بھی گھروں میں ہوتا، وہ ”سب کچھ“ ہی ہوتا تھا۔ میری چھوٹی بہن، گڈی اور بھائی ننھا ہمارے بچوں کا کردار ادا کیا کرتے۔ وہ دونوں میرے ہم شکل تھے اور ان دنوں بالترتیب تین اور پونے دو سال کے تھے۔ میں کہتا۔

”پینو! دیکھ تو سہی، میرا بیٹا ہو بہو مجھ پر گیا ہے۔“

وہ جواب دیتی۔

”بھلے لوگو! بیٹا کس کا ہے؟“

میں گڈی اور ننھے کو گود میں لے کر پیار کرنے لگتا اور پوچھتا...... ”کچھ پڑھا بھی ہے یا دن بھر کھیلتے ہی رہے ہو؟“ پھر میں جیب میں سے گڑ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکال کر انہیں دیتا اور کہتا۔

”لو میری جان! مٹھائی کھالو۔“

گھر والی ناک پر انگلی رکھ کر کہتی۔

”ہائے خائے، خود بھی کچھ کھالیا کرو۔ لڑکیوں کو مٹھائیاں نہیں کھلایا کرتے، بھولے بادشاہ! کل کلاں اس نے پرائے گھر جانا ہے۔ مت خراب کرو بیٹی کی عادتیں۔“

میں بڑا دانا بن کے بولتا۔ ”انہوں نے کھایا میں نے کھایا۔“ پھر میں آہ بھر کے کہتا۔ ”اللہ بیٹی کے مقدر اچھے کرے۔“

جس روز گھر سے کوئی چیز ہتھے نہ چڑھتی، ہم محض اداکاری کر کے یعنی ہاتھ ہلا ہلا کے منہ سے پچ پچ کی آوازیں نکال کر کام چلا لیتے۔ ہمارے سنگ اسی طرح کچھ دوسرے بچے بھی گھر گھر کھیلا کرتے۔ ان میں سے ایک میرے بھائی جان تھے جو اپنی ”گھر والی“ باجی حلیمہ اور ”بچوں“ کے ہمراہ بہ طور مہمان ہمارے گھر آیا کرتے اور کھیل ہی کھیل میں ہمارا سارا راشن چٹ کر جاتے۔ بھائی جان مجھ سے سات سال بڑے تھے۔ وہ ان دنوں چودہ سال کے تھے، باجی حلیمہ گیارہ بارہ اور پینو چھ سال کی تھی۔ میری اور دیگر تمام بچوں کی یہ دلی خواہش ہوا کرتی کہ بھائی جان باہر جا الگ سے کھیلا کریں لیکن وہ ہمارے ساتھ کھیل کھیلنے سے ٹلتے ہی نہیں تھے۔ ایک طرف تو اس کھیل کے جملہ تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے گھر کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر تھا ہی لیکن دوسری طرف بھائی جان کی گھریلو ضروریات کی فراہمی کا کام بھی کافی حد تک میرے ذمے ہی تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے مجھے ہی حکم دیتے۔ گھر سے ہر شے چوری کر کے میں لاتا اس لیے ڈانٹ ڈپٹ مجھے ہی سہنا پڑتی۔ دیگر ساتھی بچے بھی بھائی جان کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوا کرتے۔ وہ سب کزنز میں سے بڑے ہونے کے ناتے اپنے حقوق اور اختیارات میں بے جا تجاوز کرتے اور سب کو اپنے اپنے گھروں سے اشیائے خورونوش چوری کر کے لانے کی ترغیب اور تربیت دیتے۔ جو بچے شروع میں نسبتاً اناڑی تھے وہ بھی بہت جلد اس فن میں طاق ہو گئے۔

ہمارے ساتھ گھر گھر کھیلنے والوں میں کزنز کے علاوہ میرا ایک ہم جماعت لڑکا، منیر حسین بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ کشمیریوں کی گلی کے رہائشی منیر حسین کے اور ہمارے گھر کی عقبی دیواریں باہم پیوست تھیں۔ اس کے والد صاحب، بلدیہ میں انسپکٹر تہ بازاری کے عہدے پر فائز تھے۔ بڑے ٹھاٹھ اور رعب والا عہدہ تھا۔ اپنے عملے کے ہمراہ بازار میں نکلتے تو افراتفری سی مچ جایا کرتی تھی۔ اچھے بھلے دکان دار ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرتے۔ منیر حسین اپنی ماموں زاد اختر کے ساتھ اپنے چوبارے کی چھت سے دیوار پھاند کر ہمارے چوبارے کی چھت پر آجایا کرتا تھا۔ اختر کا باپ، اللہ دتہ کوچوان تھا۔ منیر حسین اور میرے مسائل کافی حد تک یکساں تھے۔ پینو کی طرح اختر بھی غریب باپ کی بیٹی تھی، اس لیے ”گھر داری“ کے تمام انتظامات، منیر حسین کو بھی اپنے بل بوتے پر کرنا پڑتے تھے۔ ویسے منیر اور اختر کی جوڑی اور میری اور پینو کی جوڑی میں ایک اور قدر بھی مشترک تھی۔ وہ یہ کہ اختر خاصی خوب صورت لڑکی تھی۔ پینو جیسی نہیں، تاہم عام کشمیری لڑکیوں جیسی گوری اور پُرکشش تھی۔ اللہ دتہ کوچوان ہوتے ہوئے بھی بڑا شریف بندہ تھا۔

اسی لیے ہماری گلی اور محلے کی دیگر عورتوں کو جب کبھی تانگے پر سفر کرنا ناگزیر ہو جاتا تو اسی کی خدمات حاصل کیا کرتیں۔ وہ ماسوائے اپنی بیوی کے، محلے کی ہر ہم عمر عورت کا بھائی، بڑی بوڑھیوں کا بھانجا بھتیجا اور ہم سب بچوں کا ماما چاچا تھا۔ اتنی خوبیوں کا مالک ہونے کے باوجود غریب بہت تھا۔ ایک تو کثیر اولاد اور اس پر مستزاد بیٹوں کے علاوہ بیٹیوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ بے چارے پر کوئی نہ کوئی افتاد پڑی ہی رہتی۔ بیوی یا گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیمار ہوا رہتا۔ بدقسمتی سے ایک دن گھوڑے کو ذرا زور سے سانٹا مار دیا تو وہ بدک کر پکی سڑک پر پھسلا اور سر کے بل گر گیا۔ تانگے کے دونوں بم ٹوٹ گئے اور ساری سواریاں لوٹنیاں کھا کر گھوڑے پر جا گریں۔ گردن ٹوٹ جانے سے گھوڑا مر گیا اور چاچا اللہ دتہ کے ہاں کئی روز تک یوں رونا پیٹنا پڑا رہا، گویا گھر کے کسی اہم فرد کے انتقال پرملال کا سانحہ گزرا ہو۔ ادھار پر گھوڑا لیا اور تقریباً ایک تہائی کمائی اس کی ہر مہینا قسط ادا کرنے پر نکل جاتی۔ منیر کی ماں کچھ اپنے میاں کی اجازت سے اور کچھ اندرخانے بھائی کی مدد کر دیا کرتی تھی۔

سب بچوں کی ماؤں کو اپنی اولاد کی پُراسرار سرگرمیوں کے پس پردہ کارفرما ہاتھ کا علم تھا اس لیے جب بھی کسی بچے کی کوئی ایسی ہی حرکت قابلِ قبول حدود سے متجاوز ہو جاتی تو کوئی تائی، چاچی، ممانی، خالہ، پھوپی یا امی جوتا، ڈوئی یا سوٹی ہاتھ میں لیے چوبارے کی چھت پر آجاتی۔ بھائی جان آن واحد میں گلی پھلانگ کر دوسری چھت پر چلے جاتے۔ وہاں مستیاں کرتے، اچھلتے کودتے، ماہیے گاتے اور بغلیں اس طرح سے بجاتے کہ ان کی تال پر منہ سے پیپیں پپیں کی آوازیں نکالتے۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ کرتوت ان کے سزا ہمیں ملتی۔ لیکن وہ بے حسی اور بے رحمی سے ہماری تباہی و بربادی کا تماشا دیکھتے۔ چونکہ حملہ آور خاتون اپنا غصہ فرو کرنے کے لیے نزلہ بر عضوِ ضعیف کے مصداق ہماری معصوم بستی کو تاخت و تاراج کر دیتی اور بھائی جان کی طرف منہ کر کے کچھ اس قسم کے کلمات ادا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے پر اکتفا کر لیتی۔

”بڈھا وچھا۔ بے شرم، بے حیا۔ بچوں میں کھیلتا ہے۔ بدشکلا باندر (بندر)...... جا آ...... دفع دور۔“

وائے حسرت، کوئی بزرگ خاتون یا مرد بھائی جان کی کارستانیوں کا مستقل سدباب نہ کر سکا۔ ہم سب کزنز کے دلوں میں یہ خواہش پل کر جوان ہوئی اور پھر بوڑھی ہو کر بالآخر مرحوم و مغفور کہ بھائی جان کسی بزرگ کے عین بوقت غیظ قابو آئیں۔ لیکن اس کے برعکس بھائی جان اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور روز افزوں خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرتے چلے گئے۔ سودا سلف لانے جاتے تو ایک دو آنے کی ڈنڈی بہ آسانی مار لیا کرتے۔ دودھ اور دہی کی بالائی راستے میں ہی صاف کر آتے۔ بنٹے والی بوتل دکاندار سے کھلوا کر لاتے تاکہ گھر پہنچنے سے پہلے پہلے کسی حد تک اپنا کلیجا ٹھنڈا کر سکیں۔ کچی سبزیاں بھی انہیں پسند تھیں۔ خصوصاً گوبھی کو فوری انصاف مہیا کرنے کی غرض سے سرِراہ کارروائی شروع کر دیتے۔ خشک میوہ جات انہیں بہت مرغوب تھے۔ جس دکان میں گھستے، دکاندار کو بھی ہول اٹھنے لگتا۔ سودا خریدنے سے زیادہ انہیں جھونگا لینے کی فکر ہوتی۔ کچھ دکاندار کی مرضی سے اور کچھ اپنی مدد آپ کے طور پر جہاں جہاں سے گزرتے جاتے، دائیں بائیں آگے پیچھے ہاتھ مارتے جاتے۔ متاثرین کو ہاتھ پاؤں پڑ جاتے۔ گلی کے بیشتر رشتہ داروں نے کوئی چھوٹی موٹی چیز منگوانے کے سلسلے میں بھائی جان کی خدمات سے مستقلاً دست کش ہونے میں ہی عافیت جانی۔ اماں نے بھی حتی الوسع یہی روش اختیار کرنے کی کوشش کی تاہم کامل اجتناب ممکن نہ تھا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے سبھی بچوں کو آنہ دو آنے جیب خرچ ملتا تھا۔ بھائی جان کا جس پر بھی بس چلتا اپنی راہنمائی میں خرچ کروانے کی کوشش کرتے اور حصہ بقدرِ جثہ وصول کر لیتے۔

دوسرے بچوں کی نسبت میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی بھائی بندی کا مظاہرہ کرتے۔ مجھے بہت دکھ ہوا کرتا۔ میرا المیہ یہ تھا کہ میری ”گھر والی“ کو اپنے گھر سے کوئی خرچ نہیں ملتا تھا لہٰذا مجھ پر دہری ذمے داریاں تھیں، جن سے عہدہ برآ ہوئے بنا مجھے چین نہیں آتا تھا۔ بہت جلد میں نے اپنی حکمتِ عملی میں نہایت دانش مندی سے کچھ مناسب تبدیلیاں کر لیں۔ نوسربازی اور سرقہ بالجبر کی ممکنہ کارروائی سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی جمع پونجی و حاضر سرمایہ صبح ہی صبح پینو کی تحویل میں دے دیا کرتا۔ بھائی جان بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھے۔ بہت جلد انہوں نے اس سربستہ راز سے علی الاعلان پردہ اٹھا دیا لیکن انہیں اس وقت سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب اماں اور ابا نے میرے اس فعل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ میرے اور پینو کے وسائل محدود تھے اور مشترکہ ضروریات کا دائرہ وسیع تر ہو رہا تھا۔ چار و ناچار مجھے گھر سے دور مضافات کی خاک چھاننا

پڑتی۔ کسی لاوارث درخت سے جامن، بیر، شہتوت یا پکے ہوئے لسوڑے اکھٹے کر کے مناسب نان ونفقہ کا اہتمام کرنا ہوتا تھا جس میں سے نفقہ فی الوقت عنقا ہی تھا، البتہ نان کسی نہ کسی طور مچھندر مہیا کرلیتا۔ دسترخوان کی لذتیں دوبالا کرنے کی خاطر کھانے خود پکانے میں بھی مہارت حاصل کی۔ چھت پر اینٹیں رکھ کر چولہا بنانا، اس میں آگ جلا کر پکوڑے اور جلیبیاں تیار کرنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ باقی بچے بھی بھرپور مدد کرتے۔ برتن اور ضروری اجزائے ترکیبی لانے میں ہر ساتھی مقدور بھر تعاون کرتا۔ پکوڑے اور جلیبیاں زیادہ تر آٹے سے ہی بنائی جاتی تھیں۔ آٹے، گڑ اور پانی کے آمیزے کو کپڑے کی سوراخ دار پوٹلی میں ڈال کر گرم گھی میں جلیبی کی صورت حرکت دینے سے پوٹلی کے پیندے والا سوراخ کبھی بڑی فراخی سے آمیزہ خارج کرتا تو کبھی انتہائی کنجوسی کا مظاہرہ کرتا۔ نتیجتاً جلیبیوں کی ہیئت مجموعی کچھ ایسی بن جاتی کہ پکوڑا نما گلٹیاں چھوٹے بڑے، موٹے پتلے تاروں سے آپس میں منسلک ہو کر وجود میں آتیں۔ بہرحال جو اور جیسا پکتا ہم بغیر ناک بھوں چڑھائے تناول کرلیتے اور ہر لمحہ خدا کا شکر ادا کرتے۔

میرا یہ شوق اور دیوانگی ہی میری بیشتر مشکلات کی موجب تھی۔ میں کسی طور بھی یہ جنوں ترک کرنے پر خود کو آمادہ نہ کرپایا۔ رفتہ رفتہ میرا سارا جمع جتھا، مال اسباب جو چھوٹی موٹی ہر طرح کی اشیا پر مشتمل تھا، پینو کے پاس منتقل ہوگیا۔ کوئی بھی چیز، قلم، پنسل تراش، شیشہ پلاسٹک کی عینک، سلیٹی، چاک، گیند، کھلونا اور تصویر، کسی ذریعے سے میرے ہاتھ لگتی، میں کرماں والی کے حوالے کردیتا۔ پیسا لاٹری کا‘ میں بہت رسیا تھا۔ ہر مرتبہ اس آس پر لاٹری ڈالتا کہ کوئی بڑا کھلونا، بناؤ سنگار کی چیز، مثلاً رولڈ گولڈ کا زیور جیتوں تو پینو کے حضور نذرانہ پیش کروں لیکن ہر مرتبہ پڑیا سے ایک پرچی نکلتی، جس پر یہ ہدایت درج ہوتی۔ ''مایوس نہ ہوں، ایک بار پھر قسمت آزمائیں۔'' میں واقعی کبھی مایوس نہیں ہوا اور بہ دستور قسمت آزماتا رہا۔

اپنی گوناگوں خوبیوں کے باوجود میں پرلے درجے کا بے وقوف بھی تھا۔ جو بھی پٹی مجھے پڑھائی جاتی اس کا بے محل انکشاف کر کے حاضرینِ محفل کے لیے تفریح طبع کا سامان پیدا کرتا ہی تھا لیکن اپنے اور خصوصاً پٹی پڑھانے والے کے لیے خفت اٹھانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ چھوڑتا۔ بھائی جان نے دولت بٹورنے کے اور بھی کئی گر سیکھ لیے تھے۔ بچوں کی دلچسپی کی کوئی بھی چیز کسی ذریعے سے ان کے ہاتھ لگ جاتی، وہ اس پر ٹکٹ لگا دیتے۔ وہ صرف اقتصادی اور مالی منصوبہ بندی کے ماہر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے موجد اور مینوفیکچرر بھی تھے۔ مالی منفعت کے حصول کے لیے بہت سی چیزیں خود بھی تیار کرلیتے۔ گتے کا ایک سلنڈر نما کھلونا بنایا جس میں آئینے کے تین عمودی ٹکڑے نصب کیے۔ پیندے میں رنگ برنگی چوڑیوں کے ٹکڑے ڈالے ہوئے تھے۔ اوپر والے تنگ سوراخ سے یک چشم ہو کر نظارہ کرنے سے طرح طرح کے ڈیزائنوں میں پھول بنتے۔ ذرا ہلا دینے سے ڈیزائن تبدیل ہوجاتے۔ بھائی جان نے اس آئٹم سے اچھی خاصی کمائی کرلی۔ جب اس کی مقبولیت کم ہوگئی تو جوتوں کا ایک خالی ڈبا لیا، اوپر اور نیچے سرکنڈوں کے دو ٹکڑے پرو دیے اور ان کے مابین کاغذ کا ایک خاصا طویل رول منسلک کیا۔ رول پر مختلف کتابوں رسالوں سے کاٹی ہوئی تصویریں چسپاں کیں۔ اوپر والے سرکنڈے کے ٹکڑے کو کلاک وائز گھماتے تو نچلے سے رول اتر کر اوپر والے پر لپٹنے لگتا، جس کے نتیجے میں ڈبے کی کھڑکی میں سے تصویریں نظر آتیں۔ وہ اسے سنیما مشین کا نام دیتے تھے۔ اپنے خاندان کے بچوں سے انہیں کوئی خاطر خواہ آمدنی نہ ہوتی تو دیگر گلیوں اور محلے کے بچوں کو ورغلا کر لے آتے اور شو چلا دیتے۔ کبھی کبھار کوئی سچ مچ کی دستاویزی یا اشتہاری فلم شہر میں آجاتی تو چھوٹے بچوں کو اپنی سرپرستی میں فلم دکھانے لے جاتے اور سیکیورٹی چارجز کے طور پر ان سے کچھ نہ کچھ بٹور لیتے۔ آمدنی میں اضافے کی خاطر انہوں نے بڑی جدتیں پیدا کیں اور نرالے انداز میں کئی کاروباری معرکے سر کیے۔ وہ اپنے سے چھوٹے، ہم عمر کزنز کے مابین اکثر و بیشتر کشتی، دوڑ یا موقع محل کے مطابق کسی بھی قسم کی شرط لگوا دیتے لیکن جیت کی رقم بہرصورت خود ہضم کیا کرتے۔

ایک دور میں بھائی جان نے گلی میں باقاعدہ مجمع لگانا شروع کردیا۔ فرش پر کمبل بچھا لیتے۔ بوٹ پالش کی خالی ڈبیوں کے دونوں حصے اور کھلے منہ والی بوتلوں کے ڈھکنے اچھی طرح دھو کر خشک کر کے کمبل کے کنارے پر قطار میں بڑی مناسب ترتیب سے سجا دیتے اور ان میں مختلف اشیا کی ننھی ننھی ڈھیریاں بڑے سلیقے سے لگا دیتے۔ مثلاً پسی ہوئی مرچ، نمک، شکر، کشمش، خشخاش، انار دانہ، چورن، سونف، اجوائن، تل، کالا نمک اور نسوار وغیرہ۔ سر پر دادا جان کی سنہری کلاہ والی پشاوری لنگی (پگڑی) رکھتے۔ ہاتھ میں بید کی چھڑی لے کر بڑے اسٹائل سے کمبل پر براجمان ہوجاتے اور یوں آغاز کرتے۔

''دیکھو بھائیو! یہ سلاجیت ہے (کسی بھی چیز کو چھڑی کی نوک سے چھو کر) یہ مصطگی رومی ہے، یہ فرفر ہے، یہ پھلیلا گم چم ہے اور یہ وغیرہ وغیرہ ہے۔'' ایک دو اشیا کے نام غالباً صحیح پکارتے تھے باقی سب مہمل۔ پھر فرماتے۔

''یہ سلاجیت بڑی مشکل سے ملا ہے۔ ہمارا چوٹا (چھوٹا) بھائی گلگت سے لایا ہے۔ ادھر اس کا شیر اور چیتے سے لڑائی ہوگیا لیکن بھائی نے دونوں درندوں کو مار دیا اور خود بڑا زخمی ہوا۔ تم ہمارا یہ دوائی کھائے گا تو ایک دم سینڈو کی موافق ہوجائے گا۔ دیکھو بھائیو! خدا کی قسم ہم سچ بولتا ہے، اگر ہم جھوٹ بولتا ہے تو اپنے پیٹ کی خاطر لیکن اگر تم قسم پر اعتبار نہیں کرے گا تو کافر کا بچہ ہوئے گا۔''

بھائی کے اس انتباہ کا خاطر خواہ اثر ہوتا، چونکہ ہم میں سے کوئی بچہ کافر ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک یا دو پیسے لے کر چٹکی چٹکی چند اشیا ملا کر بڑی مہارت سے چھوٹی سی پڑیا بنا کر تھما دیتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہماری دو سینئر تایا و پھوپی زاد بہنوں کو دو پیسے کے عوض نسوار کی ایک ایک چٹکی فروخت کی اور ہم راہ یہ طبی مشورہ مفت دیا کہ دونوں اپنے اپنے نتھنوں میں ساری خوراک ایک ہی بار لگالیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ان دونوں پر چھینکوں کا ایسا دورہ پڑا کہ ناکوں سے خون جاری ہوگیا۔ وہ یقیناً نکسیر ہی ہوگی لیکن خون ایسا گاڑھا جیسے اس میں باریک قیمہ ملا ہوا ہو۔ کچھ ڈھنڈورچی خصلت بچوں کی وساطت سے یہ خبر اپنی گلی کے سب گھروں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ تائی جان کو اپنی بیٹی سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ انہوں نے موقع واردات پر پہنچ کر خونچکاں منظر دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، چھاتی پیٹنے لگیں۔ حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بھائی جان نے جلدی جلدی دکان سمیٹنا شروع کردی۔ تائی جان نے کمبل کا ایک کونا پکڑ کر پوری قوت سے کھینچا تو بھائی الٹ گئے۔ کلاہ لڑھک گیا، چھڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور تمام قیمتی جڑی بوٹیاں اور دوائیاں بکھر گئیں۔ یعنی آن واحد میں کل مال تجارت تباہ و برباد ہوگیا۔ لباس پر مرچ مصالحوں نے تجریدی آرٹ کے نمونے بنا ڈالے۔ تمام بچے ان کی ہیئت کذائی پر خوب ہنسے۔

جلد ہی بھائی جان سینڈو بننے کے خبط میں مبتلا ہوگئے۔ تیل کی مالش کر کے ورزش کرتے اور ڈنڈ پیلتے۔ اپنے حصے کی خوراک کھانے اور دودھ پینے تک ہی محدود نہ رہتے۔ تن سازی کے جنون نے ان کی غذائی ضروریات کئی چند بڑھا دیں اس لیے وہ دوسروں کے حقوق کھلے عام غضب کر جاتے۔ مرغن غذائیں انہیں پہلے ہی بہت مرغوب تھیں۔ حسبِ ضرورت ان کے حصول کی خاطر نت نئے منصوبے بنانے لگے۔ ماحول سازگار پاتے ہوئے امی کے روبرو اپنے چہرے سے بڑی تشویش ناک مردنی کا تاثر منعکس کرنے لگتے۔ جوں ہی وہ ذرا فکرمند ہوتیں تو اپنی جان کو لگا کوئی فرضی روگ بیان کرتے۔ ممتا پگھلنے پر ہر دم آمادہ ہوتی ہی ہے، جھٹ کسی سیانے یا حکیم سے منسوب کر کے ایک انتہائی تقویت بخش اور مفرحِ قلب طبی نسخہ گوش گزار کردیتے۔ زیادہ تر وہ خود کو جس عارضے میں مبتلا کرنا مناسب خیال کیا کرتے، اس کے تیر بہدف علاج کے طور پر صبح نہار منہ بادام کی سردائی، دن میں ایک آدھ بار مرغ کی یخنی اور رات سونے سے پیشتر گرم دودھ کا گلاس نوش کرنا اکسیر قرار دیتے۔ بیماری کی علامات کچھ یوں بیان کرتے کہ دن بھر چکر آتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اور دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ مزید تاکید کرتے کہ علاج عرصے تک جاری رہے تو بیماری رفع ہوسکتی ہے۔

دیگر محلوں میں آباد دور و نزدیک کے رشتہ داروں کے ہاں حیلے بہانے جانے لگے۔ کئی مرتبہ کسی خاص مصلحت کے تحت مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میزبان گھرانے کی کوئی بزرگ خاتون ہم سے غیر متوقع طور پر شرف میزبانی بخشنے کا سبب دریافت کرتیں تو بھائی جان جواب دیتے۔

''اماں نے کہا تھا کہ خالہ کا حال احوال پوچھ آنا۔''

کہیں ہماری پذیرائی ہوجاتی اور کہیں الٹا سوال ہوجاتا۔

''آپ کی اماں کو آج ہم غریب مسکین کیسے یاد آگئے؟'' اور اس کا منطقی انجام یہ ہوا کرتا کہ بھائی جان جیسے ملنسار بچوں کے والدین کو خفیف ہونا پڑتا۔ ویسے تو بھائی جان کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیتے لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اپنا پرایا ہر کوئی ان کی بات پر اعتبار کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا۔ کوئی بہانہ نہ سوجھتا تو بھائی ملبا مجھ معصوم پر ڈالنے لگتے اور بہانہ تراشتے۔

''میں اپنے کلاس فیلو کے ہاں پریکٹیکل کی کاپی لینے جا رہا تھا تو راستے میں کاکے نے کہا کہ خالہ سے ملتے چلیں۔''

میں احتجاج کر کے صورتِ حال واضح کرتا، ابا جان بھی بڑے زیرک باپ تھے۔ بڑی محبت سے اپنے بڑے بیٹے کی حمایت کا پرچم بلند کرتے اور امی سے کہتے۔ ''او بھئی کیوں ڈانٹ رہی ہو میرے بیٹے کو؟'' پھر وہ بیٹے کی جانب متوجہ ہو کر پچکارتے۔

''ادھر آؤ یار! ذرا کھل کے بتاؤ، ہوا کیا تھا؟''

نزدیک آنے پر وہ بھائی جان کو قابو کر لیتے لیکن ایک آدھا جھانپڑ ہی رسید کر سکتے کیونکہ انہیں ہاتھوں سے مارنا فی الحقیقت خود کو سزا دینے کے مترادف تھا۔ دستی ضرب لگانے والے کے سامنے ایسی مہارت اور برق رفتاری سے اپنی کہنی کھڑی کر دیتے کہ مارنے والا اپنا ہاتھ تڑوا بیٹھتا۔

جوں ہی وہ معمول سے زیادہ شفقت پدری کا اظہار کرتے، بھائی.... دوڑ لگا دیتے اور باہر نکل کر مجھے خوب سزا دیتے۔ لیکن ہر ماں کے دل میں کوئی ایسا آئینہ نصب ہوتا ہے کہ جس میں دیکھنے سے اولاد کے چہروں پر پڑے خوشی کے مصنوعی نقاب از خود سرک جاتے ہیں اور اصل تصویریں منعکس ہو جاتی ہیں۔ اماں دو چار سوال ہی کرتیں تو راز کھل جاتا۔ بھائی جان کی حسبِ حال اور حسبِ توفیق کھچائی ہو جاتی۔ ایسے مواقع پر بھائی جان غم زدہ لہجے میں اپنا مخصوص شکوہ دہرانے لگتے۔

''کاکا ہی آپ دونوں کا بیٹا ہے۔ مجھے جہاں سے اٹھایا تھا وہاں ہی پھینک آئیں۔ ورنہ میں خود ہی کہیں چلا جاؤں گا۔''

اماں رنجیدہ ہو جاتیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کسی دوسری جانب رخ موڑ لیتیں لیکن ابا خم ٹھونک کر مقابلے پر اتر آتے اور بڑے انداز سے بولتے۔

''کب جائے گا میرا لعل؟''

جواب ملتا۔

''صبح ناشتا کر کے چلا جاؤں گا۔''

ابا بڑی رسان سے کہتے۔

''ناشتے کے پیسے لے لے میرا چاند اور ابھی چل دے۔''

ویسے ابا یہ سب کچھ اوپر اوپر ہی سے کہا کرتے۔ چونکہ بھائی جب بھی ایسے ڈائیلاگ تازہ تازہ بول کر گھر سے نکل گئے ہوتے اور ایک آدھ گھنٹے تک نظروں سے اوجھل رہتے تو ابا اچھے خاصے تھکے ہونے کے باوجود اٹھ کھڑے ہوتے اور اماں سے کہتے۔

''میں اس خبیث کو کہیں دیکھوں، پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔''

مجھے ساتھ لے لیتے۔ سائیکل پر میں ان کے آگے بیٹھا بڑی مستعدی سے راڈار کا کام کرتا اور خاص خاص جگہوں تک راہنمائی بھی کرتا جاتا۔ جہاں کہیں وہ ''خبیث'' نظر آ جاتا، ابا سائیکل پر بیٹھے بیٹھے زمین سے پاؤں ٹکا کر کھڑے ہو جاتے اور بڑی بے نیازی سے استفسار کرنے لگتے۔

''اوئے! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ چل بیٹھ پیچھے گدھا!...... میں اتنے ضروری کام سے کہیں جا رہا تھا اچھا چلو، پہلے تم دونوں کو گھر چھوڑ آؤں۔''

گھر پہنچ کر بڑے اطمینان سے بیٹھ جاتے اور خو کلامی کرنے لگتے۔ ''اس وقت نہیں جایا جاتا، کام جائے بھاڑ میں، اب کل دیکھا جائے گا۔''

اندرون شہر بسے عزیز و اقارب نے جب بھائی جان کو ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے رستہ نہ دینے کی ٹھان لی تو چار و ناچار مضافات میں مقیم بھولے بسرے عزیز و اقارب سے ہم نشین ہونے کے لیے تجدید تعلقات کا بیڑا اٹھا لیا۔ راستے بھر مجھے سبق پڑھاتے کہ اگر میزبان گھرانے میں سے کوئی مرد و خاتون از راہ شفقت کچھ نقدی بطور نذرانہ پیش کرے تو فوراً قبول کر لوں۔ مبادا بصورت انکار وہ اپنا تکلف دہرانا ضروری ہی نہ سمجھے اور نتیجتاً سفر کے جملہ ثمرات سمیٹنے کا سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

ایک ایسی ہی مہم پر جب ہم شہر سے دور چناب کے کنارے بستی میں دور پار رشتے کی ایک خالہ کے ہاں غیر متوقع رحمت کے فرشتے بن کر گئے تو دودھ، مکھن اور بالائی سے ہماری تواضع کی گئی۔ بہ وقت رخصت خالہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھا چاندی کا اکلوتا روپیہ نکالا اور میری مٹھی میں تھماتے ہوئے ہدایت کی کہ میں اسے سنبھال کر لے جاؤں اور اپنی اماں کو دوں۔ اسی اثنا میں انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹایا اور دائیں رخسار پر ایک گیلا گیلا لعاب دار بوسہ بھی ثبت کر دیا۔ بھائی جان نے بڑے بزرگانہ انداز میں مجھے ڈانٹ کر کہا۔

''اوئے! کیوں لیا ہے روپیہ، چلو واپس کرو۔''

میں ازل سے ہی کج فہم تھا، اس لیے بھائی کی سماجی ڈپلومیسی سمجھ نہ پایا اور بہ آواز بلند بحث پر اتر آیا۔

''پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے دے تو لے لینا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟''

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار کیا۔ میرا دایاں گال ابھی تک گیلا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہو بہو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں گال پر جڑ دیا اور بولیں۔

''میں صدقے واری جاؤں۔''

گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دردناک سفر ثابت ہوا۔ اگر مجھ میں ذرا سی بھی عقل ہوتی اور پیار کے ک بول پر ہی بہل جانے والا عاقبت نااندیش انسان نہ تا تو مجھے اس ایک واقعہ کی روشنی میں مستقبل کے حوالے ے اپنی زندگی کے لیے کوئی مناسب منصوبہ بندی کر لیتا تھی۔ بھائی جان نے سب سے پہلے مجھ سے روپیہ کیا۔ میں نے مزاحمت کی اور انہیں یاد دلایا کہ خالہ ان کی ہدایت کے مطابق یہ روپیہ گھر جا کر اماں کو دینا ہے۔ بر ناتواں جسم ایک سینڈو ٹائپ لڑکے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ نہوں نے میرا بایاں بازو مروڑ کر پیٹھ سے لگا دیا۔ روپیہ چھین کر جیب میں ڈالا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل دیے۔ یں بازو میں ایک جان لیوا درد کی وجہ سے بلبلا اٹھا اور چیخ چیخ ر انہیں انتباہ کیا کہ میں گھر جا کر سب کچھ، جو مجھ پر بیتی ہے، اماں اور ابا کو بتا دوں گا۔ وہ واپس آئے، میرے ابھی گالوں پر دو دو چانٹے رسید کیے جن پر خالہ نے بوسے دیے تھے۔ میرے سلیپر ہاتھ میں لیے اور سائیکل پر سوار ہو کر دور ل گئے۔ میں تپتی زمین پر ننگے پاؤں کھڑا تھا۔ میرے لوے جلنے لگے تو پگڈنڈی کے دونوں کناروں پر اگی گھاس کی جھالر پر پاؤں رکھ لیے۔ بازو کے درد نے بدن ے ساری قوت نچوڑ لی تھی۔ پسینے سے جسم شرابور ہو گیا اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کب بے سدھ ہو کر گر پڑا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ خالو نے شہر سے واپس جاتے ہوئے مجھے کھیت میں بے ہوش پڑے دیکھا تو گھوڑی پر ڈال کر گھر چھوڑ آئے۔

جھکڑ پہلوان نے میرا بازو چڑھانے کے لیے اپنی مہارت آزمائی تو مجھے بھائی جان کے ہاتھوں اٹھائی گئی اذیت بھول گئی۔ ابا مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان ے بھائی کو پکڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔ سیڑھیوں کا دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر لیا۔ پہلی نصف درجن کے لگ بھگ ضربات پر بھائی کی چیخ و پکار بلند ہوئی تو میرے بازو کا درد یکسر کافور ہو گیا اور مجھے دلی سکون محسوس ہوا، لیکن جلد ہی اوپر سے کچھ ایسی داد فریاد بلند ہوئی، جیسے ابا اپنے بڑے بیٹے کو ذبح کر رہے ہوں۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا کلیجا شق ہو جائے گا۔ میں نے اماں سے رو رو کر منتیں کیں کہ وہ ابا سے بھائی کو چھڑا لائیں۔ گھر میں پہلے ہی ساری گلی کے رشتہ دار مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ تایا جان کو فکر لاحق ہوئی تو انہوں نے زور زور سے ابا کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ دروازے کو کندھے مار مار کر کنڈی توڑ دی۔ بھائی کو چھڑا لائے اور سب کے روبرو ابا کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔

قریباً دو ماہ تک میرا بازو لکڑی کی پھٹیوں سے بندھا میرے گلے میں پڑے اماں کے دوپٹے کے ہار میں رکھا رہا۔ ایک ڈلی نمک کی ہمہ وقت میری ہتھیلی پر دھری رہتی۔ مجھے اپنی پڑھائی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں اپنی جماعت میں اوّل درجے کا طالبِ علم تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں واقعی لائق تھا۔ دراصل میں اپنے استاد ماسٹر رانجھا خان کی مار کے خوف سے بہت زیادہ پڑھا کرتا تھا۔ چونکہ جو لڑکے سبق یاد نہ کیا کرتے، ماسٹر جی، انہیں اپنی میز پر الٹا لٹا کر سوٹی سے بے تحاشا مارا کرتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

''پڑھو یا پڑھائی چھوڑ دو۔''

میں ماسٹر جی کو ایک انتہائی ظالم اور جابر شخص کے طور پر ہی جانتا رہا لیکن ان کا ایک دوسرا روپ بھی آشکار ہوا جو شفیق، ہمدرد اور غم گسار تھا۔ مجھے اس وقت بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب وہ ایک روز میری تیمار داری کے لیے آئے۔ مجھ سے پیار کیا، سبق پڑھایا اور پھر وقفے وقفے سے آ کر اگلا سبق پڑھاتے تھے۔ میں بسترِ علالت پر ہی رٹا لگاتا رہا۔ کم و بیش پورا نصاب از بر ہو گیا اور جب امتحان ہوا تو میں پھر حسبِ سابق پہلے نمبر پر رہا۔ بھائی جان دسویں میں فیل ہو گئے۔ ابا جان نے چار چھ مکے بہ ہمراہ آٹھ دس تھپڑ، باہم ملا کے ایک تگڑی سی خوراک لعنت ملامت کے ورق میں لپیٹ کر بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے فرزند کو کھلا دی تاکہ کچھ زیادہ عرصہ تک صحت ٹھیک رہے اور بازو سے پکڑ کر قریباً گھسیٹتے ہوئے لے جا کر چاچے تمے کی شاگردی میں دے دیا۔ چاچا تما ملکوں کی کھڈیوں پر چار روپے فی تھان اجرت پر کپڑا بنتے تھے۔ بھائی جان ایک روپیہ پھر دو روپے اور رفتہ رفتہ تین روپے یومیہ کمانے لگے۔

میرے دو ہی شوق تھے، پڑھنا یا گھر گھر کھیلنا۔ میں کوئی بھی کام کرتے ہوئے دل ہی دل میں کچھ نہ کچھ رٹ رہا ہوتا۔ اسی طرح چوتھی جماعت میں پہنچ گیا۔ لیکن میری احمقانہ حرکتیں بہ دستور جاری تھیں۔ ایک روز پنو، میں، گڈی اور ننھا اپنے معمول کے کھیل میں مگن تھے کہ چاچا تما اور چاچی نیامتے غیر متوقع طور پر اوپر آ گئے۔ چاچے نے پوچھا۔

''اوئے! تم یہ ہر وقت کیا کرتے رہتے ہو؟''

میں نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

''چاچا! ہم گھر گھر کھیل رہے ہیں۔ پنو میری گھر والی ہے۔ گڈی اور ننھا میرے جگر گوشے ہیں۔ دیکھو میرا بیٹا ہو بہو مجھ پر گیا ہے۔''

چاچی ہنس پڑی لیکن چاچے نے اسے گھورتے

ہوئے کہا۔

”دُر دُر کُتی! دانت نکالتی ہے۔“

ساتھ ہی ایک زوردار دھپ مجھے اور کرارا سا مکا پینو کی کمر پر مارتے ہوئے بولے۔

”اٹھو کھوتے کی نسلو!...... جان سے مار دوں گا دونوں کو۔“

میرا جوش اور خوشی ایک دم کافور ہوگئی۔ میں ششدر رہ گیا کہ چاچے نے ہمیں کس جرم کی پاداش میں سزا دی ہے۔ بہرحال ہم باز نہیں آئے۔ چونکہ چاچا شام کے بعد کھڈیوں سے گھر واپس لوٹتا تھا۔ اس اثنا میں پینو اور میں اپنے بچوں کے سنگ خاصا وقت کھیل لیا کرتے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ بھائی جان اب پورے چار روپے کے کاریگر بن چکے تھے۔ میں چوتھی جماعت میں وظیفے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرکے اپنے اساتذہ کی داد تحسین کے ڈونگرے اٹھائے پانچویں جماعت میں جاچکا تھا۔ میرے ساتھ منیر کے علاوہ دو اور لڑکوں نے بھی وظیفہ حاصل کیا۔ گرمیوں کی ایک صبح چوبارے کے صحن میں بستر سے اٹھ کر نیچے آتے ہوئے معاً میری نظر اپنے گھر کی منڈیر میں سے باجی حلیمہ کی چھت پر پڑی۔ ان کی چھت پر ایک ہی کمرا تھا۔ کمرے کے دروازے پر لوہے کی زنجیر لگی ہوتی تھی۔ ہماری چھت کی منڈیر ایک اینٹ کی بنی ہوئی تھی اور ہر اینٹ کے بعد آدھی اینٹ کے برابر مربع سوراخ تھے، جن میں سے بہ آسانی آر پار دیکھا جاسکتا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں اور کمرے کے دروازے میں چند گز کا فاصلہ تھا۔ بھائی جان کا ایک ہاتھ کنڈی پر تھا اور وہ غالباً حلیمہ کے کان میں کوئی بات کہہ رہے تھے۔ لیکن منہ کا نشانہ شاید ٹھیک نہیں رہا تھا۔

اسکول سے واپسی پر میں نے اپنے اور دیگر گھروں میں غیر معمولی کھسر پھسر ہوتے محسوس کی۔ عصر کے بعد بحث مباحثہ ہونے لگا اور پھر ہمارے گھر میں آمدورفت بڑھنے لگی۔ جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ بھائی جان کو صبح کانا پھوسی کرتے ہوئے صرف میں نے ہی نہیں دیکھا بلکہ سامنے والے گھر سے چاچی عائشہ بھی چشم دید گواہ تھی اور وہ اس معاملے کو نبیڑنے کے لیے مجھے اپنا سیکنڈ ان کمان بنانے پر تلی بیٹھی تھی۔ عقدہ یہ کھلا کہ بھائی جان نے کانا پھوسی کرتے ہوئے احتیاط سے کام نہ لیا اور بجائے کان میں کہنے کے ذرا نیچے گردن پر کچھ کہہ گزرے، وہ بھی خاصا زوردار طریقے سے جس کے نتیجے میں گوری گوری جلد پر چونی کے برابر ایک گول سا سرخ عنابی رنگ کا نشان پڑ گیا تھا۔ سوائے میری اماں اور حلیمہ کی ماں کے ساری خواتین کی آنکھیں اس سرخ عنابی نشان کا جائزہ بڑی عرق ریزی سے لے رہی تھیں اور سوال پر سوال کیے جارہی تھیں۔ حلیمہ کہہ رہی تھی کہ اسے دُھدر نکل رہا ہے۔ اس کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کئی دنوں سے دھدر کے آثار نظر آرہے تھے۔ میری اماں نے بھی بغور ملاحظہ کرنے کے بعد کامل یقین کے ساتھ اپنا فیصلہ صادر کردیا کہ لڑکی کو بلاشبہ دھدر نکل رہا ہے۔ لیکن چاچی عائشہ ماننے والی نہیں تھی۔ مجھے سامنے پاکر جھٹ میرا بازو پکڑا اور پوچھنے لگی۔

”اوئے کاکے! اٹھا قسم رسول پاکؐ کی اور سچ بتا صبح تم نے کیا دیکھا تھا۔“

نہ جانے میرے جواب میں کون سی بوٹی کا نشہ ملا ہوا تھا کہ بیشتر خواتین کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا لیکن میری اور حلیمہ کی اماں کو چپ کے ناگ نے ڈس لیا۔ جب مجھ سے دھدر نکالنے کی تشریح کرائی گئی تو میں نے یوں وضاحت کی۔

”میں نے جب دیکھا، اس وقت بھائی جان باجی کے کان میں کوئی بات کررہے تھے، دھدر بعد میں نکلا ہوگا۔“

حالانکہ میرا جی یہ چاہ رہا تھا کہ میں انہیں بتادوں کہ بھائی، بات کان کے بجائے گردن میں کررہے تھے لیکن میں نے اپنی زبان کو مضبوطی سے دانتوں تلے دبائے رکھا۔ حلیمہ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ کنڈی سخت ہونے کی وجہ سے اس سے کھل نہیں رہی تھی لہٰذا لاچار ہوکر اس نے بھائی جان کو مدد کے لیے پکارا تاکہ بستر کمرے میں رکھے جاسکیں۔ شام ہوچکی تو برادری کے تمام مرد بھی ہمارے گھر میں جمع ہوگئے۔ اس صبح کا آغاز ایک سرگوشی سے کیا ہوا تھا کہ ہمارے گھر میں سرگوشیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ کسی مرد وزن کے لیے کرنے کو اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ ہم جس کسی کے نزدیک سرک کر کوئی بات سننے، سمجھنے کی کوشش کرتے بڑی بے رحمی سے شُشکار دیے جاتے۔ بالآخر عشا کے بعد بہت سی مٹھائی آگئی۔ ہوٹل سے سالن کا بڑا سا دیگچہ، کباب اور ڈھیر ساری روٹیاں بھی لائی گئیں۔ اپنے ہی دادا جان نے، جو خیر سے مولوی بھی تھے، بھائی جان اور باجی حلیمہ کا نکاح پڑھا دیا۔ ہم سب بچوں کو جب یہ بتایا گیا کہ یہ شادی ہے تو ہمیں بہت مایوسی ہوئی۔ ڈھول نہ باجے، بغیر منگنی کے چٹ بیاہ۔ وہ بھی ایسا پھس پھسا۔ بہت عرصہ بعد بھی چاچی عائشہ سے سامنا ہوتا تو وہ ضرور ہنستی اور مجھے کندھوں سے پکڑ کر کہتی۔

”ہاں بھئی کاکے! بتاؤ پھر دھدر کیسے نکلتا ہے؟“

اب میں شرمانے لگا اور سمجھ گیا کہ متذکرہ دھدر جس انداز میں نکلا وہ کوئی ایسا سادہ سا معاملہ نہیں تھا۔ بہرحال مجھے ایک خوشگوار تجربہ ہوا کہ اب تک کی زندگی میں میری یہ پہلی حماقت تھی جس پر بھائی جان نے مجھے کوئی سزا نہ دی۔

گھرداری کے کھیل میں، بھائی جان کے ہاتھوں پے درپے صدمے اٹھانے کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ منیر اور اختر نے اپنی ہی چھت پر الگ سے اپنی دنیا بسانا شروع کردی۔ چند ایک بار بہت اصرار کرکے ہمیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، جو ہم نے بصد شکریہ قبول کرلی اور دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کرکے میں اور پینو پار اتر گئے لیکن ان کی برساتی میں دو ہی چارپائیاں پڑی ہوتی تھیں، جن سے وہ صرف اپنا گھر بنا پاتے اور ہم دونوں، بے خانماں جوڑا، محض مہمان ہوا پڑا رہتا۔ ایک ہی گھر میں دونوں جوڑوں نے پیار محبت سے رہ کر ایثار، رواداری اور فراخ دلی کے اعلیٰ معیارات قائم کیے۔ درمیان میں کھیس سے پارٹیشن کرکے میزبان جوڑے نے مثالی انصار ہونے کی روایت زندہ کردی۔ مگر ہم نے خود ہی احساس کرلیا کہ اتنے چھوٹے گھر میں دو کنبوں کا رہنا آسان نہیں۔ اور پھر یہ امر ہماری انا اور وضع داری کے مروجہ تقاضوں کے بھی منافی تھا۔ اس کے علاوہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں اور پینو عیال دار بھی تھے۔ ہمارے دونوں کم سن بچے، پہاڑ کی سی بلندی عبور کرکے ہمراہ آنے سے ہمیشہ قاصر رہے۔ ہمیں بچوں کی یاد ستانے لگتی۔ پینو ناک پر انگلی رکھ کر ذرا سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتی۔

”ننھے کے ابا! خدا کا خوف کرلیا کرو۔ معصوم بچے اکیلے ہوں گے۔ کوئی چوٹ ہی نہ لگوالیں۔ جہاں بیٹھ جاؤ، تمہارا اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

اختر بول پڑتی۔

”بہن! اللہ سے خیر مانگو۔ کچھ نہیں ہوگا بچوں کو۔ ابھی کھانے کا وقت ہورہا ہے۔ بغیر کھائے بالکل نہیں جانا۔“ اپنے ”گھروالے“ کو گھور کر دیکھتے ہوئے مزید کہتی۔

”نیک بختا! روک لے مہمانوں کو۔ کھانا کھائے بغیر چلے گئے تو برادری میں ہماری بڑی بے عزتی ہوجائے گی۔“ گھروالا بھی ہمیں رکنے پر اصرار کرنے لگتا اور بڑی اپنایت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔

”نہ نہ بھائی صاحب! ہم نہیں جانے دیں گے۔ بڑے دنوں بعد آئے ہو۔ آج رات رہ جاؤ۔ بڑی باتیں کرنی ہیں۔ تمہارے بچے خیر سے دادا دادی اور تایا کے پاس ہیں، فکر کیوں کرتے ہو؟ اللہ مالک ہے۔“

پینو جواب دیتی۔

”بھائی جان! بچوں کے ساتھ تایا بڑی سختی کرتا ہے۔ آپ کو نہیں پتا۔ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔ ہمیں اس بندے کا ذرا بھی اعتبار نہیں۔ آپ اجازت دیں۔ زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے اور رات رہ کر جائیں گے۔“ میں اپنی ”گھروالی“ کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بھابی اختر!...... اور منیر یار! دعا کیا کرو۔ اللہ غیب سے مدد کرے۔ ساتھ ساتھ جوڑ کے گھر بنائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑوسی بن کے رہیں۔“

دونوں باری باری ”آمین“ کہتے اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں اور منیر گلے ملنے لگتے تو اختر اور پینو بھی بغل گیر ہوجاتیں۔ بڑی محبت اور خلوص سے رخصت کرتے۔ ہمارے دیوار سے پار اتر آنے تک ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتے رہتے۔ آخر میں معذرت کرنا نہ بھولتے کہ وہ ہماری صحیح طرح خدمت نہیں کرپائے۔

بھائی جان نے اچانک ایک دن ہماری نئی بستی پر دھاوا بول دیا۔ باجی حلیمہ دیوار پر سے جھانکتی رہی اور اس پار نہ اتری۔ پیشتر اس کے کہ بھائی جان بن بلائے مہمان کی طرح ہمارے دسترخوان پر پل پڑتے، خوش قسمتی سے عین اسی وقت منیر کی امی چھت پر آگئیں اور بھائی جان کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تم جوان مشٹنڈے ان چھوٹے چھوٹے بچوں میں کیوں گھسے چلے آئے ہو؟ بھاگو یہاں سے۔“

بھائی جان نے فوراً بہانہ گھڑا کہ وہ مجھے لینے آئے ہیں۔ میں نے ہاتھ اور سر زور زور سے نفی میں ہلایا اور بلند آواز میں خالہ سلمیٰ سے کہا کہ بھائی جان جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ ہمارا دسترخوان چٹ کرنے آئے ہوں گے۔ اس موقع پر بھائی جان نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا اور دیوار پھاند گئے۔

تھوڑی دیر بعد پینو اور میں نے میزبانوں سے رخصت چاہی تو انہوں نے حسب روایت کچھ دیر اور بیٹھنے پر اصرار کیا اور پھر اجازت دے دی۔ ہم دونوں اپنے گھر کی سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ بھائی جان دھڑ دھڑ اوپر چڑھنے لگے۔ میں نے خطرے کو بھانپ لیا اور چیخ چلّا کر اماں کو بتایا کہ بھائی ہمیں مارنے آرہا ہے۔ پینو میری پیٹھ سے چپک گئی اور کمر میں بازو ڈال کر رونے لگی۔ اتنے میں بھائی کی زوردار آواز سنائی دی۔

”میں اُدپر واش روم میں جارہا ہوں پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔ ہٹ جاؤ آگے سے۔“

اتنے میں وہ ہمارے سامنے آگئے اور میرے ساتھ چھچلتے ہوئے اندھا دھند سیڑھیاں پھلانگتے گزر گئے۔ ہم دونوں سنبھل نہ پائے اور لوٹنیاں کھا کر لینڈنگ پر آن گرے۔ حسنِ اتفاق سے لینڈنگ اور ہمارے درمیان دو ہی سیڑھیوں کا فاصلہ رہ گیا تھا، اس لیے زیادہ چوٹیں نہ لگیں، صرف خراشیں آئیں مگر پینو خوف اور دہشت کے مارے گلا پھاڑ کے رونے لگی۔ چھت میں بنے آٹھ دس فٹ مربع روشن دان کے سریوں میں سے بھائی نے جھانک کر بہ آواز بلند اماں سے کہا کہ جلدی میں گزرتے ہوئے کا کا ٹکرا گیا اور پینو اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی، اس لیے دونوں گر گئے۔ جان بوجھ کے دھکا نہیں دیا۔ اماں نے پینو اور میری خراشیں صاف کرکے ٹنکچر لگایا۔ اتنے میں ابا جان گھر میں داخل ہوئے اور سارا ماجرا جان کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بھائی سچ مچ ہی لیٹرین میں گھسے بیٹھے تھے۔ اباجی نے آواز دی تو وہ اندر سے بولے کہ پیٹ میں بڑا سخت مروڑ اٹھ رہا ہے۔ اباجی نے کہا۔ ”تم باہر آؤ، مروڑ ایک منٹ میں ٹھیک کردوں گا۔“ بھائی نے نکلنے میں دیر کردی تو ابا جان نے چارپائی گھسیٹ لی اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔ آخرکار بھائی پیٹ پکڑے ہوئے باہر نکلے اور روہانسے ہوکر بولے۔

”بڑی سخت قبض ہوگئی ہے، درد بڑا شدید ہورہا ہے۔“

اباجی نے ان کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لیٹرین میں ایک نظر ڈال کر الٹے ہاتھ سے تین چار ایسے زوردار تھپڑ رسید کیے کہ بھائی بلبلا اٹھے۔ اباجی نے ان سے پیٹ کے درد کے بارے میں پوچھا کہ آرام آیا یا نہیں۔ وہ اور زیادہ اونچی آواز میں رونے لگے تو مزید دو تھپڑ مار کر بولے۔ ”اس خوراک سے قبض بھی کھل جائے گی۔“

اگلے روز منیر کے والد صاحب نے چھت پر مستری مزدور لگا دیے، جنہوں نے رات گئے دیوار چھ فٹ اونچی کردی۔ سب سے اوپر گولائی میں سیمنٹ تھوپ کر کانچ کے ٹکڑے کھبو دیے۔ یوں بھائی جان کی بے جا دخل اندازی کا یہ نقصان ہوا کہ چھت پر سے میرا اور منیر کا رابطہ ناممکن ہوگیا۔ مگر اسکول میں ہماری دوستی مزید گہری ہوگئی اور کمرائے جماعت میں وہ میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے لگ گیا۔ میرا ہم نشین ہونے سے منیر کو یہ فائدہ ہوا کہ پڑھائی میں اس کی دلچسپی پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہوگئی اور نوماہی امتحانات میں چودھویں پندرھویں نمبر کے بجائے جماعت میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

کالج پہنچ کر میری اور منیر کی دوستی تو برقرار رہی مگر اس نے پری میڈیکل اور میں نے پری انجینئرنگ مضامین کا انتخاب کیا۔ ہم دونوں نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلی اور میری ضلع بھر میں اوّل پوزیشن آئی۔ منیر نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور میں بی ایس سی الیکٹریکل انجینئرنگ کرنے کی غرض سے پنجاب یونیورسٹی چلا آیا۔

وقت گزرتا گیا۔ میں نے اعزاز کے ساتھ الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس سی پاس کیا اور اسکالرشپ پر مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے یو ایس اے چلا گیا۔ وہاں سے بڑی پُرکشش مراعات پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی ملازمت حاصل کرکے مڈل ایسٹ آگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے قسمت نے میرے اوپر دولت کے دروازے کھول دیے ہوں۔ میرے کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وطن بہت مختصر وقت کے لیے چند ایک مرتبہ ہی آسکا۔ دراصل بھائی جان نے یہاں بیک وقت کئی منصوبے شروع کر دیے تھے جن کے پیٹ بھرنے کے لیے میرا پردیس میں رہنا ایک مجبوری بنتا چلا گیا۔ تاہم محبت کی سحر انگیز زنجیریں میرے دل ودماغ اور جسم وجان سے لپٹی رہیں۔ مجھے اماں، ابا، گڈی اور ننھا ہر وقت یاد آتے۔ باجی حلیمہ، بھائی جان، چاچیاں، تائیاں، پھپیاں، خالائیں، چاچے، تائے، خالو، ماموں، دادا جان، نانا جان، نانی جان، سب کزنز، محلے دار، اپنا شہر، اس کے مضافات اور اپنا وطن، اس کی مٹی، موسم، ہوائیں میرے رگ وریشے میں سمائی رہیں۔ غیر مشروط محبت جیسے یہ میری فطری مجبوری تھی۔ شاید میرے خدا نے میرا وجود تخلیق کرتے ہوئے اس میں محبت ہی بھر دی تھی۔ بیرونِ ملک غیروں کی ترقی، شان وشوکت، پرشکوہ عمارات اور کشادہ سڑکیں، مجھے متاثر ضرور کرتیں لیکن اپنے شہر کی تنگ گلیاں، چھوٹی چھوٹی ایک انچ موٹی اینٹوں سے بنی صدیوں پرانی عمارتیں، حویلیاں، مکان اور اپنا چوبارہ، اپنے لوگ۔ ان کی باتیں اور محبتیں میری روح میں سمائی رہیں۔ میں سوچتا۔ آخر میں اپنے وطن سے محبت کیوں نہ کروں؟

اس عرصہ میں منیر کے ساتھ بذریعہ فون اور خط کتابت میرا رابطہ رہا۔ اس نے ایم بی بی ایس کے فائنل امتحانات کے فوراً بعد اختر سے شادی کرلی تھی اور پوسٹ گریجویشن کے لیے یو ایس اے چلا گیا۔ گھر سے آنے والے خطوط کے ذریعے مجھے پتا چلتا رہا کہ منیر کے والد نے خوب جائداد بنالی ہے اور چاچا اللہ دتہ بھی ساری اولاد کو پڑھانے میں کامیاب رہا ہے۔ بڑا بیٹا اصغر بٹ اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہے۔ صرف اختر نے بی اے سے زیادہ نہیں پڑھا اور منیر سے شادی کرلی۔ منیر اکثر مجھے فون پر یاد دلایا کرتا کہ اس نے بچپن میں کھیلا ہوا گھر گھر کا ناٹک حقیقت میں بدل ڈالا ہے، لہٰذا میں بھی پینو سے کیے ہوئے عہد وپیمان کو عملاً سچ ثابت کر دکھاؤں۔ تعلیم مکمل کرکے اس نے فلاڈیلفیا کے امریکن اونوکالوجک اسپتال میں ملازمت اختیار کرلی۔ وہاں کی شہریت ملتے ہی بیوی اور دونوں بچوں کو بھی پاس بلالیا۔ اب ہر ویک اینڈ پر وہ مجھے فون کال کرتا اور یہ ضرور کہتا۔ ”یار! جلد کردو ناں پینو سے شادی۔ پھر ساتھ ساتھ گھر بنا کر رہیں گے۔ اختر اس کو بہت یاد کرتی ہے۔“

میری یادوں پر مبنی صرف کوئی فلم یا صرف البم ہی نہیں تھی جو دماغ میں محفوظ رہتی۔ بلکہ دل میں بسے محبت کے عظیم تاج محل کی ہر دیوار پر ان محبتوں، باتوں، یادوں اور چہروں کے دل فریب نقش کندہ تھے اور اس تاج محل کی راہداریوں، دالانوں، دریچوں اور باغیچوں میں ایک خوب صورت شہزادی ہر وقت موجود ہوتی۔ جب بھی میرا اس سے سامنا ہوتا، وہ دبے پاؤں میرے قریب آکر آنسوؤں سے نم لہجے میں سرگوشی کرتی۔

”گھر میں سب کچھ ہے کرماں والیا! بڑا اللہ کا فضل ہے، بسم اللہ کرکے اب لوٹ آ۔“

وہ شہزادی، چاچے تمے کی بیٹی، جس کے گھرانے کے افراد بلاشرکت غیر حسن کے بادشاہ تھے لیکن غربت نے ان کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا رکھی تھی۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ اربوں سالوں سے اپنی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ اس کی مصلحتیں وہی جانے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسا گورکھ دھندا ہے۔ اپنے بندوں کو نعمتیں بخشتے ہوئے کوئی چیز بے حساب دے دیتا ہے اور کچھ موخر کردیتا۔ چاچے تمے کا گزارہ حسن پر ہی تھا یا عزیز رشتہ داروں کی جانب سے ملنے والی درپردہ زکوٰۃ خیرات پر۔ میں جب بھی ڈرافٹ بھیجتا تو اماں کو لکھا کرتا کہ سب رشتہ داروں کا خیال رکھا جائے اور چاچے تمے کا خاص طور پر۔ میری غیر موجودگی میں یہاں میرے اس آخری جملے کا بڑا چرچہ رہتا تھا۔ سبھی کہا کرتے کہ سارا زور دراصل آخری چھ سات الفاظ پر ہے۔ بھائی جان کہتے کہ کاکے نے ان مخصوص الفاظ کی مہر بنوا رکھی ہے۔ اپنی ہر تحریر پر بڑے اہتمام سے اس کا ٹھپا لگا دیتا ہے۔

دیارِ غیر میں میرے ہم وطن ساتھی مجھے کہا کرتے کہ میں نوسٹیلجیا (Nostalgia) کے عارضے میں مبتلا ہوچکا ہوں اس لیے اب مجھے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس مشورے پر عمل کرنے کا سوچنے لگا اور تہیہ کرلیا کہ کمپنی سے میرے معاہدے کی معیاد ختم ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔ بس دو ماہ سے بھی کم عرصے کی بات تھی۔ انہی دنوں مجھے باجی حلیمہ کی پہلی اور آخری چٹھی ملی۔ اس نے لکھا تھا۔

قرآن کی عظمت

1935ء میں جرمنی بڑا طاقتور ملک تھا۔ ایک دفعہ انجیل کے کوئی...... چالیس نسخے وہاں کے پادریوں کے ہاتھ لگے۔ انہوں نے پڑھ کر دیکھے تو سبھی نسخے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ مسلمانوں کا قرآن دیکھتے ہیں، اگر وہ بھی اسی طرح تھا تو پھر یہ نسخے ٹھیک رہیں گے ورنہ غلط ہیں۔

انہوں نے چالیس کے بجائے دنیا کے مختلف ممالک سے ستر ہزار قرآن مجید اکٹھے کیے اور سالہا سال ان پر ریسرچ کرتے رہے لیکن ایک زبر، زیر اور پیش کی بھی غلطی نکال نہ سکے۔

مرسلہ: سلمان خان، ضلع بونیر

”پیارے بھائی کاکے! سدا سلامت رہو۔ تمہارے بھائی جان نے تمہاری ہدایت پر بڑی عمدگی سے عمل کیا ہے اور کسی رشتہ دار کا زیادہ خیال نہیں رکھا البتہ چاچے تمے کی خوب مدد کی ہے اور اسے پوری دس پاور لومز (Power Looms) لگوا دی ہیں۔ کسی کو بھنک نہ پڑنے دی اور پینو سے نکاح کرکے فیکٹری والی کوٹھی میں منتقل ہوگیا ہے۔ فیکٹری اور دونوں کوٹھیاں اس نے پہلے ہی اپنے نام لگوا رکھی ہیں۔ تم ابھی مزید رقم بھیجو۔ کیا خبر تمہارے بھائی نے ابھی دو شادیاں اور کرنی ہوں۔ ویسے بھی اب تمہیں واپس آنے کی زحمت نہیں کرنی چاہیے، خدا حافظ۔ تمہاری باجی حلیمہ۔“

یہ ایک ایسا بھونچال تھا جس نے میرے دل میں بسے محبت کے عظیم الشان تاج محل کی بنیادیں ہلا دیں۔ سب دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کسی بھی لمحے اس کے ملبے تلے دب کر مرجاؤں گا۔ چوتھے روز اوقات کار کے دوران ایک حادثے کے نتیجے میں شدید برقی صدمے کا شکار ہوگیا اور میرا بایاں ہاتھ کلائی تک جل کر ایک

بے جان اور ناکارہ گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہوگیا۔ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا بازو کہنی کے قریب سے کاٹ دیا گیا۔ میں اپنے ادارے اور بیمہ کمپنی سے ڈھیروں دولت سمیٹ کر گھر واپس آ گیا۔

میں اپنے پیچھے جس طرح کا شہر، محلہ، گلی اور گھر چھوڑ گیا تھا، اب وہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ شہر سے باہر سڑکوں پر اور بھی بہت سے بنگلے بن چکے تھے۔ کئی شناسا چہروں پر سے غربت کی دھول اترنے کے ساتھ ساتھ محبت کی چمک بھی ڈھل چکی تھی۔ ہماری کھوہ والی نئی کوٹھی بڑی کشادہ اور عالی شان تھی، جس میں ابا اور اماں کے ساتھ میں رہائش پذیر ہوا۔ گڈی اور ننھا تعلیم کی غرض سے لاہور میں مقیم تھے۔ میں دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ میں نے ملک کے بہترین طبی مراکز سے چیک اپ کرایا۔ بڑی باریکی سے تحقیق و تشخیص کی گئی تو ماہرین نے حتمی رائے دی کہ برقی صدمے کے باعث میرے خون کے اندر سرخ ذرات جل گئے ہیں۔ ان کے مزید پیدا ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ وطن میں علاج کی سہولت میسر نہیں۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ بیرونِ ملک علاج کرانے جاؤں جہاں شاید کندھے کے قریب سے بازو کاٹ دیا جائے تو زندگی میں چند برسوں کا اضافہ ممکن ہے۔

میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ میں ٹکڑوں میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں ایسی حالت میں اپنی دونوں ماؤں کو چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا۔ ایک میری ماں جس سے میں نے جنم لیا اور دوسری میری مادر وطن۔ ایک کے پہلو سے لگ کے اور اس کی ممتا بھری گود میں سر رکھ کر اپنی آخری سانسیں لینا چاہتا ہوں۔ دوسری کے دامن میں ابدی نیند سونے کا متمنی ہوں۔ ایک تیسری ہستی، جس کی روح درحقیقت ازل سے میری روح سے جڑی ہوئی ہے۔ میں زندگی کے آخری لمحات میں اسے اپنی بصارت میں سموئے رکھنا چاہتا ہوں۔ جو پردیس میں تو ہمہ وقت میرے پاس تھی ہی اور اب ہر ساعت میرا طواف کرتی رہتی ہے۔ بغیر آنکھ جھپکے مجھے دیکھتی رہتی ہے۔

تپ دق کی ماری ہوئی سردیوں کی اس سہ پہر کو منیر اور اختر مجھے ملنے کے لیے اچانک کھوہ والی کوٹھی پہنچ گئے۔ دونوں کی بڑی آن بان والی جوڑی بنی تھی۔ مجھے دیکھ کر رنجیدہ ہوگئے مگر منیر جلد ہی سنبھل گیا اور قدرے شوخ ہو کر باتیں کرنے لگا، جو درحقیقت بچپن کی دل گداز یادیں تھیں۔ اس نے بتایا کہ میری بیماری کے بارے میں سن کر بیوی بچوں سمیت صرف مجھے ملنے کی خاطر امریکا سے آیا ہے۔ ان لمحات میں میرے آس پاس چھائی ہوئی افسردگی چھٹ گئی اور خوش گوار سی ہوائے بسیط چلنے لگی کہ دوست دیرینہ سات سمندر پار سے، اندوہ کی ان گھڑیوں میں مجھے ملنے چلا آیا ہے۔ تاہم یہ احساس بھی جاں گزا تھا کہ میں اس کی طرح بچپن میں جس کے ساتھ گھر گھر کھیلا کرتا تھا، حقیقی زندگی میں گھر والی بنانے سے محروم رہ گیا۔ منیر نے میری فائل منگوائی اور بہت دیر تک تمام رپورٹوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ رات کا کھانا ہم نے ایک ساتھ کھایا اور وہ میری فائل ہمراہ لے گیا۔ اگلے روز تمام کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ نقول تیار کروائیں اور اپنے لیے فائل تیار کرلی، اصل مجھے واپس کردی۔ اس کی چھٹی ایک ماہ کی تھی، مگر دس روز بعد ہی واپس چلا گیا۔

کھوہ والی کوٹھی میں میرا دل نہ لگا اور میں واپس محلے میں رہنے آ گیا ہوں۔ گو چوبارہ بھی اب بنگلے جیسا ہی ہے۔ لیکن اپنے اردگرد چھوٹے بڑے مکانوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔ جیسے سچے اور کھرے سجن ایک دوسرے سے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کے کھڑے ہوتے ہیں۔ اماں اور ابا مجھے ایک گھڑی کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ وہ ماں جس نے میری زندگی کے ایک ارب لمحات میں کم از کم ایک ارب مرتبہ میرے جینے کی دعائیں کی ہوں گی۔ بڑی عاجزی سے اللہ کے حضور میرے لیے خیر مانگی ہوگی۔ اسی ماں کے سامنے میں برف کی ڈلی کے مانند گھلتا چلا جارہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے دامن میں، ہتھیلیوں میں اور دل کے نہاں خانے میں کہیں بھی چھپا کے اب رکھ نہیں سکتی۔ جتنی سانسیں میں جیوں گا، وہ اسی طرح اپنی بے بسی پر ان گنت آنسو بہاتی رہے گی۔ میرے ابا مجھے حوصلہ دیتے ہوئے چہرے کا رخ دوسری جانب موڑ کر آنسو پونچھتے ہیں۔ میں تو حوصلہ ہارا ہی نہیں۔ میں اب بھی مسکراتا ہوں۔ سب سے باتیں کرتا ہوں۔ میرا جسم بستر پر ہوتا ہے لیکن میں خود چوبارے پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں چارپائیوں سے بنے گھر کے دروازے پر لٹکے چادر کے پردے کو اٹھا کر کہتا ہوں۔

”ہاں بھئی کرماں والی! کچھ ہے گھر میں کھانے کو؟ آج بڑی بھوک لگی ہے۔“

دوپٹے کے گھونگٹ میں سے دو نیلے ستارے چمکتے ہیں اور گلاب پر رکھی نرم پنکھڑیاں حرکت کرتی ہیں۔

”بسم اللہ کروں، تو بیٹھ تو سہی کرماں والیا! سب کچھ ہے اللہ کے فضل سے۔“

لیکن اب نیلے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ وہ آنسوؤں میں دھندلا گئے ہیں۔ گلاب پر رکھی نازک پنکھڑیاں مرجھا چکی ہیں۔ میرے دل میں کھنڈر بنے تاج محل کے کسی تاریک گوشے میں سے ایک سوال بدروح کی طرح میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔

”جب یہاں کچھ نہیں تھا تو اللہ کا بڑا فضل تھا۔ اب سب کچھ ہے لیکن اللہ کا فضل کہاں رخصت ہوگیا؟“

کاروبار میں بے پناہ وسعت اور مصروفیت کے باعث بھائی جان ہمیں ملنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے۔ ان کا بیٹا گڈو اور باجی حلیمہ ہمارے پاس ہی رہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے گھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کاروبار، فیکٹری اور کوٹھیوں کا سوال کھڑا ہوگیا۔ ساری برادری کے مرد اور خواتین نے بھائی جان کو حاضر کرلیا تو وہ اپنے روایتی انداز میں بغیر کسی لگی لپٹی کے بولے۔

”بے شک سب کچھ کاکے کا ہے لیکن اب نام یا ملکیت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بے چارہ بیمار ہے۔ کل کلاں کچھ ہوگیا تو پھر سے سارا تردد کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس بیماری کا کوئی علاج نہیں۔“

اماں نے دوہتھڑ پیٹنا شروع کردیا۔ وہ جھولی پھیلا کر رو رو کے بین کرنے لگیں اور بے اختیار ان کے منہ سے بددعائیں نکلیں۔

”وے اچھو! تو مرجائے۔ تجھے پھڑکی پڑے اور کاکا شالا جگ جگ جیئے۔“

میری روح کانپ گئی اور آنکھیں چھلک پڑیں۔ بھولی ماں اللہ سے اب کیا مانگ رہی ہے؟ اماں کو غش پڑ گیا۔ ابا میرے اوپر لیٹ گئے۔ میرے لکڑی کی طرح سوکھے ہوئے بدن اور چہرے پر آنسوؤں بھرے بوسے برسانے لگے۔ میری خالائیں، چاچیاں، تائیاں، پھپھیاں، ممانیاں اور چھوٹی بڑی لڑکی سب دھاڑیں مار کے رونے لگیں۔ مرد سب اشک بار ہوگئے۔ بھائی جان باہر نکل گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مرنے سے قبل ہی آنسوؤں کے سمندر میں غرق ہو جاؤں گا۔

پینو اپنے گھر کا رستہ بھول گئی ہے۔ اپنا گھر اور فیکٹری والی کوٹھی اس کی زندگی کے نقشے سے حذف ہو چکی ہے۔ وہ کانچ کی نازک گڑیا جیسے شفاف پانی سے ڈھلا لطیف پیکر، اشکوں سے بھرا کوئی جام، بات بات پر چھلک جاتی ہے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے یہی ایک بھیگا سوال۔

”کرماں والیا! تو کیا لینے گیا پردیس؟ میں تیری ہی کمائی کی دس پاور لومز کے عوض چپ چپاتے بک گئی، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں نے آگ لگانی تھی کوٹھیوں کو؟ تیرے ساتھ میں سرکنڈوں کی جھگی میں ساری عمر بتا دیتی۔ تیرے بعد تائی اور تایا نے میری سار نہ جانی...... کاکے!...... تو ایسا پردیس گیا، پھر مکھڑا نہ موڑا۔ یہی ہے تیری سمندر پار کی کھٹی کمائی؟ شہزادوں جیسا تھا جب یہاں سے گیا، موت سہیڑ کر آ گیا۔“

میں چپ ہو جاتا ہوں۔ میں نے اسے پردیس میں کبھی نہیں بھلایا تھا۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بھلایا تھا۔ مجھے اپنی گلیوں کی اونچی نیچی وہ اینٹیں بھی یاد رہیں جن سے ٹھوکر کھا کر بچپن میں کئی بار گرا تھا۔ میرے پاؤں کی انگلیوں اور گھٹنوں پر ہر بار اسی جگہ چوٹ لگتی تھی جو پہلے ہی زخمی تھیں۔ زخم، جن پر بہ مشکل کھرنڈ بنے ہوتے، پھر سے لہولہو ہو جاتے۔ پردیس میں اپنے گھٹنوں پر ان زخموں کے نشان دیکھ کر پیار سے سہلانے لگتا تھا۔ میں ان لوگوں کو کیسے بھول سکتا تھا جن کی محبت کے امرت سے میرا وجود نشوونما پاتا رہا اور روح سیراب ہوتی رہی۔ ہمارے مابین بچپن کی محبت کا جو ان مٹ اور انمول ایک رشتہ تھا یا شاید ایسی محبت جو بچپن سے بھی پہلے جب ہمارے وجود ابھی عدم میں تھے، میں کیسے بھول سکتا تھا؟ ایسی محبت کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔ اتنا کسی پتھر کو بھی چاہا جائے تو وہ پھول بن جائے۔ میرا خمیر ہی محبت سے اٹھایا گیا تھا۔ میرا اب بھی یہی پختہ اعتقاد ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں وہی رول ادا کیا ہے جو کاتبِ تقدیر نے مجھے تفویض کردیا تھا، میرے ایک شخص کی محنت نے کئی گھرانوں کی کایا پلٹ دی۔ لوگ جذبوں کی قدر کیوں نہیں کرتے۔ میری زندگی بھر کی کمائی پر میری محبت میں بہا کسی آنکھ سے ایک آنسو بھاری ہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ سب ہی مجھ سے بے انت محبت کرتے ہیں۔ ہر آنکھ میری محبت میں روئی ہے۔ میرے آس پاس ان آنسوؤں کی دبیز دھند میں میرے سارے دکھ، صدمے اور محرومیاں اوجھل ہوگئی ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے؟ محبت کے سوا ایسے کرشمے کہیں نہ ہوئے ہوں گے اور پھر سدا کوئی کب جیا ہے؟

میں اب اس لاغر جسم کے ساتھ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے موت سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ موت میری غم گسار ہے، میری ساتھی اور میری آخری محبت، جو مجھے اپنی آغوش میں لے کر جسمانی آزار سے نجات دلا دے گی۔ موت ہی وہ واحد دروازہ ہے جس سے گزر کر میں اپنے خالق کے روبرو پیش ہو جاؤں گا۔

بھائی جان نے پینو کو طلاق دیتے ہوئے کہا کہ اس کی

روح تمام عرصہ کہیں اور رہی اور جسم ان کے پاس۔ انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق ریمارکس دیے۔

”تم میں ہے ہی کیا؟ بس چمڑی سفید ہے۔ مجھے ایسی ہی لگی ہو جیسے کسی مریض کے لیے سوجی سے بنائی گئی پھیکی اور بدمزہ کھیر، جو تیاری کے مرحلے میں کچی رہ گئی ہو۔ تمہارے مقدر میں ٹنڈا لکھا تھا۔ میں ناحق خوار ہوا۔“

اب اس کی ایک آرزو ہے کہ چند لمحے، دن، مہینے، جتنی بھی مہلت زندگی دے، محبت کے اسی گلستان میں چاہت کے اسی نخلستان سے صدیوں کی پیاسی روح آخری بار پیاس بجھائے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں بسا محبت کا تاج محل شکستگی کے باوجود ابھی منہدم نہیں ہوا اور وہ حسین شہزادی جو اس کی راہداریوں میں گزشتہ زندگی کے پورے عرصے میں مسلسل دبے پاؤں ادھر سے ادھر چلتی رہی، وہ پھر سے لوٹ آئی ہے۔ وہ شاید ادھر ہی تھی، کہیں آس پاس۔ وہ دہلیز پر کھڑی مسلسل دستک دے رہی ہے۔ میں نے بستر مرگ سے اٹھ کر دروازہ نیم وا کیا ہے اور اندر آنے کے لیے بے تاب روح سے مخاطب ہوں۔

”محبت کا یہ تاج محل کسی بھی لمحے زمین بوس ہونے کو ہے۔ اس میں ٹمٹماتا چراغ شاید اسی گھڑی گل ہو جائے۔ تو لوٹ جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری عمر کے اندھیرے اور سناٹے تیرا مقدر بن جائیں۔“ اس نے اپنی کومل انگلیوں کی پوروں سے کواڑ کا کنارہ تھام لیا ہے، مبادا میں اسے بند کردوں۔ وہ بھیگے ہوئے اداس لہجے میں کہتی ہے۔

”محبت کی لو کبھی نہیں بجھتی، خواہ وہ پوری زندگی میں ایک ساعت کے لیے ہی جلی ہو۔ روحوں میں اس کی حیات افروز حرارت محفوظ ہو جاتی ہے۔ میں اپنی باقی تمام عمر اسی ایک ساعت کے نام کرتی ہوں۔ اور تو کہ جس نے مجھے سدا سے بے حساب چاہا ہے۔“

میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔ میں ہار جاتا ہوں۔ آخری بار کہتا ہوں۔

”پینو! ایسی محبت رسموں کی پابند نہیں ہوتی۔ ایک بار تو مطلقہ ہوئی اور اب بیوہ ہونے چلی ہے۔“ وہ نہیں مانی۔ ہر کوئی اس کا ہم نوا ہے۔ میں کس کس کا کہا موڑتا۔ آج تمام دن گھر میں جشن کا سا سماں رہا۔ مجھے اور پینو کو سچ مچ کا دلہا دلہن بنایا گیا۔ بوڑھی اور معزز خواتین نے بھی جھومر ڈالا اور خوشی کے گیت گائے۔ چھوٹے بڑے سب ہی ایسے خوش تھے جیسے میں نے واقعی ایک نئی اور طویل زندگی کا آغاز کر دیا ہو۔ یوں جیسے سب تصور کے سحر میں کہیں کھو گئے ہیں۔ سہ پہر کو تقریبات اپنے جوبن پر تھیں تو میں نے بستر پر لیٹے لیٹے محسوس کیا کہ جیسے میرے دل کی دھڑکن بہت سست ہو گئی ہو۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے بھرپور کوشش سے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا۔ تب اللہ کا مہربان روپ میرے سامنے آگیا۔ میں نے سرگوشی کی۔ ”اے میرے رب! آج کے دن میرے پیاروں کی خوشیاں ادھوری نہ رہ جائیں۔“

رات کا آخری پہر ہے۔ پینو نے ایک لمحے کو بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ وہ میرے پاس بیٹھی مسلسل مجھے دیکھ رہی ہے۔ شاید اس کے دل میں یہ وسوسہ ہو کہ کہیں وہ آنکھ جھپکے اور موت مجھے اپنے ہمراہ لے جائے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی اچانک بج اٹھی تو پینو لرز گئی۔ کپکپاتے ہاتھ سے ریسیور اٹھالیا۔ میرے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس سے کہا کہ موت کا فرشتہ آنے سے پہلے فون پر اطلاع نہیں دیا کرتا۔ اس نے ”ہیلو“ کہا اور یوں خاموش ہو گئی گویا دوسری جانب سے ہولڈر کرنے کو کہا گیا ہو۔ میری بات کا جواب نہیں دیا۔ قدرے سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جی!...... ہاں جی...... السلام علیکم بھائی جان۔ ویسے ہی ہیں جیسے آپ دیکھ کر گئے تھے۔ ہاں جی! ہماری شادی ہو گئی ہے...... خیر مبارک...... اللہ کرے، آپ کی زبان مبارک۔“ اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وفور جذبات سے آواز بھرا گئی اور اتنا ہی کہہ پائی۔ ”آپ خود اس کو بتائیں۔“ ریسیور میرے کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”منیر بھائی۔“ میرے کان میں منیر کی آواز سنائی دی۔

”فوراً ویزا لگواؤ اور بھابی پینو کو ساتھ لے کر آنا۔ میں نے ضروری کاغذات تجھے بھجوا دیے ہیں۔ میڈیکل بورڈ نے تیری ساری رپورٹیں پڑھ کر رائے دی کہ بیماری قابلِ علاج ہے۔ تمہیں بتا دوں، یہ امریکا کا پہلا کینسر اسپتال ہے جو 1904ء میں قائم ہوا تھا۔“ قدرے اونچی آواز میں ہنسا اور دوبارہ بولنے لگا۔ ”اوئے کاکے! تیار ہو جاؤ۔ اختر اور میں نے سارا پروگرام ترتیب دے لیا ہے۔ تم دونوں کے ساتھ یہاں گھر گھر کھیلنے کا...... بس تم دونوں اپنے گرم لباس ساتھ لے آؤ۔ باقی چارپائیاں، کھیس، چادریں، دریاں پوری کرنا ہمارا ذمہ۔“

کال اختتام پذیر ہوئی تو دور کی مساجد میں ہونے والی فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ اسی لمحے سڑک کے پار مسجد گلزار مدینہ کے اسپیکر سے حافظ بشارت احمد کی باٹ دار آواز فضا میں گونج اٹھی۔ ”اللہ اکبر۔“

چلتر

بابر نعیم

چلتر بازیوں میں اگرچہ مرد بھی کم نہیں ہوتے مگر اس معاملے میں عورت کے مقام کو ان کی گرد بھی نہیں چھو سکتی... اس نے بھی اس حقیقت کو سو فیصد سچ کر دکھایا... اگر ایسا جھوٹ نہ ہوتا تو ویسا سچ بھی سامنے نہ آتا۔

محبت اور فریب کا ایک دلچسپ سنگم

ویٹرس نے بل کے ساتھ دو فارچیون کوکیز بھی میز پر رکھ دیں۔ دل کی شکل کے کاغذ میں لپٹے ہوئے یہ بسکٹ ویلنٹائن ڈے کی خوشی میں اضافی ٹریٹ کے طور پر تھے۔ کیتھی اس دبلی پتلی ویٹرس کی جانب دیکھتے ہوئے یوں مسکرا دی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

جیف سے صبر نہ ہوسکا۔ اس نے اپنی قسمت کا حال جاننے کے لیے ایک فارچیون کوکی اٹھالی اور اس کا ریپر کھولنے لگا۔ اس کاغذ کی تہ کھول کر اس پر لکھی تحریر کو پڑھتے

ہی جیف کا چہرہ کمہلا گیا اور مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''کیا ہوا؟'' کیتھی نے پوچھا۔

جیف نے جواب دینے کے بجائے وہ کاغذ کیتھی کی جانب بڑھا دیا۔

کیتھی نے کاغذ لے کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔

''تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ کسی سے کچھ بھی مت کہنا۔ تم فوری طور پر شہر چھوڑ دو اور کبھی یہاں واپس مت آنا۔ پھر دہرایا جاتا ہے۔ کسی سے کچھ بھی مت کہنا......''

''یہ ایک مذاق ہے، جیف۔'' یہ کہہ کر کیتھی نے جیف کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں طائرانہ انداز میں ہال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ''جیف!'' کیتھی نے اس کے بازو کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جیف تم مجھے خوف زدہ کررہے ہو!''

تب جیف نے اپنی نگاہیں کیتھی کے چہرے پر جما دیں۔ ''میں ...... مجھے کچھ نہیں معلوم!'' جیف کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

کیتھی حیرت سے جیف کو دیکھنے لگی۔

''ہاں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' جیف نے ایک بار پھر متجسس نظروں سے ہال میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے ہفتے مجھے دفتر میں بھی بالکل ایسی ہی تحریر موصول ہوئی تھی۔ تب میں نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن اب میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''رکو!'' کیتھی نے کہا۔

''تم نے یہ تحریر پڑھ لی۔ اس میں لکھا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔'' جیف نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''کسی نے تمہارے ساتھ یقینی طور پر عملی مذاق کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے جب کسی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا کہ وہ تمہاری جان لینے کے درپے ہوجائے تو پھر تمہیں خوف کیوں محسوس ہورہا ہے؟'' کیتھی نے ایک بار پھر وہ تحریر پڑھتے ہوئے جیف کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یا تم نے کسی کے ساتھ واقعی کچھ کیا ہے؟''

جیف کے ہاتھ پسیج رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پتلون سے پونچھا اور آگے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے لازماً کسی نہ کسی کو ناراض کیا ہوگا۔ شاید اپنے کام پر...... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہی میری کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ مجھے بس فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بیس اور ایک پانچ ڈالر کا نوٹ میز پر اچھال دیا اور بیرونی دروازے کی جانب لپکا۔

کیتھی نے بھی اپنا پرس اور کوٹ اٹھایا اور جیف کے پیچھے تیزی سے چل پڑی۔

''رکو جیف۔'' اس نے دوڑتے ہوئے آواز دی۔

جیف بہ دستور تیز تیز چلتا رہا۔

کیتھی نے اس کے برابر میں پہنچ کر اس کا بازو تھام لیا اور ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس سے بولی۔ ''تمہیں پولیس کو فون کرنا چاہیے۔''

''تحریر میں کہا گیا ہے کہ کسی سے کچھ بھی نہیں کہنا۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟'' جیف نے اپنی رفتار کم کیے بغیر کہا۔

''اتنی بلند آواز سے مت کہو جیف۔ لوگ ہمیں گھور رہے ہیں۔'' کیتھی نے جواب دیا۔

جیف نے اسے ایک گلی میں کھینچ لیا۔

''بات کیا ہے؟'' کیتھی نے اصرار کیا۔

''میں تمہیں نہیں بتا سکتا!''

''ہم گزشتہ چھ ماہ سے پابندی سے ملاقاتیں کررہے ہیں اور اب مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میں تمہیں جانتی تک نہیں ہوں۔'' کیتھی نے شکایتی لہجے میں کہا اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹ گئی۔ ''شاید یہ میری غلطی تھی۔''

''نہیں، رک جاؤ...... میں......''

کیتھی رک گئی اور ٹانگیں پھیلا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنا سر بہ دستور ایک طرف یوں گھمایا ہوا تھا جیسے ناراضی کا اظہار کررہی ہو۔

''اوکے۔'' جیف نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ چند سال قبل میں نے ایک ایسا کام کیا تھا جس کے نتیجے میں کوئی اور پکڑا گیا اور اسے جیل ہوگئی...... اور ہوسکتا ہے وہ گزشتہ ہفتے جیل سے رہا ہوگیا ہو...... اور شاید اس کے خیال میں میرے پاس ایسی کوئی چیز ہے جو اس کی ملکیت ہے۔''

تب کیتھی اس کی جانب گھوم گئی۔

جیف نے ایک گہرا سانس لیا اور کیتھی کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔ ''آئی ایم سوری۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔''

''تم یہ کیا باتیں کررہے ہو؟''

''میرے بارے میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو تم نہیں جانتیں...... اور تمہارا نہ جاننا ہی بہتر ہے۔'' جیف نے کہا۔

''لیکن......''

''آئی ایم سوری۔ مجھے شہر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' کیتھی نے کہا۔

''نہیں۔'' جیف نے اپنے ہاتھ کیتھی کے شانوں پر رکھ دیے۔ ''اگر اس نے مجھے تلاش کرلیا تو وہ مجھے...... بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اوہ گاڈ! میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اس کا انجام اس طرح سے ہو۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں، کیتھی!''

کیتھی کچھ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''تم کہاں جاؤ گے؟''

''بہتر یہی ہے کہ تم لاعلم رہو!''

''لیکن اگر کچھ ہوگیا تو پھر؟ کوئی تمہیں کہاں تلاش کرے گا؟ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں گی؟'' کیتھی نے بے بسی سے کہا۔

جیف ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔ ''تمہیں وہ کیبن یاد ہے جہاں میں تمہیں ہماری تیسری ڈیٹ پر لے گیا تھا؟ وہ جو گرانڈ فادر ماؤنٹین کے پاس ہے؟''

''روٹ تین سو بیس سے پرے؟''

''ہاں وہی، میں نے اس شخص کو اس کیبن کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ میں جب تک یہ فیصلہ نہیں کرلیتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں کہاں جا سکتا ہوں، اس وقت تک وہاں محفوظ رہوں گا۔'' جیف نے کہا۔

''اوکے لیکن مجھے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے کہ تم نے واقعی چوری کی تھی۔ ایسی حرکت وہ شخص کبھی نہیں کرسکتا جس سے میں محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کیتھی نے جیف کے ہاتھ تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہارے پاس واقعی ایسی کوئی چیز ہے جو وہ شخص حاصل کرنا چاہتا ہے؟''

جیف نے قدرے تذبذب کے بعد اقرار کرلیا۔

''ہاں۔''

''اور وہ شے وہاں کیبن میں چھپی ہوئی ہے؟''

جیف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیتھی نے بے ساختہ جیف کا منہ چوم لیا اور بولی۔ ''کیا میں تمہیں دوبارہ کبھی دیکھ سکوں گی؟''

''شاید نہیں، یا ہو بھی سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن جب یہ معاملہ ختم ہوجائے گا تو مجھے امید ہے کہ ہم دونوں پھر مل جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے جیف نے کیتھی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بے ساختہ پیار کرنے لگا۔ وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے رہے۔

بالآخر جیف نے کیتھی کو علیحدہ کردیا اور گلی میں دوڑ پڑا۔ گلی کے باہر فٹ پاتھ پر پہنچ کر اس نے چوکنا انداز میں سڑک پر دائیں بائیں دیکھا اور پھر تیزی سے بائیں جانب گھوم کر کیتھی کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

کیتھی بھی آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے گلی سے باہر سڑک پر پہنچ گئی۔ اس نے سڑک پر پہنچ کر محتاط نظروں سے دونوں اطراف کا جائزہ لیا اور وہیں رک گئی۔ پھر اس نے اپنے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک فون نمبر ملایا۔

دوسری جانب سے فون اٹھانے پر وہ گویا ہوئی۔ ''وہ اپنے کیبن کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔'' وہ چند سیکنڈ تک سنتی رہی، پھر بولی۔ ''اس نے بتایا کہ رقم اس نے وہیں چھپائی ہوئی ہے۔'' پھر وہ مزید سنتی رہی۔

''اوکے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کل دوپہر بارہ بجے میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گی۔ پھر ملاقات ہوگی اور ہم تمہاری کامیابی اور انتقام کا جشن اسی کیبن میں منائیں گے سویٹ ہارٹ!''

* * *

قابلِ تقلید

☆ایک میاں بیوی آپس میں بہت بڑا جھگڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اچھے موڈ میں تھے تو انہوں نے سوچا کہ پڑوسیوں سے چل کر پوچھنا چاہیے کہ وہ کبھی کیوں نہیں لڑتے، تاکہ ان کے طریقے پر عمل کرکے ہم بھی اس روز روز کی تو تکار سے بچ جائیں، چنانچہ پڑوسی نے استفسار پر بتایا کہ ہمارا جھگڑا اس لیے نہیں ہوتا کہ سارے بڑے بڑے فیصلے میں خود کرتا ہوں جبکہ چھوٹے چھوٹے معاملات میری بیوی کے اختیار میں ہیں اور ہم نے کبھی ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیا۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت چاہی تو پڑوسی بولا کہ تمام بڑے فیصلے مثلاً امریکہ افغانستان سے جائے گا یا نہیں، کشمیر کب آزاد ہوگا اور یہ کہ صدر بش کو اس بار الیکشن جیتنا چاہیے یا نہیں، میں خود کرتا ہوں جبکہ یہ چھوٹے چھوٹے کام میری بیوی کے اختیار میں ہیں کہ آج پکانا کیا ہے، بچوں کی شادیاں کہاں کرنی ہیں اور کیا میرے والدین اور بہن بھائی میرے گھر آسکتے ہیں یا نہیں اور میں نے کبھی ان معمولی باتوں میں مداخلت نہیں کی۔ اس لیے ہمارا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔

مرسلہ: ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل، نسووال کھوکھران

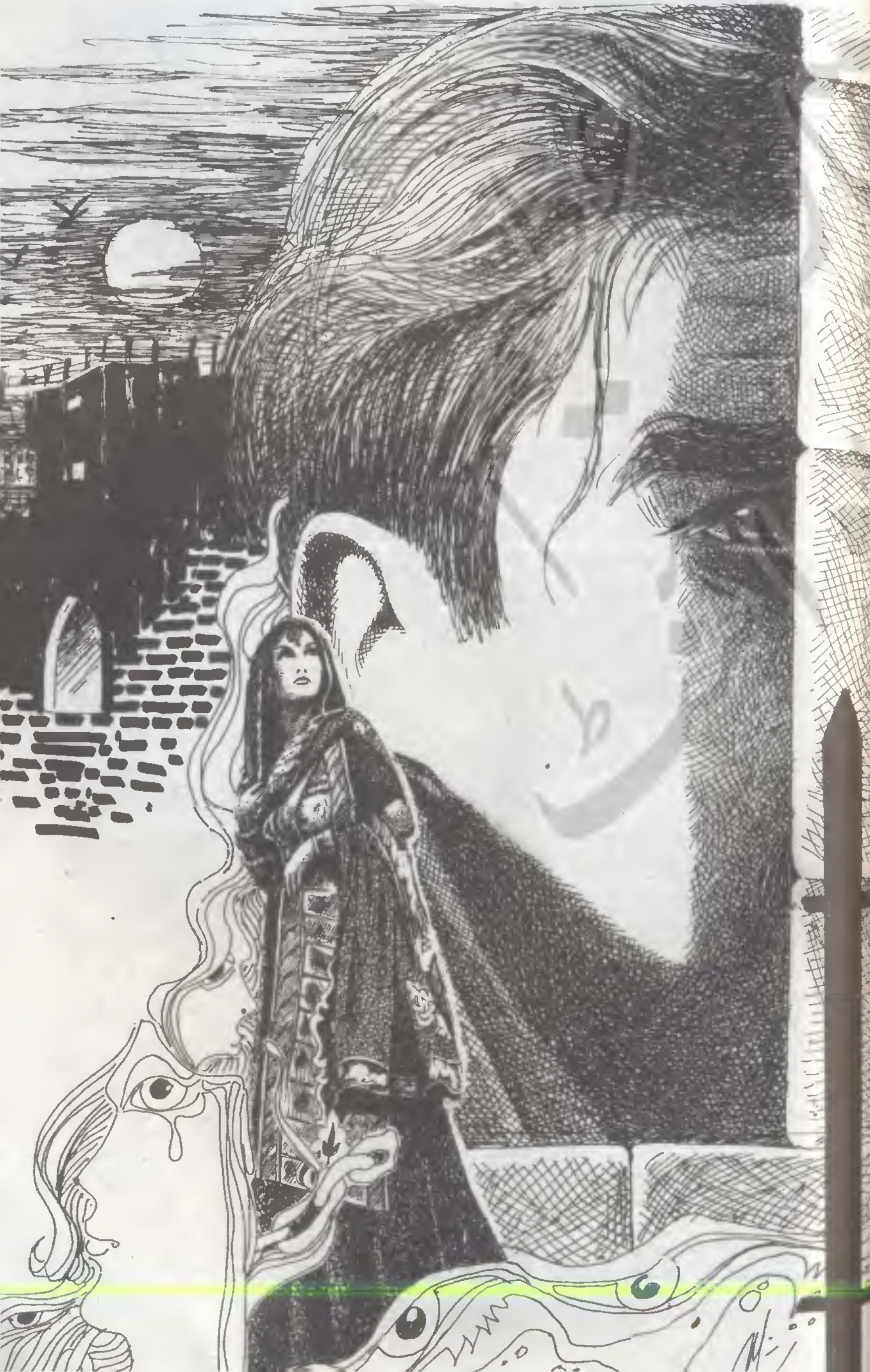

جذباتی بھونچال، سرکش موجوں کے درمیان نمو پانے والے رشتوں کی داستان

آخری مرحلہ

ایچ اقبال

دل کے معاملات میں اکثر عقل و ہوش مندی میٹھی نیند سو جاتی ہے اور جب آنکھ کھلتی ہے تو دن ڈھلتی شام کی چادر میں لپٹ کر رات کے پہلو میں چھپ جاتا ہے لیکن اندر کی وحشت پھر بھی کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ اس کے تصور میں بھی وہ دو آنکھیں ہر وقت اسے اپنے حصار میں رکھتیں جن میں بڑی نمایاں تحریر تھی ”ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک... بہت ہیں مرحلے باقی ہمیں زنجیر کرنے تک“ کسی کو شدتوں سے چاہنا، پھر اپنی دعائوں میں طلب کرنا اور اگلے پڑائو پر اسے پالینا، اگرچہ کٹھن مراحل کے بعد یہ مِوقع نصیب ہوتا ہے مگر ان سے بھی بڑی آزمائش تو اس ساتھ کو برقرار رکھنے میں درپیش ہوتی ہے کیونکہ جب توازن کچھ اس طرح ہو کہ ایک دل میں محبت ہو اور دوسرے میں حقارت تو زبردستی کے یہ سودے کب کہاں کیا رخ اختیار کرلیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ خوف کے سائے میں پلنے والے ایسے بے کل جذبوں نے ہمیشہ کسی نہ کسی جرم کو جنم دیا ہے۔ اس کی دسترس میں بھی وہ نہیں تھا جو اس کی طلب اور جستجو میں شامل تھا۔ بس ایک خواب تھا جو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا... ایک بے نام کسک، ایک مچلتی خواہش تھی جو دھیرے دھیرے اسے مایوسی کے غار میں دھکیل رہی تھی۔ وہ دونوں مخالف سمتوں کے مسافر تھے جانے کیسے ایک موڑ پر ٹکرا گئے۔ بس چند لمحوں کے اسی ملاپ نے گویا پانی میں آگ لگادی۔ پھر اس کے جذبوں کی سچائی اور خلوص کو گردش زمانہ نے بھی ثابت کردیا کہ وقت سے بہتر میزان کوئی نہیں۔

جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ نے جیل توڑ کر اپنے ان ساتھیوں کو چھڑایا تھا جو کچھ عرصے سے وہاں قید تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور قیدی بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ انہی میں ایک قیدی بختیار بھی شامل تھا جو دو ماہ سے ایک ایسے جرم کی سزا بھگت رہا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔

جیل رات کی تاریکی میں توڑی گئی تھی۔ اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر بختیار شہری حدود تک پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کی پہلی کرن پھوٹنے میں بھی کچھ دیر تھی۔ اس وقت سے فائدہ اٹھانا بختیار کے لیے ضروری تھا۔ اس کے جسم پر جیل کے کپڑے تھے جن سے نجات حاصل نہ کرنے کی صورت میں وہ جلد ہی پھر قانون کی گرفت میں ہوتا اور اسے جیل سے فرار ہونے کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا۔ وہ خمیازہ کیا ہوتا، یہ بختیار نہیں جانتا تھا۔ اسے تو سزا ہی عمر قید کی ہوئی تھی۔

شہری حدود کا آغاز غریبوں کی ایک بستی سے ہوا تھا جہاں بنے ہوئے معمولی مکانات میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے صحن کی دیواریں بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں، پھر بھی نو دس فٹ کے قریب تھیں۔

بختیار کسی مکان میں گھس کر مردانہ کپڑے چرانا چاہتا تھا اگر ایسے کپڑے مل جاتے جو اس کے قد کاٹھ کے لیے بالکل مناسب ہوتے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوتی۔

اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا اور قانون کی نظروں سے بچنے کے لیے کس طرح خود کو محفوظ رکھا جاتا، یہ سب کچھ بھی اسے سوچنا تھا مگر سب سے پہلے اسے جیل کے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر تھی۔

وہ محتاط انداز سے گلیوں کے چکر لگانے لگا۔ اسے کسی ایسے مکان کی تلاش تھی جس کے صحن کی دیوار سات فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہو۔ کیونکہ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ سے ذرا ہی زیادہ نہیں تھا۔

کہیں قریب ہی سے سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ بختیار کا دل اچھل پڑا۔ اسے پولیس کا خیال آیا تھا۔ وہ فوراً قریب کے ایک مکان کی دیوار سے تقریباً چپک کر زمین پر لیٹ گیا۔ وہاں اس کے چھپنے کے لیے کوئی اور جگہ تھی ہی نہیں۔

کچھ وقفے سے سیٹی کی آواز پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے گلی کے سرے پر ایک آدمی کو اندھیرے کے باعث سائے کے مانند دیکھا۔ وہ دائیں سے بائیں جاتے ہوئے بختیار کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بختیار نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ پولیس کانسٹیبل نہیں، اس محلے کا چوکیدار تھا۔ اس کی وضع قطع ایسی ہی تھی۔

بختیار کھڑا ہو کر پھر دبے قدموں ایک جانب بڑھنے لگا۔ اسے رات کی تاریکی میں کتوں کے بھونکنے کا اندیشہ تھا۔

کچھ دیر بعد بختیار مایوس ہونے لگا۔ اسے کوئی ایسا مکان نظر نہیں آیا تھا جس کے صحن کی دیوار اتنی کم اونچی ہو جس پر وہ چڑھ سکے۔ مایوسی کے عالم میں اسے یکایک امید کی کرن نظر آئی۔ اسے ایک جگہ چالیس پچاس اینٹیں نظر آئی تھیں جو وہاں رہنے والے کسی شخص نے اپنے مکان میں کچھ بنوانے کے لیے رکھی ہوں گی۔

ایک امید نظر آتے ہی بختیار تیزی سے حرکت میں آگیا۔ وہ دو اینٹیں اٹھا کر قریب ہی کے ایک مکان کے صحن کی دیوار تک لے گیا۔ کئی چکروں کے بعد وہ اتنا اونچا چبوترا بنانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس پر کھڑے ہو کر دیوار پر چڑھنا اگرچہ بہت آسان تو نہیں لیکن بہت مشکل بھی نہیں رہا تھا۔ چبوترے کو مزید اونچا کر کے وہ اپنے لیے آسانی بھی پیدا کر سکتا تھا مگر اسی وقت محلے کی کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ چبوترا مزید اونچا کرنے کے لیے بختیار کے پاس اب وقت نہیں تھا۔ اذان کے بعد وہ لوگ تو فوراً ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں جو پہلے ہی جاگ چکے ہوں ایسے لوگ اس گلی میں بھی آسکتے تھے اور ان کی نظر بختیار پر پڑ سکتی تھی۔

یہ صورت حال پیدا ہوتے ہی بختیار نے جلد از جلد دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ جدوجہد کے بعد وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مکان میں دو کمرے تھے جن کے دروازے صحن کی طرف کھلے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں کمرے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل تاریک تھا لیکن دوسرے کمرے میں زرد سی روشنی تھی۔ اس روشنی کا کچھ اثر صحن پر بھی پڑ رہا تھا۔

''اٹھ جا بیٹی! اذان ہو رہی ہے۔'' ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

صحن میں ایک ہی چارپائی تھی۔ عورت کے جملے سے بختیار سمجھ گیا کہ وہ ماں بیٹی ایک ہی پلنگ پر سو رہی تھیں۔ ان دونوں میں سے ماں جاگ کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کا رخ اس دیوار کی طرف نہیں تھا جس پر بختیار چڑھا تھا۔

ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر بختیار صحن میں پنجوں کے بل کودا تاکہ کم از کم آواز ہو لیکن کچھ آواز تو بہرحال ہوئی تھی۔

''دیکھ تو پروین، ادھر کچھ گرا ہے۔'' بڑی جلدی میں کہا گیا تھا۔ آواز اسی عورت کی تھی۔ اس طرح بختیار کو دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس عورت کی بیٹی کا نام پروین تھا۔

بختیار بہت تیزی سے پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت پروین بھی اٹھ بیٹھی تھی۔

''کک...... کون؟'' پروین خوف سے ہکلا گئی۔ اس نے بختیار کو ایک ہیولے ہی کے مانند دیکھا ہوگا۔ وہاں اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ بختیار کو واضح طور پر دیکھ سکتی۔ اس وقت گلی میں دو ایک آدمیوں کے قدموں کی آوازیں ہونے لگی تھیں۔

''کون ہے بیٹی؟'' پروین کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

اب بختیار کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ پروین کی ماں کو غالباً کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

''زیادہ آواز مت نکالنا۔'' بختیار نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''چاقو ہے میرے پاس! دونوں کی گردنیں کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' اس نے اپنے لہجے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''چووور۔'' پروین کی ماں کی آواز بہت سہمی ہوئی تھی۔

''چارپائی سے اترو اور کمرے میں چلو۔''

بختیار نہیں چاہتا تھا کہ وہاں ہونے والی باتوں کی مدھم سی آواز بھی گلی میں جائے۔ اسے گلی سے اب باتیں کرنے کی آواز بھی آنے لگی تھی۔

پروین نے چارپائی سے اترتے ہوئے اپنی ماں کو بھی اٹھنے کے لیے سہارا دیا تھا۔

''ارے واہ! یہ اینٹیں یہاں کیوں رکھی ہیں۔'' گلی سے آواز آئی۔ ''کوئی چور تو نہیں چڑھا ہے یہاں سے!''

بختیار کا دل جو پہلے ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، چور کا حوالہ دیے جانے پر اچھل ہی پڑا۔

''کوئی پاگل ہی چور ہوگا۔'' جواب میں ہنس کر کہا گیا تھا۔ ''بے چاری آسیہ خالہ کے گھر میں ہے ہی کیا جو کوئی چرانے آئے گا۔''

اس بات پر پہلا شخص بھی ہنسا اور قدموں کی آواز دور ہونے لگی۔ بختیار نے سکون کا سانس لیا۔ ان دونوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پروین کی ماں کا نام آسیہ تھا اور محلے میں شاید سبھی اسے آسیہ خالہ کہتے تھے۔

پروین اپنی ماں کے ساتھ پلنگ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں ان دونوں کے چہروں پر آنے والے خوف کے تاثرات دیکھے تو نہیں جا سکتے تھے لیکن بختیار کو یقین تھا کہ وہ دونوں بہت خوف زدہ ہوں گی۔

پروین کی جسامت سے بختیار نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ وہ کوئی بچی نہیں، جوان لڑکی تھی۔ بختیار انہیں اس کمرے کی طرف لے جانے لگا، جہاں ایک بلب کی روشنی تھی۔

بختیار ان دونوں کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

پروین اتنی خوف زدہ تھی کہ اب بھی اس نے مڑ کر بختیار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ غالباً اسی کی وجہ سے اس کی ماں بھی دوسری طرف منہ کیے رہی تھی۔

''اب میری طرف دیکھو، اور میری بات سنو!'' بختیار نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ کمرے میں آنے کے بعد بھی نہیں چاہتا تھا کہ بلند آواز میں بات ہو۔

وہ دونوں اس کی طرف مڑیں۔ آسیہ خالہ کی عمر اتنی زیادہ معلوم ہو رہی تھی کہ اسے پروین کی دادی ہونا چاہیے تھا۔

پروین کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ نقش و نگار ایسے تھے کہ اگر اس نے آسودہ حالی میں پرورش پائی ہوتی تو خوب صورت نظر آتی۔

''دیکھ بھیا!'' آسیہ خالہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہمارے گھر میں ایسا سامان نہیں ہے جسے چرا کر تجھے کوئی فائدہ پہنچے۔ بس ایک سلائی مشین رکھی ہے دوسرے کمرے میں۔ اگر تو وہ بھی لے گیا نا بھیا...... ہم تو فاقوں سے مر جائیں گے۔''

بختیار کو اس کمرے کے سامان سے بھی انتہائی غربت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک گوشے میں کچھ میلے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ سامان کے نام پر وہاں بھی بس ایک چارپائی تھی جس پر کچھ دھلے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

''دوسرے کمرے میں کون سویا ہوا ہے؟'' بختیار نے اب بھی اپنے لہجے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''کوئی...... کوئی نہیں۔'' پروین کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح اٹک اٹک کر نکلے جیسے اس کا حلق خشک

ہو رہا ہو۔

اس دوران میں بختیار کو یقین ہو چکا تھا کہ آسیہ خالہ کے چہرے پر آنکھیں تو تھیں لیکن ان کی روشنی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ نابینا تھی۔

''تم دونوں میرے آگے آگے اس کمرے میں چلو۔'' بختیار نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ''میں اس وقت اپنا چاقو نکال لوں گا۔ اگر مجھے وہاں کوئی نظر آیا تو میں ایک پل ضائع کیے بغیر تم دونوں کو تو چاقو مار ہی دوں گا۔''

''اس گھر میں بس ہم دونوں ہی رہتے ہیں۔'' آسیہ خالہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

''دوسرے کمرے میں چلو۔'' بختیار غرایا۔

''چلو اماں!'' پروین نے آسیہ خالہ کا بازو پکڑتے ہوئے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔

بختیار کو ان دونوں کے لب و لہجے سے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ دونوں سچ بول رہی تھیں لیکن وہ مکمل اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اطمینان حاصل کر لیا۔ اس کمرے کے ایک حصے میں نظر آنے والے سامان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جگہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی ہوگی۔ دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی پرانی سی چادر پر ہاتھ سے چلائی جانے والی سیونگ مشین رکھی تھی۔ مشین کے قریب ہی کچھ نئے لیکن معمولی سے کپڑے تھے۔ ایک کپڑا مشین کی سوئی میں اٹکا ہوا تھا، جیسے سیتے سیتے چھوڑ دیا گیا ہو۔

''ایک گلاس پانی پلا دو۔'' بختیار نے پروین سے کہا۔ اس نے بہت دیر سے پانی نہیں پیا تھا۔ حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ پروین نے اسے گلاس میں پانی لا دیا۔

''بس یہ ایک مشین ہے بھیا!'' آسیہ خالہ بولی۔ ''یہ مت لے جانا۔ یہ ہم ماں بیٹی کا ایک ہی سہارا ہے۔''

بختیار کو ''ماں بیٹی'' کے الفاظ پر تعجب ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ان دونوں کو ''دادی پوتی'' ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے اپنا دماغ اس الجھن میں نہیں پھنسایا۔ وہ بڑی حد تک مایوسی کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ جس گھر میں کوئی مرد رہتا ہی نہ ہو، وہاں سے کوئی مردانہ لباس ملنا ناممکن ہی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک امید موہوم کو پیش نظر رکھا۔

''دیکھو!'' وہ پانی کا خالی گلاس پروین کو لوٹاتے ہوئے اس مرتبہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میں تم دونوں کو ذرا بھی نقصان پہنچانے یہاں نہیں آیا ہوں۔ مجھے صرف مردانہ لباس کی ضرورت ہے، صرف ایک جوڑے کی۔''

''ہمارے گھر میں کوئی مرد ہی نہیں تو......'' آسیہ خالہ نے کہنا چاہا۔

پروین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے ابا کے دو ایک جوڑے تو بہت سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اماں! ان میں سے ایک جوڑا اسے دے دو۔'' پروین کو اتنا بولنے کی ہمت غالباً اس لیے ہوئی تھی کہ بختیار نے اب نرم لہجہ اختیار کیا تھا۔

''وہ......وہ تو......'' بختیار نے آسیہ خالہ کے چہرے پر اداسی بکھرتے دیکھی۔

''وہ کپڑے شاید تم نے یادگار کے طور پر رکھ چھوڑے ہیں بڑی بی!'' بختیار بولا۔ ''لیکن مجھے بہر حال ایک جوڑے کی شدید ضرورت ہے۔''

''ایک جوڑا اسے دو اماں!'' پروین پھر بولی۔

''اچھا۔'' آسیہ خالہ کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ ''وہ پوٹلی اسی کمرے میں ہے۔ میلے کپڑوں ہی میں کہیں دبی ہوگی۔''

''میں وہ ڈھونڈتی ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ اماں!'' پروین نے کہا اور پھر بختیار کی طرف دیکھا جیسے اسے اس کی طرف سے کسی اعتراض کا اندیشہ ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' بختیار اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ''بٹھا دو تم اپنی ماں کو۔''

پروین نے آسیہ خالہ کو سیونگ مشین کے قریب چادر پر بٹھا دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے بختیار کی طرف دیکھنے لگی۔

میلے کپڑوں کا ڈھیر بختیار نے اس کمرے میں دیکھا تھا جہاں سے وہ ان ماں بیٹی کو دوسرے کمرے میں لایا تھا۔

''چلو! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' بختیار نے کہا اور پھر آسیہ خالہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''دیکھو بڑی بی!...... اگر تم نے یہاں سے باہر جا کے شور مچایا تو سمجھ لو کہ تمہاری بیٹی کی گردن کاٹنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔''

آسیہ خالہ نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے دکھائی ہی نہیں دیتا تو باہر کیسے جاؤں گی۔ میں تو کہیں جاتی ہوں تو پروین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتی ہوں۔''

''گھر کے باہر کہیں جاتی ہوگی اس طرح۔'' بختیار نے کہا۔ ''گھر کا ایک ایک گوشہ تو تمہارا سمجھا بوجھا ہوگا۔ نابینا لوگ اپنے گھر کے ہر حصے سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ دروازے تک بھی جا سکتے ہیں۔''

''یہ کہیں نہیں جائیں گی۔'' پروین بول پڑی۔

''انہیں اپنی جان سے زیادہ میں عزیز ہوں۔''

اس جواب سے بختیار نے محسوس کیا کہ پروین تھوڑی بہت پڑھی لکھی ضرور تھی۔ وہ اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا۔ پروین نے میلے کپڑوں سے ایک پوٹلی نکال کر اس میں سے دو جوڑے نکالے۔

''تم یہ دونوں ہی لے لو۔'' وہ بولی۔ ''میں تو چاہتی تھی کہ یہ کپڑے گھر میں نہ رہیں۔ اماں کبھی کبھی ان کپڑوں کو نکال کر سینے سے لگاتی ہیں اور پھر سارے دن بالکل اداس رہتی ہیں۔''

''کیا تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے؟''

''اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمیں اکیلا کیوں رہنا پڑتا۔'' پروین افسردہ ہو گئی۔

بختیار ان دونوں میں سے ایک لباس اپنے جسم سے ناپنے لگا۔

''یہ آٹھ نو سال پرانے ہیں۔'' پروین نے بتایا۔ ''لیکن ابا نے بس سال بھر ہی پہنے تھے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تھا۔''

بختیار کا دھیان کپڑوں کی طرف تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کپڑے اس کے جسم پر قدرے تنگ رہیں گے۔

''تم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہو۔'' پروین پھر بولی۔

بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اسے یقین بھی ہو گیا کہ پروین تھوڑی بہت پڑھی ہوئی ضرور تھی۔ بالکل ان پڑھ لڑکیاں عموماً نہیں جان سکتیں کہ جیل کے قیدیوں کا لباس کیسا ہوتا ہے۔ پروین یہ بات جانتی تھی ورنہ وہ جیل سے اس کے فرار کی بات نہ کرتی۔

''لیکن تم بہت برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔'' وہ پھر بولی۔

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟'' بختیار نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں اس کمرے میں تمہارے ساتھ اکیلی ہوں لیکن تم نے بدتمیزی کی ایک بات بھی نہیں کی۔'' پروین نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میرے محلے کی تو یہ حالت ہے کہ باہر نکلتی ہوں تو لڑکے سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔''

''اچھا اب دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔ میں کپڑے بدل لوں، مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ تمہاری موجودگی میں کپڑے بدلوں لیکن مجبوری ہے۔''

''میں نے ابھی کہا تھا نا! تم بہت برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔'' پروین نے کہا اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

بختیار نے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ اس کے جسم پر تنگ تو تھے لیکن اتنے نہیں جتنا اس نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ان کپڑوں میں خود کو کسا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''اب تم میری طرف مڑ سکتی ہو۔'' بختیار نے پروین سے کہا۔

پروین مڑی اور اس پر بس ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی۔ ''اتنی دیر لگ گئی۔ اماں کو وہاں ہول آ رہا ہوگا۔''

''چلو، وہیں چلو۔''

''تم یہ دوسرا جوڑا بھی لے لو۔ تمہیں یہی چاہیے تھا نا!...... اب تمہیں جانا چاہیے ہمارے گھر سے! میں باہر کے دروازے کی کنڈی کھول دوں گی۔ تم ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکل جانا۔''

''دوسرے کمرے میں چلو۔'' بختیار غرایا۔ ''اپنی ماں کے پاس۔''

پروین جس نے نہ جانے کیسے خود کو سنبھال لیا تھا، اس کے لہجے سے ایک بار پھر سہم گئی۔

بختیار کو خود اس بات سے تکلیف پہنچ رہی تھی کہ وہ ان ماں بیٹی سے کسی نہ کسی حد تک زیادتی کر رہا تھا لیکن اس کے حالات اسے اس کے لیے مجبور کر چکے تھے۔ اس نے مستقبل میں جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہو، کرے۔

پروین کے ساتھ وہ باہر نکلا۔ اب صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ گلی میں قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ اسی وقت کسی نے زور سے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا جو صحن ہی میں تھا۔

بختیار کے اعصاب میں تناؤ آ گیا۔

''دودھ والا تو اتنی جلدی نہیں آتا۔'' پروین بڑبڑائی۔

''آسیہ خالہ!'' باہر سے آواز آئی۔

''تمہی جواب دو! پوچھو کون ہے؟'' بختیار نے سختی سے لیکن سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

''اماں سو رہی ہیں ابھی بابو چاچا!'' پروین نے آواز سے محلے کے اس شخص کو پہچان لیا تھا جس نے آواز دی تھی۔

''یہ تمہارے صحن کی دیوار کے پاس بھورے خان کے گھر کی اینٹیں رکھ کر چبوترا سا بنا ہوا ہے۔'' آواز آئی، پھر

ہنس کر کہا گیا۔ ”یہ اپنا جمیل ہے نا، یہ کہہ رہا تھا، کوئی چور نہ گھسا ہو آسیہ خالہ کے گھر میں!“

”یہاں کوئی کیا چرانے آئے گا بابو چاچا!“ پروین نے جواب دیا۔

”میں نے بھی یہی بولا تھا جمیل سے……! رات کو محلے کے دو ایک لونڈوں نے وہاں بیٹھ کر گپیں ہانکنے کے لیے بنایا ہوگا وہ چبوترا۔“

”ہاں بابو چاچا! رات کو ادھر سے کچھ آوازیں تو آ رہی تھیں۔“

ہنسنے کی آواز آئی اور پھر دو افراد کے قدموں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔

بختیار نے محسوس کیا تھا کہ پروین اس سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ تھی۔ اس نے اس کی ہدایت کے بغیر ”بابو چاچا“ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں پہنچے۔

”میں آ گئی اماں!“ پروین بولی۔

”چلا گیا وہ؟“ آسیہ خالہ نے بے تابی سے پوچھا۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”عجیب چور تھا، ایک جوڑا کپڑا لینے کے لیے گھسا تھا ہمارے گھر میں۔“

پروین نے بختیار کی طرف دیکھا۔

”میں ابھی یہیں ہوں بڑی بی!“ بختیار بولا۔

آسیہ خالہ چونک گئی۔

”تم دونوں ناشتا تو کرو گی۔“ بختیار نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ زیادہ نہ ہو لیکن ایک پیالی چائے کی گنجائش تو نکل آنا چاہیے۔“

”ارے اب ہمارا پیچھا چھوڑ دے بھیا!“ آسیہ خالہ نے کسی قدر جھنجلائے اور کسی قدر التجائیہ انداز میں کہا۔ ”تجھے کپڑے چاہیے تھا نا! وہ مل گئے تجھے! یہ سلائی کی مشین لے جانا چاہتا ہے تو یہ بھی لے جا! پیچھا چھوڑ دے اب ہمارا۔“

لیکن بختیار کچھ اور ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ صرف جیل کے لباس سے چھٹکارا اسے قانون کی نظر سے نہیں بچا سکتا۔ ضروری تھا کہ وہ اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرتا جو فی الحال صرف اسی طرح ہو سکتی تھی کہ وہ اپنا شیو اتنا بڑھا لے کہ چھوٹی سی ڈاڑھی بن جائے۔ اس عرصے میں سر کے بال بھی بڑھ جاتے اور مونچھیں بھی نکل آتیں…… یہ سب کچھ کرنے کے لیے اس نے کچھ دن اسی گھر میں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ ماں بیٹی اس کے لیے بے ضرر ثابت ہو سکتی تھیں۔ کسی جگہ کچھ دن گزارنے کے لیے اسے اس گھر کے دو افراد سے بہتر لوگ کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

بختیار نے بھی آسیہ خالہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پروین کمرے کے اس گوشے کی طرف بڑھ گئی جہاں باورچی خانے کا سامان تھا اور دیوار سے ایک نل بھی نکلا ہوا تھا جس سے برتن دھوئے جا سکتے تھے۔

”آسیہ خالہ!“ بختیار نے پہلی مرتبہ ”بڑی بی“ کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ابھی میں کچھ دن تمہارا مہمان رہوں گا۔“

یہ بات سن کر پروین نے بھی چونک کر بختیار کی طرف دیکھا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ دیکھتی رہ جاتی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے چائے کی کیتلی اٹھانے لگی۔

”نہ بھیا نہ!“ آسیہ خالہ بولی۔ ”تو ہماری سلائی مشین بھی لے جا مگر ہمارا پیچھا چھوڑ!“

”میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں آسیہ خالہ!“ بختیار نے بہ دستور نرم لہجے میں کہا۔ ”بس ایک مجبوری کی وجہ سے مجھے چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آنا پڑا۔ بس ایک جوڑے کپڑے کی ضرورت تھی مجھے۔ میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا، وہ بہت گندے ہو گئے تھے۔“

”تو ایک جوڑے کے لیے تجھے ہمارا ہی گھر ملا…… اور اب تو یہاں رکنا بھی چاہتا ہے، نہ بابا نہ! بس چائے پی اور چلا جا!“

”مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔“ بختیار نے لہجہ نرم ہی رکھا۔ ”کیا میں نے اب تک کوئی نقصان پہنچایا ہے تم دونوں کو؟“

”جان تو آدھی کر دی ہے۔“

”تم ماں بیٹی اتنی باتیں بھی اس لیے کر سکی ہو کہ میں نے جیب سے چاقو نکال کر دکھایا بھی نہیں! اگر میں ایسا کرتا تو تمہاری بیٹی کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تم دونوں کو۔“

”چپ ہو جاؤ اماں!“ پروین بول پڑی۔

آسیہ خالہ نے پہلو بدلا اور زیر لب کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ گھر میں اس کی ایک جوان بیٹی بھی ہے اور ایک اجنبی گھر میں گھس آیا ہے جس کا نہ جانے کیا ارادہ ہے۔

پروین نے چائے بنا کر اسے دی۔ پیالی کی طشتری میں ایک پاپا بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ بختیار کچھ استفسار کرتا، پروین بول پڑی۔ ”میں اور اماں ابھی چائے نہیں پی سکتے، یہ تھوڑا سا دودھ تھا کل کا بچا ہوا۔ اب دودھ والا آتا ہی ہوگا۔ اس کے بعد……“ پروین کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ باہر سے کسی اسکوٹر کی آواز سنائی دی جو دروازے پر آ کے رکی تھی۔ پروین اپنی بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے بولی۔ ”آ گیا دودھ والا۔“ اس نے ایک پتیلی اٹھائی۔ بختیار بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ پروین اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ بختیار نے کہا۔ ”جب تم دودھ لینے کے لیے دروازہ کھولو گی تو میں آڑ میں کھڑا رہوں گا۔“

وہ فی الحال ان ماں بیٹی میں سے کسی پر بھی مکمل بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

پروین کچھ بولے بغیر کمرے سے نکلی۔ بختیار پیالی رکھ کر اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ جب پروین دروازہ کھولنے لگی تو بختیار دروازے کی بائیں جانب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور پروین کے چہرے پر نظر رکھے رہا۔

پروین دودھ لے کر دروازہ بند کرنے لگی۔ پھر وہ واپس کمرے کی طرف مڑی۔ اب بختیار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”تم کسی کھاتے پیتے اچھے گھر کے لگتے ہو۔“ پروین بولی۔

”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟“

”غریبوں میں تم جیسے تندرست اور اتنے خوب صورت لوگ نہیں ہوتے۔“ پروین بڑی سادگی سے کہہ گئی۔

”اچھا!“ بختیار خفیف سا مسکرایا۔ ”خوب صورت بھی ہوں میں؟“

”جیل کیوں گئے تھے؟“ پروین نے پوچھا اور کمرے سے چند قدم کے فاصلے ہی پر رک گئی۔ وہ ماں کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔

”کسی نے سازش کر کے مجھے کسی کے قتل کے کیس میں پھنسایا تھا۔ میں اپنی صفائی میں کوئی ثبوت نہیں دے سکا اس لیے مجھے سزا سنا دی گئی۔“

”جیل سے بھاگے کیسے؟“

اس سوال کا جواب بختیار نے سچ سچ لیکن بہت مختصر طور پر دیا۔

پروین نے پوچھا۔ ”کب تک بھاگتے رہو گے پولیس سے؟“

”مجھے بھاگنا نہیں، بس اس وقت تک چھپنا ہے، جب تک میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤں!“

”ہو جاؤ گے؟“

”مجھے یقین ہے۔“

کمرے سے آسیہ خالہ کی بلند آواز آئی۔ ”کہاں رہ گئی پروین؟“

”آ رہی ہوں اماں!“ پروین نے جلدی سے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”چپل کا انگوٹھا ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ٹھیک کرنے لگی تھی۔“

بختیار اس کے جھوٹ پر اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو آسیہ خالہ نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہو گئی چپل؟“

”نہیں اماں!……ٹنکے گی یہ۔“ پروین نے پھر جھوٹ بولا۔

بختیار نے چائے کی پیالی جہاں چھوڑی تھی، وہاں سے اٹھا لی۔

پروین نے کیتلی میں پانی بھرا اور اسے ایک طرف رکھ کر دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ دی۔ اس کا دماغ یقیناً الجھا ہوا تھا ورنہ وہ پہلے دودھ چولھے پر رکھتی، اس کے بعد پتیلی میں پانی بھرتی۔

ذہن بختیار کا بھی الجھ گیا تھا۔ دودھ لے کر واپس آتے ہوئے پروین ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آئی تھی۔ اس نے اس طرح باتیں شروع کر دی تھیں جیسے ”بن بلائے مہمان“ کو اس نے ذہنی طور پر قبول کر لیا ہو اور اب اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہو…… بختیار اس الجھن کا شکار بھی تھا کہ اس کے خیال کے مطابق اسے کچھ دن گزارنے کے لیے اس گھر سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی لیکن کیا واقعی وہ وہاں رک کر محفوظ رہ سکتا تھا؟

کچھ دیر بعد بختیار اور پروین کو باتیں کرنے کا موقع اس وقت ملا جب آسیہ خالہ رفع حاجت کے لیے گئی۔ وہ جگہ کمرے کے برابر میں ذرا اندر کی طرف تھی۔

”جیل سے کب بھاگے تھے؟“ پروین نے پوچھا۔

”گیارہ بجے کے قریب جیل توڑی گئی تھی۔ اسی وقت بھاگا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ راستے میں ایک جگہ کنواں مل گیا تھا۔ وہاں سے پیاس بجھائی تھی ورنہ یہاں تک آتے آتے تو حلق میں کانٹے پڑ جاتے۔“ بختیار نے جواب دیا۔ پھر غور سے پروین کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’تم میرے بارے میں بہت زیادہ جان لینا چاہتی ہو۔‘‘

’’میں جان بھی چکی ہوں۔‘‘ پروین نے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

’’کیا جان چکی ہو۔‘‘ بختیار اسے گھورتا رہا۔ ’’تم تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہو۔‘‘

’’ابا کا انتقال ہوا تو میں آٹھویں پاس کر چکی تھی رانا بختیار صاحب!‘‘

بختیار اتنی شدت سے چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

’’آپ کسی بینک میں منیجر تھے۔‘‘ پروین نے دوسرا دھماکا کیا۔

بختیار کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔

’’ماڈل گرل کا نام شبانہ تھا جو قتل ہوئی!‘‘ پروین کا ایک اور دھماکا......

’’تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہو گیا!‘‘ بختیار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ’’اور کیا جانتی ہو؟‘‘

’’بس اتنا ہی جانتی ہوں۔‘‘ پروین نے جواب دیا۔ یہ ساری باتیں اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہی تھیں۔ وہ مزید بولی۔ ’’میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ آپ کوئی برے آدمی نہیں ہیں۔ جب میں دودھ لے کر لوٹ رہی تھی تو آپ نے جو باتیں بھی کی تھیں، سچ سچ کی تھیں۔ جھوٹ نہیں بولا تھا۔‘‘

اس گفتگو میں وہ یکایک بختیار کو ’’تم‘‘ کہتے کہتے ’’آپ، جناب‘‘ پر آ گئی تھی لیکن بختیار اس پر دھیان اس وقت دیتا جب پروین کے انکشافات کے دھماکے اسے کچھ اور سوچنے سمجھنے کی مہلت دیتے۔

’’آپ جیسا آدمی کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔‘‘ پروین اپنی رو میں کہتی چلی گئی۔ ابا کہا کرتے تھے، شریف لوگ اگر کسی مصیبت میں پڑ جائیں تو ان کی مدد کرنا چاہیے۔ میں بھی آپ کی مدد کروں گی جو بھی مجھ سے ہو سکے گی۔ آپ جب تک چاہیں، اس گھر میں چھپے رہیے۔ بالکل اطمینان سے! میں اماں کو سمجھا دوں گی۔ اب یہ چاقو واقو کی بات مجھ سے نہ کیجیے گا۔ آپ کے پاس چاقو نہیں ہوگا۔ یہ بات مجھے اور اماں کو ڈرانے کے لیے تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ خود کو چھپانے کے لیے خود آپ کو بھی خیال رکھنا ہوگا۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلواتی ہیں، ان کا آنا جانا رہتا ہے۔ جب میں ساتویں کلاس میں داخل ہوئی تھی تو میں نے سلائی کڑھائی کا کورس بھی کیا تھا۔‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔ ’’اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ابا کے مرنے کی وجہ سے وہ سب میرے کام آئے گا جو میں سیکھ رہی تھی۔‘‘

’’اچھی لڑکی!‘‘ بختیار نے جھرجھراتی سی آواز میں کہا۔ ’’تم نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آخر تمہیں اچانک میرے بارے میں کئی باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟‘‘

’’اخبار سے۔‘‘ پروین نے جواب دیا۔ ’’دودھ والا اخبار بھی بیچتا ہے۔ اخبار اس کی اسکوٹر کے ہینڈل پر بندھے رہتے ہیں۔ میری نظر ایک خبر کی سرخی پر پڑ گئی تھی۔ جیل ٹوٹنے کے بارے میں لکھا تھا۔ فرار ہونے والوں میں بینک منیجر بختیار رانا کا نام بھی تھا اور ماڈل گرل شبانہ کی تصویر کے ساتھ آپ کی تصویر بھی تھی۔ چھوٹی سرخی میں لکھا تھا کہ آپ کو شبانہ کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔‘‘

پروین کے دھماکوں سے بختیار کے اعصاب میں جو تناؤ آیا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔

’’تم وہ خبر اور میری تصویر دیکھ کر چونکی نہیں تھیں۔ تمہیں اپنے اعصاب پر بہت قابو ہے۔‘‘

پروین اب کچھ نہیں بولی۔ بختیار سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ پروین کا چہرہ کیا پیدائشی طور پر بے تاثر تھا؟

لیکن جب وہ اس مکان میں آیا تھا تو وہ اس سے خوف زدہ تو نظر آئی تھی۔

وہ کچھ رک کر بولی۔ ’’جو عورتیں کپڑوں کی سلائی کے لیے آتی ہیں، میں انہیں اسی کمرے میں بٹھاتی ہوں جہاں سلائی مشین رکھی ہے۔ کبھی کوئی عورت اماں سے ملنے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اب میں اماں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا کروں گی۔ آپ دوسرے کمرے سے اس وقت باہر مت نکلا کیجیے گا۔‘‘

’’پروین!‘‘ آسیہ خالہ نے پکارا۔

’’آئی اماں!‘‘

پروین کا سہارا لے کر آسیہ خالہ باہر نکلی اور کمرے تک آ گئی۔

بختیار جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ پروین کے انکشافات کا پس منظر اگرچہ سامنے آ چکا تھا، پھر بھی اس کی باتیں بختیار کے دماغ میں کچھ دیر تک سائیں سائیں کرتی رہیں۔

حالات بہرحال اب بہ ظاہر ایسے ہو گئے تھے کہ وہ کچھ دن اس گھر میں بے خوف و خطر گزار سکتا تھا۔ پروین اب قابل اعتماد بن چکی تھی، وہ اپنی ماں کو کس طرح سمجھائی، یہ بختیار کا دردسر نہیں تھا مگر اسے امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ

اپنی ماں کو سمجھانے میں ناکام نہیں رہے گی۔

آئندہ دو ایک دن میں یہ ثابت بھی ہو گیا۔ آسیہ خالہ اپنی زبان پر پھر کبھی ایسی کوئی بات نہیں لائی کہ وہ اب اس گھر کا پیچھا چھوڑ دے۔

سودا سلف کے لیے بھی پروین ہی کو گھر سے نکلنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ قفل لگا کر جاتی تھی۔ جب وہ پہلے پہل گھر سے گئی تھی تو بختیار قدرے وسوسے کا شکار ہوا تھا کہ پروین کسی کو اس کے بارے میں بتا نہ دے مگر دو تین روز کے بعد اسے مکمل اطمینان ہو گیا۔

بختیار کے لیے وہ ایک عجیب لڑکی اس اعتبار سے بھی ثابت ہوئی تھی کہ اس نے ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بختیار ماڈل گرل شبانہ کے قتل میں کیسے پھنس گیا تھا لیکن بختیار کے دماغ میں اپنے ماضی کے وہ واقعات چکراتے ہی رہتے تھے۔

* * *

یہ بختیار کی زندگی کا المیہ تھا کہ وہ جس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا، وہ لڑکی کسی اور کو چاہتی تھی۔ لڑکی کا نام فروزاں تھا۔ وہ بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان کی بیٹی تھی۔

بختیار نے بہت کم عمری میں ترقی کی منازل طے کی تھیں۔ وہ اکیس سال کی عمر میں کلرک کی حیثیت سے بینک میں ملازم ہوا تھا اور پچیس سال کا ہونے تک منیجر بن گیا تھا۔ ابتدا میں اسے ایک چھوٹی سی برانچ ملی تھی۔ پھر دو سال گزرتے گزرتے اسے ایک بہت بڑی برانچ کا منیجر بنا دیا گیا۔ اسی برانچ کی اوپری منزل پر اس کے بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان بیٹھا کرتے تھے۔

وہ بختیار کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ منیجر بنا تھا۔ پھر جب وہ بڑی برانچ میں آیا اور قربت بڑھی تو عبداللہ خان اسے پہلے سے زیادہ پسند کرنے لگے۔ ابتدا میں انہیں بختیار کی صرف صلاحیتوں کا علم تھا، قربت ہوئی تو انہوں نے جانا کہ وہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ عبداللہ خان خود بھی ایک اچھے انسان تھے۔

فروزاں انہی کی بیٹی تھی جو اس وقت تعلیم کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنے والد سے ملنے بینک آیا کرتی تھی۔ اوپر کی منزل تک جانے کے لیے بینک کے اندر آنا ضروری تھا۔ اسی لیے بختیار نے اس بینک کا منیجر بننے کے بعد تیسرے ہی دن اسے دیکھ لیا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ بختیار نے ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی پہلے کبھی نہ دیکھی ہو لیکن ایسا حسن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جسے ''سوگوار حسن'' بھی کہا جا سکتا۔ فروزاں کے خوب صورت چہرے پر بہ قول شاعر، اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بختیار چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کسی لڑکی کو اس طرح تکتے رہ جانا ایک غیر مہذبانہ حرکت تھی۔ بختیار نے اپنے کیبن کے شیشوں سے بینک میں کام کرنے والوں کا طائرانہ جائزہ لیا۔ تو اسے بینک کے کیشئر رندھاوا کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ کن انکھیوں سے بختیار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بختیار کو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے دیکھا تو سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

بختیار اس وقت اپنے کیبن میں اکیلا تھا، اس کے سامنے میز پر ایک کلائنٹ کی درخواست تھی جس میں اوورڈرافٹ کے لیے لکھا گیا تھا۔ بختیار دوبارہ اس درخواست کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکا۔ اس کے ذہن میں فروزاں چکراتی رہی جس کے نام تک سے بھی وہ اس وقت واقف نہیں تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے فروزاں کو واپس جاتے دیکھا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد ایک بجے بینک کے دروازے بند کر دیے گئے۔

رندھاوا کو بختیار نے اپنے کیبن کی طرف آتے دیکھا۔ ان دونوں کے تعلقات خاصے پرانے تھے۔ بختیار جب بینک کی ایک برانچ میں کلرک تھا، وہاں بھی رندھاوا کیشئر ہی تھا۔ اس میں بینکاری کی صلاحیت نہیں تھی یا شاید کوئی اور سبب ہو، وہ بہرحال ترقی نہیں کر سکا تھا۔ اس کی عمر بختیار سے دس سال زیادہ تھی۔

اس کا تبادلہ کئی برانچوں میں ہوتا رہا تھا لیکن اس دوران میں بختیار سے اس کی ملاقاتیں رہی تھیں۔ اب بختیار اس برانچ میں منیجر کی حیثیت سے آیا تھا جہاں رندھاوا کو کام کرتے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔

''آؤ رندھاوا!'' بختیار نے اس سے نظریں ملائے بغیر قدرے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔

''شرما کیوں رہے ہو۔'' رندھاوا ہنستا ہوا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔'' بختیار نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہوئی درخواست کی طرف اشارہ کیا۔

''ابھی اس پر بھی بات کر لیں گے۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ تیسرے چوتھے دن آتی رہتی ہے اور اس کے آنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آئندہ تم اسے اس طرح مت تکنا۔ اگر بات بڑے صاحب تک پہنچ گئی تو تمہارے بارے میں ان کی رائے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب تک تو وہ تمہارے خاصے گرویدہ ہیں۔ وہ لڑکی……''

''کوئی بڑی اکاؤنٹ ہولڈر ہے!'' بختیار نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس کا نام فروزاں ہے اور وہ ہمارے بڑے صاحب کی بیٹی ہے۔''

بختیار چونکا۔ ''عبداللہ صاحب کی بیٹی؟''

رندھاوا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر بولا۔ ''پچھلی سڑک پر جو کالج ہے، اسی میں پڑھتی ہے، جب وہ آتی ہے، اس وقت اس کا کوئی پیریڈ شاید خالی ہوتا ہو، یا سبب کچھ بھی ہو، وہ آتی اسی وقت ہے۔''

''خیر چھوڑو!'' بختیار نے کہا۔ ''اس پر میری نظریں ٹک گئی کہ ایسے حسین چہروں پر میں نے ایسی اداسی کبھی نہیں دیکھی۔ کیا اس کے ساتھ کوئی المیہ ہو گیا ہے؟''

''خیر چھوڑو؟'' رندھاوا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یہ بھی کہہ رہے ہو اور پھر اسی کے بارے میں سوال بھی کر رہے ہو۔ خیر! میں بھی کہہ دیتا ہوں کہ خیر چھوڑو، لیکن بتا دیتا ہوں کہ اس کے ساتھ ہرگز کوئی المیہ نہیں ہوا۔ اس کے نقش و نگار ہی ایسے ہیں کہ وہ اداس نظر آتی ہے۔''

دوسری مرتبہ ''خیر چھوڑو'' کہتے وقت بختیار نے سنجیدگی سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فروزاں کا خیال ذہن سے جھٹک دے گا۔ وہ سنجیدگی سے رندھاوا سے اس درخواست کے بارے میں بات کرنے لگا جو اس کے سامنے رکھی تھی۔ لیکن وہ سنجیدگی بس اتنی دیر کی تھی جتنی دیر رندھاوا اس کے کیبن میں رہا۔ رندھاوا کو رخصت کرتے ہی فروزاں پھر اس کے تصور میں آ گئی۔ نہ صرف اس وقت بلکہ آئندہ دو تین دنوں میں بھی ایسا ہوتا رہا کہ فروزاں اس کے تصور میں ابھری اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

چوتھے دن اس نے فروزاں کو ایک بار پھر بینک میں آتے دیکھا۔ اس موقع پر اس نے خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ وہ فروزاں کو تکتا رہ جاتا، البتہ اس نے فروزاں پر دو تین مرتبہ اچٹتی سی نظر بہرحال ڈالی تھی۔

''یہ تو شاید کچھ اور ہی معاملہ ہو گیا ہے آپ کے ساتھ بختیار صاحب!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

آنے والے دنوں میں فروزاں کے بارے میں اس کی سوچ بہ تدریج شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کے دل میں یہ خواہش امڈنے لگی کہ وہ فروزاں سے ملے۔

تین دن بعد جب فروزاں کے آنے کی توقع تھی، بختیار اس کی آمد کے وقت سے ذرا پہلے ایک فائل لے کر اس پر بات کرنے کے بہانے عبداللہ خان کے پاس پہنچ گیا۔

گفتگو پانچ منٹ ہی جاری رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر فروزاں اندر آئی۔ اس نے باپ کو سلام کیا اور بختیار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

''آؤ بیٹی! بیٹھو!'' عبداللہ خان نے کہا، پھر بختیار سے بولا۔ ''کافی تو منگاؤ بختیار!…… ہماری بیٹی کو کافی…… اوہ! میں تم دونوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ یہ میری بیٹی ہے، فروزاں اور فروزاں! یہ ہیں بختیار، اس برانچ کے منیجر! نہایت ذہین اور ہونہار نوجوان!''

''ہائے!'' فروزاں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''ہیلو!'' بختیار بھی مسکرایا۔

اس نے کبھی کبھی فروزاں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے اداس حسن کے لیے ''زرد گلاب'' کی تمثیل سوچی تھی لیکن اس وقت وہ مسکرائی تو یوں لگا جیسے زرد گلاب یکایک سرخ ہو گیا ہو۔ اداسی اس کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔

بختیار نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی کو دو پیالی کافی لانے کی ہدایت کی۔

عبداللہ خان بول پڑے۔ ''اپنے لیے بھی منگاؤ بختیار!''

''جی نہیں سر!'' بختیار بولا۔ ''آپ سے اس فائل پر جتنی بات ہو چکی ہے، اس سے ہی میں نے پورا معاملہ سمجھ لیا ہے۔ اب میں نیچے جاؤں گا، کچھ اور کام دیکھنا ہیں۔'' وہ فائل لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عبداللہ خان پر یہ تاثر ذرا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں اس کی بیٹی کی وجہ سے رکا ہے، حالانکہ اس کا دل یہی چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش عبداللہ خان نے پوری کر دی اور اسے بہ اصرار روکا۔

بختیار نے دوبارہ انٹرکام اٹھا کر تین پیالی کی ہدایت کر دی۔

عبداللہ خان مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میں نے اپنی بیٹی سے تمہاری تعریف تو کردی۔ اب تمہیں اپنی بیٹی کے بارے میں بھی تو بتاؤں۔ اسے مصوری کا شوق ہے، آرٹس کونسل باقاعدگی سے جاتی ہے۔ یہ مستقبل میں اچھی مصور ثابت ہوگی۔“

”ماشا اللہ!“ بختیار نے فروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے بہ ظاہر اس کے مصور ہونے کی لیکن دراصل اس کے حسن کی تعریف کی تھی، پھر کسی خیال کے تحت اس نے کہا۔ ”فائن آرٹس سے کچھ دلچسپی مجھے بھی ہے۔“

”تو تم بھی آرٹس کونسل کے ممبر بن جاؤ۔“ عبداللہ خان نے کہا اور پھر اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا خیال ہے بیٹی؟“

”جی ہاں ڈیڈی! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہاں فائن آرٹس کے ہر شعبے سے متعلق لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔“ فروزاں اس وقت سرخ گلاب بنی ہوئی تھی۔ ”میں انہیں ممبر شپ کا فارم لادوں گی۔“

”گڈ!“ عبداللہ خان نے سر ہلایا، پھر بختیار کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا نا؟“

بختیار کے لیے یہ ”ٹھیک“ نہیں ”بہت ٹھیک“ تھا۔ اس نے فائن آرٹس سے اپنی دلچسپی کا اظہار اسی لیے کیا تھا کہ بات کچھ آگے بڑھ سکے۔

کافی پینے تک مصوری ہی کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ بختیار نے خود تو کبھی کوئی ایک رنگین لکیر بھی نہیں کھینچی تھی لیکن مصوری پر اس نے کتابیں ضرور پڑھی تھیں اس لیے اس موضوع پر باتیں کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

کافی پینے کے بعد بختیار عبداللہ خان کے کمرے سے نکل آیا۔ فروزاں سے باتیں کر کے وہ بہت خوشی محسوس کررہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب فروزاں رخصت ہورہی تھی تو وہ بختیار کے کیبن کے شیشوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر سرخ گلاب بنی۔

رندھاوا نے بھی اسے بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کیوں وہ سنجیدہ ہی رہا حالانکہ اپنے مزاج کے مطابق اسے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بختیار کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ چند دن بعد ہی فروزاں نے اسے آرٹس کونسل کا ممبر بنوادیا۔ بختیار نے روزانہ شام کو آرٹس کونسل جانا شروع کردیا۔ فروزاں سے روز ملاقاتیں ہونے لگیں جس سے بختیار کے مزاج کی بالیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ آرٹس کونسل میں اس کی ملاقاتیں اور لوگوں سے بھی ہوتی رہیں۔ ان لوگوں میں ایک ماڈل گرل شبانہ بھی تھی جس نے ایک فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول بھی کیا تھا۔ اس نے بختیار سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن بختیار خوش اسلوبی کے ساتھ اس سے اپنا دامن بچاتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ شبانہ ماڈل گرل ہونے کے ساتھ کچھ اور بھی تھی۔

”یہ آپ اچھا کررہے ہیں بختیار صاحب کہ شبانہ سے بچے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ایک دن فروزاں نے اس سے کہا۔ ”یہاں آنے والے سبھی اچھے لوگ اس سے بچتے ہیں۔ جو اس سے بے تکلف ہوتے ہیں، وہ ٹھرکی قسم کے ہوتے ہیں۔“

بختیار کو فروزاں کے منہ سے ”ٹھرکی“ کا لفظ اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ان دونوں کی بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی نجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ بتادیا۔ بختیار کو اس سے اظہار محبت کرنے کی ہمت ابھی نہیں ہوسکی تھی لیکن بختیار نے بے صبری اس لیے بھی نہیں کی کہ ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ کسی وقت فروزاں نے ایسی بات کہی تھی جس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ گریجویشن سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بختیار ایک دن اپنے کیبن میں تنہا تھا اور کچھ فیگرز چیک کررہا تھا کہ ”ہیلو“ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

شبانہ اتنی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی کہ بختیار کو اس کی آمد کا علم اس کی آواز سے ہوا تھا۔

”آیئے مس شبانہ!“ بختیار کو منیجر کی حیثیت سے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرانا پڑا۔

”میں آپ کی برانچ میں اکاؤنٹ کھولنا چاہتی ہوں۔“ وہ اپنے پرس سے ہزار ہزار کے نئے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”پہلے آپ کا اکاؤنٹ کہاں تھا؟“ بختیار نے پوچھا۔

”وہ اب بھی ہے۔“ شبانہ نے جواب دیا۔ ”لیکن یہاں اکاؤنٹ میں اس لیے کھلوانا چاہتی ہوں کہ یہ میرے گھر سے کچھ قریب ہے۔“

بختیار چاہتا تو یہ کام بینک کے کسی اور آدمی کے سپرد کر کے شبانہ کو اپنے کیبن سے ٹال سکتا تھا لیکن اس نے یہ انداز اختیار کر کے شبانہ کو کھسیانے کا موقع دینا مناسب نہیں سمجھا، اس نے شبانہ سے فارم بھروایا۔ گارنٹر کی حیثیت سے فارم پر خود دستخط کردیے۔ سلپ بھر کے پیسے بھی جمع کروائے، سلپ بھی وہیں آگئی۔

”چائے نہیں پلوائیں گے؟“ شبانہ اٹھلائی۔

”ہاں ہاں ضرور۔“ بختیار کو کہنا پڑا۔

اس نے شبانہ کے لیے چائے منگوائی لیکن اخلاقاً اس کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ چائے آنے تک شبانہ نے آرٹس کونسل میں آنے والے کچھ لوگوں کی بات چھیڑ دی۔ بختیار نے محسوس کرلیا کہ شبانہ اس کے کیبن میں زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہے۔

جس وقت چائے آئی، کسی کا فون آگیا۔ بختیار نے ریسیور اٹھایا، فون کسی اکاؤنٹ ہولڈر کا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم میں بات ختم ہوگئی لیکن بختیار ریسیور کان سے لگائے خوامخواہ اس طرح بولتا رہا جیسے بہت اہم گفتگو ہورہی ہو۔

چائے پیتے ہوئے شبانہ کے چہرے سے اکتاہٹ اور کسی قدر جھنجلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ اسے بختیار سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بختیار نے اس وقت ریسیور رکھا جب شبانہ چائے پی چکی تھی۔

”بعض لوگ فون پر بھی اتنی دیر تک اٹکے رہتے ہیں۔“ وہ خوامخواہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اور کلائنٹ اہم ہو تو اس کی باتیں سننا ہی پڑتی ہیں۔ اس نے ایک کام بھی ایسا بتادیا ہے کہ مجھے فوراً اس بارے میں بات کرنے کے لیے صاحب کے پاس جانا پڑے گا۔“ وہ ایک فائل نکالتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ”میری یہ بداخلاقی معاف کردیجیے گا مس شبانہ...... ! ملازمت میں یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں......“ شبانہ زبردستی مسکرائی۔ ”اب میں بھی بس چلوں گی۔“

”آیئے!“ بختیار نے آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا، پھر اس کے پیچھے خود بھی باہر نکلا۔

جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تو بختیار رندھاوا کی میز کے قریب گیا۔ مقصد ذرا سا وقت گزارنا تھا۔

”کیسا کام جارہا ہے رندھاوا؟“

”میرا کام تو ٹھیک جارہا ہے لیکن......“ اس نے آواز دھیمی کی۔ ”یہ شبانہ بڑی حرافہ ہے۔“

”جانتے ہو اسے؟“

”میں اس شہر کے ہر نیک نام اور بدنام شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوں۔ ذرا بچ کے رہنا اس سے!“

”جتنا بچ سکتا ہوں، بچتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا پہلے بھی......“

”یہ آرٹس کونسل میں بہت آتی ہے۔“

”پھر تو جناب، قبلہ بختیار صاحب! بہت چوکنا رہیے گا۔“

بختیار نے مسکرا کر رندھاوا کے کندھے پر تھپکی دی اور اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔

دو دن بعد شبانہ چیک بک لینے آئی۔ اس دن بھی اس نے بختیار سے چپکنا چاہا لیکن بختیار کسی نہ کسی طرح اسے ٹالنے میں کامیاب ہوگیا۔

وقت گزرتا رہا۔ فروزاں فائنل ایر میں آگئی۔ بختیار نے اب تک اس سے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف شبانہ نے اس کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ بختیار کے گریز پا ہونے کے باوجود وہ چیک کیش کرانے یا کسی بہانے سے بینک آکر اس کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتی تھی۔

ایک دن اس نے کہا۔ ”ایک پریشانی میں پڑ گئی ہوں بختیار!“

وہ خود ہی اتنی بے تکلف ہوئی تھی کہ اس نے ”بختیار صاحب“ کہنا چھوڑ دیا تھا۔

”کیسی پریشانی؟“ بختیار نے پوچھا۔

”میں ایک کاروبار شروع کرنا چاہتی ہوں، اسی ادارے کے نام سے ایک اکاؤنٹ اور کھولوں گی۔ اس کے لیے آپ بیس لاکھ کا اوورڈرافٹ منظور کروادیجیے گا۔“

”پہلے آپ کام تو شروع کیجیے!“

”اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔“

”تب تو آپ کا یہ کام ہونا ممکن نہیں۔“

”اچھا تو میرے ہی اکاؤنٹ کے لیے اوڈی منظور کرادیں۔ میرا اکاؤنٹ تو خاصا پرانا ہوگیا ہے۔“

”زیادہ پرانا تو نہیں ہوا، اور پھر آپ کا ٹرانزکشن بھی اتنا نہیں رہا کہ بیس لاکھ کا اوورڈرافٹ منظور کروایا جاسکے۔“

”آپ چاہیں تو کرواسکتے ہیں۔“ شبانہ نے ایک ادا سے کہا۔ ”بینک منیجر یہ سب کچھ کرواسکتا ہے۔“

”میں نے اگر آؤٹ آف دی وے جاکے اس قسم کے کام کروانا سیکھا ہوتا تو آج اتنی بڑی برانچ کا منیجر نہ ہوتا۔“

”پلیز بختیار!“ شبانہ اٹھلائی۔ ”میری خاطر!“

”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“

یہ جملہ ٹالنے کے عمل کا ایک حصہ تھا جو بختیار کی ہوشیاری سے مہینوں پر محیط ہوگیا۔

فروزاں سے ملاقاتیں برابر جاری تھیں۔ ایک شام وہ دونوں آرٹس کونسل کی کینٹین میں ایک میز پر بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے، ان کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان دونوں میں بھی اتنی بے تکلفی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہنے لگے تھے۔

''ہم بڑے اچھے دوست تو بن گئے ہیں۔'' بختیار نے مسکرا کر کہا۔ اس روز اس نے دل کی بات کہنے کی ٹھان لی تھی۔

''یقیناً۔'' فروزاں بھی مسکرائی۔ ''یہاں میرے کئی اچھے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔''

''لیکن دوسروں نے تمہارے بارے میں اس طرح نہیں سوچا ہوگا جس طرح میں سوچ رہا ہوں۔''

''یعنی؟'' فروزاں سنجیدہ ہوگئی۔

''اب تم زرد گلاب نظر آرہی ہو۔''

''کیا مطلب!''

''تمہارے نقوش عجیب و غریب ہیں فروزاں!'' بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب تم سنجیدہ ہوتی ہو تو اداس نظر آنے لگتی ہو حالانکہ سنجیدگی اور اداسی دو مختلف چیزیں ہیں۔ پھر جب مسکراتی ہو، یا خوشگوار انداز میں باتیں کرتی ہو تو وہ اداسی غائب ہوجاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تمہاری اداسی کو دیکھ کر میرے تصور میں زرد گلاب ابھر آیا تھا، اور پھر جب تم مسکرائی تھیں تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے گلاب کی زردی سرخی میں بدل گئی ہو...... تمہاری یہی کشش تو ہے کہ میں تمہارے قریب ہوتا چلا گیا ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ آئندہ اتنا زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہ کرنا۔'' فروزاں نے حد درجہ سخت اور کھردرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ فوراً ہی اٹھ کر اس طرف بڑھتی چلی گئی جہاں آرٹس کونسل میں آنے والے اپنی کاریں کھڑی کیا کرتے تھے۔

بختیار دم بخود رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے فروزاں اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر گئی ہو۔ بختیار جب دم بہ خود رہ جانے والی کیفیت سے نکلا تو اس کے چہرے پر اداسی تھی۔

دوسرے دن وہ اداسی اس کے چہرے پر اس وقت بھی تھی جب وہ بینک میں کام کر رہا تھا۔ دوسروں نے اس میں یہ تبدیلی محسوس کی ہو یا نہ کی ہو لیکن رندھاوا نے متعدد بار اسے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی بات کرنے بختیار کے کیبن میں نہیں آیا۔

شام کو بختیار آرٹس کونسل گیا۔ فروزاں سے آمنا سامنا ہوا تو ''ہیلو ہائے'' بھی ہوئی۔

پھر آئندہ چند دن بھی اسی طرح گزرے۔ اگر کبھی وہ دونوں کچھ اور لوگوں کے ساتھ ہوتے تو ان میں سرسری سی باتیں بھی ہوجاتیں۔ فروزاں کا وہ کھنچاؤ بختیار نے شدت سے محسوس کیا۔ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے آرٹس کونسل جانا بھی کم کردیا۔ فروزاں کے رویے نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا تھا کہ اس کی اداسی بڑھتی چلی گئی۔

عبداللہ خان سے ملاقات کرنے کے لیے فروزاں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تھا لیکن اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ پہلے وہ آتی تھی تو اوپر جاتے جاتے بختیار کے کیبن کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار مسکراتی ضرور تھی لیکن اب مسکرانا تو کیا، وہ کیبن کی طرف اچٹتی سی نظر بھی نہیں ڈالتی تھی۔

ایک دن بختیار نے رندھاوا کو اپنے کیبن میں بلایا۔ رندھاوا آکر سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ بختیار اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔

''تم شراب پیتے ہو نا رندھاوا؟''

رندھاوا چونک گیا۔ ''یہ تو تم خود جانتے ہو......! لیکن میں زیادہ پینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بس رات کو کھانے سے پہلے دو پیگ لیتا ہوں۔''

''میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم کتنی پیتے ہو۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم لاتے کہاں سے ہو؟''

''میں نہیں لاتا۔ ایک مہربان ہیں۔ وہ دے دیتے ہیں، میرے لیے ایک بوتل ہفتے بھر کے لیے کافی ہوتی ہے۔'' جواب دیتے ہوئے رندھاوا کے چہرے سے الجھن آشکارا تھی۔

بختیار نے پوچھا۔ ''اپنے مہربان سے زیادہ نہیں منگوا سکتے؟''

''منگوا سکتا ہوں...... مگر کیوں؟''

''مجھے چاہیے۔''

رندھاوا نے طویل سانس لی۔ ''چوٹ کھا گئے......؟ ہاں یہ تو ہونا ہی تھا۔ مجھے بہت کم امید تھی کہ وہ بدل جائے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''دل ہار بیٹھے تھے نا فروزاں کو دیکھ کر؟''

بختیار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

''آرٹس کونسل بھی جانے لگے تھے۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''وہ تمہارے کیبن کی طرف دیکھ کر مسکرانے بھی لگی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ شاید تمہاری وجاہت اس کی جذباتیت کا دھارا موڑ دے اس لیے میں نے پہلے سے کچھ بتا کر تمہارا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔''

''کیا نہیں بتایا تم نے؟'' بختیار نے پہلو بدلا۔

''کنور ثقلین کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ کچھ دنوں سے اخبارات میں اس کا نام خاصا آنے لگا ہے۔ وہ سیاست کے میدان میں کود رہا ہے۔ جانتے ہو کچھ اس کے بارے میں؟''

''ہاں۔'' بختیار نے کہا۔ ''وہ شمالی پہاڑی علاقے کی ایک چھوٹی سی ریاست کے والی کا بیٹا ہے۔ اس نے سوشل کام بھی بہت کیے ہیں۔''

''صرف شہرت کے لیے۔'' رندھاوا نے تلخی سے کہا۔ ''باپ کی موت کے بعد بے تحاشا دولت کا مالک بن گیا ہے۔ سوشل کاموں میں شہرت حاصل کرنا اس کی منصوبہ بندی تھی۔ وہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ نواحی علاقے میں غریبوں کے لیے ایک بستی بھی بنوائی تھی اس نے! ثقلین آباد کا نام تم نے سنا ہی ہوگا۔''

''تم ان تفصیلات میں کیوں جارہے ہو؟ اصل بات بتاؤ مجھے۔''

''وہ اسے چاہتی ہے۔''

''فروزاں؟'' بختیار چونکا۔

''اور کس کی بات ہورہی ہے!''

بختیار کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ ''پھر تو......'' وہ بھرّائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''پھر تو ٹھیک ہے۔''

''کیا ٹھیک ہے۔''

''وہ پہلے ہی سے کسی کو پسند کرتی ہے، یا تمہارے الفاظ کے مطابق اسے چاہتی ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ مجھے ٹھکرا دے۔ اگر تم مجھے پہلے سے یہ بات بتا دیتے تو عین ممکن تھا کہ میں خود کو سنبھال لیتا۔''

''میں نے یہ سوچا تھا نا کہ شاید تمہاری وجاہت اسے بدل دے...... تم غیر معمولی طور پر وجیہہ ہو۔ کیا تمہیں اس کا احساس نہیں؟''

''محبت صرف وجاہت سے نہیں ہوتی۔'' بختیار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''وہ کنور ثقلین سے محبت کرتی ہے تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اس کی راہ میں دیوار بنوں۔''

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کرکے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787

فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

‘‘حق پہنچے یا نہ پہنچے۔’’ رندھاوا نے زور دے کر کہا۔ ‘‘تمہیں اگر اس سے محبت ہے تو اس کے راستے کی دیوار ضرور بنو۔’’

‘‘یہ تو میری خود غرضی ہوگی۔’’

‘‘نہیں۔’’ رندھاوا نے کہا۔ ‘‘یہ تمہاری محبت کا تقاضا ہوگا کہ تم اسے تباہی سے بچاؤ۔’’

‘‘تباہی؟’’ بختیار الجھا۔

‘‘ہاں۔’’ رندھاوا نے کہا۔ ‘‘کنور ثقلین ہر اعتبار سے اوباش ہے۔ شرابی، جواری، عورتوں کا رسیا! ریس کورس وہ جاتا ہے۔ چوری چھپے چلنے والے جوئے کے اڈوں میں اس کے قدم پہنچتے ہیں۔ وہ فروزاں سے شادی نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے کر بیٹھا تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ بھی دے گا۔’’

‘‘کیا فروزاں کو نہیں معلوم؟’’ بختیار نے حیرت سے پوچھا۔

‘‘کیا نہیں معلوم؟’’

‘‘کنور ثقلین ایسا ہے۔’’

‘‘نہیں معلوم ہوگا اسے! بہتوں کو نہیں معلوم! وہ تمام برے کام بڑی احتیاط سے کرتا ہے۔ اس کی ان حرکتوں کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود بھی ان حرکتوں میں ملوث ہیں۔ مجھ جیسے شاید دو ایک ہی آدمیوں کو معلوم ہوگا کہ کنور ثقلین کتنے گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔ وہ شاید ابھی فروزاں کے معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا ورنہ اسے برباد کر چکا ہوتا، اور اگر کسی وجہ سے اس نے فروزاں سے شادی کر بھی لی تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ دے گا۔’’

‘‘تم یہ بات دوسری بار کہہ رہے ہو کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔’’

‘‘مجھے معلوم ہے نا اس کا مزاج! لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اس کے لیے! وہ مستقل روگ نہیں پالنا چاہتا۔ ایک بہت خوب صورت لڑکی اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ویسے اس کے ہاتھ نہیں لگ سکی تو اس نے اس سے شادی کر لی لیکن صرف تین ماہ بعد چھوڑ دیا۔’’

‘‘لڑکی نے احتجاج نہیں کیا؟’’

‘‘کیا احتجاج کرتی…… مہر کے کئی لاکھ کا چیک اس نے لڑکی کے منہ پر دے مارا اور کہا کہ وہ جسے چاہتا ہے، اسے ہر قیمت پر خرید لیتا ہے۔’’

‘‘تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم!’’

‘‘مجھے……’’ رندھاوا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ‘‘تم میرے اچھے دوست تو بن گئے لیکن مجھے اندر سے نہیں دیکھ سکے۔ میں اپنا اندرون کسی پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا ہر جگہ ہے۔ بڑے حلقوں میں بھی اور چھوٹے حلقوں میں بھی۔ اچھے حلقوں میں بھی اور برے حلقوں میں بھی لیکن میں نے برے حلقوں کا اثر قبول کیا، نہ چھوٹے حلقوں کا۔ اسی لیے آج تک بس کیشئر ہوں ایک بینک کا۔’’ رندھاوا کی مسکراہٹ میں تلخی آ گئی۔ ‘‘مجھے سفارش پسند ہے، نہ دھونس دھمکی!…… اور ترقی کی صلاحیت تو یقیناً مجھ میں نہیں ہے۔’’

بختیار حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رندھاوا اتنا گہرا آدمی ہوگا۔

‘‘تمہارے سوالوں نے دھکیل دیا مجھے ان باتوں کی طرف۔’’ رندھاوا سنجیدگی سے بولا۔ ‘‘کوئی ضرورت نہیں تھی کہ میں تمہیں اپنے بارے میں یہ سب کچھ بتاتا۔ شاید میں یہ جان کر جذباتی ہو گیا تھا کہ تم فروزاں کا دل نہیں جیت سکے۔ میری شدید خواہش تھی کہ تم کامیاب ہو جاؤ اور ایک اچھی لڑکی تباہی سے بچ جائے۔ تمہیں اب بھی اپنی کوششیں جاری رکھنا چاہئیں۔ کسی طرح بھی فروزاں کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔ اس سے محبت ہے تو اسے تباہی سے بچاؤ اور یہ تمہیں شراب کی کیا سوجھی؟ کیا رکھا ہے شراب میں؟’’

‘‘میں اپنا غم اس میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔’’ بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔

‘‘خام خیالی ہے تمہاری کہ تم ایسا کر لیتے۔’’ رندھاوا نے کہا۔ ‘‘یہ کہانیوں کی باتیں ہیں کہ شراب پی کر غم بھلائے جا سکتے ہیں۔ شراب کا نشہ دائمی تو نہیں ہوتا۔ ادھر نشہ ختم ہوا اور ادھر رنجیدہ خیالات پھر دماغ پر سوار۔ ہاں اگر آدمی آنکھ کھلنے سے لے کر سونے تک پیتا ہی رہے تو اور بات ہے۔ کیا تم اپنی زندگی اس طرح برباد کرو گے کہ اور کسی کام کے نہ رہ جاؤ!’’

بختیار چپ رہا۔ رندھاوا کی باتوں میں خلوص تھا۔

شراب سے قطع نظر فروزاں کو تباہی سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اسے فروزاں سے محبت تھی اس لیے اسے فروزاں کو کنور ثقلین سے بچانے کی کوشش کرنا ہی چاہیے تھی۔

لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کئی دن تک نہیں آ سکی کہ یہ کام وہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے پھر باقاعدگی سے آرٹس کونسل جانا شروع کر دیا۔ وہ خواہاں تھا کہ اسے فروزاں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن فروزاں بڑی ہوشیاری سے خود کو اس سے دور رکھتی رہی۔

ایک مہینا اسی طرح گزر گیا۔ بختیار پر پھر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے لیے بینک کے کاموں میں دل لگانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

ایک روز جب وہ بینک میں ہی تھا تو اس کے انٹر کام کا بزر بجا۔ دوسری طرف عبداللہ خان تھے۔ ‘‘بختیار!’’ انہوں نے کہا۔ ‘‘پبلک کے لیے جب بینک بند ہو جائے تو میرے پاس آنا۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے۔’’

‘‘جی سر!’’

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ بختیار نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ بینک میں ان دنوں وہ جس ناکارگی کا شکار رہا تھا، اس کے بارے میں عبداللہ خان کو اس کا علم ہو گیا ہوگا۔

پندرہ منٹ بعد ہی جب بینک بند کیا گیا تو وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بوجھل قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

‘‘آؤ بختیار!’’ عبداللہ خان نے خوشگوار لہجے میں کہا جب بختیار دستک دینے کے بعد ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ بات کچھ اور ہے۔ اگر عبداللہ خان اس کی ناکارگی سے ناخوش ہوتے تو ان کا لہجہ مختلف ہوتا۔ وہ بہت گمبھیر لہجے میں بات کرتے۔

‘‘بیٹھو!’’ انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ‘‘آج مجھے تم سے جو باتیں کرنا ہیں، وہ تمہارے لیے شاید تعجب خیز ثابت ہوں۔’’

بختیار سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

عبداللہ خان پھر بولے۔ ‘‘میں نے تم سے ہمیشہ دفتر کے معاملات پر گفتگو کی ہے۔ تم کیا، میں کسی سے بھی اس کے نجی اور گھریلو معاملات پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن آج مجھے تم سے کچھ ایسی ہی باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہارے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔’’

بختیار نے اطمینان کی سانس لی۔ بات وہ نہیں تھی جس کا اسے خیال آیا تھا۔

‘‘سر!’’ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ‘‘اگر آپ میرے والدین یا میرے بھائی بہنوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ میرا نہ تو کوئی سگا بھائی ہے، نہ سگی بہن ہے۔ میرے والد کا انتقال میری پیدائش سے دو ماہ قبل ہو گیا تھا اور جب میں دو سال کا تھا تو میری والدہ بھی دنیا سے سدھار گئی تھیں۔’’

‘‘اوہ!’’ عبداللہ خان کے لہجے سے افسوس کا اظہار ہوا۔ ‘‘میں نے تو غیر ارادی طور پر ایک غم ناک موضوع……’’

‘‘نہیں سر!’’ بختیار نے ان کی بات کاٹی۔ ‘‘یہ سب کچھ اب بہت پرانی باتیں ہو چکی ہیں، وقت کی گرد میں دب چکی ہیں۔’’

‘‘تو پھر تمہاری پرورش…… تمہاری تعلیم و تربیت؟’’

‘‘میں اس کے لیے اپنی خالہ اور خالو کا احسان مند ہوں۔ میں انہی کے سایۂ عاطفت میں بڑا ہوا ہوں۔ دراصل میری خالہ کی کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی اس لیے انہوں نے مجھے اپنے سگے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ مجھے ہی نہیں بلکہ آفتاب کو بھی……! دراصل میری ایک اور خالہ اور ان کے شوہر ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کا چار سال کا ایک بیٹا تھا، میں نے ابھی اسی کا نام لیا ہے۔’’

‘‘یعنی آفتاب؟’’

‘‘جی۔’’ بختیار نے کہا۔ ‘‘آفتاب مجھ سے دو سال بڑا ہے۔’’

‘‘تمہارے خالو کیا کرتے ہیں؟’’

‘‘وہ ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ وراثت میں بھی انہیں بہت کچھ ملا تھا۔ مجھے ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ خالو کی خواہش تو تھی کہ میں تجارت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میرا رجحان شروع ہی سے بینکنگ کی طرف تھا۔ خالو نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اب بھی اکیلے ہی اپنا سارا کاروبار دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے انہیں آفتاب کی طرف سے بھی مایوسی ہو چکی تھی۔’’

‘‘آفتاب کیا کرتا ہے؟’’

‘‘وہ سیاست میں گھس گیا ہے۔ اسے بہ ظاہر کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی لیکن وہ اپنا وتیرہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا ربط ضبط انتہا پسند گروپس سے ہے۔ خالہ اور خالو کو اس قسم کی زندگی پسند نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں آفتاب سے کچھ زیادہ نہیں کہتے۔ انہیں اندازہ ہے کہ ایسی صورت میں آفتاب سرکش ہو جائے گا اور وہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔’’

‘‘یعنی وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوا؟’’

‘‘میرا وہ بھائی خالہ زاد سہی۔’’ بختیار نے کہا۔ ‘‘لیکن

میں اس کے لیے یہ الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔''

''سوری! مجھے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔''

''سوری کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے سر!''

''آفتاب کی شادی ہوچکی؟''

''جی نہیں سر!''

''تم سے اس کے تعلقات خوشگوار ہیں؟''

''ناخوشگوار نہیں ہیں۔'' بختیار نے مبہم جواب دینے کی کوشش کی۔ اپنے گھر کی ساری تفصیلات بتانے کے باوجود اس نے اس اظہار سے پہلوتہی کی تھی کہ آفتاب اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ اس کی ترقی آفتاب کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ خاص طور سے اس وقت وہ بہت کڑھ جاتا تھا جب خالہ یا خالو اسے بختیار کی مثال دے بیٹھتے تھے۔

''خیر!'' عبداللہ خان قدرے توقف سے بولے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''میری بیٹی فروزاں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

فروزاں کا نام آنے سے تو بختیار چونکا ہی تھا لیکن یہ بات بھی اس کے لیے تعجب خیز تھی کہ عبداللہ خان فروزاں کے بارے میں اس کی رائے لینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کے لیے چکرا دینے والی بات تھی کہ اس کے خاندان کی تفصیل جاننے کے بعد عبداللہ خان نے اچانک فروزاں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''جواب نہیں دیا تم نے بختیار!'' عبداللہ خان کچھ انتظار کے بعد بولے۔

''میں پریشان ہوگیا ہوں سر!'' بختیار نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے کہ آپ ان کے بارے میں میری رائے کیوں جاننا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنی پیاری بیٹی کے بارے میں ہر ایک کی رائے پوچھتا ہوں بختیار! مجھے اپنی بیٹی میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ میری عزیز بیٹی ہے لہٰذا مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ دوسروں کی رائے اسی لیے پوچھتا ہوں کہ شاید مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی ہوگئی ہو۔''

''دوسروں کی رائے کیا ہے سر؟''

''سبھی نے یہ کہا ہے کہ وہ مہذب ہے، بااخلاق ہے، بڑوں کا ادب کرتی ہے اور تعلیم کے حصول میں بھی نمایاں رہتی ہے۔ کچھ دن بعد وہ گریجویشن بھی کرلے گی۔''

''اسی رائے کا اظہار میں بھی کرسکتا ہوں سر!''

''نہیں۔'' عبداللہ خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دوستوں کی رائے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ فروزاں کے دوست اور بھی ہیں لیکن میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے تم آرٹس کونسل جا رہے ہو۔ فروزاں بھی بلاناغہ جاتی ہے۔ وہاں تم دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے فروزاں ہی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کے اچھے دوست ہو۔''

بختیار سمجھ گیا کہ فروزاں نے اپنے باپ سے یہ بات اس دن سے پہلے کہی ہوگی جب بختیار نے اس سے اظہارِ محبت کرنا چاہا تھا۔

بختیار نے احتیاط سے جواب دیا۔ ''دوست کی حیثیت سے بھی ان کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔''

عبداللہ خان فوراً کچھ نہیں بولے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ آخر انہوں نے سکوت ختم کیا اور مسکرا کر بولے۔ ''تمہارا کیا پروگرام ہے؟ شادی کب کرو گے؟''

بختیار کا دل دھک سے رہ گیا اور اس کے ذہن میں سوال ابھرا کہ وہ اب جس نتیجے تک پہنچ رہا ہے، کیا وہ صحیح ہوسکتا ہے؟

''سر!'' وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ''میری خالہ کو بھی اب جلدی ہے کہ میری شادی کردیں لیکن میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک وائس پریذیڈنٹ نہ بن جاؤں۔''

''وہ تو تم شاید اسی سال بن جاؤ گے۔'' عبداللہ خان نے مسکرا کر کہا۔

''جی!'' بختیار چونکا۔

''ہاں۔'' عبداللہ خان بولے۔ ''اوپر کی سطح پر یہ بات زیرِ غور ہے کہ تمہیں وائس پریذیڈنٹ بنا دیا جائے۔''

''اتنی جلدی؟'' بختیار کو حیرت ہوئی۔

''صلاحیت ہو تو انسان بہت سی منزلیں ایک دن میں سر کرسکتا ہے اور تم میں یہ صلاحیت ہے جس سے بینک کے بڑے بے خبر نہیں ہیں۔''

بختیار نے طویل سانس لی۔ ''اگر ایسا ہوگیا تو لوگوں کا شبہ یقین میں بدل جائے گا۔''

''کیسا شبہ؟''

''لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ میری اتنی تیزی سے ترقی کے پیچھے کوئی بڑی سفارش کام کررہی ہے۔''

''ناکارہ لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ تمہیں ان کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ خیر! ہم موضوع سے کچھ ہٹ گئے۔ اگر تمہاری خالہ کو فروزاں جیسی کوئی لڑکی نظر آجائے تو کیا وہ اسے تمہارے لیے منتخب کرلیں گی؟''

اس مرتبہ بختیار کا دل بہت زور سے دھڑکا اور اس نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''یقیناً۔''

''تو پھر اپنی خالہ کو میرے گھر بھیج دو۔ میرا گھر تم نے دیکھا ہی ہے اور ہمارے مشرقی رواج کے مطابق لڑکے والوں ہی کو لڑکی والوں کے گھر بھیجا جاتا ہے۔''

''سر!'' بختیار کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ عبداللہ خان کا منہ تکنے لگا جو شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''لیکن سر......'' بختیار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

عبداللہ خان یکایک سنجیدہ ہوگئے۔ ''کیا تم کسی اور لڑکی کا انتخاب کرچکے ہو؟''

''جی نہیں سر! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ...... آپ نے اپنی بیٹی سے بھی پوچھا ہے؟''

''پوچھ لوں گا۔ میں اس سلسلے میں فکرمند نہیں ہوں۔ وہ ہمیشہ کہتی رہی ہے کہ میں اس کے لیے کبھی کچھ برا نہیں کرسکتا لہٰذا میں جب اسے تمہارے بارے میں بتاؤں گا تو وہ انکار نہیں کرے گی۔''

بختیار کو ان باتوں سے جو خوشی حاصل ہورہی تھی، وہ لمحاتی ثابت ہوئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ فروزاں اسے قبول کرنے سے انکار کردے گی اور عبداللہ خان کی خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

یہی خیالات تھے جن کی وجہ سے اس نے اپنی خالہ کو عبداللہ خان کے گھر نہیں بھیجا، اور نہ ان سے اپنی اور عبداللہ خان کی باتوں کا ذکر کیا، لیکن آٹھ دس دن گزر جانے کے بعد امتحان پھر اس کے سر پر کھڑا تھا۔

''تم نے بھیجا نہیں اپنی خالہ کو!'' عبداللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر پوچھا۔

''جی...... وہ......'' بختیار کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ کیا کہے۔

''تمہاری شرط مجھے منظور ہے بختیار!'' عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم جب وائس پریذیڈنٹ بن جاؤ گے، شادی تبھی ہوگی اور ہاں! میں نے فروزاں سے بھی بات کرلی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔''

بختیار چونکا۔ عبداللہ خان نے جیسے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اسے ہر ملاقات میں چونکاتے رہیں گے۔

''ہاں بختیار!'' عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فروزاں کی شادی تم سے ہوجائے، اس پر فروزاں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میری خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔''

بختیار ان باتوں سے رندھاوا کو برابر آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے اس دن کی باتیں بھی رندھاوا کو بتائیں۔

رندھاوا نے ایک طویل سانس لی۔ ''گویا اس نے باپ کی وجہ سے سر جھکایا ہے لیکن مجھے ڈر ہے بختیار کہ اس سے تمہاری شادی کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ میرے علم کے مطابق اس کے اعصاب پر اب بھی کنور ثقلین ہی سوار ہے۔''

''رندھاوا!'' بختیار نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''جب وہ میرے قریب ہوجائے گی تو اسے میری محبت کی شدت کا اندازہ ہوگا۔ میں اسے اتنا خوش رکھوں گا کہ وہ بھول جائے گی کنور ثقلین کو۔''

رندھاوا کی سنجیدگی برقرار رہی۔ ''اگر تمہیں خود پر اتنا اعتماد ہے تو اپنی وائس پریذیڈنٹ کی شرط کو پس پشت ڈال دو۔ جلد از جلد شادی کرلو۔ کنور ثقلین کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اس لیے وہ اب تک فروزاں کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا ہے لیکن اسے فروزاں کی شادی کا علم ہوگا تو پھر وہ فروزاں کو......'' رندھاوا جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔

''میں سمجھ گیا۔'' بختیار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی شرط ختم کردوں گا۔ خالہ سے یہ بھی کہلوا دوں گا کہ فروزاں شادی کے بعد بھی گریجویشن کرسکتی ہے۔''

''شاید یہی بہتر ہو۔'' رندھاوا نے کہا، پھر اس نے پوچھا۔ ''فروزاں نے اس بارے میں تم سے کچھ کہا؟''

''میں ان دنوں آرٹس کونسل نہیں جارہا ہوں۔''

''اس سے مل لیتے تو اچھا تھا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ جب خالہ بات پکی کر آئیں، اس کے دوسرے دن فروزاں سے ملوں۔''

رندھاوا کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''خیر! جیسا تم مناسب سمجھو۔''

اور بختیار نے وہی مناسب سمجھا جو اس نے رندھاوا سے کہا تھا۔

اس نے جب خالہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ خالو بھی خوش ہوئے۔ خالہ کو بختیار نے

سب کچھ بتانے کے علاوہ یہ بھی سمجھا دیا کہ شادی کے سلسلے میں عجلت سے کام لیا جائے۔

اور جب خالہ عبداللہ خان کے گھر سے لوٹیں تو انہوں نے بتایا کہ ایک ماہ بعد کی تاریخ پکی بھی کرلی ہے۔

دوسرے دن عبداللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''شرط واپس لے لی تم نے؟ چلو خیر! کوئی حرج نہیں ہے۔ فروزاں سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ گریجویشن وہ شادی کے بعد کرے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تم میری بیٹی کو پسند کرنے لگے تھے اس لیے تم سے صبر نہیں ہوسکا۔''

بختیار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکالیں۔

اسی دن شام کو وہ آرٹس کونسل گیا۔ فروزاں پہلے سے موجود تھی۔ اس روز اس نے خود کوشش کی کہ بختیار سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نکالے اور اس نے موقع نکال ہی لیا۔

''جیت گئے تم!'' فروزاں سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مبارک ہو!''

''کیا تم مبارک باد نہیں لوگی؟'' بختیار مسکرایا۔

''ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔'' فروزاں کا لہجہ سپاٹ رہا۔

''کیسی بات کررہی ہو فروزاں...... ! درخواست کیا مطلب؟ تم مجھے حکم دو۔ کیا چاہتی ہو۔''

''جو بات میں تم سے کہنا چاہتی ہوں، وہ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔''

''نہیں بتاؤں گا۔'' بختیار مسکرایا۔

''وعدہ کرتو رہے ہو، وعدے کی اہمیت جانتے ہو؟''

''خوب جانتا ہوں۔''

''تو سنو! میں چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے تم ایک گھر کا بندوبست کرلو جہاں صرف میں اور تم رہو۔ میں ساس سسر، جیٹھ دیور یا نندوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

بختیار سنجیدہ ہوگیا۔ ''وہ میری ماں نہیں، خالہ ہیں فروزاں!''

''خلیا ساس سہی، ہیں تو ساس!...... خالو بھی ہیں تمہارے! ایک خالہ زاد بھائی بھی ہے۔ میں ان سب کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔''

''لیکن فروزاں!''

''تم وعدہ کرچکے ہو۔'' فروزاں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اچھا!...... اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی خالہ کا دل دکھاؤں تو...... ٹھیک ہے۔ میں اپنا وعدہ ایفا کروں گا۔''

لیکن یہ وعدہ ایفا کرنے کے لیے بختیار کو خاصے کرب سے گزرنا پڑا۔ فروزاں کی شرط کو اس نے اپنی خواہش بنا کر خالہ کے سامنے پیش کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بختیار انہیں بہ مشکل سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس زمانے میں ساس بہو کا رشتہ بہت نازک ہوچکا ہے لہٰذا شادی کے بعد الگ رہنے ہی میں محبت قائم رہتی ہے۔ اس معاملے میں اس کے خالو نے بھی دل سے یا بے دلی سے اس کی حمایت کی۔ خالہ کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

''لیکن بیاہ کر پہلے دن اسے یہیں لانا پڑے گا۔'' ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی وہ اس بات پر اڑ بھی گئیں۔ ''دوسرے دن تم اسے جہاں چاہو، لے جانا۔''

اب بختیار کو خاموش ہونا پڑا۔

دوسرے دن اس نے فروزاں کو خالہ کی شرط سے آگاہ کرنے کے بعد بڑی لجاجت سے کہا۔ ''پلیز فروزاں! کم ازکم اس بات سے انکار نہ کرنا۔ خالہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ وہ تمہیں بھی اتنا ہی چاہیں گی۔ ان کی اتنی سی بات تو رکھ لو۔''

اندیشوں کے برخلاف بختیار کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی۔ فروزاں نے بات مان لی، پھر کہا۔ ''آج کے بعد شادی تک میں آرٹس کونسل نہیں آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر کوئی شرط لے آؤ۔ مجھے اس دوران میں فون بھی مت کرنا۔ اگر کروگے تو میں ریسیو نہیں کروں گی اور کسی اجنبی نمبر سے آنے والی کال تو میں ریسیو ہی نہیں کرتی ہوں۔ آرٹ کونسل میں اس لیے بھی نہیں آؤں گی کہ اب میں شادی تک خود کو گھر میں قید کرلوں گی۔ کالج بھی نہیں جاؤں گی۔'' پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ ''شاید کسی کا بھی فون ریسیو نہ کروں۔''

بختیار نے اندازہ لگایا کہ وہ ''کسی'' کنور ثقلین بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ فروزاں خود کو اپنے ہی گھر میں قید کرلینا چاہتی تھی۔ بختیار کے لیے اس میں خوشی کا پہلو یہ تھا کہ اب اگر کنور ثقلین کو فروزاں کی شادی کا علم ہوجاتا تو بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

ایک ماہ شادی کی تیاری کے لیے کم ہوتا ہے لیکن جب دونوں طرف پیسے کی کمی نہ ہو تو ساری تیاریاں ایک ماہ

ے کم مدت میں بھی ہو جاتی ہیں۔ بختیار اتنا زیادہ پیسا خرچ نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کے خالو کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے پیسا پانی کی طرح بہایا اور یہ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوگئی۔

شادی کی پہلی رات...... ! امنگوں اور ولولوں کی رات...... ! سرشاری و دیوانگی کی رات! لیکن یہ سب کچھ بختیار تک محدود رہا۔ فروزاں برف کی سل بنی رہی۔

''خیر۔'' بختیار نے اپنے دل میں کہا۔ ''میں تمہاری محبت جیت کر رہوں گا فروزاں!''

اس شام بختیار کے خالو نے ایک بڑے سبزہ زار میں ولیمے کا اہتمام کیا تھا (شادی سے قبل) ولیمے کے دعوت ناموں کی خاصی بڑی تعداد عبداللہ خان کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ ان کی طرف سے آئے ہوئے مہمانوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی لیکن دعوت ناموں کی تعداد سے کم تھی۔

خود فروزاں نے بھی اپنے دوست لڑکوں اور لڑکیوں کو بلایا تھا۔ ان میں سے جن کا تعلق آرٹس کونسل سے تھا، وہ سب تو نہیں آئے لیکن جو آئے تھے وہ فروزاں اور بختیار کے مشترکہ مہمان تھے۔ ساڑھے نو بجے تک سب مہمان آچکے تھے یا جو تھوڑے بہت رہ گئے تھے، وہ آتے جارہے تھے۔ جب فروزاں اور بختیار مہمانوں میں گھل مل گئے تو جگہ جگہ ان کے جاننے والوں نے انہیں گھیرا۔ بختیار سب سے ہنستے مسکراتے ہوا مل رہا تھا لیکن فروزاں کے ہونٹوں پر بس ہلکی سی مسکراہٹ رہی جو بختیار کے خیال کے مطابق جبری تھی۔

ایک جگہ فروزاں چونکی۔ بختیار نے اس شخص کی طرف دیکھا جو فروزاں کے چونکنے کا سبب بنا تھا۔

''حیران رہ گئیں مجھے دیکھ کر!'' وہ آدمی قریب آتے ہوئے بولا۔ پھر قریب آکر اس نے بختیار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بختیار نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

''مجھے ثقلین کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ لوگوں کی محض محبت ہے کہ وہ مجھے کنور ثقلین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔''

''آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ آپ کنور لگتے بھی ہیں۔'' بختیار نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ وہ فروزاں کو شبہ بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اور کنور ثقلین کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

''شکریہ۔'' کنور ثقلین نے کہا اور پھر فروزاں کا نام لے کر اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر جلدی سے دوبارہ بختیار کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''برا مت مانیے گا کہ میں انہیں مسز بختیار کہنے کے بجائے ان کا نام لے رہا ہوں۔ دراصل ہم بہت پرانے دوست ہیں، فروزاں نے کبھی آپ سے میرا ذکر نہیں کیا؟''

''شاید کیا ہو۔'' بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ان کے بہت سے دوست ہیں۔ میں زیادہ تر کے نام بھول چکا ہوں۔''

کنور ثقلین نے مسکراتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی، پھر دوبارہ فروزاں کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا تم سے کہ شادی کی عجلت میں کچھ نام تمہیں یاد نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں سے ایک نام میرا بھی ہوگا اس لیے تم نے مجھے بھی اپنی شادی کا دعوت نامہ نہیں بھیجا لیکن میں نے سنا تو خود ہی آگیا۔ میں بن بلایا مہمان ہوں۔''

بختیار نے محسوس کیا کہ فروزاں اس وقت جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے اس مشکل وقت میں شبانہ اس کے کام آئی۔

''میں بھی بن بلائی مہمان ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے کسی جانب سے ان کے قریب آئی اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بینک سے معلوم ہوگیا تھا کہ آج آپ کا ولیمہ ہے۔ اگر کل معلوم ہوجاتا تو میں شادی میں بھی ایک بن بلائی مہمان ہوتی۔'' اس کا لہجہ بہت شوخ تھا۔

''ہاں۔'' بختیار نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے کئی جاننے والوں کو بلانا بھول گیا۔ یہاں تک کہ دو ایک دوستوں کو بھی بھول گیا ہوں۔''

شبانہ کی مسکراہٹ گہری تھی۔ ''آپ مجھے باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں آپ کی دوست نہیں ہوں۔''

''دراصل۔'' بختیار سنجیدہ ہوا۔ ''آپ سے آرٹس کونسل میں کبھی کبھی ملاقات ہوئی ہے۔ میں آپ کو اپنے بینک کی کلائنٹ کی حیثیت سے زیادہ جانتا ہوں اور ایک منیجر کی حیثیت سے مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے آپ کو دوست کہا تو شاید آپ برا مان جائیں۔''

''ہرگز برا نہیں مانوں گی۔'' شبانہ نے کہا۔ ''آپ مجھے دوست صرف کہیں نہیں بلکہ سمجھیں بھی!''

''ہیلو شبانہ!'' ایک جانب سے آواز آئی۔

شبانہ اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس طرح بختیار بھی ایک مشکل جواب دینے سے بچ گیا۔

اس مختصر دورانیے میں فروزاں نے اپنی جذباتی

کیفیت پر قابو پالیا تھا۔ وہ کنور ثقلین سے بولی۔ “معاف کرنا کنور! میں واقعی بھول گئی تھی، ویری سوری۔”

“کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے ایسا۔”

“پھر ملاقات ہوگی تم سے! میں ذرا کچھ اور مہمانوں کو دیکھ لوں۔”

“شیور، شیور، ضرور۔”

فروزاں نے بختیار کا ہاتھ پکڑ کر قدم آگے بڑھائے۔ اس تقریب کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا جب فروزاں نے اس کا ہاتھ خود پکڑا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ بختیار اور کنور ثقلین میں کوئی اور بات ہو۔

اس محفل میں رندھاوا بھی موجود تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی کوشش تھی کہ وہ فروزاں اور بختیار سے دور دور ہی رہے۔

فروزاں اور بختیار آگے بڑھے ہی تھے کہ بختیار کے خالہ زاد بھائی آفتاب سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ شبانہ بھی تھی۔

“آج تم بہت اچھے لگ رہے ہو بختیار!” وہ بولا۔

“اور یہ؟” بختیار نے فروزاں کی طرف اشارہ کیا۔

“یہ آخر تمہارا انتخاب ہیں۔ یہ ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں گی۔” آفتاب نے کہا، پھر فروزاں سے بولا۔ “کیوں بھا...... اوہ، نہیں۔” وہ ہنسا۔ “میں بھابی کہنے والا تھا۔ کوئی تک نہیں ہوگی اس کی۔ بختیار مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں اس کا نام لیتا ہوں اور یہ مجھے بھیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔”

“آپ میرا نام لے سکتے ہیں۔” فروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔

“یہ ہوئی نا بات!” آفتاب ہنسا۔

شبانہ اس کے برابر میں کھڑی مسکراتی رہی۔

“اب آپ اپنی گپ شپ جاری رکھیں بھیا! ہم اور مہمانوں کو دیکھتے ہیں۔” بختیار نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کے ساتھ فروزاں نے بھی قدم بڑھائے۔ اب اس نے بختیار کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

شبانہ اور آفتاب کو باتیں کرتے دیکھ کر بختیار چونک گیا تھا۔ پہلے کبھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ شبانہ سے آفتاب کی بھی شناسائی یا دوستی ہوگی۔ آفتاب کبھی آرٹس کونسل میں نظر نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے آفتاب اور کنور ثقلین کو بھی ایک جگہ کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ آفتاب سیاست دانوں میں گھسا رہتا ہے اور رندھاوا نے بتایا تھا کہ کنور ثقلین اب سیاست میں باقاعدہ قدم رکھ چکا ہے۔ غالباً وہ آنے والے انتخابات میں حصہ بھی لیتا۔

تقریب میں کئی سیاست دان نظر آرہے تھے لیکن وہ سبھی عبداللہ خان کے مہمان ہو سکتے تھے۔ بختیار کا یا اس کے خالو کا کسی سیاست دان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بارہ بجے سے پہلے تقریب ختم ہوئی جب فروزاں اور بختیار وہاں سے روانہ ہونے لگے تو آفتاب نے کہا۔

“تم دونوں کے تحائف کل پہنچا دوں تمہارے گھر فروزاں!”

بختیار کو نہ جانے کیوں یہ اچھا نہیں لگا کہ آفتاب نے یہ بات اس سے کہنے کے بجائے فروزاں سے کہی تھی۔

دوسرے دن آفتاب اپنے کہنے کے مطابق انہیں تحائف پہنچانے آیا جو ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ وہ ڈھیر وہ اپنی کار میں لایا تھا۔ ساتھ میں ایک ملازم بھی تھا جس نے وہ سب تیسری منزل تک پہنچایا۔

ملازم کو رخصت کرنے کے بعد آفتاب وہیں رکا رہا۔

“کیا چائے نہیں پلواؤ گی میری چھوٹی سی پیاری بھابی!” اس نے چہکنے کے سے انداز میں کہا۔

بختیار کو یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ وہ فروزاں سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

فروزاں نے اسے جواب دیا۔ “ابھی ہم نے کوئی ملازم نہیں رکھا۔ صبح کا ناشتا ہم نے باہر جا کے ہوٹل میں کیا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے بھی یہی کرنا پڑے گا۔”

“تو گھر آجایا کرو!” آفتاب نے کہا۔ “میں خود بھی دو ایک ڈشز خاص تمہارے لیے بنایا کروں گا۔ بختیار کو معلوم ہے کہ میں اچھا خاصا باورچی ہوں۔” وہ ہنسا۔

فروزاں اسے کوئی جواب دیے بغیر کھڑی ہو گئی اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بہت ہی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ “میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔” وہ تیزی سے خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔

آفتاب اس کی بے رخی پر چند لمحے کے لیے سنجیدہ ہوا۔ اس کے بعد پھر ہنسا۔ وہ ہنسی کھسیاہٹ کی تھی۔ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ “میں اب چلتا ہوں بختیار!”

“شکریہ بھیا! آپ نے ناحق زحمت کی۔ تحائف کسی ملازم سے بھجوا دیتے!”

“میں نے سوچا تھا کہ...... اچھا خیر!...... چلتا ہوں، خدا حافظ۔”

بختیار اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گیا۔ پھر دروازہ بند کر کے خواب گاہ میں پہنچا۔ فروزاں آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی سو جاتی۔

“فروزاں!” بختیار اس کے برابر میں لیٹتے ہوئے بولا۔ “تم ابھی سوئی تو نہیں ہوگی۔”

“ہوں۔” فروزاں آنکھیں بند کیے رہی۔

“تم مجھ سے شادی کر کے بالکل خوش نہیں ہوئیں!”

فروزاں نے نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ بختیار کی طرف کروٹ بھی لی اور بڑی سنجیدگی سے بولی۔ “آرٹس کونسل میں تم نے میرے رویے سے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ میں تمہیں دوست سے زیادہ سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔”

“تو پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟”

“ڈیڈی کی کوئی بات رد کرنا میرے لیے مشکل تھا۔”

بختیار چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ “کل ویسے میں کنور ثقلین سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ تم اس کی پرانی دوست ہو۔ پھر تم نے اسے مدعو کیوں نہیں کیا تھا؟”

“بھول گئی تھی۔”

“کیا تم اسے بھول سکتی ہو؟”

فروزاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ “کیوں؟ کیا کسی کو بھولا نہیں جا سکتا؟ کل تم بھی شبانہ سے کہہ رہے تھے کہ دو ایک دوستوں کو بلانا بھول گئے ہو۔”

“لیکن تم کنور ثقلین کو نہیں بھول سکتیں۔” بختیار اس وقت کھل کر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ “دیکھو فروزاں! یقین کرو کہ میں تمہیں بہت شدت سے چاہنے لگا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ آج تمہیں بہت کچھ بتا دوں۔”

فروزاں خاموشی سے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

بختیار اس کی طرف دیکھے بغیر ڈرامائی انداز میں بولنے لگا۔ “میں تمہیں شدت سے چاہنے لگا تھا۔” اس نے اپنی بات دہرائی۔ “یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ تم کنور کو چاہتی ہو۔ یہ جاننے کے بعد میں کوشش کرتا کہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ لوں لیکن مجھے کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر تم نے کنور سے شادی کی تو یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔”

“ٹھیک ہوا کہ تمہیں کنور سے میری محبت کا علم ہو چکا ہے۔” فروزاں نے کچھ تلخی سے کہا۔ “لیکن یہ تم کیوں کہہ رہے ہو کہ اس سے میری شادی میرے حق میں اچھی ثابت نہیں ہوتی۔”

“کنور ایسا ہی آدمی ہے۔ نئی نئی لڑکیوں سے آسودہ ہونا اس کا شوق ہے۔ تم سے وہ شادی نہیں کرتا۔ اسی کے الفاظ کے مطابق وہ مستقل روگ پالنے کا قائل نہیں۔ وہ کسی وقت بھی تمہیں...... خیر چھوڑو! اپنی یہ بات مکمل کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اگر مجبوراً اسے تم سے شادی کرنا ہی پڑ جاتی تو وہ ایک ماہ میں تم سے دل بھر جانے کے بعد تمہیں طلاق دے دیتا۔”

“بند کرو یہ فضول باتیں۔” فروزاں تقریباً چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ “میں اب تمہاری بیوی ہوں اس لیے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی، لیکن کنور پر اس قسم کے الزامات بھی میں برداشت نہیں کر سکتی۔”

“ابھی میں تمہیں اس کے بارے میں وہ کچھ بھی بتاؤں گا جو تم نہیں جانتیں۔” بختیار نے دکھی لہجے میں کہا اور پھر وہ سب کچھ بیان کر ڈالا جو اسے کنور کے بارے میں رندھاوا سے معلوم ہوا تھا۔

“بس کرو!” فروزاں چیختی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اس طرح اپنے کانوں پر رکھ لیے تھے جیسے اب بختیار کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔

“بس۔” بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔ “تمہیں اس جہنم سے بچانے ہی کے لیے میں نے تم سے شادی کی ورنہ......”

“چپ ہو جاؤ اب۔” فروزاں کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ “میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں اور میں شبانہ جیسی لڑکی نہیں ہوں۔ اب میں کنور سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، لیکن میں اس کے بارے میں یہ خرافات بھی نہیں سننا چاہتی۔”

اب بختیار کو بھی کچھ غصہ آیا وہ بولا۔ “میں اگر کوشش کروں تو ثبوت بھی حاصل کر لوں گا کہ وہ آوارہ ہے، بدمعاش ہے، شہدہ ہے۔”

غصے سے فروزاں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ کچھ بولی تو نہیں لیکن یکایک بیڈ کی دراز کی طرف گئی۔ اس دراز میں اس کار کی چابی بھی پڑی ہوئی تھی جو عبداللہ خان نے جہیز میں دی تھی۔ چابی لے کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بڑی زور سے بند کیا۔

تھا۔ بختیار دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔ اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ فروزاں اتنی چراغ پا ہو جائے گی۔ بیرونی دروازہ بھی اتنی ہی زور سے بند کیا گیا تھا کہ بختیار کو اس کی آواز صاف سنائی دے گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ اسے اب خیال آ رہا تھا کہ اس نے فروزاں کو سمجھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار نہیں کیا اور شاید مناسب الفاظ بھی استعمال نہیں کیے تھے۔

وہ بستر پر پڑا رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی کہیں نہیں گیا۔ پھر شام ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ شام تک فروزاں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ جہاں بھی گئی ہوگی، وہاں سے واپس آ جائے گی لیکن جب رات کے نو بج گئے تو وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

دس بجنے والے تھے جب اس نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

''کہاں ہو؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''میں اپنے گھر آ گئی ہوں۔'' فروزاں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''گھر تو تمہارا یہ ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ میں اپنے پہلے گھر آ گئی ہوں، ڈیڈی کے گھر۔''

''کب آؤ گی؟''

''واپس آنے کے ارادے سے نہیں نکلی تھی وہاں سے۔''

''ذرا سی بات کو اتنا نہ بڑھاؤ۔''

''ذرا سی بات نہیں تھی وہ! دل پر چرکے لگائے ہیں تم نے میرے۔''

''اس بدمعاش کی بات سے چرکے لگ گئے تمہارے دل پر؟''

بختیار روانی میں اپنا جملہ تو پورا کر گیا جبکہ فروزاں نے لفظ ''بدمعاش'' سنتے ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

بختیار نے جھنجلا کر موبائل ایک طرف ڈالا اور بستر پر گر پڑا۔ صبح کے ناشتے کے بعد ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ میں نہیں گئی تھی لیکن کچھ کھانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی عالم میں کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو چوبیس گھنٹے بھوکا رہنے کی وجہ سے کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اسی حالت میں اس نے جیسے تیسے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے دفتر روانہ ہو گیا۔

شادی کے لیے اس نے پانچ دن کی چھٹی لی تھی جو گزشتہ روز ختم ہو چکی تھی۔

دفتر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کیبن میں چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب رندھاوا اس کے کیبن میں آیا۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے بختیار کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فروزاں کے اس طرح چلے جانے سے وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے بختیار!'' رندھاوا بے چین نظر آیا۔

بختیار نے کچھ رک رک کر مختصر طور پر گزشتہ روز کا واقعہ رندھاوا کو بتا دیا۔

سب کچھ سن کر رندھاوا نظریں جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا، پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے سر اٹھایا اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا چہرہ بہت اترا ہوا سا ہے۔ کل سے تم نے کچھ کھایا بھی؟''

بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔''

پھر وہ ''نہیں نہیں'' کرتا رہ گیا لیکن رندھاوا نے چپراسی کو بلا کر ناشتا لانے کے لیے قریبی ریستوران بھیج دیا۔

انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ بختیار نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف سے عبداللہ خان کی آواز آئی۔ ''ذرا آنا بختیار!''

''جی۔'' بختیار نے اتنا ہی کہہ کر ریسیور رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

رندھاوا بڑبڑایا۔ ''میں حیران تھا کہ آج بڑے صاحب تم سے بھی دو منٹ پہلے آ گئے۔ عام طور پر دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔''

بختیار کیبن سے نکلا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ بینک میں کام کرنے والے اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے منیجر کو اتنا بدلا ہوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے کمرے میں قدم رکھا۔

''آؤ، بیٹھو!'' عبداللہ خان نے سنجیدگی سے لیکن نرم لہجے میں کہا۔

بختیار سر جھکائے بیٹھ گیا۔

''ایسا۔'' عبداللہ خان بولے۔ ''ایسا بہت کم...... شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد دو ہی دن میں میاں بیوی کا کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا ہو جائے۔ کل جب فروزاں آئی تھی تو بہت اداس تھی۔ میں نے اس سے استفسار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رات تک میں نے اس سے کئی بار پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میرے سوال کرتے ہی وہ بس رو پڑتی ہے۔ رات کو بھی وہ تمہارے پاس نہیں گئی۔ اسی سے مجھے، اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ خیر! میرے کچھ اصول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کو اپنے جھگڑے خود ہی نمٹانا چاہئیں۔ بڑوں کی دخل اندازی مناسب نہیں ہوتی، تاوقتیکہ چھوٹے خود نہ چاہیں اور فروزاں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے جواب نہ دینے سے میں سمجھتا ہوں کہ بات کچھ ایسی ہے جو وہ مجھے نہیں بتانا چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم بھی بتانا چاہو گے یا نہیں۔''

بختیار نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ میں فروزاں کو منا لوں گا۔ دور کر دوں گا اس کی ناراضی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں خود بھی اسی بات کا قائل ہوں کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو وہ تصفیہ بھی خود ہی کریں۔ اب تم جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔''

''جی۔''

بختیار اٹھ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ ناشتا آ چکا تھا۔ اس کی خوشبو سے بھی بختیار کی اشتہا نہیں جاگ سکی لیکن رندھاوا نے اصرار کر کے اسے ناشتا کرایا اور ناشتے کے دوران میں پوچھا کہ عبداللہ خان نے اسے کیوں بلایا تھا۔ بختیار نے سب کچھ بتا دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رندھاوا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ فروزاں سے یہ سب کچھ کہنے میں تم نے عجلت سے کام لیا ہے۔''

بختیار خاموش رہا۔

پھر دن گزرتے رہے۔ بختیار کی حالت غیر ہوتی رہی۔ وہ یہ معلوم کرنے سے بھی قاصر تھا کہ فروزاں کس حال میں تھی۔

اس دوران میں اس کی خالہ کے کئی فون آئے۔ بختیار مصروفیت کے بہانے انہیں ٹالتا رہا۔ وہ اداس تھیں کہ بختیار نے ان کے پاس آنا تک چھوڑ دیا تھا۔

آخر ایک دن بختیار ضبط نہ کر سکا اور اس نے موبائل فون پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

''کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''گھر پر ہی ہوں۔'' فروزاں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک دن کے لیے کیا، گھنٹا بھر کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ اطمینان رکھو کہ میں نے فون پر بھی کنور سے کوئی بات نہیں کی۔''

''اچھا اب غصہ تھوک دو۔''

''میں اب غصے میں نہیں، بس اذیت میں ہوں۔''

''اذیت؟ کیوں؟''

''دل پر لگے ہوئے چرکوں کی وجہ سے۔''

''میں تمہارے زخم مندمل کر دوں گا۔ گھر آ جاؤ۔''

کچھ توقف کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں اس دن بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے کنور کو ایس ایم ایس کیا تھا اور تم نے اس پر جو الزامات لگائے تھے، وہ سب لکھ دیے تھے۔ پھر اس کا ایس ایم ایس آیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے یا یہ سب کچھ مجھ سے کسی اور نے کہا ہے لیکن میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ میں نہیں جانتی کہ اس وقت میری ذہنی کیفیت کیا تھی کہ میں اسے وہ ایس ایم ایس کر بیٹھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم آؤ گی تو ہم بات کر لیں گے۔''

اس مرتبہ پھر کچھ توقف سے جواب آیا۔ ''میں صرف ایک شرط پر آ سکتی ہوں۔''

''بولو!''

''میں تمہیں کنور کا نمبر دیتی ہوں۔ اسے ایس ایم ایس کرو۔ اسے بتاؤ کہ وہ سب کچھ مجھ سے تم نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تم اس سے معافی بھی مانگو۔''

''کیا!'' بختیار اکھڑ گیا۔ ''میں اس سے معافی مانگوں؟''

''بس۔'' فروزاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں اسی شرط پر واپس آ سکتی ہوں۔ جب مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے اس سے معافی مانگ لی ہے تو میں آ جاؤں گی۔''

یہ سب کچھ سنتے ہوئے بختیار کے خون کی گردش تیز ہوتی رہی تھی۔ اس نے فروزاں کے خاموش ہوتے ہی جبڑے بھینچ کر کہا۔ ''یہ ناممکن ہے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔''

دوسری طرف سے کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''شٹ۔'' بختیار کے منہ سے نکلا۔

وہ اسی وقت بینک سے لوٹا تھا اور فروزاں سے بات کی تھی۔ شام تک اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیلتے پھیلتے وہ گھر سے نکلا اور تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا رندھاوا کے گھر پہنچ گیا۔

''خیریت؟'' رندھاوا اسے دیکھ کر چونکا۔ ''آؤ، اندر آؤ!''

‘‘نہیں۔ میں بس کھڑے کھڑے آیا ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ فون کر کے آؤں۔ اب میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت تم ناصح کا کردار ادا کرنا بھول جاؤ۔ میں تمہیں اس وقت ایک چارہ ساز دیکھنا چاہتا ہوں۔’’

‘‘میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو!’’ رندھاوا نے حیرت سے کہا۔

‘‘شراب ہوگی تمہارے پاس۔’’ بختیار نے کہا۔ ‘‘مجھے اس کی ضرورت ہے۔’’

‘‘لیکن...... بختیار! تم......’’

بختیار نے اس کی بات کاٹی۔ ‘‘ابھی کہا ہے نا تم سے! مجھے تمہاری چارہ سازی کی ضرورت ہے، غم گساری کی ضرورت ہے۔ ناصح نہ بنو!’’

‘‘تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔’’

بختیار جھلائے ہوئے انداز میں واپسی کے لیے مڑا۔ ‘‘ٹھیک ہے، رہنے دو، میں کہیں اور سے بندوبست کرلوں گا۔’’

رندھاوا نے بڑی مضبوطی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا اور شکست خوردہ لیکن تشویش کے لہجے میں بولا۔ ‘‘ٹھہرو! لاتا ہوں۔’’

بختیار رک گیا۔

رندھاوا جلد ہی واپس لوٹا اور بڑا سا براؤن لفافہ بختیار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ‘‘یہ آدھی ہو چکی ہے۔ آدھی میں پی چکا ہوں۔’’

‘‘اور منگاؤ گے اپنے لیے؟’’

‘‘ظاہر ہے۔’’

‘‘تو اس کے ساتھ میرے لیے کئی بوتلیں منگا لینا، میں پے منٹ کردوں گا۔’’

جواب سنے بغیر بختیار مڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ کار تیز رفتاری سے چلا دی۔ جلد ہی وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا۔

‘‘میں اس ملعون سے معافی مانگوں!’’ وہ اس وقت بڑبڑایا جب ایک گلاس میں شراب انڈیل کر اس میں پانی ملا چکا تھا۔

اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں پی تھی لیکن فلموں میں دیکھ چکا تھا کہ گلاس میں شراب کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بعض افراد پانی ملائے بغیر پیتے ہیں لیکن نئے پینے والوں کے لیے خالص شراب پینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں آگ اتر گئی ہو۔ منہ میں کڑواہٹ پھیل گئی۔ ساتھ ہی اسے ابکائی بھی آئی لیکن اس نے خود کو قے کرنے سے روکا۔ دوسری مرتبہ اس نے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

دھیرے دھیرے وہ کڑواہٹ اور آگ اس کے لیے قابل برداشت ہوتی چلی گئی۔ تیسرا گلاس بنا کے اس نے گھونٹ لیا اور پھر کرسی سے کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

‘‘بہت محبت ہے تم سے۔’’ وہ پھر بڑبڑایا۔ ‘‘لیکن تم ہی مجھے ذلیل کروانا چاہو تو یہ نہیں ہوگا۔’’

اس نے اپنے قدموں میں ڈگمگاہٹ محسوس کی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں رندھاوا کے الفاظ گونجے۔ ‘‘شراب کا نشہ دائمی نہیں ہوتا۔ شراب پی کر غم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر آنکھ کھلنے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو اور بات ہے۔’’

‘‘تو ٹھیک ہے، میں مسلسل پیتا رہوں گا۔’’ بڑبڑاتے ہوئے اس نے چونک کر شراب کی بوتل پر نظر ڈالی۔ اس نے تین گلاسوں میں اتنی شراب انڈیلی تھی کہ بوتل ایک چوتھائی سے کم رہ گئی تھی۔ ‘‘یہ ختم کرتے کرتے نیند تو آجائے گی مجھے۔’’ وہ پھر بڑبڑایا۔ ‘‘صبح جاگوں گا تو...... کیا کروں گا۔’’ اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ اس نے موبائل اٹھا کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ‘‘اور منگائی میرے لیے؟’’

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر کہا گیا۔ ‘‘تم پہلی مرتبہ پی رہے ہو۔ ابھی تم نے دو ڈھائی پیگ سے زیادہ نہیں پیے ہوں گے مگر تمہارے لہجے میں لکنت آگئی ہے۔’’

‘‘آگئی ہے نا!’’ بختیار کھلکھلا کر ہنسا۔ وہ تیسرا گلاس ختم کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ‘‘آگئی ہے تو آنے دو سالی کو......! فروزاں نہیں آتی تو نہ آئے، لکنت تو آرہی ہے نا......! یار یہ...... لکنت...... یہ کسی لڑکی کا نام بھی ہوسکتا ہے۔’’ وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ شراب اب اس کے سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ ‘‘میرے لیے...... اور منگائی؟’’ اس نے رندھاوا سے پوچھا۔

‘‘کل لادوں گا۔’’

‘‘نا ئیں......! صبح اٹھ کر کیا پیوں گا؟...... ابھی چاہیے......! کہیں سے بھی منگاؤ، ابھی منگاؤ...... نہیں تو میں...... شہر میں لوگوں سے پوچھتا پھروں گا کہ شراب کہاں ملتی ہے۔’’

‘‘پلیز!’’ رندھاوا جلدی سے بولا۔ ‘‘اس حالت میں باہر مت نکلنا۔ میں ابھی...... گھنٹا بھر میں...... آتا ہوں لے کر!’’

‘‘شاباش جانِ من! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔’’ بختیار نے کسی حد تک جھومتے ہوئے کہا اور موبائل بند کردیا۔

‘‘مزہ آرہا ہے اب!’’ وہ چوتھا گلاس بناتے ہوئے مسکرایا۔ ‘‘سالی اب کڑوی بھی نہیں لگ رہی ہے۔’’

اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بج چکے تھے۔

‘‘رات ہوگئی، فروزاں ابھی تک نہیں آئی۔’’ وہ بڑبڑایا اور پھر یکایک جھلا گیا۔ ‘‘میں بھول کیوں نہیں رہا ہوں اسے!’’

فروزاں سامنے آکھڑی ہوئی۔

‘‘کیوں آئی ہو اب!’’ وہ غصے سے چیخا۔ ‘‘چلی جاؤ!’’ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس اس پر کھینچ مارا جو دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہ صرف خیال تھا فروزاں کا جو شراب کے نشے نے بہت گہرا کردیا تھا۔

‘‘چلی گئی۔’’ وہ بڑبڑایا اور گلاس کے ٹکڑوں کو گھورتا رہا، پھر اٹھا اور دوسرا گلاس لے آیا۔ گلاس اس نے تپائی پر پٹخ سا دیا اور اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ اس کے سر میں درد شروع ہوگیا تھا۔

‘‘شٹ!’’ اس نے منہ بنایا اور پھر جیب سے موبائل نکال کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ‘‘یہ میرے سر میں...... درد کیوں ہونے لگا؟’’

‘‘تیزی سے پی رہے ہوگے۔’’ رندھاوا نے سنجیدگی سے کہا۔ ‘‘چھوٹے چھوٹے گھونٹ کچھ وقفے سے لو اور دروازہ کھولو!’’

‘‘دروازہ کھولوں؟’’ بختیار حیرت سے بولا۔ ‘‘بوتل میں دروازہ بھی ہوتا ہے؟’’

‘‘اپنی برداشت سے زیادہ پی چکے ہو تم!’’ رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ‘‘میں تمہارے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ کال بیل بجانے ہی والا تھا کہ تمہاری کال آگئی۔’’

‘‘ارے!’’ بختیار ہنسا۔ پھر اٹھ کر ڈگمگاتے قدموں سے بیرونی دروازے پر گیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے رندھاوا پریشان سا کھڑا تھا۔

‘‘لاؤ۔’’ بختیار نے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا بڑا سا براؤن لفافہ لے لیا۔ ‘‘بس اب جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ شراب پی کر تنہائی بہت اچھی لگنے لگی ہے۔’’ وہ مسکرایا۔ ‘‘کل شام کو ایک بوتل اور دے جانا۔’’

رندھاوا نے ایک شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ ‘‘اس میں چکن بروسٹ وغیرہ ہے۔ خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔’’

‘‘اچھا۔’’ بختیار نے بیگانا سعادت مندی سے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔ اس نے رندھاوا سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا، جیسے وہ اس کا دوست نہیں، کوئی ملازم تھا جو اسے شراب اور کھانے پینے کا سامان دینے آیا تھا۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے لفافے میں سے بوتل نکالی اور اس پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ‘‘اب تمہیں پیوں یا......’’ اس نے پہلی بوتل پر نظر ڈالی جس میں اب ایک پیگ سے کچھ زیادہ شراب باقی رہ گئی تھی۔

‘‘خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔’’ اسے رندھاوا کی بات یاد آئی۔

اچھا! بختیار نے سر ہلایا اور شاپر میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں دو ڈبے تھے۔ ایک اضافی ڈبا رندھاوا اس لیے دے گیا ہوگا کہ وہ دوسرے دن بختیار کے کام آئے لیکن بختیار نے کھانا شروع کیا تو دوسرا ڈبا بھی خالی کر بیٹھا۔ پھر یک بہ یک اسے بہت زور کی قے آئی۔ اسے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ باتھ روم کی طرف جاتا۔ فرش پر بچھا ہوا غالیچہ گندا ہوگیا۔ اس کے سوٹ پر بھی قے گری تھی۔ اس نے غالیچے ہی پر تھوک تھوک کر اپنا منہ صاف کیا اور کوٹ کی آستین سے ہونٹ صاف کیے۔

‘‘خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔’’ اس نے منہ بناتے ہوئے رندھاوا کی بات دہرائی۔ ‘‘بے وقوف!...... کھانے سے تو قے ہوجاتی ہے...... خالی پیٹ ہی پینا چاہیے۔’’

اس نے محسوس کیا کہ قے ہوجانے سے نشہ بھی کم ہوگیا تھا۔ اس نے نئی بوتل کھولی۔ اسے اپنے گندے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک گلاس بنایا۔ اس مرتبہ اس نے رندھاوا کی یہ بات خوش دلی سے مان لی تھی کہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے۔

گیارہ بج چکے تھے۔ بختیار کا نشہ پھر دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ نئی بوتل سے اس نے دوسرا گلاس بنایا تو ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔

‘‘تم زیادہ مزے کی ہو۔’’ اس نے بڑے پیار سے ایک بار پھر نئی بوتل پر ہاتھ پھیرا۔ ‘‘اب فروزاں یاد نہیں آرہی ہے۔’’ وہ یک بہ یک چپ ہوگیا۔ اس کے گھومتے ہوئے دماغ میں بھی یہ بات آئی کہ اگر اسے فروزاں یاد نہیں

آ رہی تھی تو اس کا نام اس کی زبان پر کیوں آیا؟

نشہ نہیں ہوا ہے، اس نے حتمی انداز میں سوچا اور نیا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھ کر اس نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا۔ موبائل فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ سیدھا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جیب خالی تھی۔ اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

''ہے......لو......'' اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔

''ہل......لو!'' وہ قدرے زور سے بولا۔

جواب اب بھی نہیں آیا۔

''بولونا...... یار!'' بختیار نے منہ بنایا۔ اب اس کی آواز ایسی ہوگئی تھی جیسے زبان موٹی ہوگئی ہو۔ ''کون ہو بھائی میاں!''

اس مرتبہ دوسری طرف سے ہلکی سی نسوانی ہنسی سنائی دی اور پھر دوسری ہی طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

بختیار موبائل اپنے چہرے کے سامنے لایا۔ کون تھی یہ؟ اس نے سوچا، فروزاں؟

بختیار کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھنچ گئی اور موبائل پر گرفت اتنی سخت ہوئی کہ ہاتھ کی رگیں ابھر آئیں۔ پھر اس نے نیا گلاس بھرا۔ وہ فروزاں کو اتنا بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کا نام بھی اس کی زبان پر نہ آئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا مگر کچھ جلدی جلدی!

آدھا گلاس خالی ہوا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

کون آ گیا اب؟ اس نے سوچتے ہوئے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اسے دو کے بجائے چار سوئیاں گڈمڈ ہوتی نظر آئیں۔ وہ ہنسا، سالی آنکھوں نے بھی شراب پی لی ہے!

وہ صوفے سے اٹھا۔ گلاس ہاتھ میں لیے وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہینڈل پر گرفت کرنے میں اسے کچھ دقت ہوئی۔ بہرحال اس نے دروازہ کھول دیا۔

باہر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بختیار نے آنکھیں مچمچا کر اسے پہچاننا چاہا مگر نہیں پہچان سکا۔

''کون......کون......؟'' بختیار اتنا ہی بول سکا۔

''اتنی کیوں پی لی تم نے!'' لڑکی نے کہا اور اندر آ گئی۔

''بس پی لی......! مرضی میری......'' بختیار نے جھومتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے دروازہ بند کیا جس میں آٹومیٹک لاک تھا۔ اس نے دروازہ بولٹ بھی کیا۔

''تم سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے ٹھیک سے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آؤ۔'' اس نے بختیار کا ایک ہاتھ اپنے شانے پر پھیلا لیا۔ ''مجھ پر زور ڈال کر چلو۔''

بختیار نے قدم بڑھاتے ہوئے ایک گھونٹ لیا۔

''بو آ رہی ہے تمہارے لباس سے۔'' لڑکی بولی۔ ''شاید قے کی ہے تم نے!''

بختیار کچھ نہیں بولا۔ اب اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس گرا اور ٹوٹ گیا۔ جو شراب اس میں تھی، وہ بہہ گئی...... دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

حواس جب بیدار ہوئے تو وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پوری طرح کھولنے کی کوشش کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے پپوٹے بہت وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ فوری طور پر اسے یہ بھی یاد نہیں آ سکا کہ وہ کون تھا اور کہاں تھا۔ دھیرے دھیرے ہی اسے یاد آنا شروع ہوا۔ پہلے اسے یہ ادراک ہوا کہ وہ کون ہے۔ پھر یاد آیا کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

مزید کچھ یاد آنے سے پہلے وہ یک بیک اسی طرح اچھل کر کھڑا ہوا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے اچھال دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس لاش کی طرف دیکھنے لگا جو غالباً لیٹے سے ذرا ہٹ کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک چاقو اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن میں پیوست تھا۔

وہ لاش شبانہ کی تھی...... اس کی گردن میں پیوست چاقو کا دستہ بھی خون سے رنگین تھا، جیسے قاتل نے چاقو اس کی گردن میں اتارنے کے بعد اس پر اپنی گرفت اس وقت تک قائم رکھی ہو جب تک شبانہ نے تڑپ تڑپ کر جان نہ دے دی ہو۔

خون اس کی گردن سے ادھر ادھر پھیلا تھا اور بہتے ہوئے اس کی موٹی پتلی دھاریں بھی کئی اطراف گئی تھیں۔ ان میں سے دو کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ایک دروازے کے قریب جا کر ختم ہوگئی تھی لیکن دوسری دروازے کے نیچے غائب تھی۔

''خدایا!'' بختیار کے منہ سے نکلا اور اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ فوراً اسے اپنے چہرے پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ بختیار نے جلدی سے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ خون تازہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے کچھ دھبے بائیں ہاتھ پر بھی آئے تھے۔

نشہ بالکل کافور ہو جانے کے باوجود بختیار پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب کال بیل بجی تھی تو اس نے نشے ہی کی حالت میں جا کے دروازہ کھولا تھا اور کوئی لڑکی اندر آئی تھی۔ بختیار اپنی آنکھوں پر بار بار چھاتی ہوئی دھند اور گہرے نشے کے باعث اسے پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔

کیا وہ لڑکی شبانہ ہی تھی؟

بختیار اپنے دماغ میں ابھرنے والے سوال پر توجہ نہیں دے سکا کیونکہ اسی وقت بیرونی دروازے کے باہر کچھ قدموں کی آہٹیں ہوئی تھیں اور پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔ ''لاک کھولیے!''

لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔

''نہیں کھل رہا۔'' فروزاں کی آواز آئی۔ ''اندر سے بولٹ کیا گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ توڑنا پڑے گا۔''

اس کے بعد دروازہ توڑنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس وقت بختیار سکتے کی سی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر دروازہ توڑ کر جو لوگ اندر آئے، ان میں فروزاں کے ساتھ پولیس کے لوگ تھے۔

''نہیں۔'' بختیار یکایک پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ ''یہ قتل میں نے نہیں کیا۔''

لیکن اس طرح چیخنا اس کے کام نہیں آ سکا۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔

فروزاں آنکھیں پھاڑے کبھی شبانہ کی لاش کی طرف اور کبھی بختیار کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بختیار جب حوالات میں تھا تو اسے معلوم ہوا کہ فروزاں اپنی کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے صبح ہی صبح وہاں آئی تھی۔ لاک کی دوسری چابی اس کے پاس تھی لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اس وقت رک گئی جب اس نے وہ خون جما ہوا دیکھا جو دروازے کے نیچے سے باہر تک پہنچ گیا تھا۔

یہ باتیں بختیار کو رندھاوا سے معلوم ہوئی تھیں جو اس سے ملنے آیا تھا اور بہت اداس تھا۔ اس کی باتوں نے ظاہر کر دیا کہ وہ بختیار کو قاتل نہیں سمجھ رہا تھا۔

بختیار کی خالہ، خالو، خالہ زاد بھائی آفتاب اور عبداللہ خان تک اسے قاتل تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

مگر ان سب کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو تمام ثبوت بختیار کے خلاف ہی تھے۔ فلیٹ مقفل تھا۔ اس کی ایک چابی بختیار کے پاس اور دوسری فروزاں کے پاس تھی۔ ایسے شواہد نہیں تھے کہ اس قتل میں فروزاں کا ہاتھ ہوگا۔ شبانہ کی گردن میں پیوست چاقو کسی حد تک اس کی گردن کے مہرے تک میں دھنس گیا تھا اور اتنی طاقت فروزاں میں نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ شبانہ کا قتل رات ایک بجے کے لگ بھگ ہوا تھا اور اس وقت فروزاں عبداللہ خان کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بیرون ملک جانے والے اپنے کسی عزیز کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس لوٹے تھے۔

بختیار ایک الزام سے البتہ بچ گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق شبانہ تین ماہ کی حاملہ تھی اس لیے بختیار کا ڈی این اے ٹیسٹ لیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں تھا۔

مخالف وکیل نے یہ کہانی بنائی تھی کہ شبانہ اور بختیار آرٹس کونسل میں ایک دوسرے سے واقف ہوئے تھے۔ شبانہ ماڈل گرل ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں سے تعلقات بھی رکھتی تھی۔ انہی میں سے کوئی اس کے ہونے والے بچے کا باپ ہوسکتا تھا۔ شبانہ بارہ بجے کے قریب بختیار سے ملنے پہنچی تھی۔ اس نے بختیار کے ساتھ شراب نوشی کے دوران میں کوشش کی کہ بختیار اس کا گناہ اپنے سر لے لے۔ اس پر نشے کے باعث دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہوئی تو بختیار نے شراب کے نشے اور غصے میں شبانہ کو قتل کر دیا اور چونکہ بختیار بہت زیادہ پی چکا تھا اس لیے نشے میں اپنے جرم کی سنگینی کا احساس نہ کرسکا اور دھت ہو کر وہیں سو گیا۔

میڈیکل ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ بختیار بہت زیادہ پی گیا تھا اور جو شراب اس نے پی تھی، وہی شبانہ کے معدے میں بھی پائی گئی تھی۔ کمرے کی تپائی پر شراب کے دو گلاس بھی ملے تھے جن میں سے ایک پر شبانہ کی انگلیوں کے نشانات اور لپ اسٹک کے داغ تھے جبکہ چاقو کے دستے پر بختیار کی ساری انگلیوں کے نشانات تھے۔ بختیار کو جب گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت بھی اس کے ہاتھ شبانہ کے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

بختیار کے بہت زیادہ پینے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ

شادی کے دو دن بعد ہی کوئی جھگڑا ہونے پر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی۔

گواہی کے لیے فروزاں کو بھی عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اس نے جھگڑے کی وجہ ذاتی بتاتے ہوئے اس کے اظہار سے گریز کیا تھا لیکن یہ بات صاف صاف کہہ دی تھی کہ اس جھگڑے کا شبانہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مخالف وکیل نے یہ قیاس بھی کیا تھا کہ بختیار، شبانہ کے بچے کا باپ نہ سہی مگر ان دونوں میں تعلقات ضرور تھے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے فون پر ان دونوں کا رابطہ ہوا تھا، بختیار نے رات گزارنے کے لیے اسے اپنے گھر بلایا ہوگا اور رات بھر وہاں رکنے کے ارادے ہی کے باعث شبانہ اپنی کار کے بجائے ٹیکسی سے وہاں پہنچی تھی۔

پولیس کو وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی مل گیا تھا جس نے شبانہ کو اپنی ٹیکسی سے بختیار کے اپارٹمنٹ کے سامنے اتارا تھا۔

بختیار اس کے علاوہ کوئی بیان نہیں دے سکا کہ وہ بہت زیادہ نشے میں تھا جب کوئی لڑکی اس کے اپارٹمنٹ میں آئی تھی۔ وہ نشے کے باعث اسے پہچان بھی نہیں سکا تھا۔

شراب اس کے پاس کہاں سے آئی؟

عدالت کے اس سوال کے جواب میں بختیار نے اپنے دوست رندھاوا کو ملوث کرنا دوستی کے آداب کے منافی سمجھتے ہوئے یہ بات شبانہ ہی پر ڈال دی تھی۔

''مجھے علم تھا کہ وہ شراب پیتی تھی۔'' بختیار نے کہا تھا۔ ''میری خواہش پر وہ شام ہی کو مجھے ڈیڑھ بوتل شراب دے گئی تھی۔''

بختیار کے اس بیان کی وجہ سے مخالف وکیل کے اس قیاس کو خاصی تقویت ملی کہ ان دونوں میں ناجائز تعلقات تھے۔

انہی تمام حالات کی روشنی میں بختیار کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

پولیس جب اسے عدالت سے لے جا رہی تھی، فروزاں نے اسے روک کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے طلاق دے دے کیونکہ وہ عمر بھر اس کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ سکتی۔

بختیار نے اس کو جواب دیا تھا کہ طلاق دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں کہ کھڑے کھاٹ دے دی جائے لیکن فروزاں اس پر اڑ گئی تھی کہ تین مرتبہ طلاق کا اعلان کر دیا جائے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

بختیار کے خیال کے مطابق اس طرح طلاق نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب ان کی باتوں کو سن کر لوگ جمع ہونے لگے اور دوسری طرف پولیس بھی اسے وہاں سے لے جانے کے لیے بے چین تھی لہٰذا بات ختم کرنے کے لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ ''تم جو چاہو سمجھو...... میری طرف تم پر کوئی پابندی نہیں ہے'' اور اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تاکہ بات مزید نہ بڑھ سکے۔

عدالت سے وہ جیل پہنچ گیا جہاں اسے دس دن سے زیادہ نہیں گزارنا پڑے۔ نامعلوم جرائم پیشہ افراد نے جیل توڑی تو بختیار کو بھی وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ چھپتے چھپاتے پولیس سے بچتے، اس نے غریبوں کی ایک نواحی بستی میں قدم رکھا اور وہاں اسے پروین کے گھر میں پناہ مل گئی۔

* * *

بیس دن گزر گئے!

بختیار کے بال خاصی تیزی سے بڑھتے تھے۔ ان دنوں اس کے سر کے بالوں کے ساتھ شیو بھی اتنا بڑھا کہ ڈاڑھی معلوم ہونے لگی اور مونچھیں بھی اچھی خاصی ہو گئیں۔

ابتدائی دنوں میں بختیار چند روز کے لیے بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ علاج کے لیے گھر سے نکلنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کچھ دواؤں کے نام اسے یاد تھے جو پروین نے اسے قریب کے کسی میڈیکل اسٹور سے لا کر دی تھیں۔ اس کے یہ اخراجات بھی پروین ہی پورے کر رہی تھی۔

ابتدائی دو ایک دن تو ایسے گزرے تھے کہ بختیار پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ دماغ جیسے ہوا میں اڑنے لگا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی چیزیں دکھائی دینے لگی تھیں جو اس نے شاید کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ پھر ایک بار یہ بھی ہوا کہ اسے فروزاں نظر آئی۔

''فروزاں!'' اس کے منہ سے چیخ سی نکلی اور اس نے فروزاں کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا تھا۔

پھر جب اس کا بخار اترا تو وہ سب کچھ اسے کسی خواب کی طرح یاد تھا۔

''میں تم لوگوں کے لیے مالی اعتبار سے بھی بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔'' بختیار نے پروین سے کہا تھا۔ ''لیکن جب بھی میں اپنے حالات درست کر سکا، واپس آ کر سب کچھ ادا کر دوں گا۔''

''میں اخراجات پورے کرنے کے لیے سلائی زیادہ کرنے لگی ہوں۔'' پروین کی آواز معمول کے مطابق سپاٹ تھی۔ ''تھوڑا بہت جوڑ کے بھی رکھا تھا جو کام آ گیا۔ آپ اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔''

بیماری کے ان دنوں میں پروین نے اس کا خیال بھی بہت رکھا تھا۔ اس کے کھانے کے لیے ہلکی غذائیں بھی تیار کی تھیں۔ اس کے رہنے کے لیے وہ کمرا مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں آسیہ خالہ رہتی تھی مگر ان دنوں میں اس نے اپنا ٹھکانا اسی کمرے میں کر لیا تھا جہاں سلائی مشین رکھی تھی۔ اس طرح کپڑے سلوانے والی عورتوں کو اس سے ملنے کے لیے اس کمرے میں آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی جہاں آسیہ خالہ اپنا دن کا وقت گزارا کرتی تھی۔ رات کو تو وہ دونوں ماں بیٹی صحن ہی میں سویا کرتی تھیں۔

اکیسویں دن بختیار نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جائے گا۔ اس نے پروین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

''میں دس پندرہ دن بعد ضرور واپس آؤں گا۔'' اس نے مزید کہا۔ ''تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اس کا صلہ تو نہیں دیا جا سکتا، میں تم دونوں ماں بیٹی کے لیے جو کچھ بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔''

''آپ کچھ کریں یا نہ کریں، آیئے گا ضرور۔ آپ مجھے یاد رہیں گے۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے پروین کی نظریں جھک گئی تھیں۔ بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی پروین کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن اس کا آخری فقرہ کچھ معنی رکھتا تھا۔ بختیار کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرا گئے۔

''یہاں سے وہ سڑک قریب ہی ہے جہاں سے بس ملتی ہے۔'' پروین نے کچھ توقف سے نظریں اٹھا کر کہا۔

''جب میں اس بستی میں آیا تھا تو وہ سڑک دیکھ لی تھی۔''

''تیرہ روپے لیتا ہے بس والا، یہ رکھ لیجیے!'' اس نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر بختیار کی طرف بڑھائے۔

بختیار نے اب تک نقد کچھ نہیں لیا تھا۔ اب بھی اس کا ہاتھ آگے نہ بڑھ سکا تو پروین نے وہ نوٹ اس کے قریب رکھ دیے اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

رات کا اندھیرا پھیلے جب دو گھنٹے گزر چکے تو پروین، بختیار کے ساتھ بیرونی دروازے پر پہنچی۔ طے پایا تھا کہ پروین دروازہ کھول کر باہر دیکھے گی اور جب گلی میں سناٹا ہوگا تو اس کا اشارہ ملتے ہی بختیار باہر نکل جائے گا۔ پروین تو کیا، وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس گھر سے نکلتے دیکھے۔

''خدا حافظ۔'' پروین کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی جب بختیار اس کا اشارہ ملتے ہی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ پروین کی آواز کا وہ گھٹا گھٹا انداز اس کے جذباتی ہو جانے کا مظہر تھا۔ بختیار کا ذہن اس سوال میں الجھ گیا کہ پروین اسے رخصت کرتے ہوئے جذباتی کیوں ہو گئی تھی؟ بختیار کو اس کی یہ بات بھی یاد تھی کہ وہ اسے یاد رہے گا۔

بختیار کو گمان ہوا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی اسے پسند کرنے لگی تھی، یا اس کی پسندیدگی محبت کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔

اگر واقعی ایسا ہے تو اس میں کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں، بختیار آگے قدم بڑھاتے ہوئے سوچتا رہا...... جب کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی زندگی میں پہلی مرتبہ جنس مخالف کے قریب ہوتے ہیں تو اسی کو پسند کرنے لگتے ہیں اور پروین ایک ایسی ہی سیدھی سادی لڑکی تھی جو اپنی زندگی میں پہلے کبھی کسی مرد کے اتنا قریب نہیں رہی ہوگی۔

بختیار نے اپنے دل میں پروین کے لیے ہمدردی محسوس کی اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

سامنے سے دو آدمی آ رہے تھے۔ بختیار خود کو ان کی طرف سے بے پروا ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس نے بس کن انکھیوں سے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزرے تھے۔ غالباً اس بستی میں رات کے وقت کسی اجنبی کا گزر نہیں ہوتا ہوگا۔ دوسرے بختیار کی وضع قطع بھی عام آدمیوں کی سی نہیں تھی۔ اس کے بال خاصے بڑھے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں بھی ترشی ہوئی نہیں تھیں۔ بختیار بس اتنا کر سکا تھا کہ اس نے ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کر لی تھی۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے جو بس آتی دیکھی، اسی کو ہاتھ دے کر روک لیا اور اس میں سوار ہو گیا۔ بس میں کچھ ہی مسافر تھے۔ انہوں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ بختیار کو یہ اطمینان تو تھا کہ اسے ''مفرور قیدی'' کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جا سکے گا لیکن اسے مشکوک شخص سمجھا جا سکتا تھا۔ اگر بس میں محکمۂ پولیس کا کوئی آدمی سادہ لباس میں موجود ہوتا تو وہ بختیار کے لیے کسی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔

لیکن ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی اور بس جب شہر کے بارونق علاقوں میں داخل ہوئی تو بختیار ان سب مقامات کو پہچاننے لگا۔

ایک جگہ وہ بس سے اتر گیا۔ وہاں سے رندھاوا کا

گھر دو میل کے فاصلے پر تھا۔ بختیار نے اپنی خالہ کے گھر کا رخ کرنے کے بجائے رندھاوا کے گھر جانے کا فیصلہ پروین کے گھر ہی میں کر لیا تھا۔

جب اس نے رندھاوا کے گھر کی کال بیل کا بٹن دبایا، گیارہ بجنے والے تھے۔ اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شاید رندھاوا اس وقت گھر پر نہ ہو۔

کسی بچے نے پھاٹک کھولے بغیر اندر سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''رندھاوا صاحب ہیں؟'' بختیار نے بلند آواز میں پوچھا۔

''بابا! بابا!'' بچہ چیخا۔ ''کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

بختیار کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رندھاوا نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو؟'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ممکن ہے کہ وہ بختیار کو فقیر ہی سمجھا ہو۔ بختیار کو خوشی ہوئی کہ رندھاوا بھی اسے فوراً نہیں پہچان سکا تھا۔

''میں بختیار ہوں رندھاوا!'' وہ بولا۔

''ارے!'' رندھاوا اس کی آواز سن کر چونکا اور پھر اسے سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''جلدی سے اندر آؤ۔''

بختیار نے اندر قدم رکھا۔ رندھاوا نے فوراً پھاٹک کا ذیلی دروازہ بند کیا۔ ''تم یہیں رکو۔ میں بیرونی کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ گھر کے لوگ نہ دیکھ لیں کہ اس حال میں کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔''

ذرا ہی دیر بعد بختیار اور رندھاوا ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور بختیار اپنی ساری کہانی سنا رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد رندھاوا نے کہا۔ ''مجھے شروع ہی سے یقین رہا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو سکتے اس لیے...... اچھا خیر چھوڑو! وہ باتیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تمہارے کھانے پینے کا اور تمہارا حلیہ درست کرنے کا کچھ بندوبست کروں۔''

رندھاوا نے گھر کے کسی فرد کو وہاں نہیں آنے دیا، خود ہی ایک ٹرے میں اس کے لیے کھانا لے کر آیا۔

بختیار نے جیل میں اور اس کے بعد پروین کے گھر میں بھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا لیکن رندھاوا کے گھر میں کھانا کھاتے ہوئے بھی اس کی توجہ کھانے کی لذت کی طرف نہیں گئی۔ اس کا دماغ اپنی غیر یقینی صورت حال میں الجھا رہا۔

''فروزاں کا کیا حال ہے؟'' اس نے کھانے کے دوران میں پوچھا۔ اس خیال سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ کہیں کنور ثقلین سے شادی نہ کر بیٹھی ہو۔

''اب بھی اسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔'' رندھاوا افسردگی سے مسکرایا۔

''کیوں نہ سوچوں؟ وہ مجھے پسند نہیں کرتی لیکن وہ میری بیوی تو ہے۔''

''تم اسے طلاق دے چکے ہو یار!''

''تم بھی اسی کی طرح سوچ رہے ہو؟ نہیں رندھاوا، اس طرح طلاق نہیں ہوتی۔ مذاق نہیں ہوتا میاں بیوی کا رشتہ کہ جب چاہو کچے دھاگے کی طرح توڑ دو۔ یہ ایک عام رواج سا تو ہو گیا ہے لیکن...... چھوڑو، میں ابھی اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ......''

''وہ ان دنوں میں آرٹس کونسل نہیں گئی۔'' رندھاوا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس دوران میں خاص طور سے معلومات حاصل کی تھیں۔ غالباً وہ گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ عبداللہ خان اس کے لیے بہت مغموم رہتے ہیں۔''

''کنور ثقلین؟''

''اس کے بارے میں بھی معلوم کیا تھا۔ اسے شبانہ کے قتل کے بعد کہیں نہیں دیکھا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ شبانہ کے قتل سے پہلے بیرون ملک چلا گیا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں گیا تھا۔ حالانکہ وہ سیاست میں قدم رکھ چکا ہے لیکن صحافیوں کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ اسے کسی سے اپنی جان کا خطرہ تھا اس لیے اس نے کچھ دنوں کے لیے ملک سے چلا جانا ضروری سمجھا۔''

یہ ساری باتیں الجھی ہوئی تھیں لیکن بختیار کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ فروزاں نے کسی سے شادی نہیں کی تھی۔

''تم نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیوں کی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''فروزاں کے بارے میں؟''

''ہاں۔''

رندھاوا چند لمحے چپ رہا، پھر اس نے بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس قتل کے معاملے میں ہر پہلو پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اسے اس صبح اپنی ضروری چیزیں لینے کا خیال کیوں آیا جس رات شبانہ قتل ہوئی۔''

بختیار حیرت سے بولا۔ ''تم کیا سوچ رہے ہو رندھاوا؟''

''میں۔'' رندھاوا نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''فروزاں خود تو قتل نہیں کر سکتی لیکن وہ قاتل کی رازدار ہو سکتی ہے۔''

بختیار حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

رندھاوا نے بات جاری رکھی۔ ''اس نے باپ کی وجہ سے شادی کی تھی تم سے......! ممکن ہے کہ وہ تم سے جان چھڑانا چاہتی ہو تاکہ بعد میں اپنی خواہش کے مطابق شادی کر سکے۔''

بختیار مضطربانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''کھانا تو کھاؤ!'' رندھاوا بولا۔

''بس کھا چکا۔'' بختیار نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑی عجیب بات کی ہے رندھاوا۔''

''میں اور جمال ہر پہلو پر غور کر رہے ہیں۔''

''جمال کون؟''

''میرا ایک دوست ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصے پہلے سی آئی ڈی میں آیا ہے۔ کوئی بڑا کام کر کے نمایاں ہونے کی دھن سوار ہے اس پر......! اسی لیے میں نے اس سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اگر وہ شبانہ کے اصل قاتل کا پتا لگانے میں کامیاب ہو جائے تو دھوم تو مچ جائے گی اس کی۔''

بختیار جو غور سے اس کی بات سن رہا تھا، آہستہ سے بولا۔ ''کیا تم اسے یہ بھی بتا دو گے کہ میں آ گیا ہوں۔''

''ابھی تو میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

''تم یا جمال آخر کیا سوچ رہے ہیں فروزاں کے بارے میں؟''

''شاید وہ اس شخص سے واقف ہو جس نے قتل کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی نے کسی سے مل کر شبانہ کو اس لیے قتل کروایا ہو کہ تم اس جرم میں پھنس کر سزا پا جاؤ اور اسے تم سے نجات مل جائے۔''

بختیار مضطرب ہو کر بولا۔ ''کیا وہ اس حد تک جا سکتی ہے؟''

''ضروری نہیں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''ہمیں ہر امکان پر غور کرنا چاہیے۔ یہ جمال کا کہنا ہے۔ شاید فروزاں وہاں گئی ہی اس لیے ہو کہ شبانہ کی لاش دیکھنے کے بعد پولیس کو اطلاع دے لیکن یہ اتفاق ہے کہ اسے اندر داخل ہونے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ خون بہتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہی دیکھ کر اس نے پولیس کو فون کر دیا۔''

''یقین نہیں آتا۔'' بختیار بڑبڑایا۔

''ابھی کسی بات پر یقین کرنا بھی نہیں چاہیے۔ فی الحال صرف امکانات کا جائزہ لینا ہے۔ جمال اس کے لیے بھی کوشاں ہے کہ کسی طرح شبانہ کے جاننے والوں کا ڈی این اے حاصل کر لے۔ اس طرح یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شبانہ جس بچے کی ماں بننے والی تھی، اس کا باپ کون ہے۔ یہ امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا باپ کنور ثقلین ہو اور اسی نے شبانہ کو قتل کروایا ہو۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار والی بات ہو سکتی ہے۔ اسے شبانہ سے اور فروزاں کو تم سے نجات۔''

''بڑی ہولناک باتیں کر رہے ہو تم!''

''یہ قطعی ہولناک نہیں ہیں۔ تمہیں یہ اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ اس میں فروزاں کا نام بھی آ رہا ہے۔''

بختیار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کسی کا ڈی این اے حاصل کرنا آخر کیسے ممکن ہے؟ یہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ چرائی جائے...... اور کنور ثقلین...... تم بتا رہے ہو کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں۔''

''اگر کسی اور کے ڈی این اے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے تو پھر قوی امکان یہی ہو گا کہ شبانہ کے اس بچے کا باپ کنور ثقلین ہی ہو گا۔ ہم اس کا انتظار کریں گے۔ وہ کبھی تو لوٹے گا۔ اس کا سبھی کچھ یہیں ہے۔ اس کے لیے اسے آنا تو پڑے گا۔''

''کتنے لوگوں کا ڈی این اے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی آخر! شبانہ کے جاننے والوں کی کمی تو نہیں۔''

''ہاں کمی تو نہیں! اگر میں ان میں سے ایک نام لوں تو تم پھر اچھل پڑو گے۔''

''ایسا کون ہے؟''

''تمہارا خالہ زاد۔''

''آفتاب!'' بختیار چونک پڑا۔

''ہاں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''مجھے اس کی اور شبانہ کی شناسائی کا علم تمہارے ولیمے کی تقریب میں ہوا تھا۔ وہ دونوں بہت بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتے نظر آئے تھے۔''

''ہاں۔'' بختیار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے خود بھی تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی کہ وہ اور شبانہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''خالہ اور خالو کا کیا حال ہے؟ خالہ تو بہت مغموم ہوں گی۔''

''قدرتی بات ہے۔ وہ تمہیں آفتاب سے زیادہ

چاہتی ہیں۔ خالو کو بھی رنج تو ہوا ہے۔ تم نے اچھا کیا جو وہاں کا رخ نہیں کیا۔ جیل سے تمہارے فرار کے بعد پولیس کو خیال تھا کہ تم وہاں پہنچو گے پولیس نے دس بارہ دن تک وہاں کی کڑی نگرانی کی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ خفیہ طور پر اب بھی ہو رہی ہو۔''

''تمہارے دوست جمال کو تو معلوم ہو سکتا ہے۔''

''اگر وہ معلوم کرنا چاہے۔'' رندھاوا نے جواب دیا ''لیکن ہم دونوں ہی نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ پولیس کو خوامخواہ کیوں معلوم ہو کہ سی آئی ڈی کا کوئی افسر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

بختیار اثبات میں سر ہلا کے کچھ سوچنے لگا۔

رندھاوا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''فردزاں سے ملنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟''

''سوچ تو رہا تھا لیکن...... تمہاری باتوں کے بعد......'' بختیار نے اپنی بات پوری نہیں کی۔

''ہاں۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''فی الحال اس کا خیال ذہن سے نکال دو اور اطمینان سے یہاں رہو۔''

''اطمینان سے!'' بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر والے بھی ادھر اس وقت تک نہیں آتے جب تک میں نہ لاؤں۔ یہاں باتھ روم بھی ہے۔'' رندھاوا نے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کل میں تمہارے لیے مناسب لباس بھی خرید لاؤں گا۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تم نڈھال نظر آرہے ہو۔''

''کھانے کے بعد واقعی خود کو نڈھال محسوس کر رہا ہوں۔''

''ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھا کر تم خاصے بدل گئے ہو لیکن مناسب ہوگا کہ یہ مناسب انداز میں ترشوائے جائیں۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھوں کی وجہ سے تم کسی کی نظر میں مشکوک ہو سکتے ہو۔''

''کسی ہیئر ڈریسر کے پاس جانا بھی تو ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''میں تمہیں کل دن میں تو نہیں لیکن کچھ اندھیرا پھیلنے کے بعد کسی فٹ پاتھی نائی کے پاس لے چلوں گا اور کل دن میں جب تمہارے لیے کپڑے لاؤں گا تو ایک چشمہ بھی خرید لاؤں گا۔ چشمے کی وجہ سے تم اور بدلے ہوئے نظر آؤ گے...... اب تم آرام کرو۔''

اس کمرے میں صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک دیوان بھی تھا۔ کیونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے کمبل وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک طرف چھوٹے اسکرین کا ٹی وی بھی رکھا تھا۔ رندھاوا نے اسے آرام کرنے سے پہلے پانی کا فلاسک جگ اور گلاس لا کے رکھ دیا۔ ایک تکیہ اور چادر بھی لا دی جبکہ گرمی کے اس موسم میں چادر کی ضرورت نہیں تھی۔

بختیار جب لیٹا تو دیگر بہت سے خیالات کی طرح اس کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ ماضی میں وہ بھی کسی جمال کو جانتا تھا اور اس جمال سے اس کی قربت بھی رہی تھی۔ بختیار کے دماغ میں آنے والے دوسرے خیالات زیادہ گمبھیر تھے اس لیے جمال کا خیال ان خیالات میں دب گیا۔

دوسری صبح وہ معمول کے مطابق جلدی جاگا حالانکہ رات کو دیر سے سویا تھا۔

رندھاوا نے ناشتا اس کے ساتھ اسی کمرے میں کیا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا کہ اس کا کوئی دوست بیرونی شہر سے آیا ہے اور چند دن وہیں رہے گا۔ اس دوران میں گھر کا کوئی فرد اس طرف نہ جائے۔

ناشتے کے دوران میں طے پانے والے پروگرام کے تحت رندھاوا صرف ایک گھنٹے کے لیے بینک گیا اور کوئی ایمرجنسی بتا کر چند دن کی چھٹی لے لی۔ جب وہ واپس لوٹا تو ان سب چیزوں سے لدا پھندا تھا جو بختیار کے لیے ضروری تھیں۔ ان میں ایک نیا موبائل فون بھی تھا جس کی سم اس نے اپنے ہی نام سے ایکٹی ویٹ کروائی تھی۔

''جمال نے آج ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے دو آدمیوں کا خون تو لے لیا ہے۔'' اس نے کھانے کے دوران میں بتایا۔

بختیار سر جھٹک کر بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی بھی شخص اپنا خون دینے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہے جب تک اس پر قانون کا دباؤ نہ ہو۔''

''راہ چلتے کسی کے پن چبھو دینا کوئی مشکل کام ہے؟'' رندھاوا مسکرایا۔

''کیا مطلب!''

''اور جب پن چبھے تو ہلکی سی سسکاری لے کر ادھر ادھر دیکھنے پر اس شخص کو معلوم بھی نہ ہو سکے کہ اسے پن کس نے چبھوئی تھی...... تو؟''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو!''

''دراصل اب لا انفورسمنٹ ایجنسیوں میں کچھ آدمیوں کو اس کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔'' رندھاوا نے بتایا۔ ''ان کے لیے مخصوص قسم کی بہت چھوٹی سرنج بنوائی جاتی ہیں۔ اس سرنج کے لگنے سے آدمی کو بس اتنا محسوس ہوتا ہے کہ اسے پن چبھی ہے۔ یہ کام کرنے والے کو بڑی پھرتی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی کہ جس پر قانوناً دباؤ نہ ڈالا جا سکے، اس کا خون بھی لیا جا سکے۔''

''اوہ!'' بختیار کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

''[illegible]ل کے محکمے میں بھی ایسی مہارت رکھنے والے موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک کو جمال نے اپنے اعتماد میں لیا ہے۔''

اب بات بختیار کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''جمال نے ایسے آدمیوں کی فہرست تیار کر لی ہے جن سے شبانہ بے تکلف تھی۔'' رندھاوا نے مزید بتایا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ان سب میں سے کوئی مطلوبہ شخص نہ ملا تو پھر وہ ان لوگوں کو بھی دیکھے گا جن سے شبانہ کے تعلقات بہ ظاہر رسمی سے نظر آتے ہیں۔''

دفعتاً بختیار کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''تمہارے اس دوست جمال کے والد کا کیا نام ہے؟''

''کیوں؟'' رندھاوا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں رات سے ہی سوچتا رہا ہوں کہ ماضی میں اس نام کا مجھ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ابھی تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ آٹھویں جماعت سے میٹرک تک ایک لڑکا جمال میرا کلاس فیلو تھا۔ اس سے میری خاصی بنتی تھی۔ پھر وہ پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد...... وہ جو کہتے ہیں نا کہ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل...... تو بس...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکول کے زمانے کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہیں۔ میں اس جمال کو بھی بھول گیا۔ شاید وہ بھی مجھے بھول چکا ہوگا لیکن یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا دوست جمال وہی جمال ہوگا جو میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ اگر تم اس کے والد کا نام بتا دو تو بات واضح ہو جائے گی۔''

''مجھے اس کے والد کا نام نہیں معلوم۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی تصویر میرے موبائل میں موجود ہے۔''

''دکھاؤ۔'' بختیار نے بے تابی سے کہا۔

رندھاوا نے پہلے ہی اپنا موبائل نکال لیا تھا۔ اس نے بختیار کو تصویر دکھائی۔

''وہی۔'' بختیار پرجوش ہو گیا۔ ''یہ وہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ برسوں پرانی بات ہو گئی لیکن اس کے نقش و نگار بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے۔ تم اس سے اس کے والد کا نام پوچھو۔ مجھے تو یہ وہی معلوم ہوتا ہے۔''

''نام تو میں پوچھ لوں گا لیکن اگر یہ وہی ہوا تو کیا تم اس سے ملو گے؟''

بختیار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ سب کچھ میں نے ابھی نہیں سوچا۔ وہ اب ایک سرکاری آفیسر ہے اور میں جیل سے بھاگا ہوا ایک قیدی! میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اب میرے لیے اس کے جذبات کیا ہوں گے۔''

''نام تو آج میں کسی بہانے پوچھ لوں گا۔''

رندھاوا چپ ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے اسکرین پر نظر ڈالی اور تیزی سے بولا۔ ''یہ جمال ہے، میں اسپیکر آن کر دیتا ہوں۔ اس کی آواز سن لو۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد آواز میں بھی کچھ تبدیلی تو آتی ہے لیکن......''

دوسری مرتبہ گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے بات ادھوری چھوڑ کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو جمال!'' اس نے کہا۔

''تم جس پر زیادہ شبہ کر رہے ہو، وہ تو آج آگیا ہے۔'' اسپیکر سے آتی ہوئی آواز بختیار نے بھی سنی۔

''کنور ثقلین؟'' رندھاوا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔''

بختیار کا جسم سنسنا گیا۔

اسپیکر سے جمال کی آواز آرہی تھی۔ ''اس نے ایک صحافی کو فون کر کے بتایا ہے کہ وہ ایک نجی کام کے سلسلے میں نہایت خاموشی سے کہیں چلا گیا تھا مگر اس کی عدم موجودگی میں یہاں افواہیں پھیل گئیں کہ اسے کسی کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو گیا تھا جو قطعی غلط ہے۔ اس نے سختی سے اس بات کی تردید کی ہے۔''

''خیر! جو کچھ بھی ہو۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''اس کا ڈی این اے ٹیسٹ بہت ضروری ہے۔''

''وہ تو تم بتا چکے ہو۔ تمہیں اسی پر زیادہ شبہ ہے لیکن اس کے معاملے میں یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ جب سے اس نے سیاست میں قدم رکھا ہے، عام لوگوں میں گھل مل جانا اس نے چھوڑ دیا ہے۔ دو باڈی گارڈز ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔''

''کچھ دن ہوئے، میں نے اسے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔'' رندھاوا کو بختیار کا ولیمہ یاد آگیا ہوگا۔ ''اس

وقت تو وہ اکیلا ہی تھا۔”

“بہ ظاہر اکیلا ہوگا۔ باڈی گارڈز قریب ہی کہیں ہوں گے۔ بہر حال اگر وہ عام قسم کی کسی تقریب میں شریک ہوتا ہے تو کام آسان ہوسکتا ہے ورنہ خاصی دشواری ہوگی، کوئی خاص طریقہ سوچنا پڑے گا۔”

“اب یہ تمہارا کام ہے کہ کیا کرو گے لیکن یہ بہت ضروری ہے۔”

“کچھ تو کر ہی گزروں گا۔ اس وقت تو تمہیں بس اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔”

اس گفتگو کے بعد رندھاوا نے بختیار کی طرف دیکھا۔

“پہچانے؟”

“ابھی آواز کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں ہوا ہے۔” بختیار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ “دراصل میں اس کی آواز پر مکمل توجہ نہیں دے سکا۔ کنور ثقلین کی خبر سن کر اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا تھا۔”

“میں سمجھ گیا۔ تمہارا اتنا جذباتی ہوجانا بھی فطری بات ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو یار!...... وہ آج سامنے آیا ہے۔ اب ایک دو ہی دن میں تو فروزاں اس سے شادی نہیں کرلے گی۔”

“ہوسکتا ہے، فون پر ان کا رابطہ رہا ہو!”

“فون پر رابطے کا مطلب بھی یہ نہیں کہ بس اب دو ایک دن میں ان کی شادی ہوجائے گی۔ ذرا جذبات کے گرداب سے نکل کر سوچو۔”

“ہوں۔” بختیار پھیکے سے انداز مین مسکرا دیا، پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ “تم سے جمال نے اس مسئلے پر بات نہیں کی کہ قاتل اپارٹمنٹ میں پہنچا کیسے؟ دروازہ تو اندر سے بولٹ تھا۔ مجھے یاد ہے، وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر آئے تھے۔ جو بھی شبانہ کا قاتل ہے، وہ اندر کیسے پہنچا اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس کی آمد پر شبانہ نے دروازہ کھولا ہوگا تو سوال یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے کس نے بولٹ کیا؟”

“بات ہوئی تھی جمال سے۔” رندھاوا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ “پولیس نے تو شاید اس پہلو پر سوچا ہی نہ ہو کیونکہ انہوں نے تمہیں قاتل سمجھ لیا تھا لیکن جمال نے اگر میری بات پر مکمل یقین کرلیا ہے تو وہ اس پہلو پر ضرور غور کرچکا ہوگا لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔” رندھاوا خاموش ہوا اور بختیار کو سوچ میں غرق دیکھ کر سوال کیا۔ “تمہاری کیا رائے ہے؟”

“میں بھی اس پر غور کرکر کے تھک چکا ہوں۔”

“تو پھر یہ معما جمال ہی حل کرے گا۔”

“ہوں۔” بختیار نے پھر سر ہلا دیا۔

اسی دن شام کو رندھاوا اسے اپنی کار میں بٹھا کر ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں دو تین نائی فٹ پاتھ پر ایک کرسی ڈالے اور اس کے سامنے دیوار سے آئینہ لگائے گاہک کے منتظر رہتے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے لوٹ رہے تھے تو بختیار کی ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال قاعدے سے ترشے ہوئے تھے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد رندھاوا نے اسے ایک ایسی ٹوپی بھی پہنا دی تھی جو کوہستانی علاقوں یا نہایت سرد رہنے والے شہروں کے لوگ عموماً پہنتے ہیں۔

“اب کسی کا باپ بھی تمہیں اس وقت تک شناخت نہیں کرسکتا جب تک تمہیں دیکھتے وقت اس کے ذہن میں یہ خیال نہ ہو کہ تم وہ مفرور قیدی ہوسکتے ہو۔” رندھاوا نے تبصرہ کیا تھا۔

بختیار نے کار کے عقب نما آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا، پھر تاریک شیشوں کا چشمہ لگا کر بھی دیکھا۔

“اب تو میں خود بھی نہیں پہچان پا رہا ہوں۔” بختیار نے کہا۔

“لیکن رات کے وقت یہ چشمہ نہیں لگایا جاسکتا۔”

“لگایا جاسکتا ہے۔” بختیار نے کہا۔ “لگاتے ہیں بعض لوگ جن کی ایک آنکھ مصنوعی ہوتی ہے یا آنکھوں میں کوئی اور خرابی ہوتی ہے۔”

“مگر ایسے لوگوں کی طرف لوگ متوجہ ضرور ہوتے ہیں۔” رندھاوا نے کہا۔ “لیکن ضرورت کیا ہے کہ تم رات کو باہر نکلو...... بلکہ یہ سب کچھ کرنا بھی محض احتیاط کا تقاضا تھا۔ تمہیں دن میں بھی باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک جمال کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی، تم میرے گھر سے باہر قدم ہی نہ رکھو۔”

“شاید کسی وقت ضرورت پڑ ہی جائے۔ اچھا ہاں! تم نے کچھ سوچا؟ جمال کے والد کا نام؟”

“آج سارا وقت تمہارے ساتھ رہا ہوں۔ کل جاؤں گا اس سے ملنے، کسی ترکیب سے پوچھ ہی لوں گا۔ ترکیب ضروری ہے، ورنہ اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرے گا کہ میں نے اس کے باپ کا نام کیوں پوچھا۔”

“ٹھیک ہے۔ کل میں بھی......” وہ یک لخت چپ ہوگیا۔

“کل تم بھی...... کیا مطلب؟”

“ہوں۔” بختیار نے کھوئے کھوئے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

“کل کیا؟” رندھاوا نے دوبارہ پوچھا۔

“جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔” بختیار نے آہستہ سے کہا۔ “میرا دماغ بہت الجھا ہوا ہے رندھاوا! تم اندازہ لگاؤ کہ میں کتنی غیر یقینی صورت حال میں سانسیں لے رہا ہوں۔”

“سب ٹھیک ہوجائے گا یار! سانچ کو آنچ نہیں۔”

بختیار چپ رہ گیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو رندھاوا اسے کمرے میں چھوڑ کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ کپڑے تبدیل کرکے کھانے کی ٹرے لے کر آئے گا۔ بختیار نے خود کو کسی حد تک یکسو کرنے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ وہ اپنا دماغ کسی طرف لگانا چاہتا تھا مگر اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار چینل بدلتا رہا اور پھر ایک نیوز چینل پر چند الفاظ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ گر گیا۔

“کنور ثقلین کو گولی ماردی گئی۔” بریکنگ نیوز تھی۔

بختیار دم بہ خود بیٹھا سنتا رہا۔ خبر کے مطابق کنور ثقلین کسی کے ڈنر میں شرکت کے لیے ایک ہوٹل پہنچا تھا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل کے سامنے اپنی کار سے اترا، ایک گولی اس کے سر میں پیوست ہوگئی۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ اس کے باوجود اسے اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے اس کی موت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی۔ یہ صرف دس منٹ پہلے کا واقعہ تھا اس لیے ابھی تک پولیس کی طرف سے صرف اتنا کہا جاسکا تھا کہ ابتدائی تحقیقات کے بعد ہی اس سلسلے میں کچھ بتایا جاسکے گا۔

یہ خبر بختیار کے لیے اس اعتبار سے خوش کن ہوسکتی تھی کہ اب فروزاں اور کنور ثقلین کی شادی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا لیکن خبر جب قتل کی ہو تو مقتول کے کسی بھی جاننے والے کے دماغ پر ہولناک اثرات تو مرتب ہوتے ہی ہیں۔

رندھاوا جب کھانے کی بڑی سی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوا، ٹی وی پر کوئی پروگرام چل رہا تھا لیکن بختیار کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔ اس کی نظریں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر تھیں۔

رندھاوا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی آمد نے بھی بختیار کو بالکل ہوشیار نہیں کیا تھا۔ “کیا بات ہے بختیار!”

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

اب بختیار نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پلکیں جھپکائے بغیر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''کنور ثقلین کو کسی نے گولی مار دی۔''

''کیا!'' رندھاوا کے منہ سے نکلا۔ اگر اس وقت اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے ہوتی تو یقیناً گر جاتی۔

ثقلین نے اسے بریکنگ نیوز کے بارے میں بتایا۔

ذرا دیر بعد خبروں کا وقت تھا۔ اس اثنا میں رندھاوا نے کچھ قیاس آرائیاں کیں۔ بختیار ''ہوں، ہاں'' کرتا رہا۔ جانے کیوں اس کے دماغ پر شدید بوجھ بڑھ گیا تھا۔ وہ اور رندھاوا اس وقت کھانا کھانا بھی بھول گئے تھے۔

خبروں میں بتایا گیا کہ پولیس تحقیقات میں مصروف تھی اور ابھی وضاحت سے کچھ بتانے کے بجائے صرف قیاس کیا جا رہا تھا کہ گولی بہت دور سے اور رائفل سے چلائی گئی تھی۔ نشانہ باز یقیناً بہت ماہر تھا جس نے زیادہ درمیانی فاصلہ ہونے کے باوجود صرف ایک گولی چلا کر کنور ثقلین کی زندگی ختم کر دی تھی۔

خبر میں بعض لوگوں کے تجزیے بھی شامل کیے گئے مگر ان میں سے کوئی بھی نتیجہ خیز نہیں تھا۔ یہ بات بھی کہی گئی کہ کنور ثقلین بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اپنی زندگی کو لاحق کسی خطرے کے باعث ملک سے کہیں چلا گیا تھا یا روپوشی اختیار کر لی تھی لیکن دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ سامنے آنے کے بعد اس نے اس قسم کی باتوں کی سختی سے تردید کی تھی۔

''برے آدمیوں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔'' رندھاوا نے تبصرہ کیا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کھانا دوبارہ نکلواتا ہوں۔ یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔''

بختیار کچھ نہیں بولا اور رندھاوا ٹرے اٹھا کر اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں بھی ان کا موضوع گفتگو ثقلین ہی رہا۔ رندھاوا نے یہ بھی کہا کہ اب بختیار کو فروزاں کی وجہ سے اپنے ذہنی انتشار سے تو نجات مل گئی ہوگی۔

کھانے کے بعد بھی یہ باتیں جاری رہیں۔ وہ خبریں بھی سنتے رہے۔ بارہ بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ گولی سر کے اوپر لگی تھی اور ٹھوڑی کی ہڈی تک چلی گئی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ فائر کچھ فاصلے کی کسی عمارت کی اوپری منزل سے کیا گیا تھا۔ دور مار رائفل کی ساخت کے بارے میں بھی کچھ اندازے لگا لیے گئے تھے اور دو عمارتوں کو مشتبہ سمجھا جا رہا تھا۔ خبروں میں ان عمارتوں کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ تفتیش کا سلسلہ جاری تھا۔

دوسرے دن رندھاوا دس بجے کے قریب جمال سے ملنے چلا گیا۔ اسے کسی بہانے جمال سے اس کے والد کا نام معلوم کرنا تھا لیکن اس وقت تک بختیار یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ اگر یہ وہی جمال نکلا جو کبھی اس کا کلاس فیلو تھا تو وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکے گا۔

فروزاں اب بھی اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے، اس کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔ اسے ہچکچاہٹ یہ تھی کہ فروزاں اس سے نہ جانے کس طرح بات کرے...... کنور ثقلین کا قتل کم از کم اس کے لیے تو غم ناک ہی ہونا چاہیے تھا۔

خاصے تذبذب کے بعد بختیار نے تمام منفی خیالات ذہن سے جھٹکے اور موبائل فون پر فروزاں سے رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف کئی مرتبہ گھنٹی بجی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ بختیار سوچنے لگا کہ فروزاں شاید ایک اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرنا مناسب نہ سمجھ رہی ہو۔

بختیار موبائل کان سے لگائے رہا۔ وہ خود رابطہ منقطع کرنے کے بجائے دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہونے کا انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آخر دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو!'' فروزاں کا لہجہ بہت مرجھایا ہوا سا تھا۔

''کیسی ہو فروزاں؟'' بختیار بہ مشکل بول سکا۔

دوسری طرف سے جواب نہیں آیا۔ فروزاں دم بہ خود رہ گئی ہوگی۔ اسے بالکل توقع نہیں ہوگی کہ بختیار اسے فون کرے گا۔

''میں بختیار بول رہا ہوں فروزاں!''

''تم!'' فروزاں کی آواز کانپ گئی۔

''مجھے...... کیا یہ امید رکھنا چاہیے...... کہ تم مجھے...... شبانہ کا قاتل سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوگی!'' بختیار رک رک کر بولا۔

''تم نے میرے......'' اتنا کہنے کے بعد فروزاں کی آواز رندھ گئی۔ ''زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے فون کیا ہے؟''

''یہ بات نہیں فروزاں!'' بختیار نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہاری آواز سننے کے لیے بے قرار تھا۔''

''تم...... تم......'' فروزاں کے لہجے میں غم کے ساتھ غصہ بھی تھا۔ ''تم ہی نے میرے کنور کو بھی قتل کیا ہوگا...... لیکن اس طرح تم مجھے دوبارہ تو حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم مجھے آزاد کر چکے ہو۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا لہٰذا وہ طلاق نہیں ہوئی ہے۔'' بختیار نے زور دے کر کہا۔ ''اور یہ بھی تم غلط سمجھ رہی ہو کہ کنور کو میں نے قتل کیا ہوگا۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' فروزاں بپھر گئی۔

''فروزاں!'' بختیار نے افسردگی سے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار بھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔''

''پولیس تم سے سب کچھ معلوم کر لے گی۔'' فروزاں کی آواز سے ظاہر ہوا، جیسے وہ رو بھی رہی ہو اور غصے سے دانت پیس رہی ہو۔ ''تم ہمیشہ قانون کے ہاتھوں سے دور نہیں رہو گے۔''

''میں قسم کھاتا ہوں فروزاں......''

''شٹ اپ بے رحم انسان!'' فروزاں چیخ پڑی اور ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

بختیار کو فروزاں سے اتنی محبت تھی کہ اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں پر تو کسی طرح قابو پا لیا مگر اس کا دل رو پڑا۔ اب وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے فروزاں سے رابطہ کیا۔ اسے سارے معلاملات درست ہو جانے تک صبر کرنا چاہیے تھا۔

رندھاوا لگ بھگ دو گھنٹے بعد واپس لوٹا۔ وہ خاصا پرجوش نظر آ رہا تھا۔

''کھیل اب ختم ہی سمجھو۔'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''کیا مطلب!''

''جمال سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ میں تمہیں ترتیب سے بتاتا ہوں۔'' رندھاوا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کو تمہاری تلاش تو ہے ہی لیکن وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ وہ شخص کون ہے، شبانہ جس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب تم پولیس کی حراست میں تھے، اس وقت تمہارا ڈی این اے تو لے لیا گیا تھا۔ اس رپورٹ سے یہ بات ثابت تھی کہ اس بچے کے ذمے دار تم نہیں تھے۔ پولیس کو اس بچے کے باپ کی تلاش اس لیے تھی کہ......''

''تھی؟'' بختیار جلدی سے بولا۔ ''کیا اب نہیں ہے؟''

''تم پوری بات تو سنو!'' رندھاوا نے کہا۔ ''سوچا یہ جا رہا تھا کہ اگر اس بچے کے باپ کا پتا چل جائے تو ممکن ہے کہ شبانہ کے قتل کے پس منظر میں کچھ اور گتھیاں بھی سامنے آئیں۔ اس سوچ سے اس معاملے میں گمبھیرتا پیدا ہو گئی تھی اس لیے کل یہ سارا کیس پولیس سے سی آئی ڈی کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ جمال نے کوشش کر کے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دراصل اب تک جمال کو تمہارے بارے میں تفتیش بہت رازداری اور احتیاط سے کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کیس کی فائل ہاتھ میں آ جانے کے بعد وہ آزادانہ طور پر کام کر سکتا تھا چنانچہ اسے جو ایک شبہ تھا، اسے یقین میں بدلنے کے لیے وہ کل رات ہی کارروائی کر چکا تھا۔''

''یعنی؟'' بختیار نے بے تابی سے پوچھا۔

''صبر سے نہیں سن سکتے۔'' رندھاوا ہنسا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ''دراصل جمال کے دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ شبانہ کا قاتل دروازہ استعمال کرنے کے بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کرے تو وہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس طرح اس کا دھیان اپارٹمنٹ کی بالکونی کی طرف گیا۔ اس نے سڑک پر کھڑے ہو کر بالکونیوں کا جائزہ لیا۔ بالکونی استعمال کرنے کے لیے نیچے سے رسی کا پھندا اوپر پھینکا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کسی جگہ پھنس جائے تو اسی کے سہارے اوپر چڑھا جا سکتا ہے لیکن تمہارا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کا امکان معدوم سمجھو۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمہارے اپارٹمنٹ کے اوپر کے اپارٹمنٹ کی بالکونی استعمال کی جائے۔ کیونکہ وہ عمارت چار منزلہ ہے اس لیے چوتھی منزل کے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں رسی باندھ کر تمہارے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں اترا جائے اور پھر وہیں سے واپسی ہو لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے یا رہنے والا قاتل کا ساتھ دے۔ جمال نے تحقیقات کر لی تھی کہ اس اپارٹمنٹ میں رہنے والی فیملی ایسی نہیں جو کسی جرائم پیشہ کا ساتھ دے۔ اس کے بعد تیسرا راستہ یہ رہ جاتا ہے کہ تمہارے اپارٹمنٹ کے برابر کا اپارٹمنٹ استعمال کیا جائے اور اس کی بالکونی سے......''

''ہاں۔'' بختیار بول پڑا۔ ''وہ اپارٹمنٹ خالی بھی تھا۔''

''جمال نے سڑک پر کھڑے ہو کر اسی بات کا جائزہ لیا۔ اس عمارت کے بلڈر یا انجینئر کی شان میں قصیدہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک اپارٹمنٹ کی بالکونی سے برابر کے اپارٹمنٹ کی بالکونی تک جانا مشکل تو کیا، خاصا آسان ہے۔''

''تو قاتل نے وہی راستہ اختیار کیا؟''

''ہاں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''جمال نے

چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے چھ ماہ قبل لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ کسی وجہ سے انہوں نے اپارٹمنٹ نہ تو بیچا تھا، نہ کرائے پر اٹھایا تھا۔ جمال نے کسی طرح ان کا لاہور کا پتا معلوم کیا اور اپنے ایک ماتحت کو لاہور بھیجا۔ اپارٹمنٹ کے مالک سے فون پر بات پہلے ہی کر لی گئی تھی۔ وہ شریف آدمی قانون سے تعاون کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گیا تھا۔ جمال کا آدمی رات کی فلائٹ سے اس اپارٹمنٹ کی چابی لے آیا۔ جمال یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کا قفل کھولنے کے لیے چابی بنوا لیتا لیکن ایک قانونی راستہ موجود ہوتے ہوئے غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی جبکہ قاتل نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔''

بختیار تیزی سے بولا۔ ''قاتل اسی اپارٹمنٹ سے میرے اپارٹمنٹ میں آیا تھا؟''

''بالکل۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس کے ثبوت مل چکے ہیں۔ وہ اپارٹمنٹ بالکل خالی پڑا ہے۔ مطلب یہ ...... کہ سامان نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ کئی جگہ مکڑیوں نے جالے تان لیے ہیں۔ فرش پر گرد ہے۔ اس پر جوتوں کے نشانات ملے ہیں جو بالکونی تک گئے ہیں۔ وہاں قاتل جوتے اتار کر بالکونی پر چڑھا تھا۔ وہاں سے تمہاری بالکونی تک ہاتھوں کے نشانات ملے ہیں۔''

''وہ نشانات ......''

''کنور ثقلین کے ہیں یا نہیں، اس کی رپورٹ ابھی نہیں ملی ہے۔'' رندھاوا نے بختیار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام آج صبح ہی تو مکمل ہوا ہے، یا شاید جمال نے مجھے بتایا نہیں ...... ویسے امکان یہ ہے کہ وہ نشانات کنور ثقلین کے نہیں ہوں گے۔ اگر اس معاملے میں اس کا ہاتھ ہے، تو بھی یہ کام اس نے کسی اور سے کروایا ہوگا۔''

''یہ قیاس تم نے کیوں کر لیا؟''

''کنور ثقلین ایک بہت بڑا گینگسٹر تھا۔''

بختیار چونک گیا۔

رندھاوا نے اثبات میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ''کچھ عرصے پہلے خفیہ محکموں کو رپورٹ ملی تھی کہ انڈر ورلڈ کے دو بڑوں میں کچھ رسا کشی ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ پرسوں رات وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہے۔ اب یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ وہ دوسرا آدمی کنور ثقلین تھا۔''

''اوہ!'' بختیار بول پڑا۔ ''گویا یہ افواہ نہیں، حقیقت تھی کہ کنور ثقلین کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا اور وہ اسی لیے غائب ہو گیا تھا اور اب جب اس کا دشمن مارا جا چکا ہے تو وہ سامنے آ گیا۔''

''لیکن کنور ثقلین کا اس حد تک مطمئن ہو جانا اس کی غلطی تھی۔ جمال کے خیال کے مطابق اسے گولی مارنے والا اس کے دشمن ہی کے گروہ کا کوئی آدمی ہوگا۔ جن مشتبہ عمارتوں کی بات خبروں میں آئی تھی، ان میں سے ایک عمارت کی چھت پر کچھ ایسے نشانات ملے ہیں جن سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کنور ثقلین پر گولی وہیں سے چلائی گئی تھی۔ وہاں کی منڈیر پر کچھ انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ ان نشانات کو جرائم پیشہ افراد کے ان فنگر پرنٹس سے ملا کر دیکھا جائے گا جو پولیس کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔''

''یہ خبریں ابھی تک ٹی وی پر نہیں آئیں۔'' بختیار بڑبڑایا۔

''شاید اب آئیں۔'' رندھاوا نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ ''یہ خبر شاید ابھی چھپائی جائے کہ تمہارے اپارٹمنٹ میں بالکونی کے ذریعے داخل ہونے والے کے فنگر پرنٹس مل گئے ہیں۔ یہ خبر آنے سے وہ شخص چوکنا ہو جائے گا جس نے تمہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد شبانہ کو قتل کیا تھا۔''

بختیار بڑبڑایا۔ ''کم از کم یہ خبر تو آ جانا چاہیے کہ کنور ثقلین ایک گینگسٹر تھا۔''

''اس کے گھر پر بھی چھاپا مارا گیا ہے۔'' رندھاوا نے بتایا۔ ''اور وہاں سے کچھ معلومات حاصل ہو جانے کے بعد اور بھی دو تین جگہ ریڈ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ثقلین آباد سے ......''

رندھاوا نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اور بختیار ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو بریکنگ نیوز کا اعلان کر رہا تھا۔

وہ بریکنگ نیوز ثقلین ہی کے بارے میں تھی کہ وہ ایک گینگسٹر تھا۔ اس خبر میں وہی سب باتیں تھیں جو بختیار کو رندھاوا سے معلوم ہو چکی تھیں، البتہ یہ بات خبروں میں نہیں آئی تھی کہ کسی عمارت کی چھت سے ملنے والے فنگر پرنٹس اور کچھ دوسرے شواہد ملنے کے باعث یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ کنور ثقلین کو وہیں سے گولی ماری گئی تھی۔

ان خبروں میں شبانہ کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں تھی۔ ابھی تک کسی خبر رساں ادارے کو کہیں سے یہ

اشارہ نہیں ملا تھا کہ شبانہ کے قتل میں بھی کنور ثقلین کا ہاتھ ہونے کے امکان کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

''اتنی خبر آ جانا بھی میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔'' بختیار نے مسکرا کر کہا۔ ''اب فروزاں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ وہ جان لے گی کہ میں نے اسے کنور ثقلین کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے کہیں زیادہ کی بات ہے۔ اگر اس نے یہ خبر سن لی ہو گی تو اب وہ مجھ پر نہیں بگڑے گی۔ اب وہ مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکے گی کہ میں نے ہی کنور ثقلین کو بھی قتل کیا ہوگا۔''

''یہ الزام اس نے تم پر کب لگایا؟'' رندھاوا نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی جب تم گئے تھے تو میں نے اسے فون کیا تھا۔''

''کیا؟'' رندھاوا گھبرا گیا۔ ''کیا باتیں ہوئی تھیں اس سے؟''

''گھبرا کیوں رہے ہو؟ اس نے تمہیں نہیں، مجھے برا بھلا کہا تھا۔''

''بات کیا ہوئی تھی؟'' رندھاوا نے بے چینی سے پوچھا۔

''جانے کیوں پریشان ہو رہے ہو تم!'' بختیار نے سر جھٹکا اور پھر وضاحت سے وہ ساری باتیں بتا دیں جو فروزاں سے ہوئی تھیں۔

''یہ کیا غضب کر بیٹھے تم!'' رندھاوا نے سر تھام لیا اور پھر یکایک کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔''

''کیوں؟'' بختیار حیرت سے بولا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' رندھاوا نے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''گھر والوں سے کچھ کہہ دوں، پھر نکلتے ہیں یہاں سے!''

اس سے پہلے کہ بختیار کچھ کہتا، وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔

بختیار پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ ٹی وی سے خبریں جاری تھیں مگر اب بختیار کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ ان خبروں کا تعلق کنور ثقلین سے نہیں تھا۔

رندھاوا واپس آیا تو بھی خاصا پریشان تھا۔

''آؤ۔'' اس نے بختیار کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''آخر ......''

''بتاتا ہوں۔ پہلے یہاں سے تو نکلیں۔''

کار میں بیٹھنے کے بعد انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے رندھاوا بڑبڑایا۔ ''شکر ہے کہ ہمیں یہاں سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''کچھ بتاؤ تو ...... آخر ......''

''تم نے بڑی حماقت کی ہے فروزاں کو فون کر کے۔ اس نے ضرور پولیس کو اطلاع دے دی ہو گی کہ تم نے ...... یعنی جیل سے مفرور قیدی نے اسے فون کیا تھا۔ قانون کو یہ معلوم کرنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ وہ موبائل کس کا ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے تمہیں بتا بھی دیا تھا کہ اس موبائل کی سم میں نے اپنے نام سے ایکٹی ویٹ کروائی ہے۔''

''اوہ!'' بختیار کے منہ سے نکلا۔

''سب ریکارڈ ہوتا ہے موبائل کمپنیوں کے پاس ...... لاؤ، موبائل مجھے دو۔'' وہ کار کی رفتار تیز کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ عام گزرگاہوں کے بجائے وہ راستے اختیار کرے جہاں ٹریفک برائے نام تھا۔

اس نے موبائل بختیار سے لیا۔

''آگے ایک گندا نالا ہے۔'' وہ بولا۔ ''موبائل اسی میں پھینک دوں گا۔ موبائل کمپنی یہ بھی بتا سکتی ہے کہ اس نمبر کا موبائل اس وقت کس علاقے میں ہے۔''

بختیار دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔

گندا نالا قریب آتے ہی رندھاوا نے موبائل اس میں پھینکا اور کار ایک شاہراہ کی طرف موڑ کر اس کی رفتار میں اضافہ کیا۔

''جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے۔'' بختیار دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے بھی اس کا علم تھا لیکن فروزاں سے بات کرنے کی بے تابی میں یہ سب کچھ میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ فروزاں پولیس کو اطلاع دے گی۔''

''اس نے لازماً دے دی ہو گی۔'' رندھاوا پریشان تھا۔ ''پولیس کسی وقت بھی میرے گھر پہنچ سکتی ہے۔ میں گھر والوں کو ہدایت کر کے آیا ہوں کہ اس کمرے کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ اور صفائی کر ڈالیں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ سوچ سکتا ہوں، کوئی تدبیر کروں گا لیکن اگر اس کمرے سے تمہارے فنگر پرنٹس بھی پولیس کو مل گئے تو میں مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ اگر میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ سوچنے میں کامیاب نہ ہوا تو حوالات میرا مقدر بن جائے گی اور مجھے وہاں سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں ملے گا جب تمہارا

معاملہ صاف ہوجائے گا۔''

''آئی ایم...... سوری...... رندھاوا۔'' بختیار بہت شرمندہ تھا۔

رندھاوا نے کار ایک شاپنگ پلازا کے سامنے پارک کی۔

''شکر ہے کہ پارکنگ کی جگہ مل گئی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اب کرنا کیا ہے؟'' بختیار بولا۔

''سب سے پہلے تو مجھے تمہاری فکر ہے۔'' رندھاوا نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

بختیار بھی اتر آیا۔ رندھاوا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ایک گلی میں مڑا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''پولیس میری کار بھی تلاش کرسکتی ہے لہٰذا اس سے چھٹکارا بھی ضروری تھا۔''

''تو اب؟''

وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے اس لیے رندھاوا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا لیکن اس کے عمل سے جواب ظاہر ہوگیا۔ ان کی خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی دوسری شاہراہ پر مل گئی۔ رندھاوا نے اسے روک کر انگریزی میں کہا۔

''اس شہر کی سب سے خوبصورت جگہ کون سی ہے؟''

''میں انگریزی نہیں جانتا صاب!'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

رندھاوا کے انگریزی بولنے کا سبب بختیار کی سمجھ میں اس وقت آیا جب ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد رندھاوا نے اس سے کہا۔ ''اب ہم انگریزی میں اپنی باتیں جاری رکھ سکتے ہیں۔'' پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ہوٹل کا نام بتایا۔

''کیا اب ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا؟'' بختیار نے انگریزی میں پوچھا۔

''نہیں۔ میں اس دوران میں تم سے باتیں بھی کرتا رہا ہوں اور سوچتا بھی رہا ہوں۔ پہلے مجھے ہوٹل ہی کا خیال آیا تھا لیکن وہ مناسب نہیں۔ اب تمہارے لیے سب سے بہتر جگہ تمہارا گھر ہی ہوسکتی ہے۔''

''اپارٹمنٹ؟'' بختیار چونکا۔

''فی الحال تو وہ سیل کردیا ہے پولیس نے! میں اس گھر کی بات کررہا ہوں جہاں تم نے زندگی گزاری ہے۔''

''یعنی خالہ کا گھر؟''

''ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں جہاں تم اس وقت تک روپوش رہ سکو جب تک تمہارے دامن سے یہ داغ دھل نہ جائے، اور مجھے امید ہے کہ یہ داغ بہت جلد دھل جائے گا۔''

''تم نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہاں کی خفیہ نگرانی شاید اب بھی ہورہی ہو۔''

''مجھے جمال سے باتوں باتوں میں معلوم ہوچکا ہے کہ نگرانی نہیں کی جارہی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ تم اس شہر سے ہی بھاگ گئے ہو۔ تمہاری تصویر دوسرے شہروں کی پولیس کو بھیج دی گئی ہے۔''

بختیار نے متفکر انداز میں سر ہلایا، پھر رندھاوا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ٹیکسی ڈرائیور کو تو تم نے ہوٹل کا نام بتایا ہے۔''

''وہاں سے ہم دوسری ٹیکسی کریں گے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''تمہیں تو جمال کے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔'' پھر اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''تم نے اس کے والد کا نام معلوم کیا؟''

''ہاں میں نے کسی بہانے سے اس کا شناختی کارڈ لے کر دیکھا تھا۔'' رندھاوا نے جواب دینے کے بعد جمال کے والد کا نام بتایا۔

''پھر تو۔'' بختیار جوشیلا ہوگیا۔ ''یہ وہی ہے۔ میرا کلاس فیلو۔''

''مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بختیار!'' رندھاوا نے کہا۔ ''اس کے مزاج میں فرض شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس نے صاف صاف کہا تھا کہ رندھاوا، اگر تمہارا خیال غلط ثابت ہوا اور شبانہ کا قتل تمہارے دوست نے ہی کیا ہے تو میں تمہاری خاطر بھی تمہارے دوست کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔'' وہ مسکرایا۔ ''اسے قانون اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے مجھ سے یہ باتیں پہلی ملاقات میں کہی تھیں۔ اب تو دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کی وجہ سے اس کو یقین ہوچکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لیکن جب تک تم بے گناہ ثابت نہیں ہوجاتے، تمہارا روپوش رہنا ضروری ہے۔ پولیس کو تمہارا سراغ ملے گا تو وہ تمہیں گرفتار کرکے رہے گی۔''

''خطرہ اب میری وجہ سے تمہارے لیے بھی ہے۔''

''میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا کر اپنا بھی کچھ بندوبست کروں گا۔''

''میرے ساتھ ہی رہو۔ خالہ، خالو، سبھی تمہیں

جانتے ہیں۔'' بختیار نے کہا۔ ''شاید آفتاب اس وقت گھر میں نہ ہو، بلکہ خالو بھی نہیں ہوں لیکن جب میں ان دونوں کو بتاؤں گا کہ تم اس معاملے میں میری مدد کررہے ہو تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ تمہارے وہاں روپوش رہنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو، ایک بات میں تمہیں اور بتادوں۔ جمال نے مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے شبہ تو ہوگیا ہے کہ تم میرے رابطے میں ہو۔''

''شبہ تو ہونا ہی چاہیے۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے اس نے میرے گھر کی نگرانی کروائی ہو اور وہ اب جان بھی چکا ہو کہ تم میرے ساتھ ہو لیکن اب وہ تمہارے لیے خطرہ نہیں بنے گا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا کہ دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کے باعث اب اسے یقین ہوچکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لہٰذا اب وہ اصل قاتل کے چکر میں ہوگا، جو کنور ثقلین کے گروہ کا کوئی شخص ہوسکتا ہے۔''

''یہ بھی معلوم ہوگیا تو فروزاں مجھ سے بہت شرمندہ ہوگی۔''

ان باتوں کے دوران میں سفر طے ہوگیا۔ ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی۔ دونوں اترے۔ رندھاوا نے کرایہ ادا کیا۔ پھر جب ٹیکسی دور جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو دونوں ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔

''خالہ مجھے اس حلیے میں پہچانیں گی کیسے؟'' بختیار بڑبڑایا۔

''جب تم سر سے ٹوپی اور آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنی آواز بھی انہیں سنادو گے تو ان کا نہ پہچاننا ممکن ہی نہیں۔ تمہارا ناک نقشہ تو تبدیل نہیں ہوا۔ صرف سر کے بڑے بڑے بال اور ڈاڑھی مونچھیں اضافی ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ مجھ سے مل کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوں گی۔ ان کے ذہن میں تو یہی ہوگا کہ شبانہ کو میں نے قتل کیا ہے۔''

''احتیاطاً تم ابھی اپنا یہ حلیہ تبدیل نہ کرنا۔'' رندھاوا نے مشورہ دیا۔

بختیار کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا کہ خالہ نے اسے پہچان کر اپنے سینے سے تو لگالیا لیکن چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات بھی ابھرے۔

''یہ تم کیا کر بیٹھے ہو میرے بچے!'' وہ رندھی ہوئی سی آواز میں بولیں۔

بختیار نے ممکنہ حد تک خالہ کو یقین دلایا کہ وہ شبانہ کا قاتل نہیں ہے اور جلد ہی اصل قاتل کا پتا لگ جانے کا امکان ہے۔

خالو اور آفتاب گھر پر نہیں تھے۔ خالہ نے دونوں کو فون کیا کہ ایک ضروری کام ہے اس لیے وہ فوراً گھر آئیں۔ یہ مشورہ انہیں بختیار ہی نے دیا تھا کہ وہ انہیں اس کی آمد کے بارے میں نہ بتائیں۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ فون پر اس کا نام لیا جاتا۔

خالو نے جواب دیا کہ وہ آدھے گھنٹے میں آجائیں گے۔ آفتاب نے بھی جلد آنے کے لیے کہا۔ خالو آدھے گھنٹے میں آگئے۔ بختیار کو وہی سب کچھ خالو سے بھی کہنا پڑا جو وہ خالہ سے کہہ چکا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل نہیں کیا اور اس کی وجہ بھی خالہ اور خالو کو بتادی۔

کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ ان تینوں نے کھانا کھایا۔ آفتاب اس وقت تک نہیں آیا تھا۔

''وہ کبھی وقت پر آیا ہے جو اب آئے گا۔'' خالہ ناخوش گوار انداز میں بڑبڑائی تھیں۔

کھانے کے بعد ان دونوں نے بڑی محبت سے بختیار کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ بختیار کو اس وقت آرام سے زیادہ تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ اس وقت صرف سوچنا چاہتا تھا اور اسے یہ خواہش بھی تھی کہ وہ دوبارہ فروزاں سے بات کرے۔ اسے یقین تھا کہ کنور ثقلین کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ ممکن نہیں تھا کہ فروزاں بے خبر رہی ہو۔ اب وہ شرمندہ ہی ہوتی کہ اس نے کنور ثقلین کے بارے میں بتائی جانے والی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوکر بختیار کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گزرے ہوئے سارے واقعات اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ حوالات میں گزرا ہوا وقت، جیل کے شب و روز، فرار، نواحی بستی میں نابینا آسیہ خالہ اور اس کی بیٹی کا گھر!

اچھی لڑکی ہے، بختیار نے پروین کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ حالات ٹھیک ہونے کے بعد وہ آسیہ خالہ کے گھر ضرور جائے گا اور ان ماں بیٹی کی مالی امداد میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔

گھر میں تین ٹیلی فون تھے جن میں سے ایک بختیار کے کمرے میں بھی تھا لیکن اس نے فروزاں کو فون نہیں کیا۔ ایک تو یہ کہ احتیاط اب بھی ضروری تھی، دوسرے یہ کہ بختیار اس حوالے سے بھی تذبذب کا شکار رہا کہ فروزاں اسے شبانہ کا قاتل تو اب بھی سمجھ رہی ہوگی۔

بستر پر لیٹے اور سوچتے ہوئے بختیار کو ایک گھنٹا گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بختیار نہ صرف چونکا بلکہ اس کے جسم میں سنسناہٹ بھی پھیل گئی۔ اول تو اس کے شناساؤں کا حلقہ زیادہ نہیں تھا اور جو تھے ان سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس نمبر پر رنگ کریں گے۔ یہ نمبر خالہ اور خالو نے خود کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

''تم جس کو چاہو، یہ نمبر بتانا۔ خالو نے اسی وقت کہہ دیا تھا جب وہ ٹیلی فون اس کے کمرے میں لگوایا گیا تھا۔

کئی گھنٹیاں بج چکی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھول کر خالہ اندر آئیں۔ ''فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہو بیٹا!''

''آپ دیکھیں خالہ، کون ہے۔'' بختیار نے فکرمندی سے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے کال ریسیو کی تو کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔''

یہ بات سن کر خالہ کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ انہوں نے قریب آکر ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، وہ سن کر خالہ ہنس پڑیں اور پھر ریسیور بختیار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارا دوست ہے رندھاوا۔''

بختیار نے بے اختیار ایک لمبی سانس لی۔ خالہ اور خالو کو وہ یہ تو بتا چکا تھا کہ اس سارے معاملے میں رندھاوا اس کی مدد کررہا ہے۔

''ہیلو رندھاوا!'' بختیار نے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ ''میں سمجھا تھا، نہ جانے کس کا فون ہو، اس لیے ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی جو تم نے فون کیا ہے۔''

''بات تو یقیناً خاص ہے۔'' رندھاوا کی آواز آئی۔ ''لیکن خالہ کو یکایک نہ بتادینا۔ انہیں جان کر صدمہ ہوگا کہ آفتاب کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

''کیا!'' بختیار حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

خالہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہاں بختیار!'' رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''شروع سے مجھے اسی پر شبہ تھا۔ اب ثابت ہوگیا ہے شبانہ کا قتل اسی نے کیا تھا اور وہی شبانہ کے اس بچے کا باپ ہے جو اس دنیا میں نہیں آسکا۔''

''کیا کہہ رہے ہو!'' بختیار کی آواز کانپ گئی۔

''نہ جانے کیوں، میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ اطلاع دے دوں۔ میں ایک گھنٹے بعد آکر تفصیل بتاؤں گا۔ ابھی میں جمال کے ساتھ ہوں۔ اس نے معلوم کرلیا تھا کہ تم میرے گھر میں تھے۔ تمہارا نام سن کر اسے بھی یاد آگیا ہے کہ اس کا کوئی کلاس فیلو بختیار بھی تھا۔ ممکن ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی تم سے ملنے آئے۔''

''اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے کہ......''

''آکر سب کچھ بتاؤں گا۔ اب تم اپنا حلیہ درست کرلو۔ ڈاڑھی مونچھوں کی ضرورت نہیں رہی۔''

''اچھا۔'' بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔

اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ خالہ بے چینی سے بول پڑیں۔ ''کیا بات ہے بختیار! کیا بتایا ہے رندھاوا نے؟''

جو کچھ رندھاوا نے بتایا تھا، وہ خالہ اور خالو، دونوں ہی کے لیے ایک صدمہ تھا۔ آفتاب کو کسی حد تک ناپسند کرنے کے باوجود انہیں اس سے محبت تو تھی۔ آخر پال پوس کر جوان کیا تھا۔ ان کا صدمہ فطری بات تھی۔

ایک بھانجا ناکردہ قتل کے جرم میں سزاوار ہوا اور دوسرا اسی قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔

بختیار کے خالو معلومات حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہوگئے...... خالہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

ایک گھنٹے بعد رندھاوا آیا۔ بختیار نے اس دوران ڈاڑھی مونچھ صاف کرکے اپنا گھریلو لباس پہن لیا تھا۔

رندھاوا نے خالہ کو مختصر طور پر کچھ بتانے کے بعد کہا کہ تفصیلات کا علم شام تک ہوگا لیکن تنہائی میں بختیار سے کہا۔ ''خالہ سے وہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا ورنہ مجھے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ خالہ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہوجائے گا یا خالو آئیں گے تو وہ بتادیں گے۔ ممکن ہے کہ ٹی وی کی خبروں میں بھی بتادیا جائے۔''

''تو تم سب کچھ جانتے ہو؟'' بختیار نے بے تابی سے پوچھا۔

''جمال نے بتایا ہے مجھے۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس نے سب سے پہلے جن دو آدمیوں کا خون حاصل کرکے ڈی این اے رپورٹ لی تھی، اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ شبانہ کے ہونے والے بچے کا باپ آفتاب ہی تھا۔ یہ رپورٹ ملنے کے بعد جمال کو بڑی حد تک یقین ہوگیا تھا کہ شبانہ کو قتل بھی اسی نے کیا ہوگا۔ بالکونی سے فنگر پرنٹس مل ہی چکے تھے۔ اس کے بعد جمال اس فکر میں تھا کہ کسی طرح آفتاب کے فنگر پرنٹس حاصل کرے۔ یہ کام بھی وہ کسی نہ کسی

طرح کرہی لیتا لیکن آفتاب نے خود ہی اسے یہ موقع فراہم کردیا۔ اس نے آج اپنی کار ایک غلط جگہ پارک کردی تھی۔ پولیس والوں نے اسے لفٹر میں اٹھا کے پولیس اسٹیشن پہنچادیا تھا۔ جمال کے آدمی آفتاب کی نگرانی کررہے تھے۔ انہوں نے اس کی اطلاع جمال کو دی۔ جمال فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ آفتاب پولیس والوں کو کچھ دے دلا کے کار واپس لے آتا لیکن جمال نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ آفتاب نے اپنے ایک شناسا مجسٹریٹ تک دوڑ لگائی کہ اس کے ذریعے سے اپنی کار چھڑالے۔ جمال نے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی کیونکہ اس دوران میں وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے فنگر پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بلوا کر ان سے کار کے اندر پائے جانے والے تمام نشانات کے پرنٹس بنوالیے تھے۔ آفتاب اپنی کار لینے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ دوسری طرف جمال نے ان پرنٹس کے ساتھ بالکونی میں ملنے والے پرنٹس محکمے کے متعلقہ افسر کو دیے۔ اس نے تصدیق کردی کہ وہ ایک ہی آدمی کے ہاتھ اور انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس کے بعد جمال نے آفتاب کو گرفتار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں جب تمہیں یہاں چھوڑ کر گیا تھا، اس کے آدھے گھنٹے بعد آفتاب کو اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ کار میں اسی طرف...... میرا مطلب ہے تمہارے اسی گھر کی طرف آرہا تھا۔‘‘

’’اسے خالہ نے فون کیا تھا کہ ایک ضروری کام ہے لہٰذا وہ فوراً گھر آئے۔‘‘ متفکر بختیار نے کہا۔ ’’خالہ بہت خوش تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ خالو اور آفتاب فوراً جان لیں کہ میں گھر آگیا ہوں۔‘‘

’’یہ بہت اچھا ہوا کہ آفتاب اس وقت گرفتار ہوگیا ورنہ وہ یہاں آکر تم سے ملنے کے بعد کسی نہ کسی طرح پولیس کو اطلاع بھجوادیتا کہ جیل سے فرار ہونے والا بختیار اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔‘‘

’’آخر اس نے مجھ سے کس بات کی دشمنی نکالی۔‘‘ بختیار کی آواز بھرا گئی۔

’’میرا خیال ہے کہ وہ خالو کی وراثت میں اکیلا حصے دار بننا چاہتا ہوگا۔ اس نے ایک طرف تو شبانہ سے نجات حاصل کی اور دوسری طرف تمہیں اس قتل میں پھنسوادیا۔‘‘

’’لیکن یہ اس نے آخر کس طرح کیا؟‘‘

’’اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔‘‘ رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’آفتاب سے واقفیت میری بھی تھی۔‘‘

’’کیا!‘‘ بختیار حیرت سے بولا۔ مگر اس نے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور کہا۔ ’’میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ اس نے آخر کس طرح کیا۔‘‘

’’وہی بتارہا ہوں۔ ایک بات تم کو یہ بھی بتادوں کہ میں شراب پیتا تو ہوں لیکن خود کبھی نہیں خریدتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کسی شراب فروش کے ساتھ دیکھا جائے۔ میں پیتا بھی کم ہوں، یہ تم جانتے ہو۔ میں نے آفتاب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دس دن میں ایک بوتل مہیا کردیا کرے۔ میں اسے ادائیگی کردیا کرتا تھا۔ دراصل آفتاب سے میری پہلی ملاقات ایک محفل میں ہوئی تھی جہاں وہ شراب پی رہا تھا۔ میرے اور تمہارے تعلقات اس کے علم میں تھے اس لیے اس نے مجھ سے نہایت عاجزانہ درخواست کی تھی کہ بھائی کو نہ بتانا۔‘‘

بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’گھر والوں کو اس کی ایک ایک حرکت کا علم ہے۔‘‘

’’یہ نہ کہو۔‘‘ رندھاوا نے کہا۔ ’’وہ تو کنور ثقلین کے لیے بھی کام کرتا تھا۔‘‘

بختیار حیرت زدہ رہ گیا۔

رندھاوا نے بات جاری رکھی۔ ’’لیکن شبانہ کے معاملے میں شاید کنور ثقلین کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ دراصل سارے معاملات کلی طور پر ابھی جمال کے علم میں بھی نہیں ہیں۔ آفتاب سے پوچھ گچھ کی جارہی ہوگی۔ سارا معاملہ وضاحت کے ساتھ اسی وقت سامنے آئے گا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے لیے میں نے جو شراب مہیا کی تھی، وہ بھی آفتاب ہی سے لی تھی اور چونکہ تم نے زیادہ شراب کی بات کی تھی، اس کی وجہ سے آفتاب کو تعجب ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹٹولنے کے لیے تمہارا ذکر کیا تھا کہ تم فروزاں کے چلے جانے سے بہت ڈسٹرب ہوگے۔ میں نہیں جانتا کہ فروزاں کی بات اسے کیسے معلوم ہوگئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ فروزاں نے فون پر ثقلین کو بتایا ہو اور ثقلین سے آفتاب کو معلوم ہوگیا ہو۔ بہرحال اس نے مجھے باتوں میں ایسا گھیرا کہ میں اسے بتا بیٹھا کہ وہ شراب میں تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔‘‘

بختیار مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

رندھاوا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ’’تم نے بتایا تھا ناکہ شبانہ کی آمد سے پہلے تمہارے پاس کسی کی کال آئی تھی لیکن دوسری طرف سے کوئی بولا نہیں تھا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ آفتاب ہی نے شبانہ سے وہ کال کروائی ہوگی۔ اس نے تمہاری آواز سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ تم نشے میں دھت ہوچکے ہو۔ اس کے بعد ہی اس نے شبانہ کو تمہارے پاس بھیجا ہوگا۔‘‘

’’مگر کس لیے؟‘‘

’’فی الحال تو میں اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ اس نے شبانہ کو پٹی پڑھائی ہوگی کہ وہ تمہارے پاس جائے اور تمہیں رجھانے کی کوشش کرے۔ اگر تم نشے کی وجہ سے بہک گئے تو شبانہ بعد میں تمہیں بلیک میل کرسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے شبانہ کو اور کوئی لالچ دیا ہو۔ جب تک آفتاب کا مکمل بیان سامنے نہیں آجاتا، یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ شبانہ بہرحال کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی۔ کسی بھی قسم کے لالچ میں وہ آفتاب کی بات مان سکتی تھی۔‘‘ رندھاوا رک کر سوچتا ہوا بولا۔ ’’اس کے بعد آفتاب دوسرے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ شبانہ کو چاقو سے ہلاک کرنے کے بعد اس نے تمہارا ہاتھ اس چاقو کے دستے پر جمایا ہوگا۔ تم اس وقت مدہوش تھے اس لیے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا ہوگا۔ اس طرح آفتاب نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ شبانہ سے اپنی جان چھڑائی اور تمہیں اس کے قتل میں پھنسوادیا۔ اب تم غالباً یہ اعتراض کرسکتے ہو کہ دوسرے اپارٹمنٹ کی چابی اس نے پہلے سے کیوں بنوالی تھی؟‘‘

’’ہاں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے۔‘‘

’’مجھے پھر کہنا پڑے گا کہ آفتاب کا بیان سامنے آئے گا، تبھی ہر بات کی وضاحت ہوگی۔ فی الحال تو میں اس معاملے میں بھی قیاس ہی کرسکتا ہوں۔ شاید اس نے تمہارے اپارٹمنٹ میں گھس کر خود ہی تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ بعد میں جب اسے تمہارے نشے کی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوسرا کھیل، کھیل ڈالا۔‘‘

بختیار اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

’’اب جمال کا ایک پیغام بھی سن لو۔‘‘ رندھاوا نے کہا۔ ’’میرے ذریعے یہ پیغام تمہارے لیے ہے۔‘‘

’’تم نے کہا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ملنے آئے گا۔‘‘

’’ابھی وہ آفتاب کے سلسلے میں بہت مصروف ہے۔ ایک آدھ دن بعد ملے گا تم سے! فی الحال تمہارے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ تم خود کو گرفتاری کے لیے پولیس کے سامنے پیش کردو۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ بختیار تیزی سے بولا۔ ’’اب تو اصل قاتل پکڑا جاچکا ہے۔‘‘

’’تم ایک مفرور قیدی اب بھی ہو۔ تمہارے بری ہونے کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی لیکن تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حوالات نہیں جانا پڑے گا تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں! جمال نے اب تک یہ بندوبست کرلیا ہوگا کہ ادھر تم اپنی گرفتاری دو، اور ادھر تمہاری ضمانت کرالی جائے۔‘‘

’’گرفتاری دینا ضروری ہے؟‘‘ بختیار پریشان ہوگیا تھا۔

’’اس کے بغیر تم قانوناً ایک آزاد شہری نہیں بن سکتے۔ ضمانت کے بعد بھی تمہیں عدالت کے دو ایک چکر تو لگانا ہی پڑیں گے۔ اب اگر تم کہو تو میں فون پر جمال سے پوچھ لوں کہ اس نے تمہاری ضمانت کا بندوبست کرلیا یا نہیں۔‘‘

’’پوچھ لو۔‘‘ بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ’’لیکن یہ بات خالہ کے علم میں ابھی نہ آئے۔ میں انہیں پولیس اسٹیشن سے واپس آنے کے بعد بتادوں گا۔‘‘

’’یہ ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔‘‘

’’میں جلد از جلد فون پر فروزاں سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی ہے کہ پہلے اس مرحلے سے گزر لیا جائے۔‘‘

’’ہاں۔ اس کے بعد تم اسے فون کرنے کے بجائے اس سے ملنے بھی جاسکتے ہو۔‘‘

’’پہلے تو میں فون ہی کردوں گا۔‘‘

’’جیسا تم چاہو۔‘‘ رندھاوا نے کہا اور موبائل پر جمال کا نمبر ملانے لگا۔

بختیار بڑبڑایا۔ ’’یہ آخری مرحلہ بھی طے کرہی لیا جائے۔‘‘

ذرا دیر بعد وہ اور رندھاوا گھر سے روانہ ہوئے۔ خالہ سے رندھاوا نے بہانہ کیا تھا کہ وہ اسی معاملے کی چھان بین کے لیے جارہا ہے۔ خالہ پریشان تھیں۔ ان حالات میں وہ اکیلی تھیں۔ خالو ابھی واپس نہیں لوٹے تھے مگر انہوں نے بختیار کو روکا نہیں۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے، گرفتاری دینے اور وہیں موجود ایک مجسٹریٹ کے سامنے ضمانت ہونے کے بعد وہ رندھاوا کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے نکلا۔ جمال اس وقت بھی وہاں نہیں تھا مگر فون پر اس نے بتادیا تھا کہ انتظامات مکمل ہیں لہٰذا بختیار قطعاً پریشان نہ ہو۔

پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد بختیار نے رندھاوا کے موبائل فون پر فروزاں کو اپنے نام سے ایک ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کررہا ہے۔ پھر اس نے فروزاں کے نمبر ملائے۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ فروزاں شاید کال ریسیو نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کال ریسیو کی گئی لیکن دوسری

طرف سے کچھ کہا نہیں گیا۔

‘‘کیسی ہو فروزاں؟’’ بختیار کا مخصوص جملہ اس کی زبان پر آ گیا۔

‘‘ٹھیک ہوں۔’’ فروزاں کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ‘‘اور بہت شرمندہ ہوں تم سے……! فون پر تمہیں جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔’’

‘‘بھول جاؤ وہ سب!’’ بختیار نے کہا۔ پھر پوچھا۔

‘‘ڈیڈی کہاں ہیں؟’’

‘‘ظاہر ہے کہ وہ ابھی آفس ہی میں ہوں گے۔’’

اس وقت چار بجے تھے۔

بختیار نے کہا۔ ‘‘اچھا میں تم سے ملنے آ رہا ہوں۔’’

‘‘کیا!’’ فروزاں چونکی۔ ‘‘تم جہاں بھی چھپے ہوئے ہو، وہاں سے نکلتے ہوئے تمہیں پولیس کا ڈر نہیں لگے گا؟’’

‘‘اب ڈرنے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ابھی میری ضمانت ہو چکی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ شخص گرفتار کیا جا چکا ہے جس نے واقعی شبانہ کو قتل کیا تھا۔’’

‘‘کیا……کیا کہہ رہے ہو تم!’’ فروزاں حیرت زدہ تھی۔

‘‘کل کے اخبارات سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور شاید کسی نیوز چینل پر بھی یہ خبر آ جائے۔’’

‘‘اگر یہ خبر سچی ہے تو میں خوشی کا اظہار کروں گی۔’’

‘‘میں تم سے ملنے آ رہا ہوں۔’’

‘‘اب کیا ضروری رہ گیا ہے ملنا!’’ فروزاں کے لہجے میں افسردگی تھی۔ اس کے ذہن میں اب بھی یہی تھا کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔

بختیار نے فون پر کوئی بحث چھیڑنے کے بجائے کہا۔

‘‘ہم دوستوں کی حیثیت سے تو مل سکتے ہیں۔’’

‘‘اگر تم اصرار کر رہے ہو تو میں کہیں آ جاتی ہوں۔ تم مت آؤ۔’’ فروزاں کے دماغ میں جو خیال جم گیا تھا، وہ بس جم گیا تھا۔

بختیار نے ضد نہیں کی اور ایک لائبریری کا نام بتایا جہاں ملاقات کی جا سکتی تھی۔

اس پبلک لائبریری کا خیال بختیار کو کسی وجہ سے آ گیا تھا۔ اس نے رندھاوا کا موبائل اسے واپس کرنا چاہا لیکن اس نے نہیں لیا۔

‘‘تمہیں جلدی ہے، تم جاؤ اور یہ لے جاؤ۔’’ رندھاوا نے مسکرا کر کہا۔ ‘‘میں خرید لوں گا دوسرا موبائل……! ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ اپنی پہلی فرصت میں اس کی سم بدلوا لینا اور اسے اپنے نام سے ایکٹی ویٹ کروانا۔’’

بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے اپنی خواب جیسی رہائی اور فروزاں سے ملنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف یہ رنج کہ اس کے خالہ زاد بھائی آفتاب کا ایک گھناؤنا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اور فروزاں لائبریری میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ فروزاں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ لائبریری کی لمبی میز کے گرد اس وقت چھ سات سے زیادہ افراد نہیں تھے جبکہ کرسیاں چالیس کے قریب تھیں۔

بختیار نے فروزاں کو ان حالات سے آگاہ کرنا شروع کیا جن سے وہ دوچار ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے آفتاب کے بارے میں وہ ساری باتیں بتائیں جو اسے رندھاوا سے معلوم ہوئی تھیں۔

فروزاں نے سب کچھ خاموشی سے سنا پھر وہ بختیار کے خاموش ہونے کے بعد ذرا سا رک کر دھیمی آواز میں بولی۔ ‘‘دنیا میں اب یہی ہو رہا ہے۔ اتنے قریب کے لوگوں کا خون بھی سفید ہو چکا ہے۔’’

‘‘کیا اب گھر چلیں؟’’ بختیار نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑنے کی کوشش کی جو اسے بہر حال چھیڑنا تھا۔

‘‘میری بات کا یقین کرو اس طرح تمہیں طلاق نہیں ہوئی ہے۔’’ بختیار نے زور دے کر کہا۔ ‘‘اگر میں نے تمہیں خاموش کرانے کی خاطر ایسا جملہ کہہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔’’

‘‘نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میں زمانے کے رواج سے واقف نہیں؟’’

‘‘غلط رواج پڑ گیا ہے اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔’’

‘‘نہیں کر سکتے۔’’ فروزاں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بختیار اپنی کرسی سے اٹھا اور دو مختلف الماریوں سے تین کتابیں لا کے فروزاں کے سامنے کھولیں۔ ان میں سے دو صفحات کھولے جو طلاق کے حوالے سے تھے۔ وہ اس نے فروزاں کے سامنے رکھے۔

‘‘ان تینوں کتابوں کے یہ صفحات پڑھ لو۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن تیسری کتاب ایک بہت بڑے عالم کی ہے۔’’

فروزاں کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ اس کا دماغ بھی الجھا ہوا ہوگا جب وہ ان کتابوں کے صفحات

پڑھ رہی تھی۔

صفحات پڑھنے کے بعد وہ ہکلائی۔ ‘‘یہ تو……یہ تو……’’

‘‘یہ ثبوت ہے نا میری بات کا۔’’ بختیار بولا۔ ‘‘اور اگر تم اسے بھی نہ مانو تو میں ایک ایسی کتاب بھی تمہارے سامنے رکھ سکتا ہوں جس سے بڑی کتاب دنیا میں کوئی نہیں۔’’

‘‘ضرورت نہیں اس کی۔’’ فروزاں نے کہا لیکن وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ‘‘کیا ڈیڈی ان کتابوں سے مطمئن ہو سکیں گے۔’’

‘‘وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کشادہ ذہن رکھتے ہیں، یہ کتابیں ہی انہیں قائل کر دیں گی۔ یہاں فوٹو اسٹیٹ کا بندوبست ہے لیکن ڈیڈی کو دکھانے کے لیے میں یہ کتابیں بازار سے خرید لوں گا۔’’

‘‘تو کیا گھر چلیں۔’’ فروزاں پہلی مرتبہ کسی قدر خوشی سے مسکرائی۔ ‘‘ڈیڈی اب کچھ دیر میں گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔’’

جواب میں بختیار کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ بختیار نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رندھاوا تھا۔

‘‘تم لائبریری ہی میں ہو؟’’ اس نے تیزی سے پوچھا۔

‘‘ہاں۔ کیوں؟’’

‘‘وہاں ٹی وی تو نہیں ہوگا۔’’

‘‘کم از کم میں نے تو لائبریریوں میں ٹی وی نہیں دیکھا۔’’

‘‘تو پھر تم نے خبریں بھی نہیں سنی ہوں گی۔’’

‘‘کوئی خاص خبر؟’’ بختیار نے جلدی سے پوچھا۔

‘‘کنور ثقلین کے حوالے سے ایک اور بات سامنے آئی ہے۔ میں کل رات ہی تمہیں کچھ باتیں تو بتانے والا تھا لیکن ٹی وی کی بریکنگ نیوز آنے کی وجہ سے میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی۔’’

‘‘اب کچھ بتاؤ گے بھی!’’ بختیار تھوڑا سا جھنجلایا۔

‘‘یہ تو میں کل رات ہی بتا دیتا کہ کنور ثقلین ایک ہوس پرست شخص تھا۔’’

‘‘اس بارے میں کچھ بات پہلے بھی ہو چکی ہے۔’’

‘‘کل رات یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جو لڑکیاں تعلقات کی بنا پر اس کے ہاتھ نہیں لگتی تھیں، انہیں وہ اغوا کروا لیتا تھا اور جب اس کی ہوس پوری ہو جاتی تھی تو وہ ان لڑکیوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں غائب کرا دیتا تھا۔ کل رات بھی اس کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے ایک نواحی بستی سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اسے ایک ایسے بنگلے میں پہنچایا تھا جو کنور ثقلین اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ پولیس اس کے کئی ٹھکانوں پر ریڈ کر چکی ہے۔ اس بنگلے سے وہ لڑکی بھی برآمد کر لی گئی ہے جسے ثقلین آباد سے اغوا کیا گیا تھا۔ پولیس نے اس کا میڈیکل کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی داغ دار ہے لیکن اس نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا کہ اسے داغدار کس نے کیا تھا۔ وہ اس معاملے میں کنور ثقلین یا اس کے کسی آدمی کو بھی ذمے دار قرار نہیں دے رہی ہے۔ جس وقت کنور ثقلین کو گولی ماری گئی ہے، لڑکی کو اس سے آدھے گھنٹے پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے اس لڑکی کے اغوا کے بارے میں تو معلوم ہو چکا تھا لیکن یہ بات ٹی وی پر ابھی آئی ہے کہ اس لڑکی کا نام پروین ہے اور اس کی ماں کا نام آسیہ تھا۔’’

‘‘اوہ گاڈ!’’ بختیار نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔

فروزاں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

رندھاوا کہہ رہا تھا۔ ‘‘تم نے جس گھر میں پناہ لی تھی، اس گھر کی مالکہ کا نام خالہ آسیہ اور لڑکی کا نام پروین بتایا تھا نا؟’’

‘‘ہاں۔’’ بختیار کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

‘‘پروین کے اغوا ہونے سے خالہ آسیہ پر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسے اسپتال لایا گیا لیکن وہ بچ نہیں سکی۔ آج پروین اس کی لاش لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئی ہے۔ پولیس تو چاہتی تھی کہ اسے دارالامان بھیج دیا جائے لیکن وہ بضد ہے کہ اپنے گھر میں رہے گی کیونکہ اسے کسی کا انتظار کرنا ہے۔’’

بختیار کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا۔ پروین نے اسے روانہ کرتے وقت کہا تھا۔ ‘‘آیئے گا ضرور! آپ مجھے یاد رہیں گے۔ میں انتظار کروں گی۔’’

‘‘کیا یہ وہی پروین ہو سکتی ہے؟’’ رندھاوا کی آواز بختیار کو کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

بختیار موبائل بند کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

‘‘تم اپنی گاڑی پر آئی ہو نا؟’’ اس نے فروزاں سے پوچھا۔

‘‘ہاں، کیوں؟’’ فروزاں بھی کھڑی ہو گئی۔

‘‘مجھے فوراً کہیں جانا ہے، اور میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔’’

‘‘تو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔’’

بختیار تیزی سے مڑا۔ فروزاں اس کے پیچھے چلی۔ بختیار اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ جو کتابیں اس نے نکالی تھیں، وہ اسے واپس بھی رکھنا چاہیے تھیں۔ اسی لیے لائبریرین اسے ناگوار انداز میں دیکھتا رہ گیا تھا۔

‘‘گاڑی میں چلاؤں گا۔’’ بختیار نے فروزاں سے

چابی لیتے ہوئے کہا۔

فروزاں نے خاموشی سے چابی اسے دے دی اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گئی۔

بختیار نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی تیزی سے دوڑا دی۔

’’احتیاط سے۔‘‘ فروزاں بولی۔

لیکن بختیار نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

’’تم پر اتنا جنون کیوں سوار ہوگیا ہے بختیار؟‘‘ فروزاں پھر بولی۔ ’’کیا بات معلوم ہوئی ہے تمہیں؟‘‘

’’بات۔‘‘ بختیار کے ہونٹ کانپ گئے۔ ’’قیامت کی بات معلوم ہوئی ہے۔‘‘

’’کچھ بتاؤ تو!‘‘

بختیار لائبریری میں فروزاں کو بتا چکا تھا کہ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے نواحی بستی کے جس مکان میں پناہ لی تھی، اس میں پروین اور اس کی بوڑھی ماں رہتی تھیں...... اب اس نے فروزاں کو یہ بھی بتایا کہ رندھاوا سے اسے کیا اطلاع ملی تھی۔

’’مگر......‘‘ فروزاں بولی۔ ’’تم کہہ رہے تھے کہ وہ بہت معصوم لڑکی تھی۔ آخر وہ داغدار کیسے ہوگئی؟‘‘

’’یقیناً کسی نے اس پر جبر کیا ہوگا۔‘‘ بختیار نے غصے سے کہا۔ ’’اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا لیکن میں اس سے پوچھ کر رہوں گا۔ میرا خیال ہے وہ مجھے بتانے سے ہچکچائے گی بھی نہیں۔ وہ مجھے بہت اچھا آدمی سمجھنے لگی تھی۔ شاید وہ مجھے بتا بھی دیتی لیکن غالباً تذبذب کا شکار رہی۔ اسی لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دوبارہ ضرور آؤں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس دوران میں وہ مجھے حقیقت بتانے کی ہمت کر ہی لے گی۔‘‘

’’اس نے بتا بھی دیا تو تم کیا کرسکو گے؟‘‘

’’میں اس معصوم لڑکی کی خاطر وہ سب کچھ کر گزروں گا جو کرسکوں گا جس نے بھی اس پر جبر کیا ہے، میں اسے ہر قیمت پر مجبور کروں گا کہ اب وہ اس سے شادی بھی کرے۔‘‘

فروزاں چپ ہوگئی۔

کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ بختیار کو ثقلین آباد کا راستہ معلوم نہیں تھا اور بس میں وہاں سے آتے وقت بھی وہ راستوں کا دھیان نہیں رکھ سکا تھا لیکن دو ایک لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ ثقلین آباد پہنچ گیا۔

اگرچہ وہ گلی تنگ تھی لیکن بختیار کسی نہ کسی طرح کار آسیہ خالہ کے گھر کے قریب تک لے جانے میں کامیاب رہا۔ عین گھر کے سامنے وہ اس لیے نہیں پہنچ سکا کہ وہاں پاس پڑوس کے بہت سے لوگ موجود تھے۔

کار سے اتر کر لوگوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آسیہ خالہ کو دفن کر کے ابھی واپس لوٹے تھے۔

’’پروین کہاں ہے؟‘‘ بختیار نے کسی سے پوچھا۔

’’آپ کون ہیں؟‘‘ بختیار کو سر سے پیر تک دیکھا گیا۔

’’آپ بس ایک احسان کیجیے مجھ پر!‘‘ بختیار نے اپنی جھنجلاہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ’’کسی طرح پروین تک یہ بات پہنچا دیجیے کہ بختیار آیا ہے۔‘‘

وہ آدمی بختیار کے لہجے سے مرعوب ہو کر بولا۔ ’’میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔‘‘

ذرا دیر بعد ہی بختیار اور فروزاں، پروین کے سامنے تھے۔

گھر میں عورتیں بھی جمع تھیں لیکن پروین نے اس کمرے سے تمام عورتوں کو باہر نکال دیا تھا۔ وہ پلنگ پر اجڑی اجڑی سی بیٹھی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ، وہ خالی خالی نظروں سے بختیار اور فروزاں کو دیکھنے لگی۔

’’مجھے ٹی وی سے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے پروین!‘‘ بختیار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’مجھے بتاؤ، وہ کون ہے جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں اسے پاتال سے بھی نکال لاؤں گا۔‘‘

’’آپ کو یاد نہیں صاحب!‘‘ پروین رو دینے والے انداز میں بولی۔ ’’جب یہاں آپ بیمار پڑے تھے۔ آپ پر مدہوشی طاری ہوگئی تھی۔ کچھ ہوش نہیں رہا تھا آپ کو......! آپ نے کسی فروزاں کو تصور میں دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ فروزاں نہیں تھی صاحب! وہ میں تھی۔‘‘ پروین کی نظریں جھک گئیں اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔ ’’میں بہت پگلی تھی صاحب!‘‘ وہ کانپتی آواز میں بولی۔ ’’مگر آپ نے مجھے نہیں چھوڑا اور......‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بختیار پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اسے وہ سب کچھ یاد آگیا تھا جسے اس نے اپنا خواب سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی فروزاں کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔

لیکن معصوم پروین کی بربادی کا مداوا ہوگیا۔ کچھ ہی دن بعد اس کے نام ’’پروین‘‘ کے ساتھ ’’بختیار‘‘ کا اضافہ ہوگیا۔ پروین بختیار!

اور بختیار کی زندگی کا یہ آخری مرحلہ فروزاں کی خواہش سے طے پایا تھا۔

* * *